انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

مستقل سلسلے

دسمبر 2012

جلد 27 شمارہ 4

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 1-2، ای 6 پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
اسلامی، ہجری سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ محرم الحرام اسلامی سال کا پہلا مہینہ۔ محرم الحرام قبل از اسلام بھی حرمت وعظمت والے مہینوں میں شمار ہوتا تھا۔ یوم عاشورہ کا دن اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی تابناک باب ہے۔ اور اس دن کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔
دس محرم الحرام کو شہادت کا وہ عظیم واقعہ پیش آیا جس کی نظیر انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بہتر رفقاء کے ساتھ میدان کربلا میں شہید کر دیے گئے۔ ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر ہونے والے ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں لیکن تاریخ انسانی میں ان کے نام سنہری حروف میں جگمگا رہے ہیں۔
امام عالی مقام نے حق کے لیے اپنی اور اپنے اہل خاندان کی قربانی دے کر ثابت کر دیا، اہل باطل خواہ کتنی ہی کثیر تعداد میں کیوں نہ ہوں، حق کو ماننے والے ثابت قدم رہتے ہیں۔۔۔ کثرت حق وصداقت کی دلیل نہیں ہے۔ سچائی ہمیشہ قائم رہنے کے لیے ہے۔ کثرت کے زعم میں حق کے ماننے والوں کو نہ جھکایا جا سکتا ہے اور نہ ختم کیا جا سکتا ہے۔

سالِ نو سروے،

جنوری کا شمارہ سال نو نمبر ہوگا۔ سال نو نمبر میں حسب روایت قارئین کی شرکت کے لیے سروے بھی شامل ہوگا۔ اس بار سروے کا سوال یہ ہے۔
گیا سال آپ کو کیا دے گیا؟ اور آپ نے کیا کھو دیا؟ گزرتے سال آپ کو کیا احساس دے جاتے ہیں؟
۱۔ ذاتی حوالے سے۔
2۔ اجتماعی اور ملکی حالات کے حوالے سے۔
اس سوال کا جواب اس طرح بھجوائیں کہ 15 دسمبر تک ہمیں موصول ہو جائے۔

اس شمارے میں،

- عنیزہ سید کا مکمل ناول۔ ٹوٹ ٹوٹ۔ ٹوٹ،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے،
- فائزہ افتخار کے ناولٹ "ایک تھی سنڈریلا" کی آخری قسط،
- راشدہ رفعت اور شہزادی عباس خلجی کے ناولٹ،
- سائرہ رضا، فرح طاہر، امایہ خان اور سعدیہ ملک کے افسانے،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- ایف ایم 103 کی آر جے فضا عابد اور عابد جمیل کا بندھن،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا دسمبر کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔ خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

زباں پہ مہر لگا دے جلال ایسا ہے
نظر کی تاب سے باہر، جمال ایسا ہے

کہیں دکھائی نہ دے اور ہر طرف موجود
گماں یقین میں بدل دے، کمال ایسا ہے

وہ نور جس کی سمائی نہیں کسی دل میں
بشر کی سوچ سے باہر، خیال ایسا ہے

ہر اک چیز نظر آتی ہے زیادہ صاف
ہماری روح کے شیشے میں بال ایسا ہے

عروج پر ہے مقدر بفیضِ چشمِ کرم
یہ مہرِ عمرِ رواں کا زوال ایسا ہے

وہ مسکرائیں گے، سن کر، پلٹ کے دیکھیں گے
ہمارے لب پہ مچلتا سوال ایسا ہے

کوئی بھی وقت ہو امجد یہ پھیلتا رہتا ہے
دلوں میں فضلِ خدا کا نہال ایسا ہے

امجد اسلام امجد

رسولِ مقبول

نعت

وہ کون ہے منتظر تھا جس کا جہان نورانیاں ازل سے
گواہ ہے کہکشاں ابھی تک کہ کوئی اس راہ سے گیا ہے

وہ سرِ تخلیق ہے مجسم کہ خود ہی آدم ہے، خود ہی عالم
وجود کی ساری وسعتوں پر محیط ہے جو وہ دائرہ ہے

وہی ہے اوّل وہی ہے آخر، وہی ہے باطن، وہی ہے ظاہر
یہ سوچ ہے آگہی سے باہر، وہ اور کیا ہے جو وہ گیا ہے

انہی کا مسکن انہی کا گھر ہیں، انہی کی نسبت سے معتبر ہیں
حرم ہو، طیبہ ہو، میرا دل ہو، یہ سب وہی اک سلسلہ ہے

نہیں ہے کوئی مثل اس کا، نہیں ہے کوئی نظیر اس کا
وہ شخص بھی ہے، وہ عکس بھی ہے اور آپ اپنا ہی آئینہ ہے

ہے حدِ واصل کہ خطِ واصل کہ قوس کے قوس ہے مقابل
سلیم عاجز ہے فہم کامل، کہاں بشر ہے، کہاں خدا ہے

سلیم احمد

زہد کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بلاشبہ دنیا کی زندگی کی مثال اس پانی کی سی ہے' جسے ہم نے آسمان سے اتارا' پھر اس کے ساتھ زمین کی نباتات مل کر نکلی جس میں سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی رونق پکڑی اور خوب مزین ہو گئی اور زمین کے مالکوں نے سمجھا کہ بے شک وہ اس (فصل کاٹنے) پر قادر ہیں تو ہمارے حکم (عذاب) رات یا دن کو (اچانک) آگیا۔ چنانچہ ہم نے اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا۔ گویا کل وہ تھی ہی نہیں۔ ہم اسی طرح صاف صاف نشانیاں بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو (وہ ایسی ہے) جیسے پانی' جسے ہم نے آسمان سے برسایا' پھر اس کے ساتھ زمین کی نباتات خوب پھولی پھلی' پھر وہ چورا چورا ہو گئی اسے ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں' وہ ثواب کے لحاظ سے تیرے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔"

اور فرمایا۔ "تم جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا اور زینت و آرائش ہے اور آپس میں فخر و ستائش جتانا اور ایک دوسرے پر مال اور اولاد میں کثرت جتانا ہے۔ (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کہ (اس سے کھیتی اگتی اور) کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے' پھر وہ خوب زور پر آتی ہے' پھر (اے دیکھنے والے) تو اسے دیکھتا ہے کہ پک کر زرد پڑ جاتی ہے' پھر چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں (کافروں کے لیے) عذاب شدید اور مومنوں کے لیے) اللہ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب ہے۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"لوگوں کے لیے نفسانی خواہشوں کی محبت مزین کی گئی ہے' جو عورتیں اور بیٹے اور سونے' چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی ہیں (مگر) یہ سب دنیاوی زندگی کے سامان میں اور اللہ کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے لوگو! بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے' پھر تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ (شیطان) فریب دینے والا اللہ کے بارے میں تمہیں فریب دے۔"

نیز فرمایا۔

"تمہیں کثرت (مال وغیرہ) کی طلب نے غافل کر دیا۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ دیکھو! تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ پھر دیکھو! تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو! اگر تم یقینی علم کے ساتھ جان لو۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل تماشا ہے اور بلاشبہ دار آخرت (کی زندگی) ہی اصل زندگی ہے' کاش! لوگ جانتے ہوتے۔"

ہلاکت

عمرو بن عوف انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرین بھیجا کہ وہاں سے جزیہ (وصول کرکے) لائیں۔ چنانچہ وہ بحرین سے مال لے کر آئے۔

انصار نے ابو عبیدہ کے آنے کی خبر سنی تو وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز میں آپہنچے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور واپس جانے لگے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں دیکھا تو مسکرائے اور پھر فرمایا۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے سن لیا ہے' ابو عبیدہ بحرین سے کچھ مال لے کر آئے ہیں؟"

انہوں نے کہا "ہاں' اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

(واقعی آیا ہے' لہٰذا) تم خوش ہو جاؤ اور خوش کن چیزوں کی امید رکھو اللہ کی قسم! مجھے تمہارے بارے میں فقر سے اندیشہ نہیں کہ وہ تمہارے بگاڑ کا سبب بنے) لیکن یہ اندیشہ ضرور ہے کہ تم پر دنیا فراخ کر دی جائے' جیسے تم سے پہلے لوگوں پر کی گئی تھی۔ تم اس میں اسی طرح رغبت کرو جیسے انہوں نے کی تھی اور یہ چیز تمہیں بھی ہلاکت میں ڈال دے جیسے اس نے انہیں ہلاکت سے دوچار کیا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس سے معلوم ہوا کہ کسی فرد یا قوم کا فقر و تنگ دستی میں مبتلا ہونا' دین کے لحاظ سے اتنا خطرناک نہیں ہے' جتنی مال و دولت کی فراوانی خطرناک ہے' اس لیے اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو مال و اسباب' دنیا کی فراوانی سے ڈرایا ہے تاکہ وہ اس فتنے کی حشر سامانیوں سے اپنا دامن بچا کر رکھیں' لیکن آپ دیکھ لیجئے کہ آپؐ نے جس چیز سے ڈرایا تھا' اب وہ واقعہ بن کر سامنے آگئی ہے اور دولت کی ریل پیل نے اہل ثروت کی اکثریت کو دین' ایمان اور ان کے تقاضوں سے یکسر غافل کر دیا ہے۔ دین سے یہ انحراف اور اعراض ہی وہ ہلاکت ہے جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندیشہ ظاہر فرمایا تھا۔

فریب

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک دنیا شیریں اور شاداب ہے (یعنی ذوق و بصر دونوں کی لذت کی جامع ہے) یقیناً "اللہ تعالیٰ اس میں تمہیں جانشین بنا کر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ چنانچہ تم دنیا (کے فریب) سے بچو اور عورتوں کے فتنے اور مکر) سے بچو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ عورتوں کے مکر و کید سے بچنے کی بطور خاص تاکید سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کے لیے عورت کا فتنہ نہایت ہی خطرناک ہے اور اس تنبیہ سے مقصود یہ ہے کہ اس سے بچنے کے لیے بھی خاص اہتمام کی اور ان احتیاطی تدابیر کے اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو شریعت نے بتائی ہیں' مثلاً "عورتوں کا پردہ' نظر نیچی رکھنا' اختلاط (مرد و خواتین کے ایک ساتھ رہنے) بالخصوص خلوت نشینی (مرد کا عورت کے پاس تنہائی اختیار کرنے) سے گریز وغیرہ۔

آخرت کی زندگی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے اللہ! زندگی تو بس آخرت ہی کی زندگی ہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو موقعوں پر یہ ارشاد فرمایا۔ ایک اس وقت جب مسلمان اپنے بچاؤ

کے لیے نہایت مشکل حالات اور تنگ دستی میں خندق کھود رہے تھے جس سے مقصد مسلمانوں کو صبر اور حوصلے کی تلقین تھی کہ ان کٹھن مراحل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ چند روزہ تکلیف اور مشقت ہے۔ اس کے بعد آخرت کی زندگی ہے اور اصل حقیقی زندگی بھی وہی ہے کیونکہ وہ دائمی ہے اور اس کا آرام بھی لازوال ہے۔ دوسرے اس موقع پر جب حجتہ الوداع میں آپؐ نے اپنے ساتھ مسلمانوں کا ایک جم غفیر دیکھا تو آپؐ نے یہ ارشاد فرما کر مسلمانوں کو تنبیہہ فرمائی کہ اس کثرت و طاقت کو دیکھ کر بے جا گھمنڈ اور خوشی میں مبتلا نہ ہو جانا' یہ سب کچھ عارضی ہے۔ یہ ساری شان و شوکت اور جاہ و حشمت ختم ہو جائے گی۔ اصل زندگی تو آخرت کی ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے بھرپور سعی کی ضرورت ہے۔

تین چیزیں

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تین چیزیں میت کے پیچھے لگتی (اس کے ساتھ جاتی) ہیں۔ اس کے گھر والے' اس کا مال اور اس کا عمل' پھر دو چیزیں تو واپس آجاتی ہیں اور ایک باقی رہ جاتی ہے۔ اس کے گھر والے اور اس کا مال (یعنی غلام وغیرہ) آجاتے ہیں اور اس کا عمل (اس کے ساتھ ہی) باقی رہ جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس میں مسلمانوں کو تنبیہہ ہے کہ زہد و تقویٰ والا عمل اختیار کریں' نہ کہ فسق و فجور والا کیونکہ یہ عمل ہی انسان کے ساتھ قبر میں جاتا ہے اور اسی کی بنیاد پر اس کی سعادت مندی یا بدبختی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر عمل صالح کی پونجی ساتھ لے جائے گا تو برزخ میں آسودگی اور راحت کی زندگی سے بہرہ ور ہو گا اور اگر اس کا دامن' عمل صالح سے خالی ہو گا تو چاہے اس نے کروڑوں اور اربوں کی جائیدادیں اپنے پیچھے چھوڑی ہو' اس کے قطعاً" کوئی کام نہ آئے گی' کیونکہ اس کے ساتھ جانے والا تو اس کا برا عمل ہو گا' جسے اس نے اختیار کیے رکھا۔ یہ برا عمل اسے برزخ میں امن اور راحت سے محروم اور عذاب میں مبتلا رکھے گا۔

دنیا کی خوش حالی

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت والے دن جہنمیوں میں سے ایسے شخص کو لایا جائے گا' جو دنیا میں سب سے زیادہ خوش حال رہا ہو گا' اسے جہنم میں ایک غوطہ دیا جائے گا' پھر پوچھا جائے گا "اے ابن آدم! کیا تو نے کبھی بھلائی (راحت) دیکھی؟ کبھی تجھ پر خوشحالی کا گزر ہوا؟" وہ کہے گا۔ "نہیں' اللہ کی قسم میرے رب!"

اور جنتیوں میں سے ایک شخص کو لایا جائے گا۔ جو دنیا میں سب سے زیادہ دکھی اور مصیبت زدہ تھا۔ اسے جنت میں ایک غوطہ دیا جائے گا' پھر اس سے پوچھا جائے گا۔ "اے ابن آدم! کیا تو نے کبھی اور سختی دیکھی ہے کیا تیرے ساتھ کبھی سختی کا گزر ہوا؟ وہ کہے گا۔ "نہیں! اللہ کی قسم' میرے ساتھ کبھی سختی کا گزر نہیں ہوا۔ نہ کبھی میں نے سختی اور تکلیف ہی دیکھی۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں بھی آخرت کی زندگی کی ترغیب ہے کہ دنیا کی یہ نعمتیں' جن کے حصول کے لیے انسان شریعت کے ضابطوں کو پامال کرتا ہے' جہنم کے ایک غوطے ہی سے فراموش ہو جائیں گی' اس لیے کیوں نہ انسان ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کرے تاکہ وہ آخرت کی دائمی نعمتوں اور اس کی مسرتوں سے ہمکنار ہو۔

2۔ اس دنیا میں دکھوں اور پریشانیوں کی زندگی بسر کرنے والے مومنوں کے لیے امید اور حوصلہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی مشکلات میں سہی لیکن بہت جلدی

ختم ہو جائے گی اور جنت کی نعمتیں دیکھتے ہی ساری مشکلات بھول جائیں گی۔

دنیا کی مثال

حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں ڈبوئے اور (پھر نکال کر) دیکھے کہ وہ سمندر کا کتنا پانی اپنے ساتھ لائی ہے۔" (مسلم)

فائدہ :

اس میں آخرت کی نعمتوں اور اس کی دائمی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی قدر و قیمت اور اس کی زندگی کا تناسب بیان کیا گیا ہے۔ یہ تناسب اس طرح ہی ہے جیسے ایک قطرہ آب اور سمندر کے پانی کے درمیان ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے کی سنگ ریزے والی زمین پر چلا جا رہا تھا کہ احد پہاڑ ہمارے سامنے آ گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابوذر!"

میں نے کہا۔ "لبیک اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو' پھر مجھ پر تین دن ایسے گزر جائیں کہ اس میں سے ایک دینار میرے پاس موجود ہو (یعنی ایک دینار بھی اپنے پاس رکھنا پسند نہ کروں) ہاں! صرف اتنا جسے میں قرض کی ادائیگی کے لیے سنبھال کر رکھ لوں مگر میں اسے اللہ کے بندوں میں اس طرح' اس طرح اور اس طرح تقسیم کر دوں۔" اپنے دائیں' بائیں اور پیچھے کی طرف اشارہ فرمایا۔) آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر آگے چلے اور فرمایا۔

"زیادہ مال و دولت والے' وہی قیامت کے دن (اجر و ثواب میں) بہت کم ہوں گے۔ مگر وہ لوگ جو مال کو اس طرح' اس طرح اور اس طرح اپنے دائیں' بائیں اور پیچھے (لوگوں پر) خرچ کریں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"اپنی جگہ پر رہنا اور جب تک میں تیرے پاس نہ آؤں' یہاں سے نہ ہٹنا۔"

پھر آپؐ رات کی تاریکی میں آگے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آپؐ اوجھل ہو گئے۔ (اچانک) میں نے ایک اونچی آواز سنی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کوئی (دشمن) آپؐ کے درپے تو نہیں ہو گیا۔ چنانچہ میں نے آپؐ کے پاس جانے کا ارادہ کیا' لیکن مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یاد آ گیا کہ "میرے آنے تک یہاں سے نہ ہٹنا۔" پس میں وہیں رہا۔"

یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لے آئے۔ میں نے عرض کیا۔

"میں نے ایک آواز سنی تھی جس سے میں ڈر گیا تھا اور ساری بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

"تم نے وہ آواز سنی تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں!" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ جبریل تھے۔ وہ میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ آپ کی امت میں سے' جو شخص مر گیا' وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو تو وہ جنت میں جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے؟"

جبریل نے کہا "اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے۔" (بخاری و مسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں)

فوائد و مسائل :

1۔ اس کے آخری حصے کا مطلب یہ ہے کہ موحد مومن جنتی ہے اگرچہ اس سے بعض کبیرہ گناہوں کا

ارتکاب بھی ہو جائے۔ اگر اللہ چاہے گا تو اپنے فضل و کرم سے اسے معاف فرما کر جنت میں بھیج دے گا یا پھر سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں چلا جائے گا یا بعض نے اسے ان افراد پر محمول کیا ہے' جنہوں نے موت کے وقت خالص توبہ کی اور اس کے بعد انہیں مزید مہلت عمل نہیں ملی۔ ایسے افراد کے کبیرہ گناہ بھی اللہ تعالیٰ بغیر سزا دیے معاف فرما دے گا۔

2۔ اس کا پہلا حصہ باب سے متعلق ہے' جس میں کم سے کم مال و اسباب دنیا رکھنے کی ترغیب ہے کیونکہ زیادہ مال والے' اجر میں کم ہوں گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرض کی ادائیگی کے لیے رقم سنبھال کر رکھنا نہ صرف جائز ہے' بلکہ ضروری ہے کیونکہ نفلی صدقے سے ادائیگی قرض زیادہ ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اس میں نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے زہد اور انفاق فی سبیل اللہ کا بھی بیان ہے۔

کمتر کو دیکھو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔ "ایسے لوگوں کی طرف دیکھو جو (دنیا کے مال و اسباب کے لحاظ سے) تم سے نیچے (کمتر) ہوں۔ اور ان کی طرف مت دیکھو جو (مال و دولت میں) تم سے اوپر (بڑھ کر) ہوں۔ اس طرح زیادہ لائق ہے کہ پھر تم اللہ کی ان نعمتوں کی ناقدری نہ کرو' جو اس کی طرف سے تم پر ہوئی ہیں۔"

(بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔)

فوائد و مسائل :

1۔ دنیوی مال و اسباب کے اعتبار سے اپنے سے بالا لوگوں کو دیکھنے سے فی الواقع انسان اللہ کی نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری کرتا ہے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا ہے' اس لیے اس کا بہترین علاج وہی ہے' جو خود اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ و سلم کی زبان مبارک ہی سے بیان کر دیا گیا ہے کہ اپنے سے کمتر لوگوں کو دیکھو۔ تمہارے پاس اگر اپنا چھوٹا موٹا مکان ہے' جس میں موسم کی سختیوں سے تم محفوظ رہتے ہو تو فلک بوس عمارتوں اور عالی شان کوٹھیوں کی طرف مت دیکھو' بلکہ ان لوگوں کو دیکھو' جو بے گھر ہیں اور گھڑوں اور فٹ پاتھوں پر رات گزارتے ہیں یا جھونپڑیوں میں رہتے ہیں' جو بارش میں چھلنی کی طرح ٹپکتی ہیں اور سیلابی پانی کے ایک ہی ریلے میں بہہ جاتی یا پیوند زمین ہو جاتی ہیں۔

2۔ تاہم دین کے اعتبار سے ان لوگوں کو دیکھنا چاہیے' جو زیادہ متقی اور عبادت گزار ہوں تاکہ انسان کے اندر تقویٰ اور عبادت کا مزید شوق پیدا ہو جیسا کہ دوسری احادیث میں یہ چیز بیان فرمائی گئی ہے۔

ہلاکت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"دینار و درہم اور شال و دوشالے کا بندہ (پرستار) ہلاک ہو کہ اسے یہ چیزیں دی جائیں تو خوش اور اگر نہ دی جائیں تو ناراض ہوتا ہے۔" (بخاری)

فائدہ :

1۔ دنیا' دینار و درہم اور چادروں کا بندہ ہونے کا مطلب ہے کہ وہ اللہ کے احکام و ہدایات کے مقابلے میں دنیا کی ان چیزوں کے حصول کو ترجیح دیتا اور شب و روز ان ہی میں مگن رہتا ہے۔ گویا وہ اللہ کی بندگی کے بجائے مال و اسباب کی بندگی کرتا ہے اور یہ غیر اللہ کی بندگی اس کی ہلاکت کا باعث ہے۔

ایف ایم ۱۰۳ کی آر جے

فضا عابد ہمراہ عابد جمیل

شاہین رشید

لڑکی یا بیٹی اپنے ماں باپ کے گھر بہت تھوڑا عرصہ رہتی ہے اور پھر بیاہ کر پیا کے گھر چلی جاتی ہے اور اس گھر کے لیے والدین ہی نہیں بلکہ ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ شوہر کا گھر ہی اب تمہارا اصلی گھر ہے اور ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ اگر بندھن مضبوط ہو تو پھر وہی گھر لڑکی کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ گھر کو مضبوط بنانے میں میاں بیوی دونوں کی کاوش ہوتی ہے مگر لڑکی کی ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے..... کیونکہ وہ ایک ماں بھی ہوتی ہے' بیوی بھی اور بہو بھی۔

بندھن کے اس سلسلے میں اس ماہ ہم فضا عابد سے آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں جو ایف ایم کی بہترین آر جے بھی ہیں اور بیوی' بہو اور ماں بھی ہیں۔

"کیا حال ہیں جی اور زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"الحمدُ للہ زندگی بہت اچھی اور بہت مصروف گزر رہی ہے اور اتنی مصروف گزر رہی ہے کہ سر کھجانے کا بھی ٹائم نہیں ہے۔"

"ایسی کیا مصروفیات ہیں؟ گھر کی مصروفیات زیادہ ہو گئی ہیں کیا؟"

"گھر کی مصروفیات تو خیر بہت زیادہ نہیں ہیں۔ اصل میں شام کے وقت میرا پڑھائی میں کافی ٹائم گزر جاتا ہے۔ پھر ریڈیو بھی چل رہا ہے اور ماشاء اللہ بیٹی کی اسکولنگ بھی شروع ہو گئی ہے تو بس ان ہی مصروفیات میں وقت گزر جاتا ہے۔ اگرچہ میری بیٹی ابھی دو سال کی بھی نہیں ہوئی ہے لیکن اس کی مو شروع ہو چکی ہے۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ اتنے بچے کے لیے ماں کی گود زیادہ ضروری ہوتی ہے اور گھر کی تربیت زیادہ اہم ہوتی ہے۔"

"گھر کی تربیت بے شک بہت ضروری ہوتی ہے اور گھر آپ کے ماں باپ اور آپ کے بڑوں سے بنتا ہے لیکن آج کل یہ بھی ضروری ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچہ بچے کو دیکھ کر زیادہ سیکھتا ہے اور جو ٹیچر ہوتی ہے وہ بہت اچھے طریقے سے بہت پیار سے بچے کو بہت کچھ سکھاتی ہے کیونکہ یہ عمر ایسی ہوتی ہے جب بچے کا دماغ بہت تیزی سے کام کرتا ہے اور بچہ بہت کچھ سیکھ جاتا ہے اور جدید ریسرچ سے بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ پانچ سال سے کم عمر کا بچہ دو زبانیں بولنا سیکھ لے تو اس کے دماغ کا ہاف پارٹ جو کہ ہم استعمال نہیں کرتے' وہ بڑی تیزی سے ڈیولپ ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بچہ بہت ذہین ہو جاتا ہے۔"

"18 جون 2010ء کو آپ کی شادی ہوئی تو پہلے اپنے اور پھر اپنے میاں صاحب کے بارے میں بتاؤ؟"

"جی ضرور..... میرے والد صاحب کا نام احسن مصطفیٰ ہے اور وہ ڈاکٹر ہیں اور والدہ کا نام سیدہ شبانہ احسن ہے اور وہ فضائیہ انٹر کالج میں ٹیچر کو آرڈینیٹر اور کیمسٹری کی لیکچرار ہیں۔ میں 26 دسمبر 1986ء کو پیدا ہوئی اور ایم بی اے کی طالبہ ہوں اور میرے شوہر ہماری ہی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی والدہ میری

دادی کی کزن ہیں اور یہ اپنی فیملی کے بہت لاڈلے ہیں ان کی ایک بہن ہے اور یہ تین بھائی ہیں اور چونکہ یہ سب سے چھوٹے ہیں تو میں سب سے چھوٹی بہو ہوں میری نند شادی شدہ ہیں اور ماشاء اللہ ساس کا رتبہ بھی انہوں نے پالیا ہے اور جو دو بھائی شادی شدہ ہیں ان کے بچے بھی ماشاء اللہ بڑے بڑے ہیں۔ میاں صاحب گریجویٹ ہیں اور ان کا اپنا بزنس ہے۔"

"شادی ارینج ہے یا تمہاری ملاقات تھی یا کوئی پسند تھی؟"

"میں نے بہت سالوں پہلے کسی فیملی فنکشن میں انہیں دیکھا تھا اور چونکہ ہمارے گھر میں تعلیم کا بہت زیادہ رجحان ہے تو میری والدہ نے ہمیں یہ احساس دلایا کہ تعلیم پہلے ہے اور فیملی فنکشن یا دیگر تقریبات دوسرے نمبر پر ہیں۔ بڑا خاندان ہونے کے باوجود ہمارا اتنا آنا جانا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن 2001ء میں بہت ہی قریبی کزن کی شادی تھی ہم اس میں ان سے ملاقات ہوئی تھی اور اس وقت انہوں نے تھوڑا اظہار پسندیدگی کیا تھا مگر میں اس وقت کافی چھوٹی تھی۔ پھر 2009ء میں میری دادی کے انتقال پہ ان کی فیملی بھی آئی جب دادی کے انتقال کے بعد پہلی عید تھی۔ اس وقت ان کے ذہن میں اور ان کی امی کے ذہن میں کچھ خیال ابھرا اور دو مہینے کے اندر اندر میری بات ان سے پکی ہو گئی۔"

"انہوں نے ڈائریکٹ تم سے پسندیدگی کا اظہار کیا یا والدہ کو بھیجا؟"

"ان کے بڑے بھائی نے مجھے پسند کیا اور والدہ سے ذکر کیا اور کہا کہ آپ سوچیں ان کے بارے میں اور جب ان کی امی نے مجھے دیکھا تو کہا کہ ہاں! تمہاری سوچ بالکل صحیح ہے اور پھر وہ ہمارے گھر رشتہ لے کر آئیں۔ لیکن میری طرف سے تھوڑی ہچکچاہٹ تھی کیونکہ میں ابھی ان ساری ذمہ داریوں کے لیے تیار نہیں تھی پھر بڑوں نے سمجھایا تو بات کچھ عقل میں آئی اور میں نے کہا کہ چلیں! ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔"

"آج کی جنریشن کی سوچ ذرا مختلف ہے تو کون سی شادی بہتر رہتی ہے۔ لو یا ارینج؟"

"مزے کی بات آپ کو بتاؤں کہ ہمارے خاندان میں میرے دادا' دادی کی لو میرج تھی۔ میرے مما پاپا کی لو میرج' میرے ساس سسر کی لو میرج' میرے دونوں جیٹھوں اور میری نند کی بھی لو میرج ہے اور صرف ہم دو ہی ایسے ہیں جن کی ارینج میرج ہوئی ہے۔ لیکن اگر 2001ء کی بات کریں تو اس وقت انہوں نے اظہار پسندیدگی کیا تھا..."

"ہوں... تو یہ صورت حال ہے...؟"

"دیکھیں! کوئی بھی رشتہ ہمیشہ محبت کے سہارے نہیں گزر سکتا جہاں پہ عزت ہے' احترام ہے۔ وہ رشتہ پائیدار ہے اور چاہے لو کریں چاہے ارینج کریں' مگر عزت و احترام کو برقرار رکھیں۔ آپ کے تعلقات اور آپ کا رشتہ ہمیشہ برقرار رہے گا بلکہ مضبوط رہے گا۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور اس دوران ملاقات وغیرہ ہوتی تھی؟"

"اگست 2010ء میں ان کے یہاں سے رشتہ آیا اور پھر نومبر میں بقر عید سے صرف ایک دن پہلے منگنی کی رسم ہوئی تھی اور میری دوستوں اور میرے کزنز نے مجھے خوب سنائی تھیں کہ ہم اپنی گائے اور بکرے تمہارے لان میں باندھ دیں گے۔ بھلا بقر عید سے ایک دن پہلے بھی کوئی منگنی کرتا ہے۔ تو جناب! منگنی کے بعد بھی ملاقاتیں رہیں اور دونوں فیملیز نے بھی منع نہیں کیا بلکہ سب کا خیال تھا کہ ملاقات کرنے سے ایک دوسرے کے مزاجوں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور یوں ہر دوسرے تیسرے دن ملاقات رہتی تھی۔"

"شادی کے بعد لڑکا لڑکی جب میاں بیوی بن جاتے ہیں تو پھر کیا چینج لگتا ہے۔ پہلے جیسی باتیں رہتی ہیں یا ایک دم تبدیلی آتی ہے؟"

"شادی سے پہلے جب ہم نے ایک دوسرے سے اپنا رشتہ شروع کیا تھا تو ہمارے درمیان یہی باتیں ہوتی تھیں کہ ایک دوسرے سے اپنا ہر مسئلہ شیئر کریں گے اور ہر کام باہمی انڈر اسٹینڈنگ سے کریں گے اور میرے یا آپ کے بیچ میں "ہم" یا "تم" نہیں آئے گا بلکہ ہماری باہمی رضامندی سے سب کام ہوں گے... اور اس وقت ہی اتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی کہ وہ رشتہ ابھی تک ویسا ہی چل رہا ہے اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ جیسے ہماری شادی اسی وقت ہو گئی تھی یا ابھی تک منگنی کا ہی پریڈ چل رہا ہے۔ ہاں کچھ میری عادتیں بگڑی ہوئی تھیں جو انہوں نے سدھاریں اور کچھ عادتیں ان کی بگڑی ہوئی تھیں جو میں نے سدھاریں اور اب ہم دونوں کو ہماری اولاد سدھار رہی ہے۔"

"ماں باپ کا گھر چھوڑتے وقت کیا احساسات تھے؟ جہاں زندگی کے بہت خوب صورت 18' 20 سال گزارے ہوتے ہیں؟"

"ماں باپ کے ساتھ میرا اتنا زیادہ وقت نہیں گزرا' کیونکہ میں ان بچوں میں سے ہوں جہاں ان کی پرورش دادا' دادی یا نانا' نانی کرتے ہیں۔ بہت اچھا وقت گزرا' لیکن میرے ماں باپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ رخصتی سے ایک دن پہلے میرا نکاح ہوا تھا اور جب نکاح نامے پہ میرے دستخط ہو رہے تھے تو مجھے کچھ یاد نہیں تھا میرے برابر میں میری امی کھڑی تھیں اور وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ بیٹا! کیا خیال ہے تمہارا۔ تو اس وقت مجھے صرف اور صرف اپنی دادی یاد آرہی تھیں اور پھر جو میں نے رونا شروع کیا تو مجھے چپ کرانا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ میں ان سے بہت زیادہ کلوز تھی۔ تھوڑا عرصہ پہلے ہی ان کا انتقال ہوا تھا اور رخصتی کے وقت میں سوچ رہی تھی کہ یہ وہ گھر ہے جہاں دادی کے ساتھ میں نے اتنا عرصہ گزارا..."

"کوئی دلچسپ واقعہ..... یا رخصتی سنجیدگی میں ہوئی؟"

"2010ء میں جب میری شادی ہوئی تو اس وقت نیا نیا آرڈر نکلا تھا کہ بارہ بجے ہال بند ہو جائیں گے تو رخصتی کے وقت ہمارے سسر جی ایک دم بولے کہ چلو چلو' بارہ بجنے والے ہیں تو ایک دم سے شور مچا اور ہم اپنی شادی کا کھانا بھی نہیں کھا سکے۔ ہمارے ہاتھ میں بروسٹ تھا جو بے چارہ منہ تک گیا ہی تھا کہ ہمیں واپس رکھنا پڑا اور ہمیں کار میں بٹھا دیا گیا تو پیچھے سے آواز آئی کہ بھئی! اس سے ملنے تو دو تو خیال آیا کہ رخصتی کے وقت رونے دھونے کا سین تو رہ ہی گیا تھا۔ امی سے تو خیر مل لی' ابو سے مل کر تھوڑا سا رونا آیا لیکن بھائی سے ملتے وقت جو رونا آیا۔ وہ بتا نہیں سکتی کیونکہ ہم دونوں ہر شرارت میں' ہر کام میں آگے آگے رہتے تھے۔ اکیلے نہ کسی سے ڈانٹ کھائی اور نہ ہی کوئی کام کیا۔ تو بس احساس تھا کہ اب پہلے والی نہ ملاقاتیں ہوں گی نہ شرارتیں ہوں گی۔"

"جہاں میکہ چھوڑنے کا احساس ہوتا ہے وہاں نئی زندگی اور نئے لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے کچھ خدشات بھی ہوں گے؟ شروع میں تو آؤ بھگت بہت ہوتی ہے۔"

"خدشات تو تھے ہی' لیکن ماحول اس لحاظ سے بہت زیادہ نیا نہیں تھا کہ سارے اپنے جانے پہچانے والے لوگ تھے بلکہ سارا خاندان ہی اپنا تھا اور آؤ بھگت بہت ہوئی اور آپ یقین مانیں کہ آج بھی اتنی ہی آؤ بھگت ہوتی ہے اور چونکہ چھوٹی بہو ہوں تو اس کے فائدے ہی الگ ہوتے ہیں۔ لاڈ بڑا ملتا ہے اور سچ جانئے! آج تک کسی نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ میری ساس میری ماں سے بڑھ کر ہیں۔ ہر چیز میں میرا سب سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ جٹھانیاں اتنی اچھی ہیں کہ وہ میرا خیال کر رہی ہوتی ہیں کہ یہ پڑھ کر آئی ہے۔ پروگرام کر کے آئی ہے تو تھکی ہوئی ہوگی اور میری بیٹی کا خیال بھی وہی رکھ رہی ہوتی ہیں۔ بہت کم لوگوں کو ایسا سسرال ملتا ہوگا جیسا مجھے ملا ہے۔ میں اللہ پاک کا جتنا شکر کروں کم ہے۔"

"کہتے ہیں کہ میکے میں بڑی آزادی ہوتی ہے۔ سونے جاگنے کی اٹھنے بیٹھنے کی کھانے پینے کی تو کیا سسرال میں بھی ایسا ہوتا ہے؟"

ہنستے ہوئے "جب میں امی کے گھر جاتی ہوں تو میرے لیے رہنا اور سونا مشکل ہو جاتا ہے۔ الٹ حساب ہو گیا ہے۔ سسرال میں مجھے ہر چیز کی آزادی ہے۔ امی کے گھر میں نہیں ہے۔ امی کے گھر جا کر سوتی ہوں تو اٹھا کر بٹھا دیتی ہیں کہ یہ کوئی وقت ہے تمہارے سونے کا یا آرام کرنے کا جبکہ سسرال میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ جہاں دل چاہے جاؤ' جو دل چاہے کھاؤ جس طرح رہنا ہے اس طرح رہو۔ بس یہ ضرور کرتی ہوں کہ ہر کام بڑوں کی اجازت سے کرتی ہوں۔ ہمارے گھر کا ماحول ہماری ساس نے اس طرح سیٹ کیا ہے کہ جو بھی بات ہو' وہ بڑوں تک ضرور پہنچا دی جائے۔ انہیں اعتماد میں لے لیا جائے۔ دوسروں کے منہ سے کوئی بات پتا چلے تو آپ کو اطمینان ہو کہ آپ نے یہ بات بتائی ہوئی ہے۔"

"فضا! یہ بتاؤ کہ ایک شادی شدہ جوڑے کو کتنا عرصہ جوائنٹ فیملی میں رہنا چاہیے؟"

"یہ سوال تو میرے لیے ایسا ہی ہو جائے گا کہ جیسے آپ مجھ سے پوچھ رہی ہوں کہ تم کتنا عرصہ اپنے بھائی کو برداشت کر سکتی ہو' جوائنٹ فیملی میں آپ کے بھائی کسی اور کی بیٹی لے کر آتے ہیں۔ آپ کی بہنوں کے توسط سے کوئی اور مرد آپ کی فیملی میں یا آپ کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے اور تعلقات بڑے مخلصانہ ہوتے ہیں تو جتنی محبت آپ اپنے بھائی سے کرتی ہیں اتنی ہی اپنی بھابھی سے بھی کر لیں۔ جتنا احترام اور پیار اپنی بہن سے کرتے ہیں اتنا ہی پیار اپنے بہنوئی سے بھی کر لیں تو پھر ساری زندگی ممکن ہے ایک ساتھ رہنا۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی اور تمام رسمیں ہوئیں؟"

"ماشاء اللہ بہت دھوم دھام سے اور میری شادی میں میرے ساس سسر نے بہت ڈانس کیا اور ہم دلہن دولہا نے بھی اپنی شادی میں خوب ڈانس کیے۔ رسمیں بھی بہت ہوئیں اور ہمارے یہاں مایوں کا جو تصور ہے وہ یہ کہ لڑکی کو کافی دن پہلے مایوں بٹھا دیا جاتا ہے تو امی نے مجھے شادی سے دس دن پہلے مایوں بٹھا دیا تھا اور مجھ پر یہ پابندی تھی کہ میں آسمان کے نیچے نہیں جاؤں گی۔ کسی نامحرم کے سامنے نہیں جانا۔ سر پر دوپٹا رہتا تھا اور نہانے پر بھی پابندی تھی اور پیلا جوڑا تھا۔ یہ میری مایوں تھی....."

"دس دن تک تم نہیں نہائیں..... تو..... جون کے مہینے میں تو حشر نشر ہو گیا ہوگا؟"

"بالکل حشر نہیں ہوا' آپ کو ایک مزے دار بات بتاؤں کہ روزانہ مجھے ابٹن' زیتون کا تیل اور چنبیلی کا عرق لگایا جاتا تھا اور دس دن کے بعد جب میں نہائی تو میرے جسم میں اتنی خوب صورت مہک تھی کہ شادی کے ہفتے دو ہفتے وہ خوشبو برقرار رہی اور ماشاء اللہ روپ بھی لوگ کہتے ہیں۔ بہت آیا اور جب میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو میں خود حیران رہ گئی کہ یہ میں ہوں؟"

"شادی کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش آیا جو یادگار بن گیا ہو؟ یا سب کام سیٹ ہو گئے تھے؟"

"ہاں! اللہ کا شکر ہے کہ سب کام سیٹ ہو گئے تھے اور ہمارے گھر والوں نے کوشش کی کہ مایوں میں ہمارے میاں صاحب ہمیں نہ دیکھیں اور ہمارے سسرال والوں نے کہا تھا کہ ہم خود آ کر مایوں بٹھائیں گے تو بڑی سادگی کے ساتھ عصر کے وقت ہمیں مایوں بٹھایا گیا بہت قریبی لوگ تھے جو رسم کرنے آئے تھے۔

ان میں ایک خاتون نہ صرف برقعہ میں بلکہ پورے نقاب میں تھیں تو امی سب کو سلام کر رہی تھیں مگر وہ خاتون جواب نہیں دے رہی تھیں بلکہ وہ امی کے قریب آ کر تیزی سے اندر چلی گئیں۔ امی کو گھبراہٹ کہ یہ کون عورت ہے' بعد میں پتا چلا کہ برقعے میں تو ہمارے میاں صاحب تھے۔ ہمارے گھر والے جو کچھ کر سکتے تھے' کر لیا مگر ان کو باہر نہیں نکال سکے اور آخر ہمارے میاں صاحب نے ہمیں دیکھ ہی لیا۔"

"میاں صاحب کو شادی سے پہلے اور پھر شادی کے بعد کتنا مختلف پایا؟"

"شادی سے پہلے ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہوتا بلکہ طبیعت میں ایک بچپنا سا پایا جاتا ہے اور شادی کے بعد اچانک ہی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے اور مزاج میں بھی تھوڑا ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ سنجیدگی آ جاتی ہے' یہ تبدیلیاں میں نے ان میں دیکھی ہیں ویسے یہ بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ کسی بات کا برا نہیں مانتے' غصہ نہیں کرتے' اگر میں غصے میں آ جاؤں تب بھی معاملے کو سنبھال لیتے ہیں۔ مسائل کو شیئر کرتے ہیں اور اگر کوئی بات ہو جائے تو ہم دونوں بڑوں سے ڈانٹ بھی مل کر کھا لیتے ہیں۔"

"صرف ڈانٹ مل کر کھاتے ہیں یا کھانا بھی مل کر کھاتے ہیں؟ گھر سے باہر کھانا پسند کرتے ہیں یا گھر پر ہی؟"

ہنستے ہوئے "ہم سب چیزیں ہی مل کر کھاتے ہیں اور کبھی ایسا ہو کہ یہ مصروف ہوں اور میں بھی مصروف ہوں تو پھر ہم کہیں باہر جا کر کھانا کھا لیتے ہیں۔ شادی سے پہلے تک اور بے بی ہونے سے پہلے تک ہم نے کراچی کے ایک ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ کیونکہ اور کچھ تھا نہیں کرنے کو' اس لیے کھانے پینے پر ہی زیادہ زور ہوتا تھا اور ویسے بھی اگر میں روزانہ ان کو پکا کر کھلاؤں گی تو پھر ان کو میری قدر نہیں رہے گی۔ جب ان کی فرمائشیں اکٹھی ہو جاتی ہیں تو پھر مہینہ دو مہینہ بعد میں ان کی فرمائش پوری کر دیتی ہوں ان کی پسند کا کھانا پکا کر۔"

"میاں صاحب کی کوئی اچھی اور بری عادت بتاؤ ..... لڑائی ہو تو صلح میں پہل کون کرتا ہے؟"

"اچھی عادت تو یہ ہے کہ کسی بھی بات پر غصہ نہیں کرتے۔ بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ ایک

دوسرے کی بات سن کر پھر کوئی بات کرتے ہیں اور بری عادت یہ ہے کہ کبھی کبھار کچھ نہیں سنتے۔ بس اپنی ہی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ میں صحیح ہوں اور دوسرے غلط ہیں۔۔۔ لڑائی خطرناک قسم کی نہیں ہوتی' بلکہ ایسی ہوتی ہے کہ لڑتے لڑتے آخر میں کسی ایک بندے کو ہنسی آجاتی ہے۔"

"ان کو سادگی میں اچھی لگتی ہیں یا بجی بنی۔"

"میں بہت زیادہ تیار رہتی تھی' مگر انہوں نے مجھے کہا کہ تم مجھے سادگی میں بہت اچھی لگتی ہو۔ اس لیے اب گھر میں میں سادہ سے حلیہ میں رہتی ہوں۔ میں نے سوچا کہ جب ان کو سادگی پسند ہے تو پھر میک اپ کا خرچ بھی بچالیا جائے۔"

"شادیوں میں جو بے جا اسراف ہوتا ہے' اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"کسی بھی چیز میں خوشی کا اظہار کرنا خواہ وہ پیسے کی شکل میں ہو یا سادگی کی صورت میں ہو یا کسی بھی صورت میں ہو' سب کا اپنا ایک مختلف انداز ہے لیکن اگر آپ کے پاس اتنی حیثیت نہیں ہے کہ آپ دھوم دھڑکا کر سکیں تو نہ کریں۔ اس میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔"

"دیکھا گیا ہے کہ آج کل "طلاق" کا رجحان کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ جہاں تھوڑا سا اختلاف ہوا' تین لفظ بول کر فارغ کر دیتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ غلطی کس کی ہوتی ہے؟"

"غلطی کسی ایک انسان کی تو نہیں ہو سکتی۔ لیکن فیصلہ کرنے والا تو ایک انسان ہی ہوتا ہے اور وہ انسان وہ ہوتا ہے جو بہت زیادہ برداشت کر چکا ہو گا یا جو بہت زیادہ تنگ آچکا ہو گا۔ آج کل مختلف وجوہات ہیں۔ آپ نے کہا کہ 25 سال بعد بھی طلاق ہو جاتی ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ پھر مرد بہت جلد کم عمر لڑکی سے شادی بھی کر لیتا ہے اور اگر عورت طلاق مانگے گی 25 سال بعد تو وہ پھر اپنی اولاد کو پروان چڑھانے کے بعد مانگے گی۔"

"لڑکیوں کو اپنے مسائل خود حل کرنے چاہئیں یا رشتے داروں کی مداخلت سے دور کرنے چاہئیں! ماؤں کا اور رشتے داروں کا کتنا قصور ہوتا ہے؟"

"جو بھڑکانے میں آجاتے ہیں' وہ اپنا گھر خود برباد کرتے ہیں۔ ایک لڑکی جس کی شادی میچیور عمر میں ہوتی ہے۔ وہ کبھی غلط مداخلت برداشت نہیں کرے گی ہمارے یہاں اکثر لڑکیاں چھوٹی چھوٹی باتیں اپنے میکے جا کر کرتی ہیں اس حد تک کہ آج چاول پکانے کا موڈ تھا مگر چاول نہیں پکائے تو پھر ایسی لڑکیاں اپنا گھر خود برباد کرتی ہیں اور مائیں مداخلت کرتی ہیں۔ بیٹی کی لگائی گئی چھوٹی چھوٹی چغلیوں پر بپھر جاتی ہیں اور خوامخواہ کی حمایت کرتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ رشتہ خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ سیریس معاملات میں گھر والوں سے ضرور مشورہ لیں لیکن چھوٹے چھوٹے معاملات کو خود حل کریں کیونکہ جس کے ساتھ آپ نے نباہ کرنا ہے' جس کے ساتھ ساری زندگی رہنا ہے اس کے ساتھ آپ کو کمپرومائز بھی کرنا پڑے گا۔"

"بہت اچھے خیالات ہیں فضا آپ کے۔۔۔۔ اب آخری سوال کہ کمرے میں آکر عابد صاحب نے پہلا جملہ کیا بولا تھا؟"

"تب۔۔۔۔ تب میں نے پانی مانگا تھا اور مجھے میری دوست نے کہا تھا کہ اگر شادی کی رات تم نے اپنے شوہر سے پانی مانگ لیا تو شوہر ساری زندگی تمہارا ہی ہو کے رہے گا اور شوہر نے تم سے پہلے پانی کا گلاس مانگ لیا تو پھر ساری زندگی تم کو اس سے دب کر رہنا پڑے گا۔ بس اس لیے میں نے سوچا کہ آزمانے میں کیا حرج ہے چنانچہ میں نے پانی کا گلاس مانگا اور آج تک وہ صحیح چل رہے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فضا عابد جمیل سے اجازت چاہی۔

دستک دستک

شاہین رشید

اختر حسنین

"کیسے ہیں اختر حسنین؟"
"اللہ کا کرم ہے۔"
"میری لاڈلی" میں آپ کی پرفارمنس بہت اچھی تھی۔ کیا رسپانس ملا تھا؟"
"بہت اچھا رسپانس ملا اور اللہ کا شکر ہے کہ میں جب سے اس فیلڈ میں آیا ہوں تب سے ہی مجھے تنقید کم اور تعریف زیادہ سننے کو ملی ہے۔"
"اب تو ماشاء اللہ آپ کا اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ کیا کیا پیش کر چکے ہیں؟"
"ابھی تو ابتدا ہے۔ مگر جو کچھ بھی پروڈیوس کیا، اس کا رسپانس بہت اچھا ملا ہے۔ ہم نے ایک ٹیلی فلم "راکھ" پروڈیوس کی جو کہ بہت پسند کی گئی۔ پھر ایک سوپ "گلیاں اور چوبارے" "تیری آہٹ" ڈراما سیریل کنارا اور چہرہ زن وغیرہ پروڈیوس کر چکا ہوں اور ابھی مزید کام ہو رہا ہے۔ ایک فلم کی بھی منصوبہ بندی کر رہا ہوں اور فلم انڈسٹری کو اس کی پرانی ڈگر پر یا مقبولیت پر لانے کے لیے بھی جدوجہد کر رہا ہوں۔"
"اس فیلڈ میں آنا محض ایک حادثہ تھا یا یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا پڑی؟"
"سب کچھ حاصل کرنے کے لیے کافی محنت کرنا پڑی۔ ویسے بھی اس دنیا میں سب کام اتنی آسانی سے کہاں ہوتے ہیں۔ شوبز کی دنیا میں اپنا مقام بنانا اتنا آسان نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔"
"دھوکے کھائے؟"
"بہت دھوکے کھائے۔ شوبز کی فیلڈ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو آپ کو کبھی آگے بڑھنے میں مدد نہیں دیں گے۔ مگر کچھ لوگ اچھے بھی ہیں اور چونکہ مجھے اس فیلڈ میں آنے کا شوق تھا تو کسی نے میرے شوق کو نہیں سمجھا نہ مجھ سے کام کروانے کی کوشش کی بس لارے لپے دیتے رہے کہ ہم تم کو ایکٹر بنا دیں گے۔ پھر اللہ کا کرم ہو ہی گیا۔ نعمان اعجاز صاحب نے کسی سے بات کی اور مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ "لگام" میرا پہلا ڈراما سیریل تھا۔ بس پھر اس کے بعد چل سو چل والا سلسلہ شروع ہوا اور اب آپ کے سامنے ہوں میں اپنی زندگی میں نعمان اعجاز، جاوید فاضل، سیما طاہر خان اور ایس سلمان صاحب کی مہربانیوں کو کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔"
"کتنے برس ضائع کیے شوبز میں آنے کے لیے؟"

"وقت تو میں نے ضائع کیا ہی نہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ اگر مجھے شوبز میں کام نہیں مل رہا یا مجھے کوئی لفٹ نہیں کرا رہا تو میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھا ہوں۔ میں ایک سیلف میڈ انسان ہوں، اپنی محنت پر بھروسا کرتا ہوں اور اپنی محنت سے ہی آگے بڑھتا ہوں۔"
"جاب وغیرہ بھی جاری رکھی کیا؟"
"بالکل! شاید میں اپنے خاندان کا واحد انسان ہوں جس نے بہت ہی کم عمری میں میں ملازمت کی اور یہ بات ہے 1993ء کی جس کمپنی میں میں نے ملازمت کی وہاں کا کم عمر ترین ایمپلائی تھا۔ اللہ نے اچھی شکل و صورت دی ہوئی تھی چنانچہ 21 سال کی عمر میں ایک کمرشل میں کام کرنے کی آفر آئی اور کمرشل کرنے کے بعد چسکا لگ گیا شوبز کا..... بس پھر اس فیلڈ میں آنے کے لیے جدوجہد شروع ہو گئی۔"
"کم عمری میں اور کیا کیا کیا؟"
"میں نے ہر طرح کے کام کیے ہیں۔ اپنی محنت کی کہانی بتا رہا ہوں آپ کو، جب اسکول کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو عام بچوں کی طرح سارا وقت کھیل کود میں نہیں گزارتا تھا بلکہ ایک فیکٹری میں ملازمت کی اور آٹھ سو روپے مہینے کی سیلری حاصل کی۔ ہر چھٹیوں میں کوئی نہ کوئی کام ضرور کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جمعہ بازار میں ایک سائیکل اسٹینڈ پر بھی کام کیا۔ چپس بھی فروخت کیے یوں سمجھیے کہ کون سا کام تھا جو میں نے نہیں کیا۔"
"گڈ..... محبت بھی کی؟"
"قہقہہ..... "یہ کام تو عمر کے ساتھ ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔ اب تو بس شادی ہی کرنی ہے۔"
"اچھا..... کب کر رہے ہیں اور کیا بیگم کا تعلق شوبز سے ہی ہو گا؟"
"ان شاء اللہ 2013ء میں شادی کروں گا اور بیگم کا تعلق شوبز سے ہی ہو گا بلکہ ہے اور وہ بہت اچھی فنکارہ ہیں۔ آپ بھی بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔"
(ہماری اطلاع کے مطابق ان کی شادی اداکارہ رز کمالی سے ہو رہی ہے۔)
"اچھا..... خوب صورتی متاثر کرتی ہے یا محبت؟"
"دونوں..... خوب صورتی تو سب کو ہی پسند ہوتی ہے اور مجھے بھی ہے اور خوب صورتی کے ساتھ ساتھ محبت بھی ہو تو کیا کہنے..... ویسے میں بہت رومانٹک مزاج ہوں اور یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"
"اسٹار اور تعلیم کیا ہے آپ کی؟"
"اسٹار تو لبرا ہے اور تعلیم گریجویشن ہے اور میں شاید اپنے اسٹار کے مطابق ہی ہوں۔"
"ویسے تو آپ نے اب کافی شہرت پالی ہے۔ پھر بھی آئندہ چند سالوں میں اپنے آپ کو کہاں دیکھتے ہیں؟"
"انسان بہت ہی بے اختیار ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے میرا کام محنت کرنا ہے۔ راستے کھولنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔"
"ڈراموں کے سلسلے میں ملک سے باہر بھی جاتے رہتے ہیں۔ کون سا ملک بہت اچھا لگا اور کہاں مستقل رہنے کی خواہش ہے؟"
"میں کافی ممالک میں جا چکا ہوں۔ سب سے اچھا ملک اپنا پاکستان ہے لیکن پھر بھی اگر مستقل رہنے کا موقع ملا یا کوئی چوائس ملی تو پھر دبئی کو ترجیح دوں گا۔ بہت ترقی کی ہے دبئی نے۔"
"اپنی زندگی سے خوش ہیں؟"
"الحمد اللہ..... بہت خوش ہوں جو چاہا حاصل کیا اگرچہ بہت محنت کی، لیکن محنت کا صلہ بھی پایا اور اب محنت کر کے ایک اچھا پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بننا چاہتا ہوں۔"
"اپنے ہم عصروں میں کون سے فنکار پسند ہیں؟"
"فہد مصطفیٰ، فیصل قریشی بہت اچھے فنکار ہیں۔ ہر قسم کے کردار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"
"ہمیں آپ کے اگلے سیریل کا انتظار رہے گا۔"

فیصل قریشی

"کیسے ہیں فیصل؟"

"الحمدللہ۔"

"کیا کھاتے ہیں کہ اتنے اسمارٹ ہیں؟"

قہقہہ۔ "خوش رہتا ہوں۔ دوسروں کی خوشیوں کا خیال رکھتا ہوں۔ ایکسرسائز کرتا ہوں اور ڈائیٹ کا خیال رکھتا ہوں۔ بس اس لیے آپ سب کو اسمارٹ دکھتا ہوں۔"

"اگر اس فیلڈ میں نہ ہوتے تو کیا پھر بھی اس طرح اپنا خیال رکھتے؟"

"یقیناً"۔۔۔ کیونکہ اچھا نظر آنا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ شوبز سے ہٹ کر بھی لوگوں کو دیکھیں کہ وہ کتنے اسمارٹ ہوتے ہیں اور جنہیں اچھا نظر آنے کی خواہش ہوتی ہے وہ اپنا خیال ضرور رکھتے ہیں۔"

"اس فیلڈ میں حسد بہت ہے۔ کبھی دل دکھتا ہے؟"

"کیوں نہیں دل دکھتا۔۔۔ ہر انسان کا دل دکھتا ہے اور میں بھی انسان ہوں۔ لیکن میں پروا نہیں کرتا۔۔۔

اور شاید شروع شروع میں ایسا تھا مگر اب تو سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ کیونکہ میں خود سب کے ساتھ بہت اچھا ہوں۔ میں اچھا ہوں تو سب اچھے ہیں۔"

"لباس کے معاملے میں چوزی ہیں کہ مخصوص ڈیزائنر کا ہی پہننا ہے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ جس ڈیزائنر کا لباس اچھا لگتا ہے، خرید لیتا ہوں۔ اپنے آپ کو اس معاملے میں محدود نہیں کیا میں نے۔"

"آپ کے پاس تو کپڑوں، جوتوں اور ٹائیوں کا ایک ذخیرہ ہو گا۔"

"بے شک ہے۔ مگر میں ذخیرہ کر کے خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ میرا دل چاہتا ہے کہ اگر میں اچھا سوٹ پہنوں تو سب پہنیں۔ میں اچھا جوتا اور ٹائی پہنوں تو سب پہنیں۔ تو بس اس نیت سے میں اکثر اپنے کپڑے اور دیگر چیزیں ضرورت مندوں میں بانٹ دیتا ہوں۔"

"فضول خرچ ہیں؟"

"اس فیلڈ کے لحاظ سے کسی حد تک لیکن مجھے اندازہ ہے کہ کمانا آسان نہیں ہے۔ کمانا مشکل ہے اور خرچ کرنا آسان ہے۔ اس لیے اپنی شاپنگ خود کرتا ہوں اور وہی چیز خریدتا ہوں جس کی مجھے ضرورت ہوتی ہے۔ بلاوجہ غیر ضروری چیزیں خرید کر پیسہ ضائع نہیں کرتا۔"

"بہت مہنگی چیزیں بھی بانٹ دیتے ہیں کیا؟"

"بانٹ تو دیتا ہوں۔ مگر بہت جلدی نہیں۔۔۔ انہیں کچھ عرصہ استعمال کرتا ہوں اور جب دل بہت زیادہ بھر جاتا ہے تو پھر کسی کو دے دیتا ہوں۔"

"اور جو آپ کے کپڑے اور چیزیں پہنتے ہوں گے وہ تو بہت خوش ہوتے ہوں گے۔"

"میرا نہیں خیال کہ ان کو پتا چلتا ہو گا۔ کیونکہ میں چیریٹی میں اپنی چیزیں دیتا ہوں۔ اب جس کے نصیب

میں جو ہوتا ہے، وہ مل جاتا ہو گا۔"

"اداکاری ورثے میں ملتی ہے۔ یا انسان پیدائشی اداکار ہوتا ہے؟"

"فنکار پیدائشی بھی ہوتا ہے اور ورثے میں بھی ملتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے ساتھ دونوں کام ہوئے ہیں۔ مجھے اداکاری ورثے میں بھی ملی ہے اور قدرت نے بھی میرے اندر یہ صلاحیت ڈالی کہ میں اداکاری کر سکوں۔ میری قسمت میں اس فیلڈ میں آنا لکھا تھا سو میں اس فیلڈ میں آ گیا۔"

☼ ☼ ☼

سنبل اقبال

"کیسی ہو۔۔۔ ماشاءاللہ اب تو تمہاری اداکاری میں بہت نکھار آتا جا رہا ہے۔ کیا رسپانس ملتا ہے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔۔۔ اور شکریہ۔۔۔ بہت اچھا رسپانس ملتا ہے۔ لوگ بہت تعریف کرتے ہیں جس کی وجہ سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔"

"آج کل کیا کام ہو رہا ہے؟"

"کام تو ماشاءاللہ اتنا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ دن رات شوٹ ہوتی ہیں۔ اس لیے تو آپ کو بھی ٹائم نہیں دے پا رہی تھی۔ ابھی بھی آپ سے بات کر رہی ہوں تو اشارے ہو رہے ہیں کہ جلدی آ جاؤ۔"

"چلو ہم بھی زیادہ ٹائم نہیں لیں گے۔ یہ بتاؤ کون سے کردار کرنے کو زیادہ ترجیح دو گی؟"

"مجھے گیٹ اپ والے کردار زیادہ پسند ہیں۔ اگرچہ ابھی تک ایسا کوئی کردار مجھے نہیں ملا کہ جس میں میں نے کوئی گیٹ اپ کیا ہو۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"جی۔۔۔ بس میرا دل ہے کہ گیٹ اپ میں، میں اتنی اچھی پرفارمنس دوں کہ لوگ پہچان ہی نہ سکیں کہ یہ سنبل اقبال ہے۔ لوگ سوچ میں رہیں کہ یہ کون

ہے، جو اتنی اچھی پرفارمنس دے رہی ہے۔"

"رونے دھونے والے کرداروں میں بھی تو پرفارمنس ہو سکتی ہے۔"

"بالکل ہو سکتی ہے اور میری کوشش ہوتی ہے کہ رونے کے سین میں میں گلسرین کا استعمال نہ کروں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ مجھے گلسرین استعمال کرنی پڑتی ہے۔"

"نئی آنے والی لڑکیوں کے لیے کیا کہو گی، فیلڈ کیسی ہے؟"

"مجھے تو اس فیلڈ میں آکر بہت مزا آرہا ہے اور دیگر آنے والی لڑکیوں کے لیے بھی میں یہ ضرور کہوں گی کہ وہ ضرور آئیں اس فیلڈ میں لیکن اپنی روایات، اپنی حدود کو نہ چھوڑیں۔ دوسروں کی عزت کریں تب آپ کی بھی عزت ہو گی۔ خود اچھی بن کے رہیں گی تو دوسرے خود بخود آپ کی عزت کریں گے اور سب سے بڑی بات کہ اپنے والدین کے بھروسے کو بالکل نہ توڑیے۔ وہ بہت اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنے بچوں کو اس فیلڈ میں بھیجتے ہیں۔"

"گھر میں کتنا ٹائم دیتی ہو؟"

"جب شوٹ نہیں ہوتی تو گھر پر ہی ہوتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ گھر والوں کے ساتھ میرا وقت بہت کم گزرتا ہے۔ اس لیے میں شوبز کی تقریبات میں جانے سے پرہیز کرتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ فارغ وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاروں۔"

"کھانا پکانے کا شوق ہے؟"

"بالکل ہے..... اور یہ شوق ہر لڑکی کو ہونا چاہیے، کیونکہ یہی اس کی پہچان ہے۔ میں اچھا پکا لیتی ہوں اور زیادہ تر بنے بنائے مسالوں سے ہی فائدہ اٹھاتی ہوں۔ آخر یہ مسالے ورکنگ وومنز کے لیے ہی تو بنائے گئے ہیں تاکہ وہ آسانی سے کوکنگ کر سکیں۔"

"اپنی شخصیت کو ایک مکمل شخصیت سمجھتی ہو؟"

"ہاں... اللہ نے مجھے ایک مکمل شخصیت بنایا ہے اور میں جیسی ہوں ویسی ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

☆

جو ملے تھے راستے میں

مصنف: احمد بشیر
تبصرہ: آمنہ ذریں

تخلیق کو استہزاء کے لیے، تحقیق کو درون خانہ کے راز جننے اور سچ کے آئینے کو محض دوسروں کے سامنے رکھنے کے لیے ہتھیار سمجھا جانے لگے، جرأت اظہار کو مناسب مواقع پر اٹھایا جانے لگے اور اخلاقیات پر سنہری موقع کا جال ڈال دیا جائے..... تو دور جدید کے ابلاغ کے فضائل بے شمار کے ساتھ ساتھ کچھ دوہرے معیار بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

سچ ..... سرفروشی کا سودا ہے ..... اس کی قیمت وصول کرنے والے بے جگری کہاں سے لائیں؟ اپنے موقف کو پیش کرنا ایک ایسی رائے کو، جو مانگے تانگے کی نہ ہو، جس کو آئے دن تبدیلی کا شوق نہ پورا کرنا ہو ..... اور جسے قائم کرنے میں آپ کے ذہن و دل، فہم و ادراک کو ٹھیک ٹھاک مشقتی عمل سے گزرنا پڑے ..... آپ اپنا سچ کہہ سکتے ہیں..... اسے بیان کرنے کے علاوہ ..... اس پر قائم رہنا آپ کی ذاتی، انفرادی استقامت کا امتحان ثابت ہوتا ہے..... اور جس کے ساتھ جڑے رہنا آپ کی شیفتگی اور سچ کے ساتھ وابستگی کا مظہر.....

اس سچ کو کہنے کی قیمت اپنوں کی خفگی کی صورت ظاہر ہو..... یا ایک متنازعہ بحث کا آغاز کر دے۔ حکومت وقت اسے ضرر رساں سمجھے..... فتوے جاری ہو جائیں..... انجام سے بے پروا۔ خطرے سے بے خبر ..... اپنے سچ کو بیان کر دینے کی جرأت احمد بشیر احمد کا امتیازی وصف تھا، جو ان کی تحریر میں شامل اپنی اور دوسروں کی رائے سے ثابت ہوتا ہے۔

زیر نظر کتاب شخصی خاکوں پر مشتمل ہے۔ تحریر کی ہر صنف دھیان کا ارتکاز مانگتی ہے۔ مشاہدہ مطالعہ اور انفرادی رجحان لکھنے والے کا تحریری مزاج بتا دیتے ہیں خاکہ نویسی، تحریر کی وہ صنف ہے، جس کے ذریعے آپ کی ان لوگوں کے مزاج، معمولات، رجحانات تک رسائی ہوتی ہے..... جو اپنے دور میں معروف اور ممتاز زندگی گزارتے ہیں..... لیکن یہ ایک ایسے شخص کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے جو ان شخصیات کو قریب سے جانتا، دیکھتا اور سمجھتا ہو..... اور اپنی ایماندارانہ رائے کو لفظی صورت گری کے ذریعے، اس شخصیت کو پڑھنے والے کے لیے مجسم کر دے۔

چلیے ..... تحریر کے مختلف ٹکڑوں سے جھلکتی..... ان کے قلم کی روانی اور لفظی تصویریں دیکھتے ہیں.....

"شہاب نامہ ایک سچی کتاب ہے مگر شہاب نے اس میں سارا سچ نہیں بول دیا جیسے روسو نے بول دیا تھا یا جس طرح ممتاز مفتی نے علی پور کا ایلی میں بول دیا ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ سچ کی کوئی معروف شکل نہیں۔ سچ ایک ہاتھی ہے۔ جسے صرف اندھے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر شخص کا سچ الگ الگ اور ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ اس کی کلیت کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ اس کے مکمل جغرافیہ کا بھی کسی کو علم نہیں۔ سچ ایک ذاتی تجربہ ہے ایک خفیہ معاہدہ ہے ایک چلبلا معشوق ہے جو چاہنے والوں کو اپنے رویے کے چھل بل

سے نبھاتا ہے مگر سارے بھاؤ کسی کو نہیں بتاتا۔"

قدرت اللہ شہاب کا خاکہ تحریر کرتے ہوئے.....

لامحالہ انہوں نے ان لوگوں کا بھی تذکرہ کیا جو شہاب صاحب کے حلقہ ارادت و محبت میں شامل تھے۔

سو' اگر تفصیلی نہیں تو ضمنی تذکرے بھی خوب ہیں۔

"شہاب کی مجلس کے جن مستوں پر انگلیاں اٹھتی ہیں ان میں ابن انشاء جیسے بے خبر' جمیل الدین، عالی جیسے خبردار' اشفاق احمد جیسے بقا بالعشق اور ممتاز مفتی جیسے فنائی العشق لوگ شامل ہیں اور باوجود اس کے ان میں کوئی بھی طرح مصرع غزل کی نہیں اور ان میں وہ سفید پروں والی بچھیری بانو قدسیہ بھی بکل مارے بیٹھی ہے۔ وہ اڑتی ہے مگر اشفاق احمد کے بادلوں والے شامیانے کے اندر اندر اور انسان لباس طعام ترک کر کے یہیں تک جا سکتا ہے۔ اس سے اوپر نکلنے کے لیے عقیدوں اور عصبیتوں کے پر قینچ کرنے پڑتے ہیں۔"

"بانو قدسیہ کو اس قدر ہنر' احساس اور قوت اظہار ملی ہے کہ اگر وہ اس سے آگاہی پھیلانے کا کام لیتی تو راستوں میں چراغ جلنے لگتے۔ اگر وہ بے خبر ہوتی تو گلہ نہ ہوتا مگر جو بارہ سُروں کے بھراؤ کی بھیروی ہو کر تین سُر نہیں لگاتی۔ وہ انسان کو اشرف المخلوقات سمجھتی ہے مگر اس کی فطرت کو گدھ کی فطرت سے قیاس کرتی ہے۔ جو غلاظت کھاتا ہے تو کہتی ہے' دیکھو بے چارہ اپنی فطرت سے کتنا مجبور ہے۔ مگر کیا وہ اتنی کودن ہے کہ وہ انسان اور گدھ کو فرق کو نہیں جانتی؟ نہیں نہیں۔ وہ بے ایمانی کرتی ہے تاکہ اس کا جاگیردار اس سے خوش رہے۔"

جمیل الدین عالی کی ذہنیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"شہاب' جمیل الدین عالی کو بھی بہت چاہتا تھا مگر وہ ایک مراعات یافتہ مڈل کلاسیا ہے۔ انسان بھرے پیٹ کے پھیلاؤ میں' جس قسم کے غم پال سکتا ہے عالی نے وہ سارے غم پال رکھے ہیں۔ اس کے مزاج میں اور اس کے کلام میں آلہا اودل کا لٹکا بھی ہے اور یوپی کے رئیس زادوں کی انا بھی' جو تونگری اور خود پرستی کی دین ہوتی ہے۔ وہ سیانا بہت ہے' اس لیے برا کسی کو نہیں کہتا مگر نصیحت ہر ایک کو کرتا ہے۔ اس طرح بھی بعض لوگ بزرگ بن جاتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں عدل کا دور دورہ ہو جائے۔ لوگ سچے پاکستانی بن جائیں اور کچھ تبدیل بھی نہ ہو۔ اس کو ایوب خان کی کوتاہیوں پر بڑا غصہ آتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ اگر وہ ہماری بات مانتا رہتا تو ہم اسے نہرو سے بڑا آدمی بنا کر چھوڑتے۔ وہ پاکستان کے زوال پر دل سے روتا ہے مگر اس کو بالکل یاد نہیں کہ اس کا عروج اس وقت شروع ہوا تھا جب ایوان صدر میں اس کے سانسوں کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔ وہ ایک پر شکوہ' خردماغ باشعور مڈل کلاسیا ہے جو جانتا ہے کہ مراعات یافتہ طبقہ تاریخ کے بہاؤ میں ہے اور اگر محروموں اور مظلوموں کو زندگی کے اسباب اور کم سے کم عزت نفس نہ ملی تو دریا چٹانیں توڑ کر اور پہاڑ کاٹ کر نکل جائیں گے۔ پھر نہ رہے گا جمیل الدین عالی اور نہ بجے گی بانسری۔"

اشفاق احمد کی شخصیت کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اشفاق احمد یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ وہ تاریخ کے جبر سے نا آشنا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ ساری شورش چند شرپسند سوشلسٹوں کی پھیلائی ہوئی ہے جو خوامخواہ زمین داروں کے دشمن ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اگر پاکستان ان چند شرپسند سوشلسٹوں کے وجود سے پاک ہو جائے تو ملک طبقاتی انتشار اور تضادات سے پاک ہو جائے اور ان کو کوئی صدمہ نہ پہنچے جن کو کبھی کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اشفاق احمد ایک ہنرمند فیوڈل ہے جو ادب اور تخلیقی عمل سے صرف اپنے خیالات کے پرچار کا کام لیتا ہے۔"

ممتاز مفتی کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے۔

"میرے خیال میں شہاب کے حواریوں میں سچا درویش ممتاز مفتی ہی ہے۔ حماقت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ دنیا اس نے کمائی نہیں اور یقین محکم سے وہ مالا مال ہے۔ وہ لوگوں کی خدمت کرتا ہے اپنے آپ کو حقیر جانتا ہے۔ جنت اور دوزخ کی بھی اسے کچھ خبر نہیں۔ مگر وہ کسی ایسے کیف کی تلاش میں ہے جس کو وہ صحیح طور پر جانتا بھی نہیں۔

"جوانی میں وہ برٹینڈ رسل کا مرید رہا اور اب بھی اس کی عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ مگر وہ سمجھتا ہے کہ زندگی ظالم اور مظلوم اونچے اور نیچے اور اچھے برے کے معاہدے کا نام ہے۔ دنیا ازل سے اسی طرح چلی آتی ہے اور ابد تک اس کا ڈھب تبدیل نہ ہوگا۔ اس لیے اس کی امنگ میں عمر ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ وہ ایک بے مثل ادیب ہے جو نئے نظریے اور نئی نگاہیں لے کر آیا۔ قاری نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا مگر وہ اس کے لیے کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ بڑی ہوئی چیزوں کو چھیڑنا ادیب کا کام نہیں۔ ادیب کی حیثیت سے وہ کوئی سماجی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اس معاملے میں اتنا اڑیل ہے کہ شہاب کی بات بھی نہیں مانتا۔ وہ نہیں جانتا کہ ادیب لفظوں کا سوداگر ہوتا ہے اور لفظ اگر سوشل کنٹریکٹ نہیں ہوتے تو کتے بلے کی آواز ہوتے ہیں۔ سماجی ذمہ داری لفظوں کی سرشت میں نہ ہوتی تو وہ پیدا ہی نہ ہوتے۔ حیوانوں کو اسی لیے لفظ' آوازیں نہیں ملی ہیں۔"

جمیل الدین عالی کو انہوں نے پیٹ بھرا مڈل کلاسیا کہا ہے۔ مڈل کلاسیے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مڈل کلاسیے سے مراد ایک خاص قسم کی نفسیات ہے۔ اس نفسیات کے مالک دینی اور دنیوی امور میں اپنی ذات کے لیے ادنیٰ سے اعلیٰ کے سفر پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر جن امور میں سے ان کا ذاتی نفع خارج ہو' وہ فقر ہی کا میدان کیوں نہ ہو۔ ان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ خدا کی خلقت میں سے جو ذاتی طور پر ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی امداد اگر وہ خوش ہو گئے تو انہوں نے حسب توفیق کر دی۔ مگر ایسے معاشرتی نظام کو جس کی بنیاد ظلم پر ہو' تبدیل کرنے میں وہ یقین نہیں رکھتے۔"

شہاب صاحب کا خاکہ نسبتاً" طویل ہے.....

چونکہ اس میں کچھ تذکرہ ان کے رفقاء کا بھی رہا..... یہ ہو گئے ضمنی خاکے! اور آپ نے دیکھا کہ اختلاف رائے کا اظہار کتنی نفاست اور طنز کی کاٹ کس سلیقے سے کی گئی ہے..... جو محض قلم کی نہیں بلکہ ذہن کی ریاضت کی آئینہ دار ہے۔ ممتاز مفتی اور احمد بشیر جوڑی دار تھے۔ کتاب میں شامل تیرہ خاکے احمد بشیر کے تحریر کردہ ہیں اور چودھواں ممتاز مفتی نے "غنڈہ" کے عنوان سے صاحب کتاب احمد بشیر پر قلم بند کیا ہے۔

آئیے دیکھتے ہیں' مفتی صاحب احمد بشیر کی شخصیت کا تجزیہ کس طرح کرتے ہیں۔

"جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ احمد بشیر ایک جن ہے جو حاضر ہونے کے لیے اس بات کا محتاج ہے کہ کوئی دیا رگڑے۔ اسے ایک الہٰ دین کی ضرورت ہے۔ یوں' ہم دونوں ساتھی بن گئے۔

اس زمانے میں میں زندگی کی منجدھار سے ڈوب کر نکلا تھا۔ میری زندگی کا عظیم ترین مشاہدہ ختم ہو چکا تھا۔ سب سے بڑی کامیابی حاصل کرنے کے بعد میں سب سے بڑی شکست کھا چکا تھا۔ نطشے کہتا ہے زندگی کا عظیم ترین لمحہ کون سا ہے' وہ لمحہ' جب تمہاری سب سے بڑی کامیابی' تمہاری سب سے بڑی آرزو تمہاری نگاہ میں ہیچ نظر آئے۔ ان دنوں میں اپنی زندگی کا وہ عظیم ترین لمحہ بیت رہا تھا۔ ہم دونوں انوکھے ساتھی تھے۔ میں میلے سے واپس آچکا تھا۔ وہ میلہ دیکھنے جا رہا تھا۔ وہ کچھ کرنے کے لیے مضطرب تھا۔ میرے پاؤں میں ڈر اور احتیاط کی بیڑیاں پڑ چکی تھیں۔

وہ تڑپ تھا' میں سکوت تھا

وہ زندگی تھا' میں موت تھا۔"

"سورما" کے عنوان سے ممتاز مفتی پر لکھا گیا طویل خاکہ نہ صرف دونوں کے مابین تعلق کی مختلف جہات پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ کردار کے نفسیاتی تجزیے بھی بیان کرتا ہے۔ اس خاکے کے سالوں بعد لکھے گئے ضمیمے بھی شامل تحریر ہیں جو گزرتے ہوئے سالوں میں آنے والی تبدیلیوں اور ان کے جائزے سے پُر ہیں۔

"اس نے زندگی میں ہر شخص کو تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے لوگوں کو نئے رویے دیے۔ آج سے اکاون برس قبل جب میں اسے گورداس پور میں ملا تو ایک نالۂ خام تھا۔ میرے ذہن پر طرح طرح کے دباؤ تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہیں ویسا نہ ہو جائے

ایک دن میں نے اس سے اپنی داخلی کیفیت بیان کی۔ اس نے نہایت توجہ سے میری داستان سنی۔ پھر اچانک راستہ چلتے رک کر کہا۔

"سوواٹ!

یعنی تمہیں یہاں سے بھی زخم لگے گا' وہاں سے بھی خون بہے گا۔ تو پھر کیا ہو جائے گا؟"

اس "سوواٹ" نے مجھے ایک نیا اور جان دار رویہ دے دیا۔ اس "سوواٹ" کے سہارے میں نے ساری زندگی ڈٹ کر گزاری۔ میں کسی مہم سے نہیں ڈرا۔ کسی بھوت کے آگے میری ٹانگیں نہیں کانپیں۔ جب بھی میں نے کسی شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالا' میں نے کہا "سوواٹ؟"

یہ اس کا اتنا بڑا احسان ہے کہ میں اس کا بدلہ کبھی چکا ہی نہیں سکتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اسے پتا بھی نہیں کہ اس نے میری زندگی کا دھارا بدل دیا ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں کی زندگیوں کے دھارے تبدیل کیے۔ بے شمار لوگوں کو ان کی خوابیدہ صلاحیتوں سے روشناس کروایا۔ بہت سے نئے لکھنے والوں نے اس کے ڈنڈے کے ڈر سے قلم اٹھایا۔ میں جو کسی قابل نہیں تھا' جو تھوڑا بہت لکھتا ہوں' اسی کی عطا ہے۔ وہ مجھے کہا کرتا تھا کہ تم میں ایک اعلیٰ ادیب کے جراثیم موجود تھے مگر تم صحافت کے کنجر خانے میں جا نکلے۔ اللہ کی مرضی یہی ہو گی کہ تم ضائع ہو جاؤ۔"

ممتاز مفتی کی وفات کے بعد لکھے گئے آخری حاشیے سے لیے گئے یہ اقتباس اپنے دوست' اپنے تعلق کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ لیکن الوداع کہتے ہوئے ـــــ قلم آپ کی آنکھوں کو دوست کے آنسو رلا دیتا ہے!

"سُر سمراٹ" کے عنوان سے خواجہ خورشید انور کے خاکے سے۔

"خواجہ صاحب فلم بہت سنجیدگی سے بناتے تھے۔ سیٹ پر کسی کو آنے نہیں دیتے تھے۔ لوگوں سے مشورہ کرتے تھے مگر کرتے وہی تھے جو خود سوچتے تھے۔

مگر فلم ڈائریکشن خواجہ صاحب کا خصوصی فن نہ تھا۔ وہ ایک ایک سین کو بناتے تھے۔ اس طرح بالعموم ان کی فلم کی کلیت ڈھیلی پڑ جاتی تھی۔ ان کا اصل میدان موسیقی تھا۔ وہ طرز بناتے تو مخصوص سازندوں کو لیتے تھے جو ان کے مزاج اور اسٹائل سے آشنا ہوتے تھے۔ ایسا باکمال کمپوزر ہندوستان اور پاکستان میں اور نہ ہوا جس کی ایک تان سن کر سننے والے کو پتا چل جائے کہ یہ دھن خواجہ خورشید انور کی ہے۔

وہ کلاسیکی موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے۔ مگر جب وہ دھن بناتے تو کلاسیکی موسیقی کو فوک دھنوں میں تبدیل کر دیتے اور سننے والے کو بھی پتا نہ چلتا کہ خواجہ صاحب مجھے کلاسیکی موسیقی سنوار رہے ہیں۔

وہ دھنوں کی غنائیت کی بنیاد دکھ پر رکھتے تھے۔ دکھ جو آنکھوں سے آنسو نہ نکلوائے۔ مگر دل کو چھید جائے۔ وہ موڈ کے بادشاہ تھے اور ان کی موسیقی موڈ کی موسیقی ہوتی تھی۔ وہ اپنے سننے والوں کو پائیڈ پائپر کی طرح پیچھے لگا کر گہرے سمندروں کی طرف چل پڑتے تھے۔ خواجہ صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی تھے۔ آئی سی ایس کا امتحان انہوں نے پاس کر لیا تھا مگر جس روز ان کا انٹرویو تھا اس روز شہر میں ایک بہت اعلا درجے کی موسیقی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ خواجہ صاحب نے آئی سی ایس کے انٹرویو پر موسیقی کانفرنس کو ترجیح دی اور یوں وہ آئی سی ایس بنتے بنتے رہ گئے۔ آئی سی ایس تو سینکڑوں فائلوں میں دفن ہو گئے مگر موسیقی کو خورشید انور جیسا خصم مل گیا۔

خواجہ صاحب کی لے آسان ہوتی تھی۔ کیونکہ موسیقی ترتیب دیتے ہوئے ان کے پیش نظر عام آدمی ہوتا تھا۔ عام آدمی کو وہ تخت پر بٹھاتے تھے اپنے سارے خواب عام آدمی سے ادھار لیتے تھے اور پھر انہیں بنا سنوار کر اسے واپس کر دیتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کی لے تھی۔ وہ ایک جادوگر شخص تھے۔ سُروں کے چھڑکاؤ سے صحراؤں میں پھول اُگا سکتے تھے۔

خواجہ صاحب اپنے شباب کے زمانے میں انقلابی بھی رہے ہیں اور یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کیونکہ اپنے اس دور کے بارے میں وہ کم ہی بات کرتے تھے۔ جس زمانے میں بھگت سنگھ کا گروہ لاہور میں بم بنانے کی کوشش کر رہا تھا' خواجہ کالج میں پڑھتے تھے اور بعض کیمیائی اجزاء جو بازار میں دستیاب نہیں تھے۔ وہ کالج کی لیبارٹری سے اڑا کر انقلابیوں کو دیا کرتے تھے۔ بالآخر بھگت سنگھ کے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب بھی پکڑے گئے مگر ان کا ایک عزیز جو رشتے میں ان کا بزرگ تھا۔ ایک بہت بڑا افسر تھا۔ اس نے خواجہ صاحب کو اس وعدے پر چھڑوایا کہ میں آئندہ کبھی سیاسی کام نہیں کروں گا۔

پھر خواجہ صاحب نے اپنی انقلابی طبیعت کو موسیقی کی طرف پھیر دیا اور اس میں ایسی اپچ دکھائی کہ ان کے پیچھے چلنا بھی دشوار ہے۔ سیاست ان کا میدان نہیں تھا کیونکہ وہ انتہا درجے کے آزاد انسان تھے۔ سیاست کے سمجھوتے ان کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر نو آبادیاتی نظام اور انگریزی راج سے ان کو شدید نفرت تھی۔ ان کی یہی تڑپ ان کی مُرلی کی پکار بن گئی۔"

تمام خاکوں میں سے واحد خاکہ خواجہ صاحب کا ہے' جس میں صاحب موضوع کا ذکر اس قدر احترام سے کیا گیا ہے۔

پروفیسر وارث میر کے خاکے میں لکھتے ہیں۔

"اپنی موت سے فقط ایک روز پہلے وہ مجھے اخبار جنگ کی سیڑھیوں میں ملا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضمون تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں خشمگیں تھیں۔ اس نے کہا "میری طبیعت خراب ہے' رات بھر سو نہیں سکا۔ اپنے ہاتھوں سے کچھ لکھ سکنے کی بھی مجھ میں سکت نہ تھی۔ اس لیے میں نے مضمون اپنے بچے کو ڈکٹیٹ کروایا ہے۔"

وہ ہانپ رہا تھا۔ بولا "تم نے کل کے اخبار میں پڑھا ہو گا' ضیاء الحق نے دانشوروں کو سیم اور تھور سے تشبیہ دی ہے۔ میں نے سوچا اس کا جواب فوری آنا چاہیے۔ سو اس امر کے باوجود کہ میرا معدہ خراب ہے اور میں بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ اس کا جواب میں نے لکھ دیا۔ موت سے پہلے میں اس کا حساب چکانا چاہتا ہوں۔"

وارث میر ہر چیز کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ قلم کا ہتھیار لے کر وہ جرنیلوں پر چڑھ دوڑتا تھا۔ وہ ایسا ہی سورما تھا۔ غیر شعوری طور پر وہ جانتا تھا کہ میں مارشل لا کو شکست نہیں دے سکتا۔ مگر وہ اسے مزید برداشت کرنا گوارا نہ کر سکتا تھا۔ موت ہی میں اس کی نجات تھی۔

اس کی موت کی خبر اس طرح پھیلی جیسے شہر میں آگ لگ گئی ہو۔

اسلام ایک انقلابی سے' قلم ایک مجاہد سے اور پاکستان ایک سچے پاکستانی سے محروم ہو گیا۔

جب وہ گیا تو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ سوائے ایک

قلم کے جس کی کاٹ سے خنجر بھی پناہ مانگے۔"

یہ ذکر ہے پروفیسر وارث میر کے دنیا سے بے وقت رخصت ہو جانے کے المیے کا۔۔۔ اور اسی خاکے کی بدولت ہم یہ جان پاتے ہیں کہ مارشل لاء کے نفاذ کو جائز قرار دینے والے گروہ راج دھانی میں کس قسم کی شراکت کے مزے لوٹتے رہے۔۔۔ اور مزاحمت کرنے والوں پر زندگی کس قدر نامہربان کر دی گئی۔

بہرحال۔۔۔ آپ ہی وہ پروفیسر وارث میر ہیں جن کے دونوں صاحب زادے آج صحافت میں مستند اور معتبر مقام رکھتے ہیں۔ (حامد میر' عامر میر)

تیرہ خاکے' یعنی تیرہ شخصیات۔۔۔ ان کی زندگی' ان کے خیال کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں۔ ان کے ساتھ پیش آنے والے دلچسپ اور عجیب واقعات' تصنع اور تکلف کا نقاب اوڑھے اور اس نقاب کو تار تار کرتا مشاہدہ' تجزیہ' صحافتی تحقیق اور حقیقت کی حقیقت چھاننے کا رسیا قلم۔۔۔ جو سچ کی لگن میں مبتلا ہے۔ ہمیں ایک ایسے صاحب ادراک کا پتا دیتے ہیں جو مسائل کے حل کے لیے خود آگے بڑھنے' کوشش اور سخت جدوجہد کر کے عام آدمی کی حالت بدلنے کا خواب دیکھتا تھا۔

حرف انکار محض "میں نہیں مانتا' میں نہیں مانتا کا مطالبہ نہیں کرتا۔" بلکہ جرأت انکار کا حامل وہی شخص ہے جس کے پاس جوابی دلائل کا انبار ہے' جو بحث کرتے ہوئے تکرار کے بجائے دلیل پیش کرتا ہے اور جس کے پاس وسعت ذہن و قلب کا بھی اثاثہ موجود ہے کہ دوستوں سے اختلاف رائے بھی رکھتا ہے اور تعلق بھی قائم رکھتا ہے۔

کتاب نادر شخصیات کی دلچسپ یادوں کا احوال تو ہے ہی۔۔۔ مگر انداز بیان کی ندرت بھی قاری کو مبہوت کیے رکھتی ہے۔

الکھ نگری' شہاب نامہ اگر آپ پڑھ چکے ہیں تو اس کتاب کی رمز کو سمجھنا آپ کے لیے آسان تو ہوتا ہی ہے۔۔۔ لطف بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔

آپ کے لیے یہ جاننا دلچسپ رہے گا کہ نیلم احمد بشیر' بشریٰ انصاری' سنبل اور اسماء صاحب کتاب (احمد بشیر) کی ہونہار اولاد ہیں۔۔۔

ہمیشہ کی طرح کچھ منفرد' کچھ نیا سکھاتی ہوئی۔۔۔ یہ کتاب بھی کچھ نئے در کھولنے کا وصف رکھتی ہے!

✡

عالیہ بخاری

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دل دار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتی کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے، جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھالاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاحی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتی کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعاگو ہیں۔

قسط: ۵۷
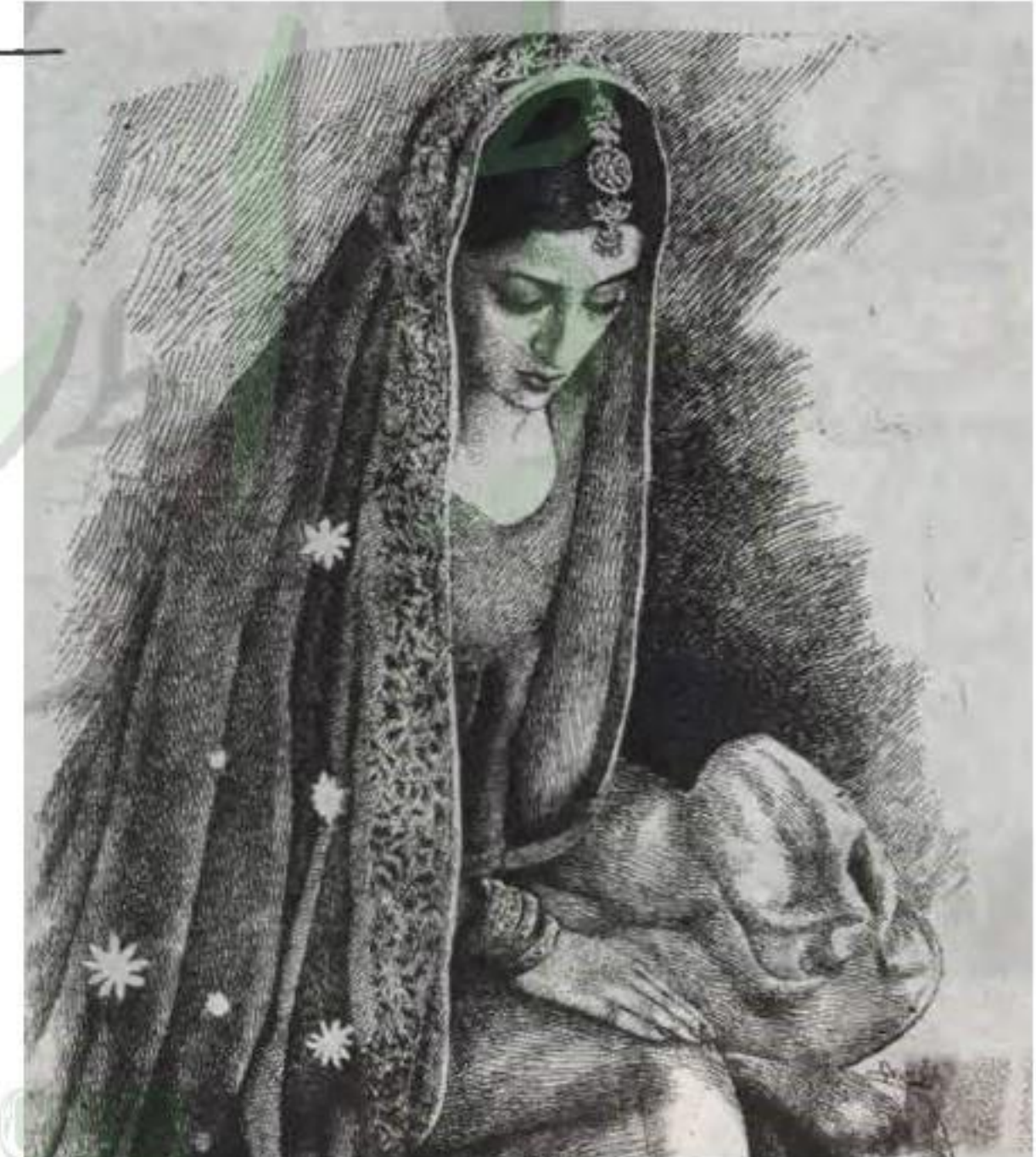
شام سمٹ کر رات میں ڈھلی اور پھر اور بھی گہری۔

وقت کا بے آواز مگر تیز رفتار سفر۔

سالار کے کمرے کا لاؤنج میں کھلنے والا دروازہ کھلتا تو نیچے سے گھٹی گھٹی سسکیوں اور زرتاج کی ہسٹریائی چیخوں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔

"وہ اب بھی رو رہی ہیں۔"

گیتی کی دھیمی اور خوف زدہ آواز عقب سے ابھری تو سالار نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔

"تم کیوں اٹھیں بستر سے۔ بڑی مشکل سے تو بخار کم ہوا ہے۔" وہ اس کے پیچھے باہر لاؤنج میں آئی تھی۔

"ان کے جانے کا اب تک کچھ نہیں ہوا کیا؟ کتنی بے چین ہیں' آپ کیوں نہیں کچھ کر رہے ہیں۔" اس نے سالار کی بات شاید سنی بھی نہیں تھی۔ "وہ ماں ہیں سالار۔ سارے زمانے کے لیے کتنی سخت دل اور بے رحم سہی اپنے بیٹے کے لیے تو ان کی بے قراری سمجھ میں آتی ہے۔ پتا نہیں کیسے کیسے وہم گھیر رہے ہوں گے انہیں۔ یہ وقت بہت سخت ہے ان کے لیے۔"

اس کی فطری نرم دلی اسے زرتاج جیسی فتنہ پرور اور تنگ دل عورت پر بھی رحم کھانے پر مجبور کر رہی تھی۔

سالار افسردگی سے مسکرا دیا۔

"فکر مت کرو' وہ کل دوپہر کی فلائٹ سے یو کے جا رہی ہیں۔ سیٹ کنفرم کروالی ہے انہوں نے۔"

"کل دوپہر تک تو بہت وقت ہو جائے گا سالار! اچھا ہوتا کہ وہ شام ہی میں یا پھر اب رات کی کسی فلائٹ سے چلی جاتیں۔"

"یہ ان کی اپنی چوائس ہے گیتی! وہ ہماری مدد لینے کو آج بھی تیار نہیں ہیں۔ ان کا غرور اور نبیل کی بدنیتی دونوں ہی کم ہونے والی چیزیں نہیں ہیں۔ تم فکر مت کرو ان کی۔ چلو اندر چلو۔ زیادہ دیر کھڑی مت رہو۔" وہ اسے واپس اندر کمرے میں لے آیا۔

کمرے میں بہت مدھم روشنی تھی۔

"اللہ ان کے حال پر رحم کرے!"

بیڈ پر بیٹھتے ہوئے گیتی نے آہستہ سے کہا تو وہ دل سے آمین بھی نہ کہہ سکا۔

"کل شام میں معاذ کے اسکول کی اوپننگ ہے۔ اللہ کرے کہ کل تک تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے۔ تم وہاں نہیں گئیں تو ان لوگوں کو بہت افسوس ہوگا۔"

"میں ان شاءاللہ ضرور چلوں گی۔ بخار نہ اترا تب بھی!"

سالار ہلکے سے مسکرایا۔ "چلو شاباش۔ اب اپنی دوا کھاؤ اور سو جاؤ۔ تمہاری دواؤں میں نیند کی ٹیبلٹ بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہیں پرسکون رہنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے اچھا ہے کہ تم بھی گہری نیند لے لو۔" وہ مڑ کر اس کی دوائیں نکالتے ہوئے بات کر رہا تھا۔

"ایسی نیند جس سے وہ کبھی اٹھے ہی نہیں!" گیتی کے دل نے بے ساختہ خواہش کی۔ کم از کم اس طرح وہ سالار کے لیے ذلت کا سبب بننے سے شاید بچ سکے۔

"پھر کچھ سوچنے لگیں!" پانی کا گلاس اور دوائیں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ پھر غور سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"نہیں' کچھ نہیں۔ اچھا ہے نیند لے لوں گی تو صبح تک بہت بہتر ہو جائے گی طبیعت۔"

"آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔ میں تمہارا سر دباتا ہوں!"

"مگر میرے سر میں بالکل درد نہیں ہے۔"

"نہ سہی' لیکن مجھے اپنی بیوی کی تھوڑی سی خدمت کرنا اچھا لگتا ہے۔ بس اب خاموش۔ ایک لفظ کی بحث نہیں! اس کا وہی پیار بھرا حتمی انداز۔

گیتی نے سختی سے آنکھیں بند کیں اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

کچھ نہیں تو راہ فرار ہی سہی۔

نچلی منزل میں رات کے اس پہر بھی بڑی دم گھوٹتی سی کیفیت طاری تھی۔ اندر باہر ساری لائٹیں جل رہی تھیں پھر بھی چاروں طرف جیسے زردی بھرا اندھیرا سا پھیلتا جا رہا تھا۔

زرتاج نے بڑے کرب ناک انداز میں آہ بھری۔ "میرا مانی!"

ساتھ والے صوفے پر نیم دراز نبیل نے بمشکل آنکھ کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

بکھرے بال۔ سرخ انگارہ ہوتی آنکھیں اور چہرے پر پھیلی ہوئی وحشت۔

پہلی نگاہ میں وہ اسے بالکل کوئی بد روح ہی محسوس ہوئی تھی۔

"میرا بیٹا۔۔۔ دشمنوں کی' بدخواہوں کی نظر۔۔۔" وقفے وقفے سے وہ یوں ہی ایک سے جملے دہراتی۔

بددعائیں' کوسنے۔

نبیل نے سخت اکتاہٹ محسوس کی تھی۔

کتنی دیر سے وہ سونا چاہ رہا تھا۔ مگر زرتاج کا رونا پیٹنا اسے صوفے سے سر ٹکا کر دو منٹ کے لیے بھی نیند لینے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

خود نہ وہ اٹھنے کے لیے تیار تھی اور نہ ہی اس نے ایک بار بھی شاید پلک جھپکی تھی۔ ہر تھوڑی سی دیر بعد وہ اسپتال کا نمبر ملاتی اور کوئی امید افزا بات نہ پا کر اس کی وحشت میں اور اضافہ ہونے لگتا۔

مانی کی حالت نازک تھی۔

"وہ بچ تو جائے گا نا نبیل!" اس کی آواز کسی سرگوشی کی طرح نبیل کے کانوں میں اتری تو اسے سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔ زرتاج پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کا غرور' اس کی خوب صورتی۔ اس کی عیاری کی حد کو پار کرتی عقل' سب ہی ان چند گھنٹوں میں اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

اور آج سے پہلے شاید وہ کبھی اتنی بدشکل بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

نبیل سے محض چند لمحے ہی اس کی طرف دیکھا گیا۔ آج جتنی بار بھی اس کی نگاہ زرتاج کے چہرے پر پڑی تھی اس نے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس کیا تھا۔

چاہے "مصلحتاً" ہی سہی' زندگی کے مزید کچھ اور سال زرتاج کے ساتھ گزارنے ہی تھے۔ وہ دل کڑا کر کے پھر اس کے قریب آ بیٹھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ تم دیکھنا' جب تم وہاں پہنچو گی۔ تب تک وہ ہوش میں آ جائے گا۔ فکر نہ کرو۔" زرتاج کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے۔ وہ رٹے رٹائے انداز میں اپنی ڈیوٹی نبھائے گیا۔

زرتاج کے پاس اس مشکل ترین گھڑی میں یہی تنکے کا سہارا تھا۔

"تم بھی میرے ساتھ چلتے تو میری ہمت بندھی رہتی۔ سفر کاٹنا تھوڑا سا آسان ہو جاتا۔ مجھے اپنی تنہائی کا سوچ کر ہی ہول اٹھ رہے ہیں نبیل!"

اس کی کانپتی ہوئی آواز میں خوف کا تاثر تھا۔

نبیل کو بے ساختہ ہی عروج کا وہ زمانہ یاد آیا جب وہ کمپاؤنڈ میں دوسری طرف بنی ماربل والی سہ دری میں چاند کی پہلی جمعرات کو مستحقین میں خیرات تقسیم کیا کرتی تھی۔

قیمتی لباس، غرور سے چمکتا ہوا چہرہ' نازک اندامی سب ہی مل کر زرتاج بیگم کو کچھ سے کچھ بنا دیا کرتے تھے وہی وقت تھا' جب اسے راجو نے یہاں سکریٹری کی نوکری دلائی تھی۔ اور اس کی سخت تنگ دستی کے زمانے کا اختتام ہو کر' عیش و عشرت کے اس دور کا آغاز ہوا تھا۔ جس کا اس نے اپنی کچی بستی میں گزرنے والی زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"تم چلو میرے ساتھ۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اکیلے جانے سے بہت ڈر لگ رہا ہے نبیل!"

اس کے ہاتھ پر اپنا دباؤ بڑھاتے ہوئے وہ ضد پر اتر رہی تھی۔

نبیل نے اندر ہی اندر ایک گہری سانس لی۔

"میں نہیں جا سکتا ہوں زرتاج۔ تمہیں پتا ہے۔ جب تک کیس کا فیصلہ نہ آجائے' میں بیرون ملک کیا' بیرون شہر بھی اب تو نہیں جا سکتا ہوں۔ بس اب صرف تین چار دن کی بات ہے۔ جس روز فیصلہ آئے گا۔ میں اسی دن کی فلائٹ لینے کی کوشش کروں گا...... تم بالکل بے فکر رہو۔ بس چند دن میں' میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"چند دن بھی بہت ہوتے ہیں نبیل! میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ میں ہوم سیکریٹری سے بات کرتی ہوں۔ وہ تمہیں میرے ساتھ جانے کی خصوصی اجازت دلوا سکتے ہیں کورٹ سے۔" اس کا ہاتھ تھامے وہ اب بھی بضد تھی۔

"پھر بھی میں تمہارے ساتھ تو نہیں جا سکوں گا نا۔ صبح کورٹ کھلنے کے بعد اگر درخواست جمع کرائی تب بھی' پرسوں کہیں جا کر میرا چلنا ممکن ہو گا۔ ذرا سوچو' تم اتنے دن مائی کو دیکھے بغیر رہ سکو گی...... نہیں نا......"

ذرا رک کر اس نے زرتاج کو دیکھا۔

"بس اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تھوڑی سی ہمت کر لو۔ کچھ نہیں ہوا مائی کو...... وہ انگلینڈ میں ہے۔ جہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے اسپتال میں۔ وہ لوگ بچا لیں گے مائی کو اور اس بار کچھ دنوں کے لیے ہی سہی ہم اسے اپنے ساتھ لے کر آئیں گے پاکستان۔ پھر ہم اس کی صحت یابی پر ایک بڑا فنکشن رکھیں گے۔ اور اس وقت تک یہ بدبخت سالار اور اس کی بیوی بھی منہ چھپا کر بھاگ چکے ہوں گے اس گھر سے بھی اور اس شہر سے بھی۔"

"میں واپسی پر ان کی شکلیں نہیں دیکھنا چاہوں گی نبیل! انہیں تم واقعی نکال دو گے نا یہاں سے۔" نبیل کے ہاتھ پر اس کی گرفت اور بھی بڑھ رہی تھی اور وہ اس طرح نبیل کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے ایک اس کی ہاں اور نہ پر ہی زندگی کا دارومدار ہو۔

باہر سے کوئی گاڑی اندر آ رہی تھی اور رات کے اس آخری پہر میں یہ بڑی غیر معمولی سی بات تھی۔

زرتاج نے چونک کر نبیل کی طرف دیکھا۔

"میرا آدمی ہے...... میں نے ہی اس وقت بلایا تھا۔" نبیل نے اٹھتے ہوئے اطمینان دلایا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ یوں ہی خالی خالی نگاہوں سے دیکھے گئی۔

آج کی رات ہر بات محض چند لمحوں کے لیے ہی اس کے پاس ٹھہر رہی تھی...... سوائے اس ایک بات کے...... پاس رکھا ہوا موبائل اٹھاتے ہوئے۔ اس نے ایک بار پھر اس نمبر پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کال ملائی۔ جو پتا نہیں کتنی بار دہرایا جا چکا تھا۔

باہر اس سیاہ گاڑی کے پاس کھڑے نبیل کے لبوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"تم نے بہترین کام کیا بلو! اور اس کے لیے میں تمہیں خوش کر دوں گا۔" اس کی نگاہ ہاتھ میں تھامے پمفلٹ پر تھی' جو وہ آدمی چھپوا کر لایا تھا۔

"بدنام زمانہ عورتوں کا سول سوسائٹی پر تیزی سے بڑھتا ہوا اثر و رسوخ ایک لمحہ فکریہ۔"

نمایاں انداز میں دی گئی اس ہیڈ لائن کے نیچے بڑی چٹخارے دار زبان میں گیتی آرا اور اس کے خاندان کے بخیے ادھیڑے گئے تھے...... گلناز جان اور الماس کے بیرون ملک کے دورے۔ نگینہ کے ایکسٹراز میں ڈانس کرنے کا تصویری ثبوت' صندل کا فلمی کیریر سب کے حوالوں کے ساتھ گیتی آرا کی سالار سے شادی نمایاں موضوع تھا۔

نام نہاد نیک نامی کا پردہ فاش......

"میں تو کہتا ہوں نبیل صاحب! یہ پمفلٹ' اسکول اور اس کے آس پاس کی دیواروں پر لگا دیتے ہیں۔ ابھی صبح ہونے میں کافی وقت ہے۔" انعام کی رقم مزید بڑھ جانے کی امید نے بلو کا جوش و خروش اور بھی زیادہ بڑھا دیا تھا۔

نبیل نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں! وہاں سے تو وہ لوگ صبح ہی ہٹا دیں گے' ایک پمفلٹ نظر نہیں آئے گا وہاں...... ہماری ساری محنت بے کار جائے گی۔ یہ وہاں اس وقت تقسیم ہوں گے جب تقریب شروع ہو چکی ہو گی اور یہ عزت مآب اسٹیج پر تشریف فرما ہوں گے۔"

قریب کھڑے بلو نے اس میں سے صرف کام کی بات سمجھی اور خوشامدانہ انداز میں ہنس پڑا۔

"میں چند چھوٹے لڑکے لے جاؤں گا ساتھ' ویسے بھی وہاں اس عمر کے بچے ہی سب سے زیادہ ہوں گے۔ اس لیے کسی کو محسوس بھی نہیں ہو پائے گا فوری طور پر۔"

"بالکل ٹھیک۔" نبیل کی نگاہ اس پمفلٹ پر ہی جمی تھی۔

"نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں اس بدنام طبقے کو حصے دار بنانے سے بہتر ہے' ان سے بھیک منگوائی جائے۔ اپنے بچے کے ایڈمیشن سے پہلے ایک بار ضرور سوچ لیں۔" حرف اختتام یہی تھا۔

"بلو! یہ میری گاڑی کی ڈگی میں رکھ دو۔ کل شام میں خود وہاں آؤں گا۔ تم مجھ سے پہلے پہنچ جانا' اس مزے دار تماشے کو میں مس نہیں کرنا چاہتا۔"

اس نے تصور میں ہی سالار کے اڑتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر مزا لیا۔

☆ ☆ ☆

سلمان کی ہنسی کسی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آپا گل نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔ ہنستے ہنستے وہ صوفے پر دہرا ہوا جا رہا تھا۔

"قسم سے...... آپا گل! مجھے یقین نہیں آ رہا۔" الفاظ اس کے منہ سے بمشکل ادا ہوئے ہنسی تھی کہ رکنے کا نام نہیں۔

"یہ ہنسنے کا نہیں رونے کا مقام ہے سلمان...... مگر تم کیا سمجھو گے۔ تمہیں تو اپنی بربادی پر بھی دو آنسو بہانے کی توفیق نہیں ہوئی۔" وہ مر جانے کی حد تک سنجیدہ تھیں۔ "ذرا سوچو' یہاں ہمارے گھر میں اس شخص کے ساتھ ایسا سلوک ہوا ہے' جو ہم سب کی پریشانیاں دور کرنے میں عملی طور پر آگے آیا ہے۔ میں تو شرم سے کٹی جا رہی ہوں' جب سے سنا ہے!"

"ہا...... آ! کاش میں وہ منظر دیکھ سکتا' پتا نہیں کیوں تم لوگوں کی فضول باتیں سننے کے لیے یہاں کمرے میں بیٹھا تھا۔" وہ ان کی شرمندگی میں حصہ دار بننے کے لیے ذرا بھی تیار نہیں تھا۔

"ذرا سوچو' جویا اور ایسا ردعمل..... فریدالدین کی تو سٹی گم ہو گئی ہو گی' ہونے والی سسرال میں پہلا خیر مقدم؟" وہ پھر سے ہنس پڑا۔ "ویسے تمہاری بیٹیاں بہت تیز ہیں۔ بالکل تمہاری کاپی' ہو سکتا ہے' بات اتنی نہ ہو جتنی انہوں نے تمہیں سنادی۔" اپنی ہنسی کو کنٹرول کر کے اس نے ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنا چاہا۔

"میری بیٹیاں بہت سمجھ دار ہیں۔ اپنی عمر سے کہیں آگے۔"

"بے شک' بے شک!" وہ مکمل طور پر متفق ہوا۔

"انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جویا نے بہت زور سے فریدالدین کے منہ پر تھپڑ مارا تھا اور تمہیں شک کیوں ہے۔ آواز تو کمرے تک آئی تھی۔ ہم سب نے سنی تھی۔ میرا تو دل اسی وقت کانپ گیا تھا کہ بس اب کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو گی' یہ لڑکی اس گھر کی مکمل بربادی کے درپے ہے۔ اب پتا نہیں اور کیا کروا کر چھوڑے گی۔" وہ آواز اور لہجے میں جتنی مایوسی سمو سکتی تھیں انہوں نے کی۔

"ارے چھوڑو۔ کچھ نہیں ہوتا!" سلمان نے بے فکری سے ہاتھ ہلایا۔

"مجھے تو یہ افسوس ہو رہا ہے کہ کاش میں بھی آخری ملاقات میں ایسا ہی ایک تھپڑ زوبیہ کے لگا سکتا۔ کچھ تو دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی۔ جویا کی ہمت کو ماننا پڑے گا۔ دیکھ لینا' اب فریدالدین ساری عمر اس کے آگے دب کر رہے گا۔ وہ کون سی مثال ہے فارسی کی گربہ کشتن......"

"ہونہہ!..... غلط فہمی ہے تمہاری..... کھاتا پیتا پیسے والا مرد۔ غریب گھر کی لڑکی سے کبھی نہیں دبتا۔ جویا کون سا لاکھوں کا جہیز لے کر جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ تو تم لوگ ہو' ایک پورے خاندان کی ذمہ داری' بے چارہ فریدالدین اٹھائے گا پھر دبنے کا کیا سوال۔"

ان کے چہرے پر آئی طنزیہ مسکراہٹ' سلمان کو ایک بھولی ہوئی بات یاد دلا گئی۔

"لاکھوں کا جہیز بھی تھا۔ اگر تم نے قبضہ نہ جمایا ہوتا۔ یاد کرو ذرا۔ جب جویا کا رشتہ ختم ہوا تھا تو کیا چیز نہیں تھی س کے جہیز میں..... سارا کا سارا تم سمیٹ کر لے گئی تھیں اور آج تک ایک پیسہ ادا نہیں کیا اس کا۔"

"ہاں' نہیں کیا' جاؤ کیا کر لو گے۔ میرا بھی حق ہے۔ آخر بیٹی ہوں اس گھر کی۔ چند چیزیں لے لیں تو کیا ہوا۔" وہ راجو شرمندہ تھیں۔

"ہا!" چند چیزیں!" سلمان کو غصہ آنا شروع ہوا۔

"اس وقت گڑے مردے مت اکھاڑو سلمان! حالات نازک ہیں۔ معاملات اس وقت بگڑے تو پھر کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلیں گے۔ ہوش کرو ذرا۔" آپا گل نے بروقت خود پر قابو پا لیا تھا۔ ورنہ بات کہیں سے کہیں نکلتی چلی جاتی۔

"کیا ہوا..... کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے کیا!"

"ہماری قسمتوں میں گڑبڑ کے علاوہ ہے ہی کیا..... کیسے کیسے جھٹکے سہے مگر ایسے ڈھیٹ ہیں کہ....." انہوں نے بےزاری سے سر کو جھٹکا اور ذرا قریب سرک آئیں۔

"فریدالدین کو شک پڑ گیا ہے!"

"کیسا شک؟ کیا معاذ والا قصہ پتا چل گیا ہے اسے۔ برا مت ماننا آپا گل! یہ ہو نہ ہو تمہارے میاں کی کارستانی ہے۔ ورنہ اور کون ہے۔ جو اتنے اندر کی بات جا کر فریدالدین کو سنا سکے؟" سلمان کے فی الفور اخذ کیے ہوئے نتیجے میں دم نہیں تھا۔

"شرم کرو کچھ..... وہ بے چارے تین میں نہ تیرہ میں..... اور معاذ کا نام نہیں لیا ہے فریدالدین نے۔ اسے تو جویا کی حالت دیکھ کر جھٹکا لگا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ کوئی بیماری لگ گئی ہے جویا کو..... پہچانی نہیں جا رہی ہے۔ میں نے بڑی

مشکل سے بات بنائی کہ بخار آرہا ہے کئی دن سے۔ مگر وہ مطمئن نہیں ہوا کہہ رہا تھا کوئی تو بات ہے۔" آپا گل کی فکر مندی بڑھ رہی تھی۔ "میں تو کہتی ہوں کہ اب تو ایک دن کی بھی دیر نہیں ہونی چاہیے۔ دو چار دنوں میں لگ کر شفٹنگ کر دو۔ سلمان! تم ہی ہو اب گھر میں' ابو بے چارے تو ساری ہمت کھوتے جا رہے ہیں۔"

"دو چار دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس منحوس گھر سے چھٹکارا مل جائے۔ میں کل کیا آج ہی سے سامان باندھتا ہوں۔ کل فرید الدین چابی تو دے گیا تھا نا؟"

"ہاں۔۔۔!" وہ مڑ کر اپنا پرس اٹھانے لگیں' تب ہی سلمان کی نگاہ کچن سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جاتی ہوئی جویا پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ کمرے میں جا چکی تھی۔

ان چند لمحوں میں ہی سلمان کو پہلی بار فرید الدین کی بات میں کچھ حقیقت دکھائی دی۔

جویا واقعی بے حد کمزور ہو گئی تھی۔

اس کی رنگت بالکل زرد پڑ چکی تھی اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں اس کا وجود بہت ہی عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ سلمان نے کچھ کنفیوز سا ہو کر اس پر سے نگاہ ہٹائی تھی۔

"امی کیا جویا کے کمرے میں ہیں!" آپا گل نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

"ہوں۔" وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

"اچھا ہے' وہاں ایک طرف بیٹھی ہیں۔ ورنہ ہر بات میں بے کار کا دخل دیتی رہیں گی۔"

"آپا۔۔۔ جویا واقعی بیمار ہے!"

آپا گل نے چونک کر سلمان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی اور مسکراہٹ یکسر غائب۔

"تم بھی وہم پالنے لگے۔ کمال ہے!" انہوں نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا اور پرس سے برآمد کیا' چابیوں کا گچھا سلمان کے ہاتھ میں تھمایا۔

"یہ لو اور بسم اللہ کرو۔ زندگی کو بدلنے کے آثار اب کہیں جا کر نظر آئے ہیں اور رہی جویا تو ان حالات میں وہ بیمار تو کیا مر بھی جائے تو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کتنے عرصے سے اکیلی گھر کی گاڑی کو کھینچ رہی ہے۔ حال تو اس کا خراب ہونا ہی ہے اور میں جو کچھ کر رہی ہوں' اس کی بہتری کے لیے ہی کر رہی ہوں۔ مگر نہ وہ سمجھ رہی ہے اور نہ تم لوگ۔"

انہوں نے بڑی رقیق القلبی سے جویا کی حالت زار کا نقشہ کھینچا "اب شادی کر کے آرام و آسائش کے ساتھ رہے گی تو دیکھنا کتنی جلدی بالکل بدل جائے گی۔ پیسے سے زیادہ راحت اور کسی شے میں نہیں ہے۔"

سلمان چپ چاپ ان کی شکل دیکھے گیا۔ کم از کم اس آخری بات کی گواہی تو وہ بھی دے سکتا تھا۔

"تو بس اب طے ہے کہ اس موضوع پر اب کوئی اور نئی بات نہیں کی جائے گی' اس میں ہم سب کی بھلائی ہے اور جویا کی سب سے زیادہ۔"

اس بار سلمان نے بڑی عقیدت سے انہیں دیکھا تھا۔

سو ثابت ہوا تھا کہ جویا کا بھلا چاہنے والا ان لوگوں سے زیادہ اور کوئی نہیں تھا۔

"میں سامان کی پیکنگ شروع کرتا ہوں۔ سب سے پہلے اپنی الماری خالی کر لوں ذرا۔ اور تم کچن پر نگاہ ڈال لو۔ ہم کل ہی چلے جائیں گے یہاں سے۔۔۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

آپا گل نے طمانیت بھرا سانس لیا تھا۔

نیم روشن کمرے میں شاکرہ امی نے اضطراب سے پہلو بدلا تھا۔

"میں تیری مجرم ہوں جویا! تیری زندگی' تیرا دل سب ہی تو اجاڑنے میں برابر کی شریک۔" انہوں نے سسکی سی لی۔

جویا نے فکر مندی سے ان کی طرف دیکھا۔

"بھلا کوئی اپنی سگی اولاد کو بھی قتل کرتا ہے؟" ان کی آواز ایک سرگوشی سے زیادہ اونچی نہیں تھی اور کچھ ایسا تھا ان کے لہجے میں جو خوف زدہ کرتا تھا۔

"امی! آپ کھانا کھائیں پلیز! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' دماغ پر زور مت ڈالیں۔"

اس نے ہاتھ میں تھاما چمچہ ان کی طرف بڑھایا' تو انہوں نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں جویا۔ کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ کیا تم بھی گل کی طرح مجھے پاگل سمجھنے لگی ہو۔"

"خدا نہ کرے!" اس نے بے ساختہ ہی ان کا ہاتھ تھاما۔ شاکرہ امی چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھے گئیں۔

سادہ' صاف چہرہ بے ریا معصوم آنکھیں۔ وہ اتنی زرد کبھی بھی نہیں تھی۔

اس کی سنہری گندمی رنگت کب کھوئی۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا۔

انہیں اپنی بے خبری پر شرم آئی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں؟" اس پر شاید ہر وقت ہی سہم سا طاری رہنے لگا تھا اور وہ بھی کب سے۔۔۔ تن تنہا' کسی کے اپنے ساتھ ہونے کا احساس تک نہیں۔

ماں ہونے کا فخر اور اس سے کہیں آگے' اس کی زندگی میں اپنی موجودگی کا احساس' سب ہی کچھ رائیگاں۔

وہ اب بھی ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور ہاتھ میں تھمی پلیٹ چمچہ میں ہلکی سی لرزش۔

شاکرہ امی نے جویا کے ہاتھ سے دونوں چیزیں لے کر سائیڈ میں رکھیں۔

"مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی امی!" وہ خوف زدہ لہجے میں ان سے پوچھ رہی تھی۔

شاکرہ امی نے نرمی سے اس کے چہرے کو چھوا اور ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔

جویا نے ان کے چہرے پر پھیلتے آنسوؤں کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے انہوں نے اسے اپنے گلے لگایا تھا۔ ذرا دیر کے لیے زندگی سے بہت کچھ نفی ہوا۔

اپنی بدنصیبی' پیروں تلے جلتی آگ' فرید الدین' آپا گل سب ہی۔

مگر نہیں۔

سب کہاں؟

☼ ☼ ☼

وسیع کمپاؤنڈ میں خوب صورتی کے ساتھ لگائے گئے سفید اور نیلے شامیانے بڑا خوشگوار سا تاثر دے رہے تھے گیٹ سے اندر تک آنے والے راستے پر دونوں طرف پھولوں سے لدے ہوئے گملے۔ اندر قطار در قطار رکھی صاف ستھری کرسیاں۔ سادہ اور پروقار انداز میں سجایا گیا اسٹیج۔ اور سب سے بڑھ کر ماحول پر چھایا خوشی اور سکون کا گہرا احساس۔

برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے معاذ نے ایک گہری سانس لی اور مسکرا دیا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے نا معاذ بھائی؟" چند زینے نیچے کھڑے خیام نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"شان دار۔" معاذ کو اب اس کی کارکردگی پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔

وہ تہہ در تہہ' اس پر کھلا تھا۔

بے حد صلاحیت رکھنے والا' باکردار لڑکا' جو اکیلا صرف اپنے سہارے پر کھڑا تھا۔

"مجھے تم پر فخر ہے خیام! اور اب پورا یقین ہے کہ تم میرے کام کو بہت آگے تک لے کر جاؤ گے ان شاء اللہ۔"

معاذ نے بہت محبت سے اس کی طرف دیکھا' لیکن وہ کچھ برا مان گیا۔
"آپ اپنے کام کو خود لے کر چلیں گے۔ میں صرف آپ کے پیچھے ہوں گا ہمیشہ۔ اور آئندہ ایسی بات کیجیے گا بھی مت!"
اتنی سی بات کہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آئی تھی' جسے اس نے دوسری طرف رخ موڑ کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔
معاذ اتر کر اس کے قریب آکھڑا ہوا۔
وہ پہلے بھی یوں ہی روانی میں کہی گئی' ایسی ہر بات پر اسی طرح جذباتی ہو جاتا تھا اور ہر بار اس کی خود سے محبت پر معاذ کا دل خوشی سے بھرنے لگتا تھا۔
"اچھا سوری۔ بس یوں ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ تم کیا لڑکیوں کی طرح دل پر لے لیتے ہو۔"
"میرے لیے آپ ساری دنیا سے زیادہ اہم ہیں معاذ بھائی! آپ نہ ملتے تو پتا نہیں میرا اور کیا حال بننے والا تھا۔ ایک تنہا' بے سہارا مفلس لڑکا یہاں اس دھکم پیل میں اور کتنے دن زندہ رہ سکتا تھا۔ مگر آپ نے مجھے بچالیا۔"
"بچانے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ ہم تم صرف ذریعہ بن سکتے ہیں سمجھے۔"
"ٹھیک کہتے ہیں آپ!" خیام کی آواز مدھم تھی۔
سامنے کمپاؤنڈ میں ابھی بھی چند لڑکے چھوٹی موٹی درستگیاں کیے جارہے تھے۔ یہ سب اس قابل فخر ٹیم کا حصہ تھے۔
"یہ اللہ کی مہربانی تھی مجھ پر کہ اس نے مجھے آپ سے ملادیا۔ اور اس کے اس احسان پر میں نے زندگی میں پہلی بار اس ہستی کو جانا۔ اس کا شکر ادا کیا۔ ورنہ اب تک تو میرے پاس صرف گلے شکوے ہی تھے اللہ سے۔ مجھے لگتا تھا کہ شاید اسے میری پرواہی نہیں ہے۔ یا پھر وہ مجھے۔"
"غلط سوچ تھی تمہاری۔ مجھ سے ملنے سے پہلے بھی وہ تم پر مہربان تھا' وہ ہمیشہ اپنے بندوں پر مہربان رہتا ہے خیام! مشکل سے مشکل حالات میں بھی' وہ ہمیں تنہا نہیں چھوڑتا۔ اس کے بے بہا احسانات کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی آزمائش پر ہمارا اس سے گلہ کرنا' ہمارے ایمان کی کمزوری ہے۔"
پل کے ایک چھوٹے سے حصے میں وہ کہیں سے کہیں پہنچا۔
خیام نے اس روشن مہربان مسکراہٹ کو کہرے میں گم ہوتا محسوس کیا تھا۔
اور ایسا پہلی بار نہیں تھا۔
کاش وہ اس دکھ کو ختم کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکے۔ جو معاذ بھائی جیسے پیارے انسان کے دل سے جڑا ہے۔
اور وہ کم از کم دعا تو اس پل بھی کر سکتا تھا' سو اس نے دل کی گہرائی سے کی۔
معاذ سیڑھیاں اتر کر سامنے شامیانوں کی طرف جاچکا تھا۔ تب ہی خیام نے اندر آتی ہوئی وہ گاڑی دیکھی' جو اب اس کے لیے اتنی اجنبی نہیں رہی تھی۔
پچھلے کئی دنوں میں راجو کئی بار یہاں آیا تھا اور معاذ کی زبانی اس کے ساتھ پیش آنے والی دکھ بھری کہانی سن کر وہ اس کے ساتھ گہری ہمدردی رکھنے لگا تھا۔ لیکن آج راجو اکیلا نہیں تھا' زرق برق لباس میں ملبوس زری بھی اس کے ساتھ تھی۔
زری جس پر نگاہ پڑتے ہی کچھ اور بھی ساتھ چلا آیا۔ معاذ کے گھر کے گیٹ پر ہونے والے اس ٹکراؤ میں ربیعہ کے ساتھ وہی تھی' جس کی بے معنی گفتگو نے ربیعہ کو کچھ دیر ٹھہرنے پر مجبور کیا تھا۔
ایک مدھم سی مسکراہٹ خیام کے چہرے پر آئی۔

معاذ کے گھرانے کے لیے جو احترام اس کے دل میں تھا' وہ کہیں کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا تھا۔ اور اب تو خیر۔۔۔
دو دن بعد ربیعہ کی سسرال والوں کی آمد متوقع تھی۔ اور معاذ نے کتنی ہی ذمہ داریاں اس کے سپرد کی تھیں۔ راجو گاڑی پارک کر کے کچھ بڑے بڑے شاپرز نکال رہا تھا۔
فی الوقت یہاں کی گہما گہمی میں کچھ بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ خیام تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس کی مدد کے لیے آگے چلا گیا۔ زری نے اسے آتا دیکھ کر بڑے ادب سے سلام کیا تھا۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر خود خیام کو بڑا اچھا لگا تھا۔
"سالار بھائی نے یہ سب پہنچانے کے لیے کہا تھا' دیکھ لیں اگر مزید ضرورت ہو تو میں اور لے آتا ہوں۔"
مہنگی اور مشہور فوڈ چین سے آیا ہوا کھانا 'کافی سے زیادہ تھا۔ سو خیام نے اسے "فوراً" ہی منع کیا۔
معاذ بھی ان لوگوں کو دیکھ کر اس طرف آیا تھا اور بے حد ممنون تھا۔
"میں کیا کہوں۔۔۔ وہ اس طرح ہم لوگوں کا خیال رکھتے ہیں کہ شکریہ کے لفظ بھی نہیں ملتے۔"
"آج وہاں گھر میں بڑی گڑبڑ ہے معاذ بھائی۔" راجو نے تازہ خبر شیئر کی۔ "زرتاج بیگم کے بیٹے کا بڑا ہی برا ایکسیڈنٹ ہوا ہے' بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ وہ اسی وقت روانہ ہونے والی ہیں انگلینڈ۔"
"اوہ افسوس ہوا۔" معاذ کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔ مگر راجو کا چہرہ بے تاثر تھا۔
"اللہ ہمارے گناہوں کو معاف کرے معاذ بھائی۔ لیکن یہاں افسوس کا نہیں عبرت کا مقام ہے۔ سالار بھائی تو باظرف انسان ہیں' کسی کو بددعا بھی نہیں دیتے' مگر معلوم نہیں کیا کیا انصاف طلب ہے؟"
اس کی آواز دھیمی تھی۔ "خیر چھوڑیے' آج بڑا خیر و برکت والا دن ہے۔ اللہ آپ کو مبارک کرے۔"
معاذ مسکرا بھی نہ سکا۔
زری کچھ فاصلے پر خاموش کھڑی تھی۔ نگاہیں جھکائے پرسکون۔
شادی کے بعد سے اب تک جتنی بار بھی معاذ سے اس کا سامنا ہوا تھا۔ وہ اسی ایک موڈ میں نظر آئی۔ معاذ کا اطمینان اور بھی بڑھ جاتا۔
"کیسی ہو زری؟"
"شکر ہے اللہ کا' بالکل ٹھیک۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔ "گھر میں سب کیسے ہیں؟"
"وہ بھی سب اچھے ہیں' ابا اور امی تو آئیں گے آج یہاں' ربیعہ کو دادی کی وجہ سے گھر میں رکنا پڑے گا۔"
"میں پنجاب جانے سے پہلے ان سے ملنے کے لیے آؤں گی۔"
"ضرور!" وہ دوبارہ راجو کی طرف مڑ گیا۔
"ابھی تو وقت ہے۔ تقریب شروع ہونے میں' میں زری کو خالہ بتول کے گھر چھوڑ کر ابھی آتا ہوں۔ یہ لوگ پھر سب ایک ساتھ آئیں گے۔ بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں یہاں آنے کے لیے آج ہمارے پرانے محلے میں۔"
راجو اب مسکرانا سیکھ رہا تھا اور تعلقات نبھانا بھی۔ وہ لوگ چلے گئے تو معاذ واپس برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔
خیام اور دوسرے لڑکوں نے میز لگا کر کھانا نکال لیا تھا۔
"خیام! ایک بات کا تم لوگ بہت خیال رکھنا کہ کسی بھی قسم کی بدمزگی نہ ہونے پائے۔ گو ایسا کوئی امکان تو نہیں' لیکن پھر بھی ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ ہر ایک کو چیکنگ کے بعد اندر آنے دینا اور پارکنگ پر دو' تین لوگ مستقل رہیں' تاکہ وہاں بھی کوئی مسئلہ نہ اٹھے اور اگر پھر بھی خدانخواستہ کچھ ایسا ہو جو غیر متوقع ہو تو مجھے پوری امید ہے کہ تم لوگ سنبھال لو گے۔"

"آپ بے فکر رہیں معاذ بھائی۔۔۔! ان شاء اللہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔" ان میں سے ایک نے پورے یقین سے کہا۔
خیام سمیت وہ سب پراعتماد تھے۔

☼ ☼ ☼

جناح ایئرپورٹ سے باہر قدم رکھتے ہوئے نبیل نے ایک گہری ٹھنڈی لمبی سانس لی۔
بالآخر زرتاج رخصت ہوئی۔
پہلا احساس جو اسے حاصل ہوا تھا' وہ اب لمبی آزادی کا تھا۔ جن حالات میں وہ یہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ وہ اس کی طویل رخصت کی نشان دہی کر رہے تھے۔ سائی کومے میں تھا اور پتا نہیں کتنی مدت کے لیے یہی صورت حال رہنا تھی۔
وہ چلتا ہوا پارکنگ ایریا تک آیا۔
زرتاج کی فلائٹ روانہ ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی اور اس کی سختی سے تاکید تھی کہ فلائٹ ٹیک آف کرنے تک وہ وہیں باہر موجود رہے۔ لیکن نبیل کا اس پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
گاڑی کی ڈگی میں رکھا ہوا پمفلٹ کا ڈھیر ایک لمحہ بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا اور اپنے گھٹیا منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے۔ وہ بے قرار تھا۔
آج کے بعد سالار کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہنے والا تھا شہر بھر میں۔
یہ سوچ کر ہی اس کی انتقامی فطرت کو بڑی راحت ملی تھی اور پھر چند دن بعد آنے والا روزی کے کیس کا فیصلہ۔
اس کا دل بے ساختہ قہقہے لگانے کو چاہا۔ لیکن یہاں ہمہ وقت چھایا رش' ایسی کسی حرکت کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔
نبیل نے گاڑی ریورس کی اور وہاں سے نکل کر روڈ تک آنے میں اسے مزید چند منٹ لگے۔
تب ہی اسے وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس ہوا۔ سہ پہر ڈھلنے کو تھی اور یہاں سے اسکول تک کی ڈرائیو گھنٹہ تو لینے ہی والی تھی اور اگر دو' چار سگنل بند ملتے یا ٹریفک جام کے روزمرہ والے معمول سے دوچار ہونا پڑتا تو پھر وقت کی کوئی بھی گارنٹی نہیں دی جا سکتی تھی۔
نبیل نے مضطرب سا ہو کر گاڑی کی رفتار بڑھائی۔
"پتا نہیں سالار اور گیتی آرا ابھی گھر سے نکلے ہوں گے یا نہیں۔" اس نے اندازہ لگانا چاہا۔ مگر حتمی طور پر کچھ بھی آئیڈیا نہیں تھا۔ سو اس نے کسی ملازم سے کنفرم کرنے میں دیر نہیں لگائی۔
وہ لوگ ابھی گھر پر ہی تھے۔
نبیل نے فوری طور پر سکون محسوس کیا تھا یہ سن کر۔ آج چیزیں اس کے حق میں جا رہی تھیں۔ وہ سالار اور گیتی کے ساتھ ہی پہنچنا چاہ رہا تھا۔
ایکسیلیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ اور بھی بڑھا۔

☼ ☼ ☼

گیتی نے انہیں اوپر والے لاؤنج کی کھڑکی سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ زرتاج کا واویلا' بددعائیں' غضب کا شور و غل برپا کیے ہوئے تھیں۔ نبیل اسے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھا رہا تھا۔ تب گیتی تیزی سے واپس اندر آ گئی تھی۔
نبیل خوف و دہشت کی وہ علامت تھا جو زندگی کے سارے رنگ بڑی تیزی سے مٹاتا جا رہا تھا۔

بری طرح دھڑکتے دل اور ٹھنڈے پڑتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ وہ چپ چاپ وہیں لاؤنج میں بیٹھی رہی۔
سالار کسی کام سے باہر آیا تو اسے یوں گم صم بیٹھا دیکھ کر تھوڑا سا حیران بھی ہوا۔
"کیا ہوا؟ چلنا نہیں ہے کیا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔" ایک سانس میں کتنے سوال۔
وہ بدقت مسکرائی۔
سالار جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا اور اب تک گیتی اچھی طرح جان چکی تھی کہ اس کی تیاری محض چند منٹ لیتی ہے۔
سادہ اور پروقار۔
گیتی نے بہت دھیان سے اس کی طرف دیکھنا چاہا' مگر کبھی کبھی یہ بھی مشکل ہونے لگتا تھا۔
"اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو مت جاؤ۔ میں معذرت کرلوں گا تمہاری طرف سے۔" وہ اس کی مستقل خاموشی سے یہی اندازہ لگا سکا۔
ایک لمحے کو تو گیتی کا دل بھی چاہا کہ وہ ایسا ہی کرے... لوگوں کا سامنا کرنا مشکل تر لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔
نبیل کی دھمکیاں' اس کی بدفطرتی اور کیا خبر وہ سالار کی غیر موجودگی میں زرتاج کو چھوڑ کر گھر واپس آجاتا ہے۔
اور وہ اس لمحے سے پہلے مرجانا پسند کرے گی' جب سالار کے لیے ذلت اور شرمندگی کا سبب بنے۔
ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔
"میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔"
وہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور فوراً" ہی کمرے کی طرف گئی۔ سالار مطمئن ہو کر نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔ گیتی تیار ہو کر باہر آئی تو وہ گاڑی کے پاس ہی کھڑا تھا۔
گزشتہ دن کے تیز بخار کا اثر ابھی بھی چہرے پر تھا۔ مگر سالار کو وہ اس تھکے تھکے سے حلیے میں اور بھی زیادہ خوب صورت لگی تھی۔
"آخر یہ کون سی پراسرار کشش ہے۔ جس کا راز ہی نہیں کھلتا' تمہاری بیماری ہے یا کوئی بیوٹی ٹریٹمنٹ۔" گاڑی کو مین روڈ پر لاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
گیتی ہلکے سے مسکرادی۔
"یہ صرف آپ کی محبت ہے... کسی بھی عورت کو اس طرح چاہا جائے تو وہ یوں ہی خاص بن جاتی ہے کسی کی نظر میں' ورنہ میں کیا..." اس نے ہلکے سے سر جھٹک کر بات ادھوری چھوڑی۔
"خیر... اب میری بیوی کے لیے ایسا مبہم کمنٹ بھی نہ دو۔"
"کبھی میری امی کے سامنے کہیے گا... ان بے چاری کو تو ہمیشہ یہی دکھ رہا کہ میں صندل جیسی کیوں نہ ہوئی۔"
اس بار وہ صرف ہلکے سے ہنسا تھا۔
"سالار! آپ کو نہیں لگتا کہ اگر میں بھی صندل جیسی خوب صورت ہوتی' تو ظاہر ہے امی مجھے بھی فلم میں ہی بھیجتیں۔ آپ سے شادی تو نہ کرتیں نا میری... اور شاید میں خود بھی نہ کرتی۔"
اپنے سارے بیک گراؤنڈ کو بے رحمی سے جتاتے ہوئے اس نے سالار سے پتا نہیں کیا جاننا چاہا تھا اور پورا یقین تھا کہ چند لمحوں کے لیے ہی سہی اس کے چہرے کا رنگ تو ضرور ہی اڑے گا۔
مگر وہ بے ساختہ ہی ہنستا چلا گیا۔
"تم کچھ بھی کر رہی ہوتیں' شادی بہرحال مجھ سے ہی کرتیں۔ اس لیے کہ یہ مقدر کا لکھا فیصلہ تھا۔ میری

تمہاری یا کسی کی بھی مرضی کا کیا دخل تھا؟"

"آپ کو تقدیر پر اتنا یقین ہے؟"

"ہاں اور ہر مسلمان کو ہونا چاہیے۔" وہ بڑا پر سکون تھا۔

کبھی کبھی تو گیتی آرا کو اس پر اتنا رشک آتا کہ.... بس.... اتنی ٹھنڈک' اتنا ٹھہراؤ' اتنا سکون' کیسے ممکن تھا بھلا؟ مگر اس وقت ایک اور سوال تھا جو عرصے سے جواب طلب کر رہا تھا۔

"سچ بتائیے! آپ کو اس بات پر شرمندگی ہوتی ہے کہ آپ کی بیوی کا تعلق وہاں سے ہے جہاں سے رشتے داریاں جوڑنے کا لوگ تصور بھی نہیں کرتے۔"

بڑی ہی بے موقع بات تھی۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ آج معاذ کے اسکول کے افتتاح پر جاتے ہوئے وہ بے حد خوش تھا۔

گیتی کو بات منہ سے نکالنے کے بعد افسوس سا ہوا۔

"کیا تم اسی لیے آج کل پریشان رہتی ہو' کسی نے کہا ہے تم سے کچھ' زرتاج نے یا نبیل نے؟ سچ بتاؤ مجھے گیتی؟" وہ جواب ڈھونڈنے کی زحمت میں پڑنے کے بجائے الٹا اس سے پوچھ رہا تھا اور انداز میں کچھ ایسی بے تابی تھی جیسے کسی جگ سا پزل کا کھویا ہوا ٹکڑا ہاتھ آیا ہو۔

گیتی آرا نے بے ساختہ نگاہ چرائی تھی۔

"کچھ نہیں' میں صرف اپنے اطمینان کے لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"تمہیں اطمینان میں نے نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے دلا دیا تھا ساری عمر کے لیے.... یہ کچھ اور ہی بات ہے۔"

اس نے چند لمحوں میں ہی دل ہی دل میں کئی اندازے لگائے تھے۔ بھلا کیسے ممکن تھا کہ نبیل اور زرتاج جیسے لوگ اس طرح کی کسی بات کا سرا پکڑ کر گیتی جیسی سادہ لوح لڑکی کا جینا محال نہ کریں۔

وہ کیوں بھولا تھا کہ جس بات کی اس کے نزدیک رائی کے برابر بھی اہمیت نہیں تھی۔ وہ گیتی کے دل میں' اس کی زندگی میں آج بھی کمپلیکس کا سبب تھی اور اس کمپلیکس کو خوف میں بدلنے والے بھی وہیں قریب تر۔

"اوہ خدا۔" وہ جیسے اپنی غفلت پر شرمندہ ہوا۔

"بتائیں نا۔" وہ اب بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سالار نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"میں کون ہوتا ہوں لوگوں کو عزت کے پیمانے پر ناپنے والا۔ یہ تو اس رب جلیل کا منصب ہے گیتی! اچھائی برائی' گناہ' ثواب' سب کا فیصلہ' سب کا حکم وہیں سے نافذ ہوتا ہے۔ ہمیں تو صرف اپنی فکر کرنی چاہیے کہ وہ ہماری کوتاہیوں کو معاف کرے' ہمیں دنیا اور آخرت کی رسوائی سے بچا لے۔"

"سب لوگ آپ کی طرح نہیں سوچتے' وہاں کا حوالہ گالی کی طرح دیتے ہیں۔ مجھے پہلی بار لگا کہ خیام نے بہت اچھا کیا تھا' جو وہاں کا ہر حوالہ ختم کیا۔ وہ لڑکا تھا۔ پتا نہیں کس طرح باہر لوگوں کو فیس کرتا ہوگا' گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ کس اذیت سے گزرتا ہوگا۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا ہے۔"

گیتی کے خوب صورت چہرے پر دکھ کا تاثر اترا تھا اور آج اس وقت اس نے سالار سے خیام کے بارے میں بات کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں کی تھی۔

وہ اس کی بات سے متفق نہیں تھا۔ لیکن آج وہ اسے خود سے بے حد قریب لگی۔

اس نے دھیرے سے گیتی کا ہاتھ تھاما۔

"محبت بھرے رشتے ہر جگہ ایک سے ہوتے ہیں گیتی! اور ان سے جڑی سچائی بھی۔ کبھی مصلحت' کبھی مجبوری

ان کی خوب صورتی کو دھندلانے لگے' تب بھی ان کی طاقت کم نہیں ہوتی۔ میری نظر میں خیام آج بھی بے وقوف' جذباتی لڑکا ہے۔ اسے جانا تھا۔ ضرور جاتا۔ لیکن سب کو خدا حافظ کہہ کر۔ ایک تعلق ہمیشہ برقرار رکھ کر.... ایسا نہ کرکے اس نے نانی کو ہی نہیں خود کو بھی بہت بے سکون کر لیا ہے۔ میں نے دیکھا تھا اسے ایک مشکل ترین دور سے گزرتے ہوئے۔" سالار کی آواز بتدریج دھیمی پڑی تھی۔

"دھیان سے گاڑی چلائیے۔" گیتی نے نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے الگ کیا۔

خیام کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش بھی کب کی تمام ہوئی تھی۔

گاڑی سے باہر نگاہ جماتے ہوئے وہ صرف سالار کے لیے فکرمند تھی۔

روزی کے کیس میں ناکامی پر وہ کس دکھ سے گزرنے والا ہے' نبیل جیسے درندہ صفت کی کامیابی۔

اور یہ کامیابی آگے کتنے ہی مظالم کی ابتدا ٹھہرے گی۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ اپنے بھی دکھ کو بھولی تھی۔

وہاں اسکول کمپاؤنڈ میں مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ خیام اور دوسرے لڑکے اسی بھاگ دوڑ میں تیار ہو چکے تھے۔ گیٹ کی طرف آتے ہوئے معاذ کی نگاہ خیام پر جمی تھی۔

وائٹ شرٹ اور بلو جینز میں وہ اتنا اسمارٹ اور اچھا لگ رہا تھا کہ معاذ کا بے ساختہ ہی چند لمحے رک کر اسے دیکھنے کو دل چاہا۔ اس کی سنہری رنگت' ہلکا سا بڑھا ہوا شیو اور ماتھے پر گرتے ہوئے براؤن بال۔

ایک عجیب سی دل کشی تھی' جو اس کی طرف بے ساختہ ہی دل کھینچتی تھی۔ وہ اداسی جو اس کی آنکھوں سے ہمیشہ جھلکتی تھی' آج بھی تھی۔ لیکن آج وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

لوگوں کو ریسیو کرتے ہوئے اپنے ساتھی دوستوں سے بات کرتے ہوئے دن میں کئی بار معاذ نے اسے مسکراتے دیکھا اور بے حد خوشی محسوس کی۔

جب سے وہ اس کی کہانی کے اصل سے واقف ہوا تھا' تب سے خیام کی محبت اور عزت اس کے دل میں اور بھی بڑھی تھی۔ گھر چھوڑے اسے کتنے سال ہو رہے تھے۔ وہ ایک نوعمر سا لڑکا' اس بے حس دنیا میں اکیلا تن تنہا کس طرح رہا ہے۔ معاذ نے سر جھٹک کر خود کو کمپوزڈ رکھنا چاہا۔

اور ان لوگوں کی طرف چلا آیا۔

تب ہی اس نے یوسف کمالی کو گاڑی سے اتر کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے اور معاذ کو ان کی بے تابی پر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔

ان کی نگاہ قدرے فاصلے سے ہی خیام پر جمی تھی۔ معاذ نے دانستہ آگے بڑھ کر ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔

"السلام علیکم کمالی صاحب۔"

انہوں نے کچھ چونک کر معاذ کی طرف دیکھا۔ "وعلیکم السلام بیٹا! مجھے دیر تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں بالکل نہیں' آج آپ بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔"

معاذ نے محسوس کیا تھا کہ ان کی نگاہ اس سے بات کرتے ہوئے بھی خیام کی طرف ہی اٹھ رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں تھما کمالی صاحب کا ہاتھ بالکل سرد ہو رہا تھا۔

معاذ نے غور سے ان کے چہرے کو دیکھا۔

چند ہفتوں میں ہی ان کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ وہ بہت تھکے تھکے اور کمزور محسوس ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ظاہر کرتے تھے کہ وہ پتا نہیں کب سے گہری نیند نہیں سوئے ہیں۔

"میں تو گھنٹہ بھر پہلے ہی نکل گیا تھا گھر سے' لیکن یہ لینے میں تھوڑی سی دیر لگ ہی گئی۔" انہوں نے ڈرائیور کے ہاتھ سے وہ بڑا سا بوکے اور کیک لے کر معاذ کی طرف بڑھایا۔

"تمہیں بہت مبارک ہو معاذ بیٹا! اللہ زندگی میں تمہیں ہزارہا خوشیاں اور آسانیاں عطا کرے۔"
اس کی آنکھ میں اتنی سی بات کرتے ہوئے بھی پانی اترا تھا۔ معاذ نے ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھاما۔ یہ ایک خاموش یقین دہانی تھی۔
"آپ کا بے حد شکریہ اور یہ سب کچھ مجھ سے زیادہ ان سب کی محنت کا نتیجہ ہے۔" اس نے ان سب کی طرف اشارہ کیا۔
خیام بے نیازی سے ذرا سا رخ موڑ کر کسی ساتھی سے بات کر رہا تھا۔
"آج میں ان سب کے لیے بھی انفرادی طور پر بہت شان دار سے انعامات دینے والا ہوں۔ جو بہر حال ان کی محنت اور خلوص کے آگے کچھ نہیں ہیں۔"
خیام نے ان کی بات سنی بھی نہیں تھی۔
کمالی صاحب کی نگاہوں میں بڑی حسرت، بڑی محرومی تھی۔ زندگی کی یہ سب سے بڑی دولت ان کی ہو کر بھی ان کی نہیں۔ فیروزہ کا بیٹا انہیں معاف کرے گا بھی یا نہیں۔
"خیام!"
وہ معاذ کی آواز پر پلٹا تھا اور ابھی تک وہیں کھڑے کمالی صاحب کو دیکھ کر تھوڑا سا حیران ہوا تھا۔
"ان سے ملو کمالی صاحب۔۔۔ ہمارے اسکول کے لیے ان کا بھی بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے۔"
"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے شاید صرف کرٹسی ہی برتی تھی، لیکن کمالی صاحب کے لیے یہ محض ایک رسمی ملاقات نہیں تھی۔
"جیتے رہو، خوش رہو۔" بڑی محبت سے اس کو گلے سے لگاتے ہوئے ان کی آواز میں نمی واضح ہو رہی تھی۔
خیام اس اجنبی شخص کی جذباتیت کو محسوس کر کے چونکا تھا۔ وہ فوری طور پر اس سے الگ ہونے کے بجائے اسے سینے سے لگائے کھڑے رہے تھے۔
معاذ نے ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر دانستہ نگاہ چرائی۔
"آیئے کمالی صاحب! میں آپ کو دوسرے مہمانوں سے ملاتا ہوں۔"
اس کے احساس دلانے پر وہ چونک کر اس سے الگ ہوئے۔
"چلو!" بنا خیام کی طرف دیکھے وہ معاذ کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔
"عجیب شخص تھے۔" وہ ابھی تک کنفیوژ تھا۔
معاذ انہیں چھوڑ کر واپس آگیا تھا۔ لوگوں کا رش ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔ انہیں ترتیب وار بٹھانا بہت ضروری تھا۔ خیام دوسرے لڑکوں کے ساتھ مصروف ہونے لگا۔
سالار کی گاڑی رکتے دیکھ کر معاذ نے خیام کو تلاشنا چاہا۔ مگر وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔
آج اس کا اور گیتی کا سامنا لازمی تھا اور معاذ خاموشی سے الغرض رہ کر اس کے رد عمل کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر شناسائی کا اظہار کرتا ہے یا نہیں۔
اسی پر کمالی صاحب سے اس کے اصل تعارف کے ساتھ ملاقات کی کامیابی ٹکی تھی۔
ابا کا خیال تھا کہ اگر وہ گیتی سے ملتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوا، تو یہ اس کی ذہنی بہتری کی علامت ہو گا۔ ورنہ کچھ اور انتظار بھی ضروری تھا۔ کسی بھی طور وہ خیام کو کسی ذہنی جھٹکے سے بچائے رکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس وقت لوگوں کے رش میں وہ کہیں نہیں تھا۔ معاذ ان لوگوں کے استقبال کے لیے آگے بڑھتا چلا گیا۔
خیام نے بہت دور سے اسے گاڑی میں سے اترتے دیکھا تھا۔

سادہ سی مخصوص مسکراہٹ آج بھی اس کے چہرے پر تھی اور آج بھی وہی بے نیازی جو اچھے اچھوں کو دھوکے میں ڈال سکتی تھی۔
وہ جو سڑک کنارے بنے ہوئے ایک معمولی سے گھر کے ایک چھوٹے سے کرائے کے کمرے میں رہتا تھا اور جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی کئی بار اسے مدد بھی لینی پڑی۔
فجر کی اذانوں میں گونجتی وہ صبح آج بھی خیام کو پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھی۔ جب سالار نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا تھا' بس کا ٹکٹ' گرما گرم ناشتا' کانٹیکٹ نمبر......
ہر مہربانی جو وہ اس وقت اس پر کر سکتا تھا' اس نے کی۔
ایک چھوٹے سے پل میں بہت کچھ دل پر سے ہو گزرا تھا۔ وہ دم بخود سالار کو دیکھ رہا تھا۔
یوں جیسے نگاہوں پر یقین نہ ہو۔
کئی بار اس نام کو خیام کے منہ سے سن کر اسے شبہ سا گزرا بھی تو خود ہی اپنی نفی کی۔
یہ ایسا ہی ناممکن تھا جیسا خود اس کے اپنے حسب نسب میں چاند ستارے جڑنا۔
مگر یہ سالار ہی تھا اور اس کے ساتھ...... گیتی آرا۔
خیام کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا اور چہرہ پسینے سے تر۔ ایک خوش حال شادی شدہ زندگی گزارنے والے میاں' بیوی۔ معاشرے میں نمایاں حیثیت رکھنے والے سالار کی بیوی گیتی آرا' اس نے دو یا تین بار آنکھ جھپکی۔
مگر یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ گیتی کے خوب صورت چہرے پر وقار تھا اور وہ بہت پراعتماد انداز میں سالار کے ساتھ کھڑی تھی۔ ابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔
ایک باعزت' محفوظ و مامون زندگی گیتی آرا کو نصیب ہوئی تھی۔ کچھ پوچھے' کچھ جانے بغیر خیام پر گیتی کی خوش نصیبی کھلی تھی۔
تب ہی گیتی نے بھی اسے دیکھا تھا۔ اسے وہم سا ہوا۔
وہ خاموشی سے پیچھے ہٹا اور پھر ہٹتا ہی چلا گیا۔ لوگوں سے' کرسیوں سے الجھتا ہوا۔ قناتوں کے دوسری طرف جہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ تقریباً "دوڑتا ہوا گزرا۔
پارکنگ سے گزرتا ہوا وہ بالکل آخری سرے پر ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے ایک پتھر پر جا کر بیٹھا تھا۔
اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا یا آنسوؤں سے' اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔
یہ آنسو تھے جو ایک تواتر سے اس کے چہرے پر گر رہے تھے۔
"او خدا' او خدا!"
وہ سر کو گھٹنوں پر جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ اپنی سرکشی پر بھی اور اپنی بے بسی پر بھی۔
جس عزت کے لیے وہ آج بھی سرگرداں تھا' گیتی آرا کو کس آسانی کے ساتھ ملی تھی۔ اس چوبارے والی زندگی کے حوالے سے وہ سالار کی زندگی میں آئی۔ حالانکہ اس نے کبھی بھی اپنے ماحول' اپنے لوگوں سے نفرت نہیں کی تھی۔
نانی ستارہ کی رعب داب والی شخصیت سے لے کر شاما جیسی معمولی حیثیت والی ملازمہ تک وہ ہر ایک سے ادب سے پیش آتی رہی' محبت کرتی رہی۔ جبکہ وہ خود ساری محبتوں' ساری سہولتوں سے فیض یاب ہو کر بھی ان سب سے گھن کھاتا رہا۔
شاما کا ہاتھ اپنے برتنوں پر اپنے کمرے کی کسی چیز پر اسے چھونا بھی گوارا نہیں رہا تھا۔
وہ ان سب کو ان کی اوقات یاد دلانے میں ہمیشہ بے رحم رہا۔ نفرت تھی اسے ان سے' اور شاید آج بھی۔

آج کتنے دن بعد اس نے پلٹ کر دیکھا اور ان سب کے بارے میں سوچا تھا۔
بڑی دیر بعد اس نے اپنا جھکا ہوا چہرہ اٹھایا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو رگڑ رگڑ کر خشک کرتے ہوئے اس نے تیزی سے ڈھلتی شام کو دیکھا۔
اندر اسکول کا فنکشن عروج پر تھا۔
اتنے دن سے وہ اس فنکشن کے لیے پرجوش اور مصروف تھا۔ مگر آج سب ہی کچھ صفر ہوا تھا۔
کاش وہ فیروزہ کا بیٹا نہ ہوتا یا پھر وہ اسے اپنے ساتھ لانے کے بجائے اس کے باپ کے منہ پر مار آتی یا پھر کسی یتیم خانے میں داخل کروا دیتی تو یہ ایک ڈری' سہمی' شرمندہ کرتی آزمائش بھری زندگی اس کے حصے میں نہ آتی۔
یا پھر خدا گیتی جیسی نیک نیتی اس کی فطرت کا حصہ بنا دیتا' تب شاید اس کی بھی نجات ممکن ہو جاتی۔
وہ فی الحال وہاں سے اٹھنے کے بھی قابل نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

نبیل کا ہاتھ مستقل ہارن کو دبائے گیا۔
گاڑیوں کا جم غفیر تھا' جو چیونٹی کی رفتار سے رینگ رہا تھا۔ آس پاس کی کئی گاڑیوں نے اس کے مستقل ہارن بجانے پر اسے بہت بے زار نگاہوں سے دیکھا تھا۔
مگر اس کی دحشت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔
وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور کئی دن سے بنایا ہوا پلان بالکل ہی چوپٹ ہوا جا رہا تھا۔
سالار پر اس کا لمبا حساب کھلتا تھا۔
سالار' گیتی' راجو......
ان تین کی ذلت اور رسوائی اس نے خود پر فرض کی تھی اور آج ایک بہترین موقع تھا' جو بلاوجہ ہی ضائع ہو رہا تھا۔ کاش اس نے وہ پمفلٹ کل رات ہی اپنے لوگوں کو دے دیے ہوتے تو شاید اب تک وہاں رنگ میں بھنگ پڑ چکا ہوتا' مگر وہ خود تماشا دیکھنے کا منتظر تھا۔
کیا سین ہو گا جب سالار اپنی حسین بیوی کو لے کر چوروں کی طرح وہاں سے نکلے گا اور وہاں موجود ہر شخص کی نگاہیں اس پر ہوں گی یا ہاتھ میں تھامے پمفلٹ پر۔
دل میں اٹھنے والی کمینگی بھری خوشی اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ کسی بھی طرح یہاں سے گاڑی نکال لے اور اگر وہ دس' پندرہ منٹ بھی حاصل کر سکا تو یہ سب ابھی بھی ممکن ہو سکے گا۔
تب ہی اچانک آگے رکی گاڑیاں بڑھنا شروع ہوئی تھیں۔ رفتار ہلکی اور پھر بتدریج بڑھنے لگی۔ نبیل کے چہرے پر بڑی گہری مسکراہٹ آکر ٹھہری۔
"میں آرہا ہوں سالار! انتظار کرو۔" اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے دل میں کہا۔
وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا چلا گیا۔
فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔
تیز اور تیز......
تب ہی اچانک اس کے آگے جانے والی گاڑی نے بالکل اچانک بریک لگائے تھے۔ آگے پیچھے کئی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔
نبیل نے بے ساختہ ہی سر تھاما۔ لوگ اتر کر اپنے اپنے نقصان کا اندازہ لگا رہے تھے اور ساتھ ہی ایک دوسرے

کو قصور وار ٹھہرانے کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ نبیل نے بڑے تاسف سے گاڑی کی پچکی ہوئی ڈگی کو دیکھا۔ یہ گاڑی بالکل نئی تھی اور اسے بے حد پسند بھی۔
ڈگی جھٹکے یا ٹکرانے سے تھوڑی سی کھل گئی تھی۔ تھوڑا سا زور لگا کر اس نے ڈگی کو اور کھولنا چاہا تو بے ساختہ ہی حیرت سے پیچھے ہٹا۔
ڈگی میں رکھی ہوئی کسی سیاہی مائل تیل کی بوتل کھلی پڑی تھی اور وہ پمفلٹ کا ڈھیر اس میں پوری طرح ڈوب چکا تھا۔ تیل کی سیاہی الفاظ کے اوپر اس طرح پھیلی تھی کہ ان کا تقریباً" ہر لفظ مٹا تھا۔

☆ ☆ ☆

فنکشن تمام ہوا تھا۔
لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہوئے تھے۔
وہ گاڑیوں' موٹر سائیکلوں اور قدموں کی چاپ' خاموشی سے سنے گیا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ شور بھی معدوم ہوا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ وہاں اب اندھیرا تھا۔ لیکن اس نے پھر بھی اٹھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔
"خیام' خیام' خیام!" معاذ بہت بے تابی سے اسے آواز دے رہا تھا۔
"خیام! کہاں ہو تم۔"
"پتا نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے ابا... پورا وقت وہ نظر نہیں آیا مجھے۔" اس نے اسلام صاحب کی طرف بہت تشویش سے دیکھا تھا۔ "آج جبکہ اس کا یہاں آنا بہت ضروری تھا' بہت خوشی اور جذبے سے اس نے اس دن کی تیاری کی تھی اور وہ خود ہی یہاں موجود نہیں رہا۔ کیا وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے ابا؟"
"خدا نہ کرے۔" اسلام صاحب نے بے ساختہ کہا۔ یہ ایک بے حد تکلیف دہ امکان تھا۔ جس پر ایک پل کے لیے بھی غور کرنے کی ان دونوں میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں تھی۔
"تمہیں لڑکوں کو شام سے ہی اس کی تلاش میں بھیجنا چاہیے تھا۔ اس کی جذباتی کیفیت کا اندازہ بھی تھا۔ پھر بھی..." وہ معاذ پر ناراض ہو رہے تھے۔
"بس یہی سمجھتا رہا کہ وہ شاید باہر کسی مصروفیت میں الجھا ہے۔ اگر ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ یہاں نہیں ہے تو میں اس فنکشن کو چھوڑ کر اسے ڈھونڈنے کے لیے خود چلا جاتا؟"
معاذ کو پچھتاوے گھیر رہے تھے۔
"نہیں... وہ یہیں کہیں ہے' وہ کم از کم مجھے اور آپ کو چھوڑ کر جانے والا نہیں ہے۔"
معاذ کے ہاتھ میں موبائل تھا' جس سے وہ بار بار خیام کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا۔ مگر کوئی رابطہ نہیں۔
"آپ گھر چلے جائیں ابا... مگر میں اسے ڈھونڈے بغیر کہیں نہیں جاؤں گا' میں کسی لڑکے سے کہتا ہوں' وہ آپ کو چھوڑ آئے۔" وہ دونوں چلتے ہوئے خاصا آگے نکل آئے تھے۔
"میں بھی تمہارے ساتھ رکوں گا۔ خیام کی فکر مجھے گھر میں آرام سے نہیں رہنے دے گی۔" وہ ایک فیصد بھی راضی نہیں تھے۔ تب ہی سامنے سڑک سے خاصا ہٹ کر ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ انہیں کچھ شبہ سا گزرا۔
"کون ہے؟" معاذ تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ اسلام صاحب اس کے پیچھے تھے۔
ٹارچ کی روشنی میں دیوار کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا ہوا وہ خیام ہی تھا۔
اسلام صاحب اور معاذ نے ایک ساتھ ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
"خیام! اٹھو بیٹا' میرے ساتھ گھر چلو!" اسلام صاحب نے بغیر کسی بھی سوال جواب کے بہت نرمی سے اس

سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کچن کی کھڑکی سے نظر آتے پچھلے احاطے میں نیلاہٹ مائل اجالا اترا تھا۔
صبح ابھی پوری طرح روشن نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہ سحر خیزی اس کا پرانا معمول تھی۔ چائے کے پانی کے پکنے کے انتظار میں وہ یوں ہی چند منٹ اس خاموش اور پر سکون منظر میں کھو جاتی تھی۔
سامنے پھیلا سبزہ ' چمپا کے پھولوں سے لدا درختوں کا جھنڈ ' پچھلی دیوار پر پھیلی نارنجی پھولوں کی بیل ' سب ہی کچھ جو دن میں ' بہت عام سے محسوس ہوتے تھے۔ صبح کے ان اولین لمحوں میں کسی خواب کا حصہ محسوس ہوتے تھے۔ بے حد خوب صورت خاموش منظر جو صرف اس کے لیے تخلیق ہوتا تھا۔
ایک زمانے میں تو معاذ نے پورا یقین دلا رکھا تھا کہ یہیں کہیں ' کسی جھنڈ کے پیچھے کسی درخت کی اوٹ میں ' بونوں کی کوئی انوکھی دنیا ہے ' جہاں وہ اسے کسی دن سیر کے لیے لے جا سکتے ہیں یا پھر نارنجی پھولوں کے درمیان کہیں چھوٹی چھوٹی ننھی پریاں ہیں ' جو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اڑنا سکھا دیں گی ' لیکن یہ تب ہو گا جب وہ ایک اچھی اور نیک بچی بن جائے گی۔
سو معاذ کی کہی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کی عادت ' اسے اچھی بچی بنے رہنے پر مجبور کرتی تھی اور اس اچھی بچی کے لیے ضروری تھا کہ وہ معاذ کے ہوم ورک سے لے کر اس کے سارے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے۔
ربیعہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ چائے کا پانی پک چکا تھا۔
ابا کے لیے چائے کا کپ تیار کر کے وہ کچن سے باہر آئی ' گھر پر ابھی بھی سناٹا تھا۔
اب جب وہ یہاں سے جانے ہی والی ہے تو یہ سب مانوس سا ماحول اور روٹین کتنی دور چلی جائے گی۔ محض ایک خوب صورت یاد کا حصہ۔
دن میں کتنی ہی بار وہ آنکھ میں آئے آنسو جھٹکتی تھی۔ کیسی محفوظ ' مامون ' پر سکون زندگی تھی اس گھر میں۔
سامنے ابا کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابا کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے خود کو پوری طرح کنٹرول کیا اور مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی ' لیکن وہ وہاں نہیں تھے۔
چائے کا کپ میز پر رکھ کر وہ کھڑکی کی طرف مڑ کر پردے ہٹانے لگی۔ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا خوشبو سے بوجھل ہوا کا جھونکا اندر آیا ' تب ہی اپنے پیچھے آہٹ پر ربیعہ نے مڑ کر دیکھا۔
خیام سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پانی کی نمی تھی اور آنکھیں اب بھی سرخی مائل۔
"سوری!" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ ہی نکلا تھا۔
ربیعہ کے چہرے پر شرمندگی بھری مسکراہٹ ابھری۔ "مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ یہاں ہیں۔"
"میں رات سے یہیں ہوں ' ابا مجھے ساتھ لے کر آئے تھے۔" اس کے چہرے سے نگاہ ہٹانے میں خیام کو وقت کا سامنا ہوا تھا۔

(اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سائرہ رضا

اڈی والی جوتی

آسمان کی ملکیت کے دونوں دعوے دار منظر سے غائب تھے ' جب مائی بختی نے اپنے کچے پکے کوٹھے کی دہلیز پار کی۔ سورج جا چکا تھا اور نہ جانے چاند کو کیا جھجک تھی کہ نکل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ اکلوتا بلب اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا ' کیونکہ اس کی روشنی کمرے کے اندر برآمدے اور پتلی لکیر کی صورت کونے میں بنے چولہے تک مزے سے پہنچتی تھی۔ دروازے کے پاس بنے غسل خانے تک اندازے سے بنا ٹھوکر کے پہنچ جاتے ہیں ' کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ موسم چونکہ سردی کی جانب مائل تھا تو پنکھے کی ضرورت نہیں تھی۔
"اے گلابی.... اے سانولی.... کدر جا بیٹھی؟" اس کی پاٹ دار آواز آنگن میں گونجنے لگی۔
گلابی چولہے کے پاس سے اور سانولی کمرے سے لپک کر برآمد ہوئی۔ سانولی نے ہاتھ میں پکڑا شیشے کے ڈھکن والا لکڑی کا بریف کیس احتیاط سے چارپائی پہ رکھ دیا۔ گلابی نے سر سے گٹھڑ اتارا اور بغل کا جھولا بھی ' مگر تیسرا سیاہ تھیلا بختی نے ہاتھ بڑھانے پر بھی نہ دیا ' دونوں سمجھ گئیں ' آج اماں کچھ خرید لائی تھی۔
"اماں! اس میں کیا ہے؟" گلابی شرم سے دہری ہونے لگی۔
"صبر کر صبر.... تیرے لیے ہی ہے۔ ذرا پانی تو پلا۔ اج بڑے بازار میں خوب رش لگے ' خبر نہیں ' دنیا مہنگائی روتی ہے پر بازار تو ایسے بھرے ہیں جیسے شام کو خالی کر کے جائیں گے۔ ہر پل خیر! رب سوہنا بازار آباد رکھے۔"
سانولی نے مٹی کے آب خورے میں مٹکے کا پانی ڈال کر ماں کو بصد احترام دیا ' جو وہ غٹا غٹ پی گئی۔
"آج کیا پکا لیا؟ زوروں کی بھک (بھوک) لگے ہے۔"

"اماں! ساگ بنایا ہے۔ بس تڑکنا باقی ہے۔" گلابی کی نگاہیں سیاہ تھیلے پر جمی تھیں۔ مائی بختی بھوک کی کچی تھی۔ اب پہلے وہ روٹی ڈالے گی' پھر کھائی جائے گی۔ بعد میں چائے کا کپ۔ پھر تھیلا کھلے گا۔ وہ ٹھنڈا سانس لے کر مڑ گئی۔

مائی بختی سیاہ کرتے کی جیب سے پیسے نکال کر گننے لگی۔ سب چھوٹے چھوٹے نوٹ سکے۔ سانولی کو کچھ روپے دیے گھر کے خرچ کے' باقی سارے پیسے کرتے کی اندرونی سلی جیب میں ڈال لیے۔

یہ روز کا معمول تھا' پھر وہ ہاتھ پیر دھونے غسل خانے میں گھس گئی۔

سانولی گلابی کے پاس پیروں کے بل بیٹھی اندازے لگا رہی تھی۔ تھیلے میں کیا ہو سکتا ہے۔ گلابی ریشمی سوٹ' سرخ گرم شال اور سرخ موزے مگر پھر... تھیلے کی ساخت سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے۔ اماں صبح منہ اندھیرے منہ پیٹ بھر ناشتا کر نکلتی تو پھر رات کا کھانا ہی کھاتی۔ کبھی جو دن میں بھوک ستاتی تو چھپر ہوٹل سے کڑک چائے کے ساتھ کیک پیس یا چھلی لے لیتی۔ کبھی کبھار سموسے کی عیاشی بھی ہو جاتی۔ مائی بختی نے ان کے صبر کے ساتھ ساتھ اپنے صبر کو بھی آزمایا تھا۔ وہ پوری تسلی اور طمانیت کے ساتھ اپنی خریداری سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی اور بالآخر تھیلی سے بلی باہر آنے کا وقت ہو گیا۔ مائی بختی نے پہلے سانولی کی مدد سے ہاتھ دھوئے' پھر اپنے دوپٹے سے اچھی طرح پونچھ کر تھیلے کی گرہ کھول دی۔

"لے تو! آپ اپنے ہاتھوں دیکھ۔" اس نے دو زانوں بیٹھی گلابی کی گود میں تھیلا الٹ دیا۔

"ہیں!" گلابی اور سانولی دونوں نے اچنبھے سے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور کوئی جواب نہ ملنے پر وہ یک زبان بولیں۔

"یہ کیا ہے اماں؟" گلابی نے خاکی رنگ کے سوٹ پیس کو گھٹنوں پر پھیلا لیا۔ وہ تو سرخ نیلے پیلے رنگوں کی منتظر تھی۔

"یہ بھلا کس کے واسطے؟ اس کا کیا کرنا ہے؟"

"اور کس کے واسطے؟ اپنے رئیس کے ویاہ کا شگن لائی ہوں بوسکی کا سوٹ... پورے ساڑھے چار سو روپے خرچ کیے۔ وڈے باجار ماں آٹھ سو سے کم تی نہیں' پر میں چوہدری سے لائی ہوں۔ وہ گچی پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ اماں بختی! تو تو اپنی بھائی بند ہے۔ تیرے سے کیا مناپھا (منافع) لینا... کہیں' کہیں ہزار کا بھی ملے ہے۔"

اماں کے چہرے پر خوشی اور جوش سرخی بن کے جھلک رہا تھا۔ گلابی سرتاپا کپکپا گئی۔ اس نے بوسکی کے کپڑے کو جھٹکا دیا اور گھٹنوں میں منہ دے گئی۔ جیسے رئیس کے بوسکی کے سوٹ پر نہیں' اس کے چوڑے شانوں کو چھو لیا ہو سب کے سامنے۔ اماں نے مصنوعی خفگی سے اس کی شکل دیکھی اور سوٹ احتیاط کے ساتھ تھیلے میں ڈال دیا۔ اب اس کے قدم اندر کے صندوق کی جانب تھے' جہاں گلابی کے جہیز کا سامان اکٹھا کر رہی تھی۔ کالے سیاہ۔ صندوق پر اس کے مرحوم شوہر کا نام سفید رنگ سے لکھا تھا اور مائی بختی غیر ارادی طور پر ہمیشہ اس پر اپنی انگلیاں پھیر کر صندوق کھولتی جیسے اسے محسوس کر رہی ہو۔

گلابی اور سانولی تیز قدموں سے پیچھے لپکیں۔ عمرو کی زنبیل جیسے کھل گئی۔ ایک سرخ ریشمی جوڑا جو مائی بختی نے دو سال پہلے لے کر ڈال دیا تھا' سرخ پراندہ' مینا کے کام والی سرخ و سبز چوڑیاں' اسٹیل کے چار گلاس' چار پلیٹیں' ایک پتیلی' آٹا گوندھنے کی پرات' ایک لوٹا اور ایک بستر کی چادر بھی تھی۔ دو کھیس چرخا کاتنے والی مائی سے بنوائے تھے۔ تکیے البتہ اپنے استعمال شدہ تھے۔ روئی دھنوا کر نئے کر دیے گئے تھے۔

گلابی کو بہت ارمان تھا' سنہری ہیل والی سینڈل کے ساتھ سرخ موزے پہنے۔ اب موزے تو مائی بختی لے دیتی' مگر جوتی پورے سات سو کی تھی اور اس کے بجٹ میں دور دور تک اس کی گنجائش نہ تھی۔ اس گھر میں غریبی نہیں تھی۔ غریبی کچھ ہوتا اور کچھ نہ ہوتا ہوتی ہے۔ اس گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ روز کنواں کھودنے والے لوگ۔ کام کر لو تو کھا لو ورنہ منہ باندھ کے بیٹھ رہو۔ کہانی ختم۔ کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں۔

"یہ سوٹ سلائی لگوا کر دوں گی تاکہ اگلا پہن سکے... رب سوہنا خیر رکھے اور اب روٹی کا بندوبست ہو جائے' تو تیرے پیو کے آگے میرا سر اونچا ہووے۔"

مائی بختی نے مطمئن نگاہ صندوق پر ڈالتے ہوئے احتیاط سے بند کر کے تالا ڈال دیا۔ اس کی چال میں غرور تھا۔ گلابی شرم سے لالی بن چکی تھی۔ اس کے نکاح کے سرخ جوڑے کے ساتھ بوسکی کا جوڑا اماں نے جما کر رکھا تھا۔ دونوں رنگوں کا میچ دل میں گدگدیاں پیدا کر رہا تھا۔

"اماں! اڈی والی (اونچی ہیل والی) جتی لے کر نئیں دیوے گی؟" سانولی کو یاد آیا۔ اماں کی پلاننگ میں اس کا ذکر تک نہ تھا۔

"ابھی میں نے سوچا نہیں۔ میٹھے چاول پکانے کا بولا ہے۔ ساتھ آلو گوشت۔ تنے خبر ہے' گوشت ہڈی ملا کر ڈھائی سو روپے کا ایک کلو۔ اب بول! میں کہاں سے پورا کروں؟ پہلے ضروری کم ہوویں' تیں بعد میں اڈی والی جتی کا نام لیو۔" مائی بختی جھنجلا گئی۔

ویاہ گلابی کا تھا اور ارمان سارے سانولی کے۔ اس اڈی والی جتی نے دماغ پکا دیا۔

☼ ☼ ☼

ابھی چار ہی بجے تھے کہ مائی بختی نے آسمان کو دیکھتے ہوئے گھر واپسی کا قصد کر لیا۔ بارش کا مکمل امکان تھا۔ وہ مین روڈ چھوڑ کر بنگلوں والی گلی سے گزرنے لگی۔ سر پر بڑا گٹھڑ' بغل میں جھولا اور ہاتھ میں شیشے کے ڈھکن والا لکڑی کا بریف کیس جس میں زمانے بھر کا سامان بھرا تھا۔ دھاگے' بٹنیں' الاسٹک' سیفٹی پن' کروشیا' اون' دنداسہ' دو نمبر کریمیں' پاؤڈر' کڑھائی کے دھاگے' چھاپے اور فریم' سوئیاں' چھوٹی' قینچیاں اور اس طرح کی ڈھیروں چیزیں۔ یہی مائی بختی کا وہ بزنس تھا جس کے سہارے اس نے بیوگی کے دس سال کاٹے اور دو بیٹیوں کا پیٹ بھر کے آج دانتوں کی گئی بچت کے عوض وہ دھوم دھام سے بیٹی کی شادی کرنے جا رہی تھی۔

یہ ابھی کل ہی کی تو بات تھی' راج مزدوری کرنے والے بخش دین کو جھونپڑی والوں کی بخت بی بی بھا گئی اور نکاح کر کے اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ چڑھتی ندی جیسی ساڑھے پانچ فٹ سے بھی نکلتے قد کی قیامت تھی' جو ہر دیکھنے والی آنکھ کے اوپر گزرتی تھی۔ سانولے رنگ پر بڑی بڑی آنکھیں' یتیم یسیر' نہ آگا نہ پیچھا۔ بخش دین کی مانو دنیا بدل گئی۔ دن بھر اینٹیں ڈھونے اور ریت سیمنٹ ملانے کے بعد جب وہ تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو سنگ اسود سے ترشی مورت جیسے ساری دھول مٹی چاٹ لیتی۔ مرنے کے بعد ملنے والی جنت تو سب کے لیے یکساں ہو گی' مگر دنیا میں ہر کسی کی الگ الگ جنت ہوتی ہے' سو وہ دونوں جیسے جنت میں رہتے تھے۔

دونوں اس لیے کہ بخت بی بی کے لیے بخش دین خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سب سے بڑھ کر تھا۔ ایک غیر متوقع چیز ایک ایسا خواب جو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس نے اس قسم کا سخت ہاتھ پیر والا مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے میکے میں مرد تھڑا اور گانجی پی کر مست رہتے۔ جب پیسوں کی ضرورت ہوتی' سائیکل پر غبارے' مہندی کا عرق' پھونک سے بھرنے والے کھلونے لاد کر گلی گلی نکل جاتے۔ بس اسی روز کے کھانے اور صبح ناشتے کے پیسے دے کر باقی پیسوں سے اپنا بندوبست کر کے غائب۔ مگر یہ ذرا غیرت مند احساس مند مرد تھا۔ کچھ وہ بھی تو تھے جو ادھر ادھر ہاتھ مارتے اور پیالہ منہ کو لگا' دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ ایسے میں عورتیں گھروں سے نکلتیں' چوڑیاں بیچتیں' بھیک مانگتیں' کبھی کسی کا کوئی کام دھام کر دیتیں۔

جنت، بختی کو مل گئی تھی۔ ایک کمرے اور برآمدے والا پکی چھت کا گھر چھت پر پنکھا اور بلب کی روشنی۔۔۔

"ہا!" وہ گول گھوم جاتی۔ بس اب اور کیا چاہیے۔ کیسے مزے کی زندگی ہو گئی تھی۔ صبح سویرے شوہر کو کام بھیج اور اپنے محل کو سجا سنوار، خود نہا دھو تیار ہو کر شام کی ہانڈی روٹی کر کے بخش دین کا انتظار کرتی۔

وہ بخش دین کی گھر والی تھی۔ اس کے یار دوست اسے بھر جائی کہتے۔ بخش دین کی ہدایت پر وہ ان سب سے اپنا منہ چھپاتی۔ دروازے پر پردہ ٹنگا تھا۔ وہ دوپٹے سے گھونگھٹ نکال کر پردے کے پیچھے سے جب کبھی انہیں بخش دین کے نہ ہونے کا بتاتی تو بعد میں اپنے رتبے کا احساس کر کے تفاخر سے گردن اکڑائے گھومتی۔ وہاں جھگی والوں میں تو پردے کا کوئی لحاظ نہیں تھا۔ بختی نے بخش دین کے کہنے سے پہلے ہی جھگی والوں سے خود ہی قطع تعلق کر لیا۔ اللہ نے دو بیٹیاں دیں۔ اس نے انہیں بخش دین کے دوست احباب کے گھر والوں کے چلن کے حساب سے پالنا شروع کر دیا۔ اس کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس کے لیے ابھی تک یہ بھی ایک خواب تھا کہ آٹے کا کنستر خالی ہونے سے پہلے بھر جاتا ہے اور دودھ والا دروازہ بجا، پورا آدھ کلو دودھ۔ "بھابھی جی! دودھ لے لو۔" کہہ کر بصد احترام دیتا ہے۔

بس اب زندگی کو ایک بیٹا درکار تھا۔ اپنے باپ کی طرح اونچا لمبا، مضبوط ہاتھ پیر کا بیٹا جو بڑا ہو کر مستری بنے۔ ہر کسی کا خواب۔۔۔ مگر خواب، خواب ہی ہوتے ہیں۔ دنیا کی جنت چھننے کے لیے ہی ہوتی ہے۔

بینک کی عمارت بن رہی تھی۔ پانچویں منزل پیر بخش دین کا پھسلا تھا اور منہ کے بل بخت بی بی گری تھی۔ روڈ پر سیدھی چلتی مائی بختی کے چہرے پر بوندیں گریں تو وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ سامنے خالی پلاٹ پر گھاس لگی تھی۔ وہ درخت کے نیچے لیٹ کر کچھ دیر ستا لینے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اچانک ایک بچے اور پھر عورت کی یکے بعد دیگرے چیخیں سنائی دیں۔

سے جیسے بچھو نے ڈنک مارا وہ بریف کیس پوری طاقت سے پھینک کر سامنے بھاگی۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز نے بھی قدم نہ روکے۔

تین چار سال کا بچہ اپنی گیند ہوا میں اچھالتا اوپر دیکھتا بڑا مگن آرہا تھا۔ ماں ہاتھ میں جوس لیے اور فون سنتی دو قدم پیچھے تھی۔ سامنے کھلے مین ہول پر تختہ لکڑی دھری تھی۔ بچہ دھڑام سے اندر، چیخ کی آواز پر ماں کے ہاتھ سے موبائل اور جوس زمین پر گر گئے، مگر ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ بختی کے ہاتھ میں ــــ

صرف سامنے کی تین انگلیاں آئی تھیں۔ وہ روڈ پر اوندھی لیٹ گئی اور منہ گٹر کے اندر کر لیا۔ اپنے جسم کی ساری طاقت استعمال کر کے اسے کھینچ رہی تھی۔ جیسے وہ اب تک اس بچے کو بچانے کے لیے ہی تو زندہ تھی۔

اس نے دوسرا ہاتھ اور آدھا دھڑ بھی اندر اتارا ماں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ وہ تیورا کر گرنے کو تھی جب بختی نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا۔

وہ بچہ باہر کھینچ چکی تھی۔ اب وہ روڈ پر کمر کے بل بالکل سیدھی لیٹ چکی تھی اور بچہ اس کے سینے سے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دودھ ہلدی تو میں نے کبھی نہ پیا۔ تمہاری مہربانی اگر جو چائے کا کوپ بنا دے۔ ساتھ وہ گلابی گولی، درداں والی۔ وہ۔۔۔ برو پھن۔"

اس نے کچھ جھجکتے ہوئے بالآخر ملتجی لہجے میں کہہ دیا۔ ننھے حمزہ کی ماں کا بس نہ چلتا تھا کہ اس کے پیر دھو دھو پی ڈالے۔ دس سال کی دعاؤں اور علاج کے بعد ملنے والا اس کا اکلوتا بیٹا۔۔۔ اس سے آگے وہ سوچ بھی نہ پاتی تھی۔ بچے کی صرف ٹھوڑی اور گھٹنے پر خراشیں آئی تھیں اور وہ اب نہا دھو کر ہلکے پیلے نیکر بشرٹ میں اپنی سبز آنکھوں کے ساتھ کوئی گڈا

معلوم ہو رہا تھا۔ حفصہ نے ماسی کو چائے کا کہا اور پھسکڑا مار کے بیٹھی مائی کے پاس اوکڑوں بیٹھ گئی۔

"میں آپ کا نقصان پورا کر دوں گی مائی!"

مائی بختی نے دیکھا۔ نقصان لفظ چھوٹا تھا۔ یہ سانحہ ہوا تھا۔ جاپان کے زلزلے کا نقصان اس کے سامنے کم تھا۔ نو دن بعد ہونے والی شادی، آلو گوشت رئیس کی تلے والی جتی، گھڑی سات سو روپے کی جس کے سنہرے رنگ کی گارنٹی سات سال ہی تھی۔ باوجود ضبط کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سر جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

"آپ روئیں نہیں مائی! میں نے کہا ناں یہ نقصان میں پورا کروں گی، ابھی اسی وقت۔" حفصہ کی اپنی آنکھیں سوج رہی تھیں۔

"گر۔۔۔ اگر۔۔۔ مارا بوت نقصان ہو گیا۔ تمہارے سے کیا پورا ہو گا۔" وہ مایوس تھی۔

"کم از کم کتنا؟ آپ بتائیں تو۔۔۔ میں۔۔۔ میں اپنی جان بیچ کر بھی پورا کروں گی۔" حفصہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

وہ بتانے میں متذبذب تھی۔

"اماں بولیں تو۔۔۔" حفصہ نے بے صبری سے اس کا شانہ ہلایا۔

مائی بختی نے ایک گہری نگاہ سامان پر ڈالی نقصان کا تخمینہ تو اسی وقت لگا لیا تھا، جب وہ بچے کو باہر نکال کر سینے میں بھینچے ہوئے تھی۔

"بولیں اماں!"

"ایک تو یہ۔۔۔ مارے بکسے کا شیشہ پانچ سو کا لگے۔۔۔ اور دوسرا سامان چھ، سات سو کا ہو گا۔" مائی کی آواز گم ہو گئی۔

"ارے اماں! میں دیتی ہوں ابھی۔" حفصہ نے پندرہ سو روپے نکال کر ہاتھ میں رکھے۔ "یہ باقی آپ کی دواؤں کے۔۔۔ میں چار دن بعد واپس اسلام آباد چلی جاؤں گی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو ضرور آئیے گا۔ وعدہ کریں۔" وہ بضد ہوئی۔

اس وقت ہونے والا درد ٹھنڈا ہو کر ہڈیوں میں ایسا گھسا کہ مائی بختی پورے چار روز کام پر نہ جا سکی۔

☆ ☆ ☆

"اب ایسا موقع تو جندگی میں بار بار آوے ناہی (نہیں)۔۔۔ میں عورت ذات، کم عقل۔۔۔ تو تجھے مشورے کے لیے بلا لیا۔ ہاں کر دوں پھر۔۔۔؟" مائی بختی فیصلہ تو کر چکی تھی، مگر بس یونہی۔۔۔

"لڑکا بہت اچھا ہے۔ بڑے بازار ماں وہ جو مشہور دکان ہے لسی کی۔۔۔ وہیں کچوری کا کاریگر ہے۔ دونوں ہاتھوں سے کماوے گا۔۔۔ میں کانی عقل، بلانے گئی کہ بھلے بخش دین مر گیا مگر تمہارے چاچا کا لڑکا تھا۔ تم نے بھلے نہ پوچھا، جینے مرنے پر۔ تمہاری چھوٹی بھتیجی بیاہ رہی ہوں، دین لین کچھ نہیں بس ہاتھ دھرنے کو آجانا۔ ورنہ کوئی ہووے، نہ ہووے دنیا کو کیا فرق۔۔۔؟ لے بھئی! اگلا آگیا دوپہر میں اپنی عورت کے ساتھ۔ کہنے لگا "بڑی کا بھی ساتھ کر دے۔" اب نہ میرے پاس داج نہ دولت۔۔۔ کہتا "ایک روٹی میں دو بار اتیں نبٹا لیں۔ اور اسے کچھ نہیں چاہیے۔" اور تو میری عقل دیکھ! وہ اپنے دکان دار کے چھوکرے سے کہہ کر لڑکے کے بارے میں سب معلومات کروالیں۔ سب نے ایکی زبان بولا "لڑکا ہیرا ہے، ہیرا۔۔۔"

مائی بختی بہت تیز تیز بول کر اپنی حیرت بھری بے تحاشا خوشی بیان کر رہی تھی۔

"لڑکی تو راضی ہو جائے گی ناں ماسی۔۔۔؟" رئیس اب اور کیا کہتا۔

"ارے!" مائی بختی کی آنکھیں پھیلیں۔ "میری لڑکیاں ابھی اتنی دیدہ پھاڑ نہیں ہوئیں۔ یہ تو چلو لڑکا ہے۔ میں راہ چلتے وہ ڈنو کے گدھے سے بھی باندھتی تو اف نہ کرتیں۔ ساری زندگی گھاس پانی دیتیں۔ اب تجھے نہیں دی کیا؟ کچھ بولی میری گلابی؟"

رئیس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کھڑکی سے لگی کھڑی گلابی جو رئیس کو دیکھنے اور سانولی جو اپنی زندگی کا فیصلہ

سننے کی منتظر تھی، روکتے روکتے بھی دونوں ہنسی کی بوچھاڑ روک نہ پائی تھیں۔

"میں گدھا...؟ ماسی...!" رئیس کی سوئی اٹک گئی۔

"ارے! رب نہ کرے..." مائی نے سر پر ہاتھ مارا۔

"تو... تو میرا بیٹا... وہ تو میں نے کہاوت بتائی تھی کہ..."

☼ ☼ ☼

مائی بختی کی قسمت اوج ثریا پر تھی کہاں ایک بیٹی کی شادی کہاں بیٹھے بٹھائے سانولی کا رشتہ آگیا۔ وہ گلابی سے بڑی اور شکل میں کم تر تھی۔ مائی بختی بڑی کی موجودگی میں کبھی چھوٹی کی نہ کرتی، مگر رئیس کا اصرار اور سر سے بوجھ تھوڑا تو کم ہوتا ہی... اس نے جو کچھ سانولی کے لیے جمع کر رکھا تھا، خود بخود بنا کہے سنے گلابی کا ہوا۔

اب مائی بختی آج پھر اپنا سیاہ صندوق کھولے بیٹھی تھی۔ اس کا ارادہ سامان کو آدھا آدھا کرنے کا تھا۔ مگر اب وہ اکڑوں بیٹھی چیزیں دیکھتی تھی اور چہرے پر زردی چھاتی جا رہی تھی۔ اس نے دو ڈھیریاں بنانا شروع کیں۔ وہ ایک چیز ادھر سے کم کرتی، ادھر زیادہ... توازن قائم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"ویسے تو میں نے ساری جندگی اپنے ہاتھوں کی کمائی پر بھروسا کیا... پر کیا ہو جاتا، وہ چھورے کی ماں نپھسر (حفصہ) نقد پیسے ہی دے جاتی۔"

"تو صحیح کہتی ہے اماں!" دونوں نے بے ساختہ ہاں میں ہاں ملائی۔

ہوا کچھ یوں کہ حفصہ دو دن پہلے آکر مائی بختی کو ایک رسید دے گئی۔ ایک دیگ قورمہ، نافتان، نان اور رنگین زردہ اپنی بیٹی کی شادی والے دن وہ رسید دکھا کر حاصل کر سکتی تھی۔ اس نے ایک گفٹ پیک بھی دینے کا وعدہ کیا کہ ابھی تو وہ جلدی میں ہے۔ اس کے بھائی بعد میں دے جائیں گے۔ اب اس میں اللہ جانے کیا ہوگا تینوں نے نہیں سوچا۔ دونوں ماں کے آگے کچھ بول نہیں رہی تھیں، مگر ترازو کا اس اوپر نیچے ہوتا دونوں کو پریشان کر رہا تھا۔

مائی بختی نے جب گلابی سوٹ پر جس کے اوپر ستارے لگے تھے، اٹھا کر سانولی کے آگے رکھا تو گلابی کا رنگ زرد ہو گیا۔

"رہن دے ماں! میرے کالے رنگ پر یہ نہ پھبے گا۔ اس کو تو تو رہنے دے۔" سانولی بروقت بولی۔

"اچھا تو یہ فیروجی رکھ لیتی ہوں۔" مائی بختی نے اگلا ہاتھ بڑھایا۔

گلابی کے دل پر ہاتھ پڑا "اماں! اس نے ملتجی لہجے میں قیفل کھول دی۔ "یہ تتلیاں... مجھے یہ چھاپہ بہوت اماں! اس کو مجھے ہی دینا۔" وہ رو پڑی۔

"تو کیا اب یہ کالا جو رئیس نے فرمائش کر کے بنوایا، اس کو پکڑا دوں؟ بدھی ماری گئی؟ کیا (عقل چلی گئی کیا؟)"

"ہاں... ہاں... دے دے... وہ منّے ہور دلوا دے گا۔"

"اری عقل کی دشمن! اس کے کالے رنگ پر کالا گلاپھ (غلاف) چڑھا دوں... یہ پھر دکھے گی کیسے؟" مائی بختی خود بھی ہار گئی۔ کپڑے ٹرنک میں گھسیڑ کر اسے بند کر دیا۔ اب وہ پھسکڑا مارے خفا سی بیٹھی تھی۔

"اماں! تو نے بھی تو ساری زندگی کالا رنگ پہنا۔" سانولی نے یونہی دھیان بٹانے کو کہا۔

"ارے... یہ میرا کالا رنگ؟" مائی بختی نے گردن جھکا کر اپنے سراپے پر نگاہ کی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اے! کالا رنگ سارے عیبوں کو ڈھانپ لے۔"

"اماں! تیرے کون سے عیب؟"

"جوانی بھی تو عیب ہووے اور رانڈ کی جوانی... دھامن سانپ کے ڈنک سے زیادہ مسہور اور زہریلی ہک ہا۔" مائی بختی جیسے دور کہیں خلاؤں میں کھو گئی تھی۔ انداز خود کلامی کا سا...

"اور رانڈ کی جوانی مرکک کا تار کول ہووے سورج نکلتے ہی گرم ہو کر پگھلے اور شام کو ہولے ہولے ٹھنڈی... جم جاوے... بے جان... ہزاروں دن رات گزریں تب بھی مٹی کے ڈھیر میں نہ بدلے۔ اور..." مائی بختی کی ہتھیلیاں ساکت ہو گئی تھیں۔ وہ جیسے وہاں بیٹھے بیٹھے دور پہنچ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رئیس جی جان سے گلابی پر خرچ کرنا چاہتا تھا، جو بھی گلابی چاہے، مگر واحد رکاوٹ مائی بختی تھی۔ جو اپنے حساب سے سوچتی تھی۔ رئیس اپنا جمع جتھا گلابی کی فرمائشوں کو پورا کرتے ہوئے خرچ کرنا چاہتا تھا، مگر مائی بختی نے رئیس کے گھر کو بغور دیکھا تھا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ گھر کو مرمت کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس نے رئیس کے سر پر کھڑے ہو کر کام کرایا۔ چٹائی خریدی تو رنگین پلنگ بھی۔ ایک کی جگہ دو جوڑے۔

"جب تیرے گھر آئے گی تو لے کر دیتے رہنا۔ اب یہ کہاں کی عقل کہ سوہنا جوڑا بھی سینڈل چڑھا لے اور اٹھنے بیٹھنے کو جگہ نہیں۔ آج کے دن ماری باتاں کنڈے کی طرح لگتی ہیں پر کل دیکھنا۔"

اس نے رئیس کے ساتھ ساتھ گلابی کو بھی عقل دی۔ رئیس کے بڑے اصرار پر ایک سیاہ جالی کا سوٹ خرید آگیا۔ باقی پیسے رئیس کے ایک کمرے کے گھر پر خرچ کر دیے گئے۔ گلابی اور رئیس پوری طرح مائی بختی کے کہنے میں تھے۔ یہاں سب کچھ اس کی سمجھ بوجھ اور منشاء کے مطابق ہو رہا تھا۔

رئیس کا نہ آگا، نہ پیچھا۔ وہ اس کے مرحوم شوہر کے مرحوم دوست کا بیٹا تھا جسے سمجھو مائی بختی ہی نے پالا تھا، مگر سانولی اور رشید کا معاملہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"بس تو نے لڑکی دے دی بہت ہے۔ ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔" دیور نے کہا تھا۔ "نہ ہم تم سے کچھ مانگتے، نہ تم ہم سے کچھ مانگنا۔ ہم نے ابھی عید پر دو لڑکیاں اپنے گھر کی ہیں۔ اب یہ تمہارا ایک روٹی میں دو باراتوں والا معاملہ نہ ہوتا تو ہم تیاری کا سال مانگ لیتے، مگر اب گھر کی بات ہے۔ دو کپڑوں میں لڑکی دے دو۔ ابھی رب خیر رکھے، اوپر کمرا ڈالا ہے اسی رشید کے لیے۔ بڑا محنتی بچہ ہے۔ چھ مہینے میں بھر دے گا سامان سے..."

رشید کی ماں نے ایک سانس میں معاملہ سیٹ کر دیا۔

"اور اپنوں میں کیا لین دین۔" دیور نے بیوی کے کہے پر تصدیق کی مہر لگائی۔

مائی بختی کوئی احمق عورت نہیں تھی، مگر صورت حال۔ سانولی کی کم روئی، وہ گلابی سے پانچ سال بڑی تھی اور مانگنے والوں نے ہمیشہ گلابی ہی کو دیکھا تھا اور سب سے بڑھ کر رشید اچھا لڑکا تھا، وہ بس سہلاتی رہی۔

ادھر گلابی کم عمر اور کچھ کم عقل یا معصوم، نا سمجھ تھی، اسے بخوبی معلوم تھا کہ جہیز کا سارا سامان اماں نے سانولی کے نام پر لیا تھا، مگر سال بھر کے اندر جب اس کی اور رئیس کی تاریخ ٹھہری بغیر کہے وہ سب چیزیں گلابی کی ہو گئی تھیں۔

"نکاح والے روز کا جوڑا تو لائے گی پھر تو...؟" مائی بختی نے رشید کی ماں سے پوچھا۔

"اے کیوں... ہمارے میں لڑکی ماں کے گھر سے تیار آئے گی۔ میں ولیمہ کا لے کر رکھوں گی —— تو دونوں کا ایک جیسا لے لینا۔"

مائی بختی کی آنکھوں میں تفکر ہلکورے لینے لگا۔ وہ رئیس کی کل جمع پونجی سے واقف تھی اور اپنا کھیسا تو خالی تھا ہی۔ وہ گلابی کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی، منہ سے نہ بولی مگر التجا واضح تھی۔

"ماں مجھ سے کچھ نہ لینا۔" گلابی نے ہٹیلے پن سے کہا۔ مائی بختی کو غصہ نہیں آیا۔ آنکھوں میں نمی دوڑ گئی۔

"اماں! چھوڑ دے۔ چاچا کہہ رہا ہے ناں کچھ نہیں چاہیے تو بس ختم۔" سانولی نے بہت تحمل سے کہا۔ مائی بختی نے اسے گلے سے لگا لیا۔ گلابی اچھل کر ماں

بہن سے لپٹ گئی۔
"تو کتنی اچھی ہے سانولی!" وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شادی کا دن بہت خوشیاں اور اطمینان لے کر طلوع ہوا تھا۔ صبح اذانوں کے بعد ہی **حفصہ** کے بھائی کا ڈرائیور ایک گفٹ پیک تھما گیا تھا۔
"رات کو بھول گیا مائی! اسی لیے ابھی لایا ہوں۔" وہ معذرت کر رہا تھا۔
"بی بی سے کہنا اس نے جو کر دیا وہ بھی مارے واسطے بہوت تھا۔ اللہ اسے اور چھورے کو خوش رکھے۔ اب اور نہ کرے۔ انسان کو ایسے ہی لمبی زندگی نہیں ملتی۔ اس کے کام رہتے ہیں۔ میں نہ بچائی تو کوئی اور ہوتا چھورا بہوت جیے گا ابھی۔"
وہ اندر آئی تو دونوں لڑکیاں ششدر تھیں۔ ان کے پاس زرق برق ٹماٹر رنگ کے کپڑے کا ڈھیر تھا۔
آرگنزا نیٹ پر کورا، دبکہ اور نلکیاں (سنہری، سبز، فیروزی) شلوار قمیص، دوپٹہ دو سیٹ چوڑیاں اور... اور... سنہرے رنگ کی نگوں سے جڑی شیشے جیسی ایڑی والی سینڈل۔
"ہا... ام... اماں...!" گلابی کی آواز جیسے پھٹ پڑی۔
"اماں! اڈی والی جوتی... اماں!"
اسے مارے خوشی کے غش آنے والا تھا۔ خوشی، حیرت، مسرت۔ الفاظ نہیں تھے اس کے چہرے کے رنگوں کے بیاں کے لیے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے جوتا اپنے پیر میں ڈالا۔ دوسرا پیر سانولی کے ہاتھ میں تھا، جو اسے یوں دیکھ رہی تھی، جیسے کوئی آفاقی تحفہ گلابی نے جھپٹ لیا... وہ... اس کے پیروں میں پورے آگئے تھے۔ وہ ڈرتے ڈرتے کھڑی ہو گئی۔ اس نے تیزی سے دوپٹا اپنے اوپر ڈالا۔ وہ گھوم گئی۔
"اماں... اماں...!" وہ دیوار میں لگے آئینے میں خود کو دیکھنے کی سعی کرنے لگی جو بس چہرہ دکھا پاتا تھا۔
"میں کیسی لگ رہی ہوں... اماں؟"
"بہوت اچھی!" مائی بختی کی آنکھیں بھی خیرہ تھیں۔ بیٹی کا یہ روپ... وہ اسے گلے لگانے کے لیے بڑھی مگر آگے سانولی کا چہرہ ٹھہر گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی مگر آنکھوں میں جھلملاہٹ تھی۔ خوشی، حیرت حسرت، بے بسی۔
"ٹھہر... گلابی! یہ سانولی کو دے دے۔" اس نے فیصلہ کن آواز لگائی۔
"نن... نہیں... اماں!" گلابی کے جیسے کلیجے پر ہاتھ پڑا۔ "نہ اماں! میں نہ دوں گی، کبھی نہیں۔"
"ہر شے کیا تو ہی لیوے گی۔" اسے غصہ آگیا۔
"مجھے نہیں پتا، یہ مجھے ہی چاہیے۔ وہ باجی میرے لیے ہی دے گئی ہے۔"
"تیرا کیا نام لکھا ہے؟ لا مجھے دے۔"
"نہ اماں نہ۔" گلابی نے پورا سوٹ اور سینڈل بازوؤں میں چھپا لیے۔ لٹکتے پلو کو بھی بغل میں پھنسا دیا، مبادا مائی بختی کھینچ لے۔
"گلابی! میرے ساتھ جور آجمائی (زور آزمائی) نہ کریو۔ میرا آکھیری پھیصلہ (آخری فیصلہ) ہو گیا۔ یہ شگنوں کا جوڑا سانولی کو ہی دوں گی۔"
"اماں! میں نہ دوں گی... اماں..." گلابی نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔
"رہن دے اماں...! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ اسے تو ہی رکھ لے۔ تیرے گورے رنگ پر یہ خوب جچے گا۔" سانولی نے گلابی کے کندھے کو چھوا۔
"ہٹ ہٹ دور..." وہ سمجھی، سانولی سوٹ چھیننے لگی ہے۔ اس کے ہاتھ کو دھکا دیا۔
"بس چھ مہینے اپنی ماں کو دینا۔ تیرے لیے اس سے ڈبل سامان درواجے ماں چھوڑ جاؤں گی۔ قسم مرے بخش دین کی۔" مائی بختی نے سانولی کو اپنے سامنے بٹھا کر تسلی دی اور اپنی شہ رگ کو چھو کر قسم کھائی۔
سانولی ماں سے لپٹ گئی۔ دو تار جڑنے سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ لمس طاقت ور ہوتا ہے۔ وہ لپٹیں تو زار و قطار رونے لگیں۔ گلابی میں بچپنا تھا، مگر دل بھی تھا، وہ ان کے قریب سرک آئی۔
"اچھا، وہ میرا والا سرخ جوڑا تو لے لے... یہ والا..."
اس نے اپنا سوٹ سانولی کی گود میں ڈال دیا۔
"اب چپ کر جا ناں اماں! تو بھی..." وہ جھلائی۔
دونوں بار اتیں آگے پیچھے آگئیں اور لمحوں میں نکاح کا عمل مکمل ہو گیا۔ سانولی نے گلابی کو... اور گلابی نے سانولی کو تیار کرنا تھا۔ دونوں نے قمیص بدل لی تھیں اور دو پیلے بلبوں کی روشنی میں اپنے چہرے پر رنگ مل رہی تھیں۔ گلابی ہر لحاظ سے سانولی پر بھاری تھی۔ وہ اپنے باپ پر پڑی تھی۔ اس کا رنگ گورا گلابی دکھتا تھا اور سانولی مائی بختی کا پرتو لگتی تھی۔ گلابی کے ہاتھ مہندی رچے، عرق لگے میرون ناخن، سرخ پوریں جیسے خون میں ڈبو کر نکالی ہوں۔ دونوں بہنوں کا نقشہ ایک تھا، مگر رنگ کا فرق... اور اور اب پہناوے کا فرق... گلابی کا رنگ سرخی میں... اور سانولی زردی میں بدل رہی تھی۔
دروازہ بج رہا تھا۔ سانولی کی ساس کڑے تیوروں کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ مائی بختی کے چہرے پر حیرت، خوف، شرمندگی کی پرتیں چڑھی تھیں۔ وہ ہاتھ مسل رہی تھی اور ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی۔ دروازہ دوبارہ کھلا تو اندر چاچا اور رشید کا بڑا بھائی اور بہنیں تھیں۔ گلابی نے رخ بدل لیا۔
سانولی نے جلدی سے لینن کا دوپٹا اپنے گرد لپیٹ لیا۔ کچھ انہونی کا احساس... اس کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ ٹانگیں کپکپا گئیں۔ وہ ماں کا چہرہ پڑھنا جانتی تھی۔ اور وہ تحریر... وہ خود کو سہارا دیتی چارپائی کے ڈنڈے پر ٹک گئی۔
"بالکل! کہا تھا اپنوں میں کیا لین دین... نہ ہم کچھ لائیں نہ تم... مگر ایسی ناانصافی۔" چاچا بول رہا تھا۔
"ناانصافی نہ کہو جی! بے ایمانی... بلکہ کھلی بے شرمی... ہم نے تو دھی سمجھ کے سر پر ہاتھ رکھا... کہ چلو بیوہ بھرجائی ہے پر بھتیجی تو ہمارا خون ہے۔ مگر بھئی! حد ہے مکاری کی۔" چاچی قبر پھاڑ کے بولی تھی۔
"ایک تو ہم نے تمہاری کم شکل لڑکی لی... بجائے اسے داج جہیز دے کر بھاری کرتے۔ ساری دنیا کے سامنے ننگی بچی بھیجنے چلی۔ اور تو جی مجھے نہ پتا چلتا تھا وہ کوئی اللہ بھلے کرے پڑوسنیں، ایسے ہی کہنے لگیں۔ "آپ سامان کے لیے سوزوکی تو لائے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "کون سا سامان؟ ہماری اپنی بچی ہے۔ گھر کی عزت۔ سامان کی کیا ضرورت" کہنے لگی "اس چھوٹی کو تو بہت دیا ہے۔" میں نے کہاں یقین کرنا تھا۔ کہتی ہے۔ "یہ چار گھر چھوڑ کر تو رئیس کا گھر ہے۔ آؤ! تمہیں دکھا دوں۔" بس جی! میری تو آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ یہ رنگیلے نواڑی پلنگ تو اوپر کھیس اور موڑھے، برتن بھانڈے۔ میں تو..."
"وہ... وہ سب تو رئیس نے خود بنائے ہیں۔ مارا سامان تو ادھر ہارے پاس ہے ابھی ساتھ۔"
چاچی سانس لینے کو رکیں تو مائی بختی نے منمناتی آواز میں کچھ کہنا چاہا، مگر چاچی دو سانس لے کر دوبارہ فعال ہوئیں۔
"ارے جاؤ... جاؤ! اسی لیے کہتے ہیں شادی جانچ پڑتال کے کرو۔ اب ہم بھی لے کر جا رہے ہیں۔ ایک نمونہ... رب خیر ہی کرے۔" چاچی نے آنکھیں نچائیں۔
"میں چار چھ مہینے میں سب کر دوں گی۔ بس تھوڑا..."
"بعد میں کون دیتا ہے۔ جس نے ویلے پر نہ دیا۔ میں کہے دے رہی ہوں رشید کے ابا! میں نے نہیں اٹھانی ڈولی۔ چھ مہینے بعد ہی اٹھالیں گے۔ سمجھ لو نکاح کرنے آئے تھے۔ ساتھ چھوٹی کی شادی بھی کھالی۔ ارے نہ دیتی، دونوں کو نہ دیتی اور اب ایک کو دے۔ دوسرے کو نہیں۔ توبہ، توبہ میرے کیا ماتھے پر لکھا ہے... پاگل۔"
اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ مائی بختی کے سانولے چہرے پر اچانک بہت سی جھریاں نمودار

ہو گئیں۔ وہ جی دار عورت تھی۔ زمانے کے سرد و گرم جھیلی ہوئی' سخت ہاتھوں والی عورت جو روزانہ لکڑی کا بریف کیس' ایک کپڑے کا جھولا اور سر پر چوڑیوں کا گھڑلے کر توازن کے ساتھ چلتی جاتی تھی۔ آج اس کے وجود پر کوئی وزن نہیں تھا' مگر جیسے منوں بوجھ نے شل کر دیا ہو.... جھکے کندھے... ادھر ادھر ڈولتے قدم ....اب گری کہ تب....

"اور... اماں یہ دیکھو ذرا اس گلابی کے کپڑے اور یہ ہماری بھابھی کا جوڑا... ہونہہ....! دیکھو دیکھو اماں!" بیٹی نے سرخ دوپٹا اور پھر ٹماٹر دوپٹا ماں اور باپ کے سامنے پھیلا دیے۔

"اب کہہ دو! یہ بھی رئیس لایا ہوگا۔ کہہ دو۔" چاچی گلابی کے قریب کھڑی ہو گئی۔

"نہیں! یہ تو.... اماں نے وہ...." گلابی کو کوئی جواب نہ سوجھا۔

"بس! دیکھ لیا تم نے....؟ ارے مجھے بتانا ذرا بخت بی بی! تم نے کس بات کا فرق کیا ہم سے۔ ہیں؟ بس جی! میں نے سنا دیا ہے اپنا فیصلہ ہم اپنا حساب کتاب کر لو رشید کے ابا! میرا اتنا سوہنا پتر ماہر کاریگر۔ اس کے ہاتھ کی پچوری۔ جدھر منہ کرتی لوگ لڑکی گھر چھوڑ کے جاتے' مگر تم ہی نے یہ کالی بلا اس کے گلے باندھ دی۔ ہائے...." وہ باقاعدہ بین ڈالنے لگی۔

"کیا بات ہے؟ کیا مسئلہ ہو گیا اماں...؟" رئیس دولہا بنا اندر آ گیا۔ کھانا لگا تھا۔ وہ خود بھی دولہا تھا' مگر اس نے کسی کے کہے سنے بغیر سانولی کے حوالے سے خود کو میزبان سمجھ لیا تھا۔

سب کے چہرے داستان سنا رہے تھے۔ بس وہ ہی عنوان سے بے خبر تھا۔ بخت بی بی کے بخت کہیں جا سوئے تھے۔ اب وہ منہ سے کیا کہتی' چاچی نے سب کہہ دیا ہو۔

"نہ دیتی تو دونوں کو نہ دیتی۔ اب دیا ہے تو برابر دے۔ میں نہیں پیچھے ہٹنے والی۔"

چاچی نے دو ٹوک فیصلہ سنا دیا اور سب اس کے حامی تھے۔ مائی بختی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چارپائی کے دوسرے ڈنڈے پر مجرموں کی طرح ٹک گئی۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ کیا چیز آدھی کرتی اور کیسے انصاف کرتی۔ دونوں طرف بیٹیاں۔ اور رشید تو گھر کا لڑکا تھا۔ گھر والا ایسے تو نہیں کرتا اور جو سب اتنا آسان لگ رہا تھا' وہ اتنا آسان کب تھا۔

"چلو! تو پھر یوں ہی کر لیتی ہوں نکاح ہو گیا خیر! میں سال کا ٹیم (ٹائم) مانگ لیتی ہوں بہت کچھ بن سکتا ہے۔"

وہ جس علاقے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہاں جہیز کب دیتے ہیں۔ وہاں تو قیمت لگائی جاتی ہے۔ اس نے تو اپنے شوہر کے خواب کے مطابق بیٹیاں رخصت کرانے کا سوچا تھا۔ اس کا دماغ سن ہو رہا تھا' کمرے میں شور بڑھتا جا رہا تھا۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ مگر اس شور میں بھی سانولی کی گھٹی گھٹی سسکیاں اعصاب پر کوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔ وہ بے چارگی سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی سن رہی تھی۔ دیکھنے کی قوت کھو چکی تھی.... اور یوں بھی جو کچھ ہو رہا تھا' اسے دیکھنے کے لیے بینائی ضروری نہیں۔ فیصلے کا اختیار کب دوسروں کے پاس چلا گیا۔ پتا ہی نہ چلا۔ اس نے اپنے کھردرے محنت کش سخت ہاتھ آنکھوں پر رگڑ دیے۔

"رئیس بھائی! سوزوکی بھر گئی۔ اندر کچھ ہے تو دے دو۔" کوئی بہت تیزی سے پکارتا آیا۔ رئیس حق دق کھڑی گلابی کے پاس ٹھہرا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا رکھا تھا۔ گلابی ساکت رہ گئی۔ کیا وہ وہی مانگ رہا تھا' جو وہ سمجھ رہی تھی؟ لیکن یہ سچ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا مان اتنا گہرا اعتماد تھا کہ گلابی کا نفی میں ہلتا سر رک گیا۔

اس نے بڑے ٹرنک کو کھول کر سیاہ سوٹ نکال لیا۔ اپنے پرانے گھر میں استعمال ہونے والے کپڑے فیروزی تتلی والا سوٹ۔ اس نے بھری آنکھوں سے رئیس کے پتھریلے چہرے کو دیکھا۔ وہ

اجازت مانگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی تڑپ اور التجا تھی کہ رئیس نے آنکھوں میں نرمی پیدا کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے صندوق پر تالا ڈال کر چابی سانولی کے سرخ پرس میں رکھ دی۔

"آپ لوگ روٹی پانی شروع کریں بھوک کا وقت ہے۔" رئیس نے ذمے دار میزبان کی طرح ادب سے سب کو یاد دلایا۔

رئیس کا اگلا اشارہ گلابی کے دل کو کچل دینے کے مترادف تھا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ اس کی آنکھیں جھر جھر بہہ رہی تھی۔ سیاہ سرمہ' گالوں کی لالی' ہونٹوں کی سرخی۔ اس نے گریبان کے پاس سے قمیص کو مٹھی میں جکڑ رکھا تھا' پھر اس کا نفی میں ہلتا سر رک گیا۔ اس نے ہمیشہ رئیس کو کن اکھیوں سے مسکراتے اشارہ کرتے' کھنکھارتے دیکھا تھا۔ اتنا حتمی سرد لہجہ' اس نے دوپٹے پر دھرا ہاتھ ڈھیلا کر دیا۔ اسے لگتا تھا اس کا دل بند ہونے والا ہے۔

☼ ☼ ☼

گلابی نے کپڑے بدل کر دوبارہ میک اپ کر لیا تھا' اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ بالکل رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر جیسے نلکا چل گیا ہو۔ اسے اپنا آپ بے جان لگ رہا۔ رخصتی کی گھڑی آ گئی تھی۔ وہ رئیس کے اشارے پر بمشکل خود کو گھسیٹتی دروازے تک آئی۔ سرخ سوٹ میں وہ پیاری لگ رہی تھی۔

اس نے دیکھا رئیس کا خرید انواڑی پلنگ' پیڈسٹل فین' دو موڑھے.... پلاسٹک کا لال ٹب جس کے اندر لوٹا' صابن دانی' برش رکھے تھے' رول کی ہوئی چٹائی۔ وہ سب جو رئیس نے خریدا تھا' وہ سب سوزوکی میں تھا۔ میرون رضائی اور وہ سیاہ صندوق جس پر اس کے باپ کا نام کھدا ہوا تھا۔ اسے سانولی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ میرون شیشوں والی چادر میں ڈھکا تھا۔ سانولی آرائشی دروازے ٹاپنے والی تھی' جب گلابی پر نگاہ پڑی۔ وہ گھر میں پہننے والی پلاسٹک کی لال چپل پیروں میں ڈالے ہوئے تھی۔

"ٹھہر سانولی....!" وہ یکدم چلائی۔ مائی بختی کا دل دھک سے رہ گیا۔ "تو ٹھہر ذرا۔" رئیس نے اچنبھے سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تنبیہہ تھی۔ اس نے ابھی تو اسے تسلی دی تھی' وہ کل ہی اسے تمام چیزیں لا کر دے گا۔ اس نے بتایا تھا' اس کے پاس پیسے ہیں۔ وہ بازار جا کر جس چیز پر ہاتھ رکھے گی وہ لے کر دے گا۔ اس نے اس کا نرم ہاتھ تھام کر اسے تسلی دی تھی۔ اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا۔ چند پیار بھری سرگوشیاں کی تھیں۔ "ابھی سردیاں ہیں پنکھا دو مہینے بعد لے لیں گے اور ایک رضائی اور ایک پلنگ کافی ہے یار...."

گلابی سب بھول بھال شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ سب چلا گیا تھا' مگر رئیس موجود تھا جو دل کا رئیس تھا اور مرد تو اپنے جھوٹے بولوں سے بھی عورت کو بہلا لیتا ہے۔ رئیس تو پھر سچا کھرا انسان تھا اور گلابی کچی عمر کی الہڑ نادان لڑکی تھی۔ پھر پیچھے سے آواز کیوں دی؟

گلابی اگلے پل باہر تھی۔ وہ سانولی کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا مدعا جانتے ہوئے سانولی نے ناسمجھی کے عالم میں پیر اٹھایا تو گلابی نے اس کے پیروں سے سیاہ دوپٹی جوتی اتار لی اور اپنے بغل سے سنہری نگوں جڑی شیشے جیسی ایڑی والی جوتی اس کے سانولے پیروں میں ڈال دی۔ سانولی گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹی مگر اس کی پکڑ مضبوط تھی اور جب وہ کھڑی ہوئی تو رئیس کے بازو میں دبک گئی' مائی بختی اور رئیس نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو اب بھی تھے' مگر وہاں ایک جتاتا احساس بھی تھا۔

پتا نہیں ایثار تھا یا نہیں۔ صحیح کیا یا غلط.... وہ پیچھے بہرحال نہیں رہی تھی۔

امایہ خان

"بیٹی! کوئی ڈائن بھی اپنے بچے نہیں کھاتی۔ زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تجھے یہ دکھ نہ دکھائے۔"

وہ چیخ اٹھی۔ "معاف کردو دادی!" درد زہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔ تین گھنٹوں سے بستر پر پڑی غزالہ کا دم گویا سُولی پر اٹکا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کو توڑتے آگے بڑھتے درد کی شدید لہروں کا پورے جسم میں دوڑنا اس کی دلدوز چیخوں کا موجب تھا۔

چند منٹوں کے لیے جو درد تھما تو وہ بے سدھ ہوگئی۔ آنکھیں بند ہوتے ہی دادی کا چہرہ پھر نظروں کے سامنے آگیا۔ بلکتے ہوئے وہ پھر گڑگڑائی۔ "مجھے معاف کردو دادی.... مجھ سے غلطی ہوگئی۔"

پر معافی کہاں سے ملتی؟ دادی کو گزرے اب چار برس ہونے کو آئے تھے۔ اپنے سر کو پٹختے ہوئے وہ زور زور سے رونے لگی، درد دوبارہ شروع ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اماں کو دودھ دے دیا تھا؟"

کچی مٹی کے برتنوں سے کھیلتے ہوئے اس نے ابا کی آواز سنی، جو اس کی ماں سے مخاطب تھا۔ یہ ایک سوال وہ ہر روز صبح شام باقاعدگی سے پوچھا کرتا۔ اسے دادی کے کھانے پینے کا ہمیشہ خیال رہتا۔ خاص کر دودھ کے دو گلاس جو ناشتے اور رات کے کھانے کے بعد گرم کرکے دینا زرینہ کی ذمہ داری تھی۔ اس کا باپ دلاور یہ بات جانتا تھا کہ اگر وہ خیال نہیں کرے گا تو زرینہ اس میں ضرور کوتاہی برتے گی۔

"کبھی ابا نے ہمارے لیے تو اتنا نہیں سوچا۔ کبھی یہ نہیں پوچھا اماں سے ہمیں.... ان کی اولاد کو دودھ ملایا نہیں؟" اس نے سر جھٹک کر سوچا۔

وہ گھر کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس کے بعد تین بھائی، بہن اور تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ گھر میں کھانے پینے کی تنگی تھی مگر ماں کی دیکھا دیکھی وہ بھی دادی سے چڑنے لگی تھی۔ زرینہ، دلاور کے سامنے تو کچھ نہ بولتی تھی، مگر اس کے جاتے ہی بے چاری دادی کی شامت آجاتی۔

"ہونہہ.... دودھ کے بغیر نہ تو صبح کا ناشتا ہضم ہوتا ہے نہ ہی رات کو نیند آتی ہے۔ میں اپنے بچوں کو دیکھوں یا تمہارے نخرے اٹھاتی رہوں؟"

اپنی ساس کے سامنے ملائی کی پھٹکیوں سے بھرا باسی چکنا دودھ گلاس میں بھر کر دیتے ہوئے وہ ضرور کوئی نہ کوئی دل جلانے والی بات کہتی تھی۔ جس پر دادی شرمندہ سی ہو کر وضاحت دینے لگتیں۔

"بیٹی! میں تو منع کرتی ہوں دلاور کو.... پر اسے ڈاکٹر نے کہا ہے تو...."

"ہاں ہاں معلوم ہے.... ڈاکٹر نے کہا ہے، بڑا آیا۔" زرینہ جل کر کہتی اور خالی گلاس لے کر وہاں سے ہٹ جاتی۔

دادی اب آرام کرنے لگی تھیں، ورنہ پہلے زرینہ کے بہت سے کام وہ بنا کہے خود ہی کر دیا کرتی تھیں۔ باورچی خانے میں اسی طرح ایک دن کام کرتے کرتے دادی پھسل کر گریں اور ٹانگ میں فریکچر ہوگیا تھا۔ ابا نے ان کا شہر کے مہنگے ترین ڈاکٹر سے علاج کروایا تھا۔ اس نے تشخیص کی کہ دادی کی ہڈیاں اندر سے بھربھری ہوچکی ہیں۔ یوں ہلکی سی ضرب یا چوٹ فریکچر کا باعث بن سکتی تھی۔

اسے یاد تھا، ڈاکٹر کے پاس سے واپس آنے کے بعد ابا نے اماں کے سامنے ڈاکٹر کی تمام ہدایات دہراتے ہوئے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ ہر روز صبح ناشتے کے بعد اور رات کو سونے سے پہلے ماں جی کو دودھ گرم کرکے دینا ہے۔ دادی بہت کمزور سی تھیں۔ دبلی پتلی نحیف و نزار۔

وہ پڑوس کی طیبہ کی دادی جیسی بالکل نہیں تھیں، جس نے پورے گھر کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا اور جس کے لڑائی جھگڑوں کا تماشا آئے دن پورا محلہ دیکھا اور سنا کرتا تھا۔ اس کی دادی تو بالکل سیدھی تھیں۔ زرینہ کی کڑوی کسیلی باتوں کا جواب بھی نہیں دیتی تھیں۔

☼ ☼ ☼
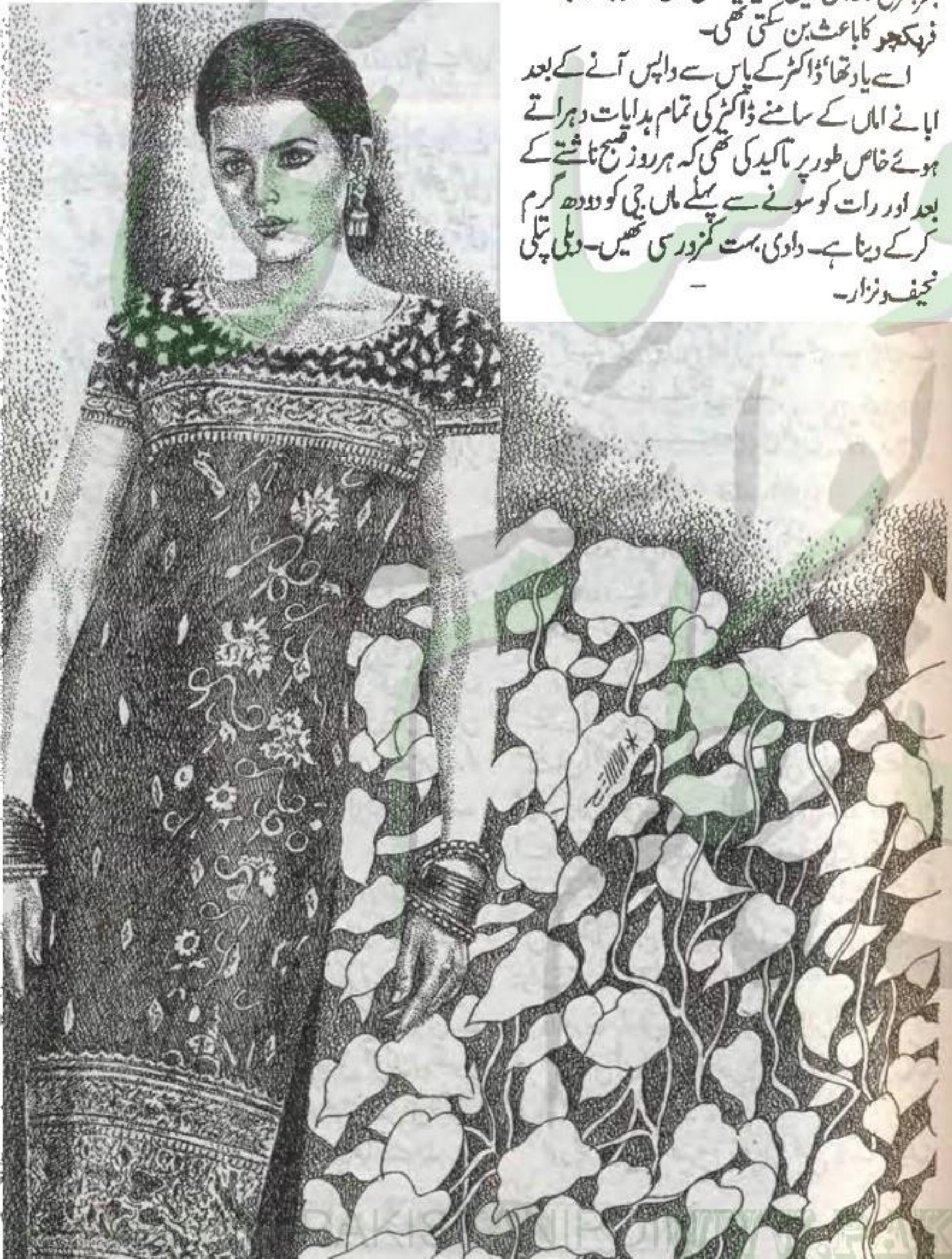
”اماں۔۔۔ دادی کو کیا بیماری ہے؟“ چھوٹے مجو نے سل پر چٹنی پیستی ماں سے سوال کیا تو وہ جل کر بولی۔

”اپنی دادی سے جا کر پوچھ۔۔۔ میرا سر کھانے چلا آیا۔“ مجو ماں کا خراب موڈ دیکھ کر وہاں سے بھاگا اور صحن میں تخت پر بیٹھی دادی کے پاس آ بیٹھا۔

”دادی‘ دادی! بولو نا تمہیں کیا بیماری ہے؟“

”پتر! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں‘ درد رہتا ہے ان میں۔۔۔“

مجو ٹانگیں جھلاتا دادی کے سرہانے تلے ہاتھ مارنے لگا۔ شاید کوئی چونی‘ اٹھنی ہاتھ لگے اور وہ کھٹی میٹھی گولی خرید کر کھائے۔ ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چلتی رہی۔

”کیوں درد رہتا ہے دادی!“ کوئی سکہ تو نہ ملا۔ ایک فوٹو تک ہاتھ جا پہنچا جسے فوراً ہی اس نے باہر کھینچ لیا۔

”میں بوڑھی ہوں نا۔“ مجو نے دادی کے جواب پر غور نہیں کیا اور فوٹو ان کی آنکھوں کے سامنے لا کر پوچھا۔

”یہ کس کی تصویر ہے دادی!“

غزالہ نل کے پاس بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ مجو کے سوال پر اس نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ بچپن میں ماں کے غصے سے ڈر کر وہ دادی سے زیادہ گھلتی ملتی نہیں تھی اور وہی گریز بڑھ کر اب بے زاری میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے دادی کے روتے بسورتے چہرے کو ایک نظر دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

تصویر ہاتھ میں پکڑ کر اپنی عینک درست کرتے ہوئے دادی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ انہوں نے کوئی بھی جواب دیے بغیر مجو کو باہر کھیلنے بھیج دیا اور تصویر واپس سرہانے کے نیچے کھسکا دی۔ ان کے کچھ کہے بغیر ہی غزالہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ تصویر دادی کے ان تین بچوں کی تھی‘ جو کم سنی میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ ولاور ان کی آخری اولاد تھا‘ جسے اللہ نے زندگی دی تھی۔

دادی کہا کرتی تھیں۔ ”اسے میری ساس کی دعا لگی ہے۔ انہوں نے اسے لمبی زندگی کی دعا دی تھی اور کہا تھا کہ اللہ اسے بیٹے‘ بیٹیاں دونوں سے نوازے۔“

”دادی! تم تو میری ماں کے کارنامے بھی اپنی ساس کے کھاتے میں ڈال رہی ہو۔“ اپنی ماں کی دیکھا دیکھی وہ بھی طنز کرنا سیکھ گئی تھی۔

ابا کہتا تھا ”میری ماں نے بڑا سخت وقت دیکھا ہے۔ میرا باپ بہت غریب تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی تنگی تھی۔ ابا ہماری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ ماں نے ہمیشہ اپنے منہ کا نوالہ میرے منہ میں ڈالا ہے۔ اب میرا فرض ہے میں اس کا خیال رکھوں۔“

مگر اپنی ماں کی زبانی وہ کچھ اور ہی قصے سنتی‘ جو ہمیشہ اس کی دادی کو ڈائن کہا کرتی تھی۔

”اپنے تین بچوں کو کھا گئی۔ اب میرے بچوں کے رزق میں حصہ بٹانے آ گئی ہے۔“

اپنی ماں کی رائے سے وہ پوری طرح متفق تھی۔

☼ ☼ ☼

غزالہ ذرا بڑی ہوئی تو ایک دن بیٹھے بٹھائے دادی کو گرم دودھ دینے کی ڈیوٹی ولاور نے اس کے سپرد کر دی۔ وہ بہت سٹپٹائی۔ ”کیا مصیبت ہے۔“

زرینہ نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ اس کی بلا سے۔۔۔ اس کی تو جان چھوٹ گئی تھی‘ پر زبان اب بھی شعلے ہی اگلتی تھی اور پتا نہیں دادی کو غزالہ سے اتنی محبت کیوں تھی۔ وہ جب ان کے پاس سے گزرتی‘ وہ اسے پکڑ کر بٹھا لیتیں۔ کبھی زبردستی بالوں میں تیل ڈال دیتیں‘ تو کبھی آنکھوں میں سرمہ‘ ابا کے سامنے تو اس کا بس نہ چلتا‘ پر ان کی غیر موجودگی میں وہ کوئی سخت سا جواب دے کر وہاں سے ہٹ جاتی۔

ولاور شام کو ماں کے ساتھ وقت گزارا کرتا تھا۔

”ماں جی! میری بیٹی کو گھر بنانے کا گُر بتاؤ۔۔۔ اس کی ماں تو کسی کام کی نہیں۔“

اور پھر دادی کی نصیحتوں کا پٹارا کھل جاتا۔ گھر میں

جمع بے کار سامان اور کپڑے کی کترنوں کو جمع کر کے وہ خود دن بھر جانے کیا کچھ بناتی رہتی تھیں۔ اب اس فضول مشغلے میں ان کا ہاتھ بٹانا غزالہ کے لیے سخت کوفت کا سبب تھا۔ وہ سترہ سال کی ہو رہی تھی۔ جوان لڑکی‘ بات بے بات کھلکھلاتا‘ سکھیوں کے سنگ گلی کے نکڑ پر پارک میں باتوں کی شوقین‘ ہنسی ٹھٹھول‘ بنا سنورنا اور دل تو تتلی بن کر یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا۔۔۔ ایسی عمر میں دادی کی سر پر دوپٹا اوڑھ‘ نظر نیچی کر‘ آہستہ آواز میں ہنس‘ سنگھار نہ کر۔۔۔“ جیسی نصیحتیں زہر لگا کرتیں۔ دن بدن اسے دادی سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر دادی نے ولاور سے اس کی جلدی شادی کر دینے پر زور دینا شروع کر دیا۔ ولاور کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو ہمیشہ ماں کے مشورے پر عمل کرتا آیا تھا۔ اس کے لیے آئے رشتے پر دادی سو جان سے راضی تھیں۔

”لڑکے کی شکل و صورت نہیں دیکھ‘ رزق حلال کماتا ہے‘ دین دار ہے۔ گھرانہ بھی شریف ہے‘ بس اور کیا چاہیے؟“

یوں پہلے ہی رشتے پر اس کی ہاں ہو گئی اور شادی کی تاریخ بھی پکی کر دی گئی۔

”جلد سے جلد بیاہ دو‘ پرائے لوگوں میں سو جھنجٹ کھڑے ہوتے ہیں۔ خوامخواہ بات خراب ہوتی ہے۔“

دادی جیسے جیسے کہتی رہیں ابا ویسے ہی کرتا رہا اور وہ کلستی رہ گئی۔ طیبہ کی منگنی ایک سال رہی۔ کیسے کیسے تحائف بھیجتا تھا اس کا منگیتر۔ ہر ہفتے کی شام بہانے سے پارک میں ملاقات بھی ہوتی تھی۔ بالکل فلموں جیسی رومانوی زندگی۔۔۔ ہائے دادی! یہ کیا کیا تم نے۔۔۔ سارے خواب ہی بکھر گئے۔

چار مہینے بعد ہی اس کی شادی ہو گئی۔ رخصتی پر دادی نے خوب آنسو بہائے۔ وہ سب سے خود گلے ملی پر دادی کے پاس جانے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ان ہی کی وجہ سے تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ دادی اس کے گریز سے بے خبر دعائیں دیتی رہیں۔

پتا نہیں اس کی قسمت اچھی تھی یا دادی کی دعائیں پوری ہوئی تھیں۔

سسرال میں اسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہر طرح کی آزادی تھی۔ ساس‘ سسر محبت کرنے والے اور شوہر بہت خیال رکھنے والا ملا تھا۔ مگر اسے اپنے خواب ٹوٹنے کا ملال کھائے جا رہا تھا۔

چند مہینوں بعد وہ امید سے ہو گئی۔ میکے آئی‘ ماں کو بتایا تو دادی نے بھی سن لیا۔ لگیں چٹا چٹ بلائیں لینے اور ساتھ نصیحتوں کا پٹارا بھی کھل گیا۔ ایسے چلنا‘ ایسے سونا‘ یوں بیٹھنا‘ یہ کھانا‘ وہ پینا۔۔۔ وہ دس منٹ میں ہی عاجز آ کر اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

پہلا بیٹا پیدا ہوا تو سسرال والوں نے تو اسے جیسے پلکوں پر بٹھا لیا۔ محلے بھر میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ ہر کوئی مبارک باد دینے کے لیے آنے لگا۔

دادی بہت کمزور تھیں۔ اسے دیکھنے آ نہیں سکتی تھیں اور خود وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ماں‘ باپ‘ بہن‘ بھائی ان سب سے ملاقات ہو گئی۔ یہ کافی تھا اس کے لیے۔

اس کے شوہر نے چھلا کرنے میکے نہیں بھیجا تھا‘ خود اس کا بھی دل نہیں تھا۔

”ایک دن کو گھر چلی آ‘ ماں جی تیرے بیٹے کو دیکھنا چاہتی ہیں۔“ ابا کے اصرار پر اسے کوئی جواب بن نہ پڑا تو زرینہ بیچ میں کود پڑی۔

”کیا ہو گیا مجو کے ابا۔۔۔ ایسی کیا مصیبت آ پڑی ہے۔ ابھی اسے وہیں رہنے دو۔ ایسی حالت میں باہر نہیں نکلتے۔ پہلوٹھی کی اولاد ہے۔“

”او۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ جاہلوں والی باتیں نہ کیا کر۔“ ولاور ایک دم غصے میں آ گیا۔

”ہاں‘ ہاں میں تو جاہل ہوں۔ تمہاری ماں ہی پڑھی لکھی‘ سمجھ دار ہے۔ پر اس نے بھی یہی کہا تھا مجھ سے‘ جب غزالہ پیدا ہوئی تھی کہ باہر نہ نکلو‘ نظر لگ جاتی

ہے۔" زرینہ ہاتھ نچاتی وہیں پہ شروع ہو گئی۔ دلاور کوفت سے سر جھٹکتا وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے کمرے سے باہر نکلتے ہی زرینہ نے بیٹی کو تاکید کی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے گھر آنے کی' وہیں آرام کر۔ تیرے ابا کو تو خوامخواہ شوق ہے اپنی ماں کے چاہ پورے کرنے کا۔ اپنی اولاد کی ایسی فکر نہیں کرتا۔ تو اپنا خیال کر۔ جب چالیس دن گزر جائیں' تب آجانا ہم سے ملنے۔" غزالہ نے تائیدی انداز میں سے ہلایا۔ خود اس کی بھی یہی مرضی تھی۔

✲ ✲ ✲

"سن! دادی کے پاس اکیلے نہ چھوڑنا... اس کے تو اپنے بچے جیتے نہ بچے... تیرے باپ کو اس کی ساس نے ہی پالا' ورنہ یہ تو اسے بھی کھا جاتی۔ پتا نہیں کون سا سایہ ہے اس پر۔ بچے کو اس کی گود میں ہرگز نہ دینا۔"

وہ دو مہینے کے بچے کو لے کر گھر آئی تھی اور زرینہ نے آتے ہی یہ پٹی پڑھادی۔ وہ کچھ نہ بھی کہتی تو غزالہ کے خیالات بھی یہی تھے۔

"میری گود میں ڈال۔"

"ارے دادی! تمہاری ہڈی کمزور ہے۔ سنبھال نہیں پاؤ گی۔ چوٹ لگ جائے گی اسے بھی اور تمہیں بھی۔"

جب دادی نے بہت اصرار کر کے اس سے بچہ گود میں دینے کو کہا تو ابا کے سامنے اسے یہی جواب سوجھا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے انہیں بچے کی شکل دکھادی تھی' پر گود میں نہیں لینے دیا۔ دادی اس کا جواب سن کر بجھ سی گئیں مگر بچے کے لیے دعائیں مسلسل ان کی زبان سے ادا ہوتی رہیں۔

وہ ہفتہ بھر کے لیے آئی تھی ماں کے پاس' اس دوران محلے کے ہر بچے' بوڑھے نے آکر اس کے بیٹے کو دیکھا بھی اور گود میں بھی لیا' پر دادی... ترستی ہی رہیں۔

✲ ✲ ✲

اس نے ایک لمحے کے لیے بھی بچے کو ان کے پاس اکیلا چھوڑنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ پہلا بچہ تھا' جتنی احتیاط کی جاتی' کم تھا۔ زرینہ محلے کی سیر کو نکلی ہوئی تھی۔ بہن' بھائی اپنے اپنے اسکول میں تھے۔ شام کو غزالہ کا شوہر اسے لینے کے لیے آرہا تھا۔ وہ بیٹے کو سلا کر گھر میں پھیلی اپنی چیزیں اکٹھی کرنے لگی۔ پھر بچے کا سامان بھی پیک کرنے لگی۔ کچھ کپڑے صبح دھلوا کر چھت پر ڈالے تھے۔

"اب تک سوکھ گئے ہوں گے۔ ابھی لے آتی ہوں' ورنہ بھول جاؤں گی۔" بچے کے دونوں اطراف تکیے لگا کر وہ چھت پر کپڑے لینے چلی گئی۔ جب واپس کمرے میں آئی تو دیکھا۔ دادی گود میں بچے کو لیے بیٹھی ہیں۔ وہ چیل کی طرح جھپٹی۔

"کیا کرتی ہو دادی! منع بھی کیا تھا' نہیں اٹھایا جائے گا تم سے۔" اس نے فوراً" اپنا بچہ ان کی گود سے واپس لینا چاہا' پر وہ بچے کا سر تھامے ہوئے تھیں۔

"میں نے پلنگ پر بیٹھ کر اٹھایا ہے اسے... نہیں گرے گا میرے ہاتھ سے غزالہ! تھوڑی دیر لینے دے مجھے۔"

پر وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ بچہ اس چھینا جھپٹی سے گھبرا کر جاگ گیا اور زور' زور سے رونے لگا۔

"رہنے دو! اپنے بچے تو سنبھالے نہیں گئے تم سے۔ ایک ایک کر کے کھا گئیں سب کو' اب میری اولاد کے پیچھے پڑی ہو۔" وہ تنک کر بولی۔ پتا نہیں اس کے لفظوں میں زہر زیادہ تھا یا لہجے میں... پر دادی کو سکتہ ہو گیا۔

وہ زرینہ کے طعنے چپ چاپ سہہ جاتی تھیں مگر غزالہ کے منہ سے نکلے یہ الفاظ سیسے کی سلاخ بن کر کانوں میں اترے۔

"اے بچی تو... تو یہ کہہ رہی ہے...؟ میں اپنے بچوں کو کھا گئی؟" دادی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بھی اس کا دل نہ پسیجا۔

"کوئی ماں اپنے بچوں کو نہیں کھاتی۔ زندگی موت اللہ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تجھے یہ دکھ نہ دکھائے۔" دادی نے بڑے کرب سے کہا تھا لیکن شاید ان کا دکھا ہوا دل' ان کی آنکھوں کے آنسو بددعا بن گئے اور یہ خاموش بددعا اس کی زندگی پر حاوی ہو گئی۔

یہ فقرہ دو سال بعد اسے تب یاد آیا جب وہ اپنے دوسرے بچے کی پیدائش پر پہلے بچے کی موت کی خبر سن رہی تھی۔

دادی اس کے بعد زیادہ دن جی نہیں پائی تھیں۔ چند مہینوں بعد ہی ان کے انتقال کی خبر آئی تو وہ اخلاقاً" اپنے گھر کچھ دن کے لیے آگئی۔ اس کا باپ بہت رو رہا تھا۔

"میرے سر سے دعاؤں والے ہاتھ اٹھ گئے۔"

اس نے بےزاری سے باپ کی طرف دیکھا۔ اب بھلا اس بڑھاپے میں ابا کو دعاؤں کی کیا ضرورت پیش آنے والی تھی۔ تب اسے نہیں معلوم تھا کہ دعا کی ضرورت تو ہر کسی کو ہمیشہ ہی رہتی ہے۔

اسے بھی دعاؤں کی ضرورت پڑی' جب اس کا بیٹا بیمار ہوا۔ نمونیہ ہو گیا تھا اسے۔ دسمبر کی سردی میں سینے میں ٹھنڈ بیٹھ گئی تھی۔ وہ ساتویں مہینے کا آخر تھا۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے ڈیڑھ سال کے بیٹے کو گود میں اٹھائے رہی۔ ڈاکٹروں کے پاس لے جانا' دوا دارو کرنا' راتوں کو اس کے ساتھ جاگنا... مگر بچے کو آرام نہ آیا۔ بخار کسی طور کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

بچے کی پریشانی میں اس کی اپنی طبیعت بھی خراب ہو گئی اور وقت سے پہلے اسپتال بھاگنا پڑا' جہاں ایمرجنسی کے ایک حصے میں وہ تکلیف دہ عمل سے گزر رہی تھی' وہیں دوسری طرف اس کا بیٹا جان کی بازی ہار رہا تھا۔

اور جب اس نے اپنی بیٹی کے پیدا ہوتے ہی اس کے رونے کی آواز سنی' تب ہی اپنی ساس کے بین کانوں میں سنائی دینے لگے۔ اس کا بیٹا مر گیا تھا۔

دادی کے دکھے دل کی آہ اسے لگ گئی تھی۔

گھر میں نومولود بیٹی کو گود میں لیے وہ ڈیڑھ سالہ بیٹے کی میت پر بین کرتے ہوئے دادی کو پکار رہی تھی۔

"دیکھو دادی! میرا بچہ مر گیا۔"

سننے والے سمجھ رہے تھے' اسے اپنی دادی سے بہت محبت تھی۔ وہ سر پٹخ پٹخ کر روتی رہی۔ اسے صبر نہیں آرہا تھا۔ کیسے آتا؟

نو مہینے کوکھ میں رکھ کر' بوجھ اٹھا کر' درد سہہ کر پیدا کرنے والی' سینے سے لگا کر دودھ پلانے والی ماں اپنے بچے کی موت پر جتنا روتی کم تھا۔

پہلی بار اسے دادی کے درد کا احساس ہوا۔ وہ تو تین بار اس صدمے سے گزری تھیں۔

کیسے سہا ہوگا انہوں نے؟

اس کے پاس دادی کے لیے ہمدردی کے دو بول نہ تھے نہ سہی پر یوں وہ ان کا دل تو نہ دکھاتی۔ اس کا کڑوا بول اس کے سامنے آرہا تھا۔

اور یہ محض ابتدا تھی۔

آج چار سال بعد وہ تیسری بار ماں بننے کے عمل سے گزر رہی تھی اور اس کی بیٹی...

ہاں! اس کی دوسری اولاد بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی اور وہ روتے بلکتے اپنی دادی کو یاد کر کے معافیاں مانگ رہی تھی۔

"معاف کردو دادی! مجھے معاف کردو..."

مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لاکھ سر پٹختی' روتی' گڑگڑاتی... اس کی دادی واپس نہیں آسکتی تھی۔ اسے دادی سے معافی نہیں مل سکتی تھی۔ دعائیں دینے والی زبان تو خاموش ہو چکی تھی۔

✲

ناولٹ

راشدہ رفعت
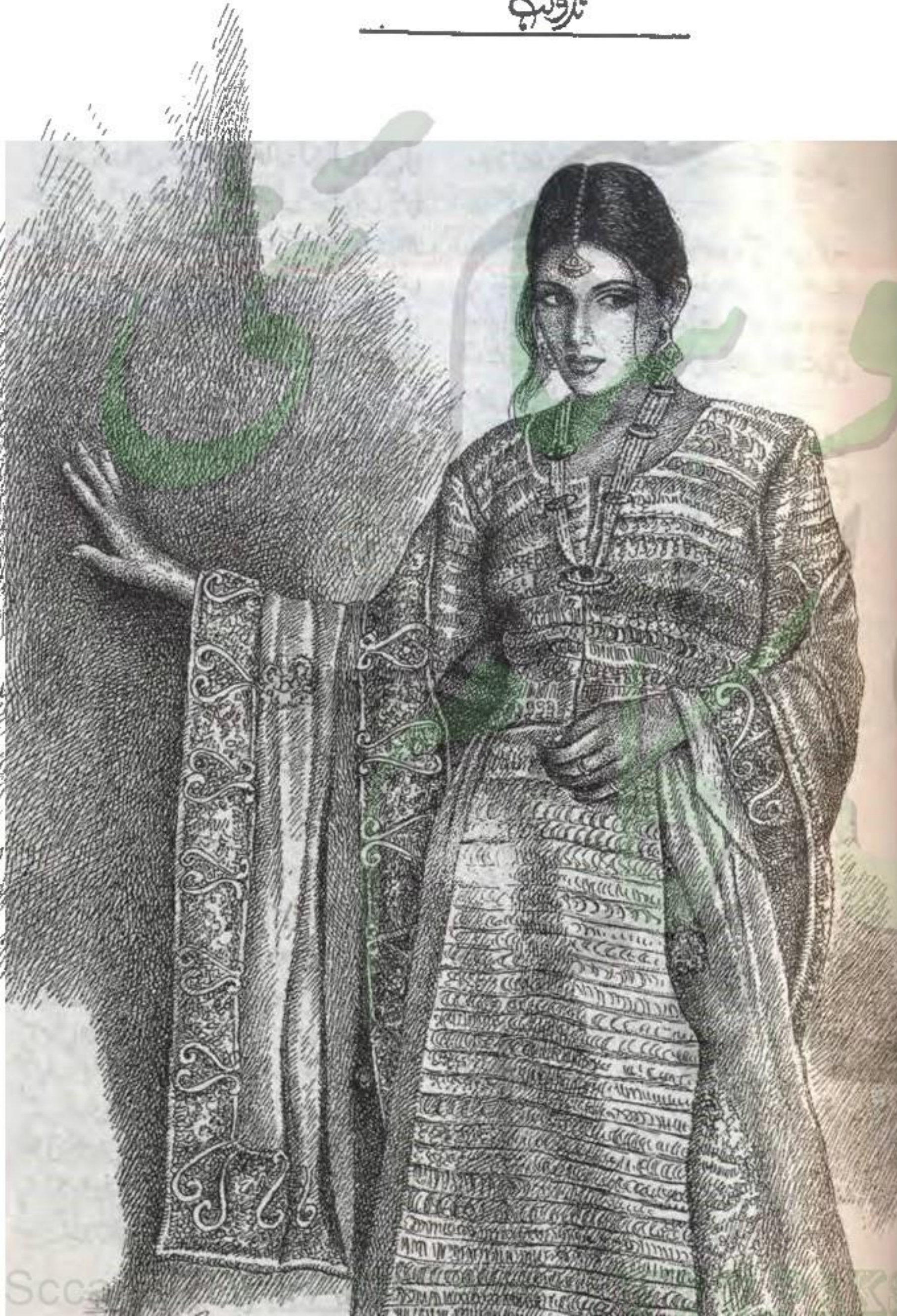
جب عادل اور ماہین ہمایوں کے گھر پہنچے تو وہاں ہمایوں سمیت پوری فیملی تک سک سے تیار لاؤنج میں بیٹھی ملی۔

"ہم غلط وقت پر آگئے' آپ لوگ شاید کہیں جارہے ہیں۔" ماہین ہمایوں کی ممی اور بہنوں سے ملتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

"نہیں بیٹا! کہیں نہیں جارہے' کہیں سے آرہے ہیں' ابھی پانچ منٹ پہلے ہی گھر پہنچے ہیں۔ تم لوگ تو بالکل درست وقت پر آئے ہو اگر پانچ سات منٹ پہلے آتے تو گھر لاک ملتا۔" ہمایوں کی ممی بیگم اخلاق الدین نے مسکرا کر ماہین کو جواب دیا۔

"کہیں آؤٹنگ پر نکلے ہوئے تھے۔" عادل نے مسکرا کر پوچھا۔

"کہاں کی آؤٹنگ عادل بھائی! آپ کے دوست نے ہم سب کی زندگیوں کو مشکل میں ڈالا ہوا ہے۔ آج ان کی وجہ سے ہمارا مسلسل چوتھا سنڈے برباد ہوا ہے۔" ہمایوں سے ایک برس چھوٹی نشا کے ضبط کا پیمانہ آج لبریز ہو ہی گیا۔ وہ عادل کے سامنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے بنا نہ رہ پائی اور جب وہ بولنا شروع ہوئی تو الوینہ اور مائدہ بھی شروع ہوگئیں' اکلوتے بھائی کے خلاف شکایتوں کا ایک انبار تھا جو اس کے بہترین دوست کی سماعتوں میں منتقل کیا جارہا تھا۔

عادل ہمایوں کا بچپن کا دوست تھا' بے تکلفی سے اس کے گھر آنا جانا تھا' دو برس پہلے جب ماہین اس کی زندگی میں شامل ہوئی تب سے وہ بھی شوہر کے ساتھ پندرہ بیس دن میں یہاں کا چکر لگا لیتی تھی۔ ہمایوں کی ماں بہنوں سے اس کی بہت اچھی سلام دعا تھی' ہمایوں کی ممی بیگم اخلاق واقعی بہت اخلاق والی خاتون تھیں ماہین سے ہمیشہ بہت محبت اور شفقت سے ملتیں' یہ ہی اپنائیت ہمایوں کی بہنوں کی جانب سے بھی ملتی جو اگرچہ اب اپنے اپنے گھر بار کی تھیں مگر میکے کا چکر لگاتی رہتی تھیں' سو ان سے بھی اکثر ملاقات رہتی۔ ہمایوں خود بہت ڈیسنٹ اور سلجھا ہوا شخص تھا۔ بیگم اخلاق کی بہترین تربیت کا عکس ان کے بچوں میں جھلکتا تھا۔

ہمایوں خاص طور پر ان کی تربیت کا شاہکار تھا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی' گھر میں روپے پیسے کی فراوانی تھی پھر بھی اس کی شخصیت کسی قسم کے بگاڑ کا شکار نہ ہوئی۔ اس نے اپنی خواہش پر میڈیکل کا پروفیشن اپنایا تھا اور اب تو اسے پریکٹس کرتے بھی تین چار سال ہونے کو آئے تھے۔

عادل اور ماہین کے علم میں تھا کہ آج کل ہمایوں کی ماں' بہنیں اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہی ہیں لیکن رشتے کی بیل کہیں بھی اور کیوں منڈھے نہیں چڑھ رہی' وجہ سے دونوں ہی ناواقف تھے۔ ہمایوں اور عادل کی لاکھ بے تکلفی سہی مگر دونوں ہی ایک دوسرے کی ذاتی زندگی میں مداخلت کے قائل نہ تھے۔ بیگم اخلاق بھی بہت وضع دار خاتون تھیں انہوں نے کبھی ماہین کے سامنے گھریلو مسئلے مسائل ڈسکس نہ کیے تھے لیکن آج ان کی تینوں بیٹیوں کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے بھائی کے خلاف شکایتوں کے انبار لگا دیے۔

ذرا سی دیر میں سارا مسئلہ عادل اور ماہین کی سمجھ میں آچکا تھا۔ ہمایوں میں جذبہ انسانیت کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس کی شخصیت رحم دلی سادگی اور سخاوت کا مرقع تھی اور وہ یہ ہی خصوصیات اپنی شریک حیات میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ ماں' بہنوں کو لاکھ کوششوں کے باوجود گوہر مقصود مل نہ پایا تھا۔

"اب آپ خود ہی بتائیں ماہین بھابھی! ہر کوئی لڑکی کی تلاش کے وقت یہ تین خوبیاں ذہن میں رکھتا ہے لڑکی خوبصورت ہو' پڑھی لکھی ہو اور سلیقہ مند ہو' ہم نے بھی جاننے والوں کو یہ ہی اوصاف بتا کر کسی اچھی سی لڑکی کے بارے میں بتانے کا کہہ دیا۔ میرے سسرال والوں نے' کولیگز نے' دوستوں نے ڈھیروں لڑکیاں گنوا دیں لیکن ہمایوں صاحب کو کوئی پسند ہی نہیں آرہی۔" ہمایوں سے بڑی الوینہ نے بھائی کو شکایتی نگاہوں سے تکتے ہوئے ماہین کو بتایا تھا۔

"موصوف فرماتے ہیں کہ مجھے ظاہری خوبصورتی سے کوئی سروکار نہیں مجھے باطن کی خوبصورتی چاہیے۔" مائدہ نے بھی خفگی بھرے انداز میں کہا تھا۔

"تو یہ مطالبہ کوئی ایسا ناجائز بھی نہیں۔" عادل نے خاموش بیٹھے دوست کی سائیڈ لی۔

"اچھا عادل بھائی! پھر یہ بتائیں کہ باطن کی خوبصورتی کیسے ڈھونڈیں؟ اپنے دوست سے ہی پوچھ کر بتا دیں اتنے قابل ڈاکٹر ہیں' یہ کوئی ایسا ایکس رے الٹرا ساؤنڈ ایجاد ہوا ہے جو باطن کا پتا دے سکے۔ حد ہوتی ہے بھئی۔"

سب سے چھوٹی نشا سب سے زیادہ غصے میں تھی۔ چھ مہینے پہلے وہ بھی پیا دیس سدھار چکی تھی۔ اکلوتے بھائی کی شادی کا ارمان ظاہر ہے تینوں بہنوں کو ہی بہت تھا لیکن بے حد شریف الطبع بھائی نے اس معاملے میں بہنوں کو زچ کر دیا تھا۔

"دنیا کی نظروں میں ہم برے بنتے ہیں کہ لڑکیاں دیکھ دیکھ کر ریجیکٹ کر رہے ہیں۔ اب دنیا والوں کو کیا بتائیں کہ ہمارا بھائی ہی کتنی ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا ہے۔" مائدہ اپنے بچے کو زبردستی تھپکتے ہوئے بولی۔

"تو آخر لڑکیاں ریجیکٹ کس لیے کر رہے ہیں ہمایوں بھائی! کیا انہیں لڑکی دیکھتے ہی اس کے باطن کا اندازہ ہو جاتا ہے۔" ماہین نے اچنبھے سے پوچھا۔

"کیا بتائیں ماہین بھابھی! جو سب سے پہلی لڑکی دیکھی۔ اچھی خوبصورت پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ ہم تو دیکھ کر لڑکی اوکے کر آئے۔ اگلے چکر میں لڑکی والوں کی فرمائش پر ہمایوں بھائی کو ساتھ لے کر گئے۔ لڑکی کے والدین خاصے لبرل تھے۔ ہمایوں بھائی اور اپنی بیٹی کو بات چیت کا موقع بھی فراہم کر دیا۔ باتوں باتوں میں جب لڑکی کو پتا چلا کہ شام کے اوقات میں ہمایوں بھائی جو کلینک چلا رہے ہیں اس سے برائے نام ہی آمدنی ہوتی ہے کہ غریبوں اور ناداروں کے مفت علاج کی شہرت سن کر کلینک پر آنے والے مریضوں کی اکثریت خود کو غریب ظاہر کرتی ہے۔ لڑکی نے خلوص دل سے سمجھانا چاہا کہ اکثر لوگ خود کو مستحق اور ضرورت مند ظاہر کرنے کا صرف ڈرامہ کرتے ہیں اور گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا۔ بس جی گھوڑے نے یہ سننا تھا کہ چائے کا کپ پٹخ کر میز پر رکھا اور ہم لوگوں کو چلنے کا اشارہ کر دیا۔ سچ اتنی خفت ہوئی کہ بتا نہیں سکتے۔"

نشا نے جس طرح منظر کشی کی تھی الوینہ اور مائدہ سمیت عادل وغیرہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"یہ تو ہو گیا ایک کیس' اگلی بار کیا ہوا؟" ماہین نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

"اگلی دفعہ ہم ہمایوں بھائی کو پہلی بار ہی اپنے ساتھ لے گئے تاکہ ان کی جو بھی رائے ہو' پہلی ملاقات کے بعد ہی پتا لگ جائے۔ کسی کے گھر دو' دفعہ جا کر خاطر مدارت کروانا اچھا لگتا ہے کیا۔" اس بار راوی مائدہ تھی۔ عادل اور ماہین اسے محویت سے سننے لگے۔

"اتنی خوبصورت لڑکی تھی ماہین بھابھی کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ اور فیملی بھی ہمایوں بھائی کی شرائط پر پوری اترتی تھی۔ لڑکی کی ماں جانی پہچانی سوشل ورکر ہے۔ ہم بھی اسی چکر میں چلے گئے کہ جذبہ انسانیت رکھنے والا خاندان ہمارے بھائی کا سسرال بن جائے لیکن ان کا چوکیدار اتفاق سے بھائی کا پرانا مریض نکل آیا۔ اس وقت تو لگ رہا تھا کہ بھائی کو بھی لڑکی پسند آئی ہے لیکن شام کو چوکیدار صاحب نے کلینک پر آکر اپنے مالکوں کے متعلق چند قصے سنا دیے کہ لڑکی کا باپ بہت بڑا ذخیرہ اندوز ہے اور ماں بھی صرف دکھاوے کو سوشل ورک کرتی ہے۔ لڑکی ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے اس لیے ضدی اور خود سر ہے۔ کسی کو اپنے آگے کچھ نہیں سمجھتی۔ بس بھائی صاحب فوراً اس چوکیدار کی باتوں میں آگئے۔ بالا ہی بالا خود لڑکی والوں کو انکار کہلوا بھیجا۔"

"خیر مائدہ! اس لڑکی پر تو میرا خود کا دل نہیں ٹھک رہا تھا۔ شرم و حیا اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ اس کی ڈریسنگ یاد ہے تمہیں۔" الوینہ آپی نے بہن کو مخاطب کیا۔

"چھوڑیں آپی! اس وقت تو آپ کہہ رہی تھیں کہ لڑکیوں کی فطرت میں بہت لچک ہوتی ہے۔ شادی کے بعد ہمایوں جس رنگ میں اسے ڈھالے گا ڈھل جائے گی۔" مائدہ نے یاد دلایا۔

"اچھا چلیں' چھوڑیں اس قصے کو۔ آج بتائیں کیا ہوا؟" عادل نے الوینہ کو مخاطب کیا۔

"آج کیا ہونا تھا بھیا۔" الوینہ آپی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میری نند نے بتایا تھا رشتہ' بہت پڑھی لکھی فیملی ہے۔ لڑکی بی اے کر رہی ہے' اتنی ذہین' قابل اور خوبصورت بچی مگر وہ بھی تمہارے دوست کی ناک کے نیچے نہیں آئی۔" الوینہ آپی دل گرفتی سے بولیں۔

"آخر کیوں؟" ماہین پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

"ان کے گھر میں آٹھ' نو سال کی ملازمہ بچی تھی۔ مجھے تو بھیا کی شکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں اتنی چھوٹی بچی کو گھریلو ملازمہ کے روپ میں دیکھ کر سخت شاک پہنچا ہے۔ بلکہ جب لڑکی آئی تو بھائی اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئے۔ پر سوچ نگاہوں سے بچی کو ہی تکے جا رہے تھے' سوچ رہے ہوں گے' کیسے اس بچی کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جا سکے اور بچی بھی شاید بھائی کی نگاہوں سے ہی کنفیوز ہوئی ہوگی جب وہ کولڈ ڈرنک سرو کر رہی تھی تو لڑکی کو گلاس پکڑاتے ہوئے اس کا ہاتھ لرزا اور گلاس چھلک گیا۔ ہمیں تو نظر نہیں آیا لیکن بھائی کو لڑکی کے چہرے کے بگڑے زاویے بھی نظر آگئے اور اسے بچی کو ایڈیٹ کہتے ہوئے بھی سن لیا۔ اب کہتے ہیں کہ وہ تو ہماری موجودگی کی وجہ سے لڑکی نے ملازمہ کو صرف ایڈیٹ کہنے پر اکتفا کیا ہے اگر ہم نہ ہوتے تو یقیناً" تھپڑ بھی جڑ دیتی اسے۔"

نشا نے آج کی روداد بھی سنا ڈالی۔ کمرے میں صرف دو لوگ خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بیگم اخلاق اور ہمایوں اور اب بیگم اخلاق بھی تھکے تھکے لہجے میں بول پڑی تھیں۔

"بات دراصل یہ ہے بیٹا کہ بہنوں کو ہمایوں کی شادی کا زیادہ ہی ارمان ہے اسی لیے ضرورت سے زیادہ شاکی ہوئی بیٹھی ہیں لیکن میرے ہمایوں کی نیچر کا تو تم لوگوں کو اندازہ ہے ہی۔ اس کی فرمائش کچھ ایسی بے جا

بھی نہیں شریک حیات کے حوالے سے اس نے ذہن میں ایک خاص قسم کا خاکہ بنا رکھا ہے اور اتفاق سے جو بھی لڑکیاں ہم نے دیکھیں کوئی بھی اس خاکے پر پوری نہیں اتری۔"

"ممی! میں آپ کو بتائے دے رہی ہوں' اس خاکے پر کوئی پوری اتر بھی نہیں سکتی۔ بھائی کو خدانخواستہ کنوارا ہی رہنا پڑے گا ساری عمر۔" مائدہ کٹھور پن سے بولی تھی۔

"اللہ نہ کرے۔" بیگم اخلاق نے دہل کر اس کی بات کاٹی۔

"تو پھر کہاں سے ڈھونڈیں گی ان کے لیے کوئی مدر ٹریسا۔" نشا نے بھی تنک کر پوچھا تھا۔

"ہمایوں نے آج تک میرے سامنے اپنے شریک حیات کے ممکنہ خاکے کا ذکر نہیں کیا ورنہ آپ لوگوں کو اتنی مصیبت جھیلنا ہی نہ پڑتی۔ میں ایسی ایک لڑکی سے واقف ہوں۔" عادل نے جملہ حاضرین کو مخاطب کیا۔

ردعمل حسب توقع تھا' سب ہی جیسے اچھل پڑے۔ بیگم اخلاق نے بھی بہت اشتیاق سے بیٹے کے دوست کو دیکھا تھا۔ وہ اس سے لڑکی کا نام پتا جاننے کو بے تاب تھیں اور تو اور ہمایوں بھی سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ عادل کو حیرت اور استعجاب سے تک رہا تھا۔

"تمہاری اجازت ہے تو میں بتا دوں ماہین!" عادل نے ماہین سے پوچھا۔ ماہین کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"حیرت ہے عادل! آپ کا دھیان وہاں چلا گیا ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ گھر جا کر آپ سے یہ معاملہ ڈسکس کروں گی لیکن اب آپ نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا تو بتا دیں۔" اس نے شوہر کو اجازت دے دی۔

"فوہ سسپنس کیوں پھیلا رہے ہیں آپ دونوں۔ آخر بتاتے کیوں نہیں کس کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟" نشا نے بے تابی سے پوچھا۔

"ماہین کے خاندان میں بھی تمہارے بھائی جیسا ایک نمونہ پایا جاتا ہے۔" عادل نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ماہین نے اسے گھور کر دیکھا۔

"سوری بھئی۔ بہت اچھی لڑکی ہے درشہوار۔ ماہین کی فرسٹ کزن ان فیکٹ اس کے ماموں کی بیٹی ہے۔ جو خصوصیات آپ کے محترم بھائی جان میں پائی جاتی ہیں' بالکل وہی عادتیں درشہوار کی ہیں۔ ماہین کے ماموں کا اچھا خاصا کاروبار ہے مگر اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کا پرس ہر وقت خالی رہتا ہے۔ ایسا نہیں کہ انہیں جیب خرچ ملتا نہیں۔ ملتا ہے بہت زیادہ ملتا ہے مگر خود پر خرچ کرنے کی نوبت نہیں آتی اور ایسی رازداری سے بنا ڈھنڈورا پیٹے لوگوں کی مدد کرتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔" عادل درشہوار کے متعلق بتانے لگا وہ سب بہت اشتیاق سے اسے سن رہے تھے۔

"شہوار ہمیشہ سے ہی ایسی ہے۔ اسکول میں اور پھر کالج میں بھی مجھ سے دو سال جونیئر تھی' اس لیے مجھے اس کی نیچر کا بہت اچھی طرح علم ہے اور سچ پوچھیں تو وہ مجھے اپنی بہنوں کی طرح ہی عزیز ہے۔ وہ ہے ہی اتنی اچھی۔ اس کی ظاہری خوبصورتی سے کہیں زیادہ اس کے باطن میں خوبصورتی پائی جاتی ہے۔" عادل کے بعد ماہین نے بہت محبت سے اپنی کزن کا تذکرہ کیا تھا۔

"لو بھلا بتاؤ' یہ تو وہ ہی بات ہو گئی۔ بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ ماہین بیٹی! تم نے پہلے اس بچی کے متعلق کیوں نہیں بتایا۔" بیگم اخلاق یہ سب سن کر بہت پرجوش ہو گئی تھیں۔

"سچی بات ہے آنٹی! کہ کبھی ایسا خیال ہی نہیں آیا اور ہمایوں بھائی ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں۔ ہمارا تو یہ ہی خیال تھا کہ ان کی لائف پارٹنر بھی اسی پروفیشن سے تعلق رکھتی ہوگی۔" ماہین نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"ہماری طرف سے تو اجازت تھی کہ یہ خود کسی ڈاکٹر کو ہی پسند کر لے لیکن کہتا ہے کہ اس کی جتنی بھی کولیگز ہیں کیریر کے آغاز میں واقعی دکھی انسانیت کی خدمت کا عزم رکھتی تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ عزم بھاپ بن کر اڑ گیا۔ ویسے تو اس کی اپنی تمام کولیگز سے بہت اچھی سلام دعا ہے لیکن ان میں سے کسی سے بھی شادی پر نہیں مانتا۔" بیگم اخلاق نے بتایا تھا۔

"تو اب ان میں سے بچا ہی کون ہے۔ خیر سے سب کی شادیاں ہو گئی ہیں۔" نشا نے برا سا منہ بنایا تھا۔

"بھابھی! آپ کی بات درمیان میں ہی رہ گئی' آپ کچھ بتا رہی تھیں اپنی کزن کے متعلق۔" اتنی دیر سے خاموش بیٹھے ہمایوں نے چپ توڑتے ہوئے ماہین کو مخاطب کیا۔ اس کی ممی اور تینوں بہنوں نے سرخوشی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ ماہین بھی ہنس پڑی تھی۔

"میں نے آپ کو بتایا نا ہمایوں بھائی! وہ بہت ہمدرد اور پرخلوص لڑکی ہے۔ انتہائی ملنسار اور منکسر المزاج۔ لیکن میری ممانی اس کے لیے فکر مند بھی بہت رہتی ہیں' کہتی ہیں اس کی عادتیں اتنی عجیب و غریب ہیں کہ کوئی نارمل بندہ اس کے ساتھ نباہ کر ہی نہیں سکتا۔ روزانہ شام کو اپنے لان میں ملازموں کے بچوں کو اکٹھا کر کے پڑھاتی ہے۔ پہلے صرف اپنے گھر کے ملازمین کے بچے پڑھنے آتے تھے مگر جب اس رضاکارانہ سروس کی شہرت ہوئی تو اردگرد کے بنگلوں کے سرونٹ کوارٹرز سے بھی بچے آنا شروع ہو گئے اور اب تو بچوں کے ساتھ ان کی مائیں بھی آنے لگی ہیں۔ بچوں کو رسمی پڑھائی کے علاوہ زندگی کی اونچ نیچ بھی سمجھاتی ہے۔ ماؤں کو شعور دینے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اچھائی برائی کی تمیز کیسے سکھائیں۔ اگر کوئی ہنرمند عورت ہوتی ہے تو اسے ممکنہ مالی وسائل فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے لیے باعزت پیشہ اپنا سکے۔ اپنے باورچی کو اپنی دوست کے والد کے ریسٹورنٹ میں اچھی جاب دلوا دی تو گھریلو کام کاج والی ملازمہ کو ایک بوتیک کا کام دلوا دیا۔ ساتھ والوں کے چوکیدار تک کو نہیں بخشا۔ شہوار کی ایک دوست کا بھائی پی ٹی وی پروڈیوسر ہے۔ خان صاحب کو ڈراموں میں کام دلوا دیا۔ اب ہر تیسرے ڈرامے میں وہ ہی چوکیدار گن ہاتھ میں پکڑے گیٹ کھولتے بند کرتے نظر آتے ہیں۔ کام وہی ہے مگر معاوضہ معقول۔"

ماہین نے ہنستے ہنستے بتایا تھا سب بہت دلچسپی سے اسے سن رہے تھے۔ ہمایوں کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"میری ممانی بیٹی کی حرکتوں سے عاجز آئی ہوئی ہیں اور سچی بات ہے کہ ممانی کی فکر مندی بے جا نہیں۔ درشہوار کی "اچھائیوں" کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ہے لوگ اس کے جذبہ انسانیت کو سراہتے تو ہیں مگر کوئی خلوص کے اس مجسمے کو گھر لے جانے کی نہیں سوچتا۔ میں نے بھی آپ لوگوں کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا ہے۔ کہنے کی اور بات ہوتی ہے مگر ایسے لوگ برداشت کا امتحان بھی بہت لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ زندگی گزارنا خاصا صبر آزما کام ہوتا ہے۔" ماہین نے صاف گوئی سے جتا دیا تھا۔

"تو ہمارے بھائی کے ساتھ زندگی گزارنا کب آسان ہے۔ ان کے ساتھ کوئی ایسی ہی لڑکی گزارہ کر سکے گی۔ آپ بس ہمیں درشہوار کے گھر لے جائیں۔" الوینہ بے صبری سے بولی تھی۔

"ہاں بیٹے! تمہارا ہم سب پر بڑا احسان ہوگا اگر تمہارے تعاون سے یہ مشکل مرحلہ سر ہو جائے گا۔ وہ بچی بالکل میرے ہمایوں کی ہم مزاج معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے گھر آ کر اسے قطعاً" کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ روپے پیسے کی ماشاء اللہ کوئی کمی نہیں۔ ہمایوں کے ابو کا پھلتا پھولتا بزنس ہے۔ اس کی بہنیں اپنے گھربار کی ہیں اور میں دعوا تو نہیں کرتی مگر اتنی سخت دل میں بھی نہیں۔ اگر ہمایوں کا نصیب اس بچی سے جڑ جاتا ہے تو دونوں کا سوشل ورک میری روک ٹوک کا شکار نہیں ہوگا بلکہ میری تو آخری عمر ہے' اچھا ہے اپنے بچوں کے ساتھ کچھ نیکیاں میں بھی سمیٹ لوں۔" بیگم اخلاق کا جوش بھی دیدنی تھا۔

"دھیرج آنٹی! آپ لوگ تو ایسے پرجوش ہو گئے ہیں جیسے ہمایوں اور شہوار کا رشتہ پکا ہی ہو گیا ہو۔ آپ ایک بار شہوار کو دیکھ تو لیں۔" عادل ہنسا تھا۔

"ہمیں آپ پر اعتبار ہے عادل بھائی! آپ نے درشہوار کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ سچ ہی ہوگا اور یہ ہی ہمارے بھائی کی ڈیمانڈ ہے انہیں ظاہری حسن درکار

ہی نہیں' سو وہ جیسی بھی ہوں گی ہمیں قبول ہے۔" نشا بول اٹھی تھی۔

"خیر بہت پیاری ہے میری بہن۔ ظاہر اور باطن دونوں کا حسن رکھتی ہے۔" ماہین نے تفاخر سے بتایا۔

"تو پھر آپ کب لے کر چل رہی ہیں ان کے گھر۔" مائدہ نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

"آج ہم آپ لوگوں کو اریج کی سالگرہ میں انوائٹ کرنے آئے تھے۔ پرسوں اریج کی سالگرہ ہے۔ ماموں کی فیملی بھی آئے گی۔ ایک ملاقات ہمارے گھر کر لیجئے گا اگر بات کچھ بنتی نظر آئے تو ایک دوسرے کو خود ہی اپنے اپنے گھر انوائٹ کر لیجئے گا۔"

عادل نے رسانیت سے جملہ حاضرین کو مخاطب کیا۔ اریج' عادل اور ماہین کی بیٹی تھی اور آج وہ اسے اس کی نانو کے ہاں چھوڑ کر عزیز و اقارب کو اس کی پہلی سالگرہ میں انوائٹ کرنے نکلے ہوئے تھے۔ ہمایوں کا گھر پہلا گھر تھا جہاں وہ آئے تھے اور یہاں آنے سے پہلے دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اریج کی سالگرہ کا بلاوا پس پشت چلا جائے گا اور ان کی اتفاقیہ آمد ہمایوں اور در شہوار کے ملن کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ اریج کی سالگرہ میں دونوں خاندانوں کی بہت بھرپور ملاقات رہی تھی۔ ماہین ماموں' ممانی کو پہلے ہی ان کی خواہش سے آگاہ کر چکی تھی۔ دونوں میاں بیوی نے ہمایوں کی شان میں بہت سے قصیدے بھی پڑھ دیے تھے۔

سالگرہ والے دن اگرچہ ہمایوں نہیں پہنچ پایا تھا۔ اس کے کلینک میں کوئی ایمرجنسی کیس آگیا تھا لیکن اس کی ممی اور تینوں بہنیں در شہوار کے ممی' پاپا سے بہت گرمجوشی سے ملیں۔

در شہوار بھی شرمائی شرمائی سی اپنی ممی کے ساتھ بیٹھی رہی۔ ماہین نے اسے بھی ہمایوں کے متعلق بریف کر دیا تھا۔ ایسے ہی شریک حیات کا تصور اس نے کب سے اپنی پلکوں پر سجا رکھا تھا۔ ہمایوں کی ممی اور بہنیں اس سے جتنی محبت سے ملیں اس سے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے اسے پہلی نگاہ میں ہی سند قبولیت بخش دی ہے۔ اریج کی سالگرہ کا فنکشن اختتام کو پہنچا تو بیگم اخلاق نے بہت اصرار سے در شہوار کے والدین کو اگلے ہی روز اپنے گھر ڈنر پر انوائٹ کر لیا۔ ان لوگوں کے انداز و اطوار سے لگتا تھا کہ وہ واقعی ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں۔

"پہلے آپ لوگ ہماری طرف چکر لگایئے۔" در شہوار کی ممی نے مسکرا کر انہیں دعوت دے ڈالی۔

"دیکھیے بہن! ماہین اور عادل آپ لوگوں کو ہماری خواہش سے آگاہ تو کر ہی چکے ہیں۔ اس لیے ہم رسمی کارروائیوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ آپ کی بچی ہمارے من کو بہت بھائی ہے۔ اب آپ لوگ آکر میرے ہمایوں کو بھی دیکھ لیں اگر آپ لوگوں کو ہمارا بچہ پسند آتا ہے تو پھر میں ایک ہی دفعہ آپ کے گھر آؤں گی وہ بھی شادی کی تاریخ لینے اور اگلی بار اپنی بیٹی کو لینے۔" بیگم اخلاق نے بہت محبت سے در شہوار کو دیکھا تھا۔

"یہ سب اتنا فوراً" کیسے ہو سکتا ہے۔" در شہوار کی ممی بوکھلا گئی تھیں۔

اکلوتی بیٹی سے انہیں لاکھ شکایتیں سہی مگر اتنے مختصر نوٹس پر اپنے جگر کے ٹکڑے کو کسی کے سپرد کر دینا آسان کب ہوتا ہے لیکن اگلی شام جب وہ اپنے شوہر اور عادل' ماہین کے ساتھ ہمایوں والا ڈنر پر پہنچیں تو ہمایوں سے ملاقات کے بعد انہیں اس کی ممی کی بات ماننی پڑ گئی۔ ایسا ہیرا لڑکا ان کا داماد بننے جا رہا تھا' سوچنے کے لیے وقت مانگنا انہیں رسک لگا۔ عادل اور ماہین اس کے متعلق ہر طرح کا اطمینان پہلے ہی دلا چکے تھے۔ ظاہری طور پر بھی یہ ایک آئیڈیل رشتہ تھا۔ ان کی سرپھری بیٹی یقیناً" اس ہمدرد اور ملنسار سے شخص کی سنگت میں بہت خوش رہے گی۔ ایسے اچھے لڑکے کو رشتوں کی کیا کمی ہونی تھی۔

وقت رخصت انہوں نے ہمایوں کی ممی کو مثبت عندیہ دے دیا۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو گئیں ان کی چھوٹی بیٹی بھاگی بھاگی اندر گئی اور مٹھائی کا ڈبہ لیے پورچ میں آگئی۔ ہنستے ہنستے انہوں نے منہ میٹھا کیا اور ہمایوں کی ممی کو ایک بار پھر اپنے ہاں لنچ کی یاد دہانی کروا کر رخصت ہو گئیں۔ ہمایوں کی ممی قول کی سچی نکلیں۔

در شہوار کے گھر پہلی بار جانے پر ہی انہوں نے شادی کی تاریخ مانگ لی۔ وہ لوگ بھی اب اپنا ذہن بنا چکے تھے سو ان لوگوں کی خواہش پر اگلے مہینے کی تاریخ دے دی گئی۔

در شہوار یہ معاملہ اتنی تیزی سے نمٹ جانے پر کچھ حیران پریشان تھی۔ اس نے ہمایوں کی تصویر تک نہ دیکھی تھی۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ایک بار ان کے گھر آیا ضرور تھا لیکن اس روز در شہوار اپنے مالی بابا کی بیٹی کے نکاح میں شریک تھی' سو دونوں کی ملاقات نہ ہو پائی۔ خیر اسے ہمایوں کی ظاہری شخصیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔

ماہین نے اس کی نیچر کے متعلق جو کچھ بتایا تھا۔ یہ سن کر وہ ہمایوں اخلاق کو اوکے کر چکی تھی۔ مگر پھر بھی دل کے کسی نہ کسی گوشے میں اسے دیکھنے کی تمنا ضرور موجود تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنا اکلوتا ہونا کھلا تھا۔ کوئی بہن ہوتی تو اسے ہمایوں کی تصویر تو دیکھنے کو مل جاتی۔

ماہین آپی سے اس کی لاکھ بے تکلفی سہی مگر یہ معاملہ ایسا تھا کہ کچھ کہتے ہوئے جھجک آڑے آجاتی سو یہ طے تھا کہ اسے ہمایوں اخلاق سے مسز ہمایوں بننے کے بعد ہی ملنا پڑے گا۔ ادھر ہمایوں کا حال بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ در شہوار کو بنا دیکھے ہی اس کے اوصاف کی بنا پر دل پسندیدگی کی سند دے چکا تھا مگر اسے دیکھنے کی فطری خواہش دل میں موجود تھی۔

اس کی تینوں بہنیں زور و شور سے شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ انہیں خیال تک نہ آیا کہ بھائی کو اس کی بیوی کی جھلک ہی دکھا دیں' چاہے وہ تصویری جھلک ہی کیوں نہ ہو۔ خیر اب شادی میں تھوڑا ہی عرصہ باقی تھا۔ ہمایوں نے در شہوار کو دیکھنے کی خواہش دل میں ہی دبالی تھی۔ لیکن اس روز قسمت نے اسے در شہوار کو دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا۔

وہ عادل سے ملنے گیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ماہین کی مزاج پرسی کرنے گیا تھا۔ کچھ دنوں سے ماہین کی طبیعت ناساز تھی۔ دو دن پہلے شام کو عادل ماہین کا چیک اپ کروانے اس کے کلینک آیا تھا۔ موسمی بخار اور فلو نے ماہین کو خاصا نڈھال کر رکھا تھا۔ ہمایوں نے دوا تو دے دی سوچا تھا اگلے دن گھر جا کر اس کا حال احوال لے گا مگر ان کے گھر جانے کی فرصت اسے دو دن بعد میسر آئی تھی۔

ماہین خاصی نازک مزاج لڑکی تھی۔ اب طبیعت صحیح تھی مگر پھر بھی وہ نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ عادل کی زبانی پتا چلا کہ ماہین اور اریج دونوں اس وقت سونے کا شغل فرما رہے ہیں۔

"میں تو بھابھی کا ہی حال پوچھنے آیا تھا۔ پھر چلتا ہوں ایک اور جگہ جانا ہے۔" ہمایوں نے عادل کو مخاطب کیا۔

"چائے کا کپ ملنے کی امید نہیں تو فوراً" ہی چلنے کی ٹھان لی۔" عادل نے اسے گھورا تھا۔

"ظاہر ہے بھابھی سو رہی ہیں اور تیرے ہاتھ کی بدمزا چائے پینے سے بہتر ہے کہ کسی ایسی جگہ جایا جائے جہاں اچھی سی شام کی چائے کا اہتمام ہو۔ باسط کی طرف جا رہا ہوں۔ بہت دن ہو گئے اس کی طرف کا چکر لگائے ہوئے۔ اس بے چارے کو تو میری شادی کا بھی علم نہیں اگر ڈائریکٹ شادی کا کارڈ لے کر پہنچا تو وہ میرا سر پھاڑ دے گا۔" ہمایوں نے اپنے اور عادل کے ایک اور مشترکہ دوست کا نام لیا تھا جو قریب کی رہائشی کالونی میں ہی رہائش پذیر تھا۔

"میں تو سوچ رہا تھا' تجھے در شہوار کے ہاتھ کی چائے پلوا دوں لیکن ٹھیک ہے اگر تجھے جلدی ہے تو کوئی بات نہیں۔" عادل معنی خیز انداز میں ہنسا تھا۔

"در شہوار؟ وہ آئی ہوئی ہیں کیا۔" ہمایوں ایک دم خوشگوار احساسات میں گھر گیا تھا۔

"ہاں ماہین کی طبیعت خرابی کا پتا چلا تو حال پوچھنے آگئی۔ ماہین صاحبہ نے بھی اس کی ہمدرد فطرت کا فائدہ اٹھایا اور اسے رات کے لیے سالن بنانے کا کام سونپ دیا اور خود لمبی تان کر سو گئیں۔ تو بیٹھ میں اسے چائے کا کہہ آتا ہوں۔" عادل نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"رہنے دے نا۔ کیا زحمت دینی' چائے کی کوئی اتنی

خاص طلب بھی نہیں۔" ہمایوں نے اسے منع کرنا چاہا۔

"اوئے ہوئے ابھی سے اتنا خیال۔" عادل نے اسے چھیڑا۔ وہ جھینپ کر ہنس پڑا۔

"بیٹھ جا۔ درشہوار بہت اچھی چائے بناتی ہے اور جب وہ ماہین کی خاطر کچن میں گھس کر کھانا بنا سکتی ہے تو اپنے ہونے والے میاں کو ایک چائے کا کپ نہیں بنا کر دے سکتی اور گھامڑ! اسے تو اس سے دلی مسرت حاصل ہوگی۔"

"اس کی دلی مسرت کا اتنا خیال ہے اور اپنے دوست کے دل میں دبے ارمان کا تجھے کچھ خیال نہیں۔" ہمایوں کے دل میں اچانک ایک خیال آیا تھا اس نے لہجے میں کچھ حسرت سموتے ہوئے عادل کو مخاطب کیا۔

"کون سا ارمان۔" عادل نے حسب توقع حیرانی کا اظہار کیا۔

"یار! میں اپنی ہونے والی بیگم کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔" ہمایوں نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔

"بمشکل کام ہے بھائی میرے۔" عادل نے نفی میں گردن ہلائی۔

"کیوں یار! ایک نگاہ تو ڈال ہی سکتا ہوں۔ اس کی تو شریعت بھی اجازت دیتی ہے۔"

"مگر میری بیوی تو اجازت نہیں دیتی نا' وہ بظاہر بہت آزاد خیال ہے مگر اس کے اندر سولھویں صدی کی کوئی قدامت پسند روح بنا کرایہ ادا کیے مقیم ہے۔ حالانکہ ہم دونوں کی تو پسند کی شادی تھی پھر بھی شادی سے دو' ڈھائی مہینے پہلے اس نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا تھا اور ایک مہینے پہلے تو فون پر بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ ماہین کا خیال ہے کہ جو میاں بیوی شادی سے پہلے ایک دوسرے سے ملتے رہیں تو شادی والے دن دولہن پر روپ نہیں چڑھتا اور برادرم! آپ کی شادی میں تو جمعہ جمعہ آٹھ دن رہ گئے ہیں۔ ماہین کو پتا چلا کہ میں نے تمہاری ملاقات ارینج کروائی ہے تو وہ مجھ پر چڑھ دوڑے گی سو میری طرف سے تو معذرت۔" عادل نے کہا تھا۔

"میں آپ سے ملاقات ارینج کرنے کا کہہ بھی نہیں رہا۔ میں صرف اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں اور اگر آپ تعاون کریں تو سوتی ہوئی ماہین بھابھی کو علم بھی نہیں ہو سکے گا۔" ہمایوں چبا چبا کر بولا تھا۔ عادل کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! کچن کے پاس سے چکر کاٹ کر آجائیں درشہوار ہانڈی بھون رہی ہوگی لیکن خبردار کچن کے اندر جانے کی کوشش نہ کرنا۔ ایک جھلک کو ہی بہت جاننا۔ پروین برتن دھو رہی ہے۔ ماہین کی پکی جاسوسہ ہے اسے پل پل کی رپورٹ دیتی ہے حتیٰ کہ اسے یہ بھی بتا دیتی ہے کہ اس کی غیر موجودگی میں' میں نے کون سے ٹی وی چینل دیکھے اور فون پر کس سے گپیں لڑائیں۔"

"نئی ملازمہ رکھ لی کیا؟" ہمایوں نے اچنبھے سے پوچھا۔ عادل کے ہاں برسوں سے ایک بوڑھی ملازمہ کام کرتی تھی۔ ہمایوں اس سے بخوبی واقف تھا۔

"ہاں' اماں رحیمہ کی بہو ہے۔ اماں رحیمہ بہت بوڑھی ہوگئی تھیں۔ اتنی انسانیت تو ہم میں بھی ہے۔ انہیں ریٹائر کر دیا۔ بدلے میں ایک اچھے پیکج پر ان کی بہو کو ہائر کر لیا۔" عادل نے تفصیل بتائی تھی۔

"اوکے اوکے۔ میں صرف کچن کے آگے سے گزر کر آجاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔"

ہمایوں نے اسے تسلی دی تھی اور چند لمحوں بعد وہ کچن کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ پہلی نگاہ برتن دھوتی پروین پر پڑی تھی۔ عادل کی باتوں سے کسی تیز طرار سی ملازمہ کا تصور ذہن میں ابھرا تھا لیکن وہ تو بہت نازک اندام سی لڑکی تھی۔ کہیں سے بھی شادی شدہ نہ لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی ملاحت اور دلکشی تھی لیکن یہ وقت پروین پر غور و فکر کا نہ تھا۔ ہانڈی بھونتی درشہوار کہیں زیادہ توجہ کی متقاضی تھی ہمایوں اسے دیکھتا ہوا دبے پاؤں وہاں سے گزر گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر دونوں میں سے کسی کی نگاہ ہمایوں پر نہ پڑی تھی لیکن درشہوار کی ایک جھلک دیکھ کر ہمایوں کے اندر سناٹا سا اتر گیا تھا۔ وہ چہرے پر زبردستی کی

بشاشت اور مسکراہٹ سجاتا ہوا عادل کے پاس واپس آیا تھا۔

"ہاں جناب! ہو گیا دیدار یار۔" عادل نے شوخی سے چھیڑا۔

"ایک جھلک دیکھی ہے بمشکل۔"

"اچھا بیٹھ۔ میں تو تجھے ویسے ہی تنگ کر رہا تھا۔ میں درشہوار کو بلاتا ہوں۔ تھوڑی دیر گپ شپ لگا لو۔" اس کے چہرے پر پھیلے مایوسی کے سائے عادل کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پائے تھے وہ اس مایوسی کو ملاقات کی تشنگی پر محمول کر رہا تھا سو اسے مزید ستانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اس نے اسے درشہوار سے ملوانا چاہا تھا لیکن اس بار ہمایوں نے معذرت کر لی۔

"میں بھول گیا تھا یار! ایک پیشنٹ کو ٹائم دے رکھا ہے۔ دیر ہو رہی ہے چلتا ہوں۔"

عادل ارے' رے ہی کرتا رہ گیا تھا مگر ہمایوں نہ رکا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر عادل مزید کوئی قیافے لگائے۔ وہ ہرگز اچھا ایکٹر نہ تھا اگر عادل کے پاس چند منٹ کے لیے بھی بیٹھ جاتا تو وہ اس کے تاثرات دیکھ کر بھانپ سکتا تھا کہ ہمایوں اخلاق درشہوار کو دیکھ کر کچھ اپ سیٹ ہو گیا ہے۔

ہمایوں خود اپنی ذہنی کیفیت کو سمجھ نہ پا رہا تھا۔ ظاہری حسن کبھی بھی اس کی ترجیح میں شامل نہ تھا پھر کیوں سانولی رنگت اور عام سے نین نقش والی درشہوار کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا تھا۔ کیا وہ آج تک خود کو فریب دیتا آیا تھا کہ ظاہری خوبصورتی سے زیادہ اسے باطنی خوبصورتی سے سروکار ہے یا پھر ماہین کی زبانی درشہوار کی خوبصورتی سے متعلق سن کر اس نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ بنا لیا تھا اور جب درشہوار اس خاکے پر پوری نہ اتری تو اسے شاک لگا۔

وہ الجھتے ہوئے خود سے ان سوالوں کے جواب چاہ رہا تھا مگر کبھی کبھار انسان اپنے آپ کو سمجھنے سے بھی قاصر ہو جاتا ہے یہ ہی حال اس وقت ہمایوں اخلاق کا ہو رہا تھا۔ ہاں اسے ماہین پر بھی غصہ آ رہا تھا اس نے غلط بیانی سے کام کیوں لیا۔ کتنے تفاخر بھرے انداز میں

اس نے کہا تھا۔ میری بہن ظاہر اور باطن دونوں کی خوبصورتی رکھتی ہے۔

ایک ماں کے بارے میں تو سن رکھا تھا کہ اسے اپنی اولاد دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے لیکن ایک کزن اپنی ماموں زاد بہن کی محبت میں اتنی غلط بیانی سے کام لے گی۔ یہ ہمایوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہمایوں الجھی الجھی کیفیت میں گھر لوٹ آیا۔ شکر ہے ممی گھر پر نہ تھیں یقیناً" کسی نہ کسی بیٹی کو ساتھ لے کر شاپنگ پر ہی نکلی ہوئی تھیں۔ ہمایوں شکر کا کلمہ پڑھتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کو ممی نے ڈنر کے لیے اسے بلانا چاہا تب بھی اس نے تھکن اور سر درد کا بہانہ کر کے ڈائننگ روم میں جانے سے معذرت کر لی۔

وہ اس وقت صرف تنہائی چاہتا تھا۔ ممی نے کھانا کمرے میں بھجوا دیا مگر ٹرے جوں کی توں رکھی رہی۔ وہ رات ہمایوں اخلاق کے محاسبے کی رات تھی۔ وہ خود اپنی ذات کا محاسبہ کر رہا تھا۔ آخر اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس کے دل کے نہاں گوشوں میں ایسی شریک حیات کا تصور بسا تھا جو باطنی خوبصورتی سے تو مالا مال ہو مگر جو ظاہری طور پر بھی پرکشش لگتی ہو۔

خود سے یہ اعتراف کرتے ہوئے اسے اپنا آپ بہت چھوٹا لگا لیکن سچ یہی تھا کہ درشہوار اس کے من کو نہیں بھائی تھی۔ مگر اس سچ سے بڑا سچ یہ تھا کہ ہمایوں نے یہ اعتراف نما حقیقت سینے میں ہمیشہ کے لیے دفن کر لی تھی۔ اس نے اپنی ناپسندیدگی درشہوار سمیت دنیا کے کسی بھی فرد کے سامنے ظاہر نہیں کرنا تھی۔

اپنی جس اچھی فطرت پر وہ آج تک انجانے میں فخر کرتا رہا تھا' اب اس کا عملی ثبوت دینے کا وقت تھا۔ اس کا نصیب اب جس لڑکی سے جڑنے جا رہا تھا۔ وہ بھلے سے ظاہری طور پر بہت خوبصورت نہ سہی مگر اس کا من بہت اجلا تھا اور ہمایوں اخلاق نے اس اجلے من والی لڑکی کو پورے عزت و احترام سے اپنی زندگی کا حصہ بنانا تھا۔

رات آہستہ آہستہ بیتتی جا رہی تھی اور ہمایوں

اخلاق کے دل کو بھی آہستہ آہستہ قرار آتا جا رہا تھا۔
صبح جب وہ اسپتال جانے کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو کوئی اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی رات کسی ذہنی کشمکش میں گزری ہے۔ اب وہ بالکل بشاش موڈ میں تھا' اپنی تقدیر پر صابر شاکر۔ دل کے کسی اندرونی گوشے میں بے اطمینانی کی لہر سر اٹھاتی تھی مگر دل کے اتنے اندر کون جھانک کر دیکھتا۔ اتنی فرصت تو اس کے خود کے پاس نہ تھی' وہ اپنے لیے تقدیر کا کیا گیا فیصلہ قبول کر چکا تھا یہ ہی اس کے نزدیک عقل مندی کا تقاضا تھا۔

☼ ☼ ☼

در شہوار اس وقت اپنی بیسٹ فرینڈ ایمان کے ہمراہ ڈھیروں شاپنگ بیگز اٹھائے سڑک کے کنارے کسی ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔
"تمہارا ڈرائیور اتنا بھی بیمار نہیں تھا شہوار! تم کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ مروت اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتی ہو۔" ایمان نے اسے گھر کا تھا۔
"نہیں یار! بے چارے کو واقعی تیز بخار تھا اور وہ تو ساتھ آنا چاہ رہا تھا' میں نے ہی منع کیا اسے۔"
شہوار نے اپنے ڈرائیور کی سائیڈ لی اور سچ بھی یہی تھا۔ وہ جتنا اپنے ملازمین کا خیال رکھتی تھی جواباً "وہ بھی زیادہ تابعداری کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن آج غلام رسول کی طبیعت واقعی ناساز تھی۔ شہوار نے ایمان کے ساتھ کچھ ضروری شاپنگ کرنی تھی ورنہ شاپنگ کا بیشتر کام ممی پہلے ہی نمٹا چکی تھیں' اسے دوسری لڑکیوں کی طرح شاپنگ کا شوق نہ تھا لیکن جوتے کاسمیٹکس اور چند دوسری چیزوں کی خریداری کا کام ممی نے اس پر ہی چھوڑ رکھا تھا۔
وہ خود کو شاپنگ میں اناڑی تصور کرتی تھی۔ سو اسی لیے ایمان کو ساتھ لے لیا تھا۔ ایمان نے واقعی بہت دل جمعی سے اس کی شاپنگ مکمل کروائی تھی بلکہ آخر میں شہوار ہی اس کا ہاتھ کھینچ کر شاپنگ مال سے باہر لائی تھی۔ دونوں بری طرح تھک چکی تھیں اور اب کسی ٹیکسی کو ہاتھ دینے کا سوچ ہی رہی تھیں کہ اتنے میں سگنل پر رکی ایک گاڑی نے شہوار کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس گاڑی کو تو وہ سینکڑوں گاڑیوں میں بھی باآسانی شناخت کر سکتی تھی۔
ہفتہ پہلے الوینہ آپی اس کے جوتے کا ناپ لینے آئی تھیں۔ بمشکل پانچ منٹ بیٹھ کر انہوں نے واپسی کا قصد کیا تھا۔ ممی گھر پر نہ تھیں شہوار نے انہیں رسمی طور پر تو روکا تھا مگر سچی بات تو یہ تھی کہ اسے سسرالی رشتہ داروں سے عجیب سی شرم اور گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی سو جب انہوں نے پیار سے اس کا گال تھپتھپا کر کیا۔
"جلدی ہے چندا! پھر آؤں گی۔" تو شہوار نے مزید اصرار نہ کیا۔ وہ انہیں چھوڑنے پورچ تک آئی تھی اور تب الوینہ آپی کی گاڑی کی نمبر پلیٹ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"میرے موبائل نمبر کے آخری تین ڈیجیٹ آپ کی گاڑی کا نمبر ہیں کیسا اتفاق ہے نا؟" وہ ان سے کہے بنا نہ رہ پائی۔ الوینہ آپی بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔
"تمہارا فون نمبر جس کی گاڑی کے نمبر سے میچ کر رہا ہے وہ وہی ہے جس سے تمہاری قسمت کے ستارے ملنے جا رہے ہیں۔ جانو یہ میری نہیں ہمایوں کی گاڑی ہے۔" انہوں نے اسے محبت سے مسکرا کر دیکھا تھا' بلاشبہ یہ کوئی شرمانے والی بات نہیں تھی لیکن در شہوار بری طرح سرخ ہو گئی تھی۔
"دراصل میری گاڑی سروس کے لیے گئی ہوئی ہے' اسی لیے ذرا دیر کو ہمایوں کی گاڑی مانگ کر لائی ہوں۔ اسے کلینک سے دیر ہو رہی تھی لیکن میں نے کہا میرا کام بھی کم ضروری نہیں لیکن اس نے تاکید کر کے بھیجا ہے کہ زیادہ دیر مت لگایئے گا دراصل میرے بھائی کی بہت سی اچھی عادتوں میں سے ایک عادت پابندی وقت کی بھی ہے۔"
الوینہ آپی نے بتایا تھا۔ شہوار کیا کہتی' سر جھکا کر انہیں چپ چاپ سنے گئی اور الوینہ آپی اس کے گالوں پر الوداعی بوسہ دے کر زن سے گاڑی بھگا کر لے گئی

تھیں اور اب وہ ہی گاڑی اس کی نگاہوں کے سامنے موجود تھی۔
"ہمایوں کی گاڑی۔" اس کے لبوں سے سرگوشی سی برآمد ہوئی مگر پاس کھڑی ایمان کی سماعت قابل رشک حد تک حیران کن تھی۔
"کیا کہہ رہی ہو' یہ ہمایوں بھائی کی گاڑی ہے۔" اس نے در شہوار کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے پوچھا تھا' مگر در شہوار نے اس کا سوال سنا ہی نہیں وہ تو پتھرائی ہوئی نگاہوں سے گاڑی کے مالک کو دیکھ رہی تھی جو پچھلی نشست پر بڑے آرام سے نیم دراز تھا۔ اس کی گود میں دھرا اوور آل اور اسٹیتھسکوپ اتنے فاصلے سے بھی باآسانی نظر آ رہا تھا۔ کان سے موبائل لگائے وہ خوش گوار انداز میں کسی سے باتوں میں مشغول تھا۔
"یہ ہیں ڈاکٹر ہمایوں۔" ایمان چیخی تھی۔ "شہوار کی بچی! تم شادی بھی کسی سوشل ورک کے تحت کر رہی ہو کیا؟" ایمان کا بس نہ چل رہا تھا کہ شہوار کو کچا چبا لے۔
"اس گنجے موٹے اور ٹھگنے ڈاکٹر سے شادی سے بہتر تھا کہ تم ساری عمر کنواری رہ لیتیں۔" ایمان اس پر چڑھ دوڑی تھی۔ شہوار کے پاس بولنے کے لیے ایک لفظ نہ تھا۔
"اس دیو سے لاکھ درجے اچھا تو اس کا ڈرائیور ہے' کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہے۔" ایمان نے توجہ دلوائی تو اس نے سرسری نگاہ ڈرائیونگ پر بیٹھے ڈرائیور پر ڈالی تھی۔ سادہ سے قمیص شلوار میں ملبوس خاصے رف حلیے میں بھی وہ ڈرائیور واقعی دیکھنے کی چیز تھا' لیکن شہوار کو اس ڈیشنگ اور اسمارٹ سے ڈرائیور سے کیا لینا دینا تھا۔ اس کی نگاہیں تو ڈاکٹر صاحب کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں' کب سگنل کھلا' اسے خبر نہ ہوئی۔
گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔ ایمان اپنے قریب رکنے والی ٹیکسی کو گھر کا ایڈریس بتا کر بیٹھی تو وہ بھی میکانکی انداز میں اس کے برابر والی نشست سنبھال کر بیٹھ گئی' ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔
"میں گھر جا کر آنٹی سے بات کروں گی' کیا کمی تھی تمہیں رشتوں کی۔ تمہارے لیے یہ پکی عمر کا ڈاکٹر ہی رہ گیا تھا۔" ایمان اب بھی مسلسل بول رہی تھی۔
"پلیز ایمان! ممی کو کچھ نہ کہنا۔" اس نے فوراً" اسے ٹوکا تھا۔
"کیوں نہ کہوں' اکلوتی بیٹی کو کوئی یوں بوجھ کی طرح اتار پھینکتا ہے۔" وہ در شہوار سے واقعی بہت محبت کرتی تھی' جب ہی مسلسل کڑھ رہی تھی۔
"یہ رشتہ سو فیصد میری پسند اور رضامندی سے طے پایا ہے ایمان! اور اب جب شادی میں اتنے کم دن رہ گئے ہیں' میں گھر میں کوئی ٹینشن پھیلتی نہیں دیکھ سکتی۔" اس نے اسے قطعیت سے باور کروایا تھا۔
"تم نے اس نمونے کو دیکھا تھا پہلے جو دعوا کر رہی ہو کہ یہ رشتہ تمہاری پسند اور رضامندی سے طے پایا ہے۔" ایمان جرح کے موڈ میں تھی۔
"مجھے کسی کی ظاہری شخصیت سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے کردار کی خوب صورتی اپیل کرتی ہے۔"
جب وہ بولی تو اس کے لہجے کا کھوکھلا پن خود اس پر بھی ظاہر ہو گیا تھا۔ ایمان کچھ نہ بولی بس بڑبڑاتے ہوئے رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر تکنے لگی اور شکر ہے اس نے شہوار کا کہا مان لیا تھا۔ گھر جا کر اس کی ممی سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کی شاید وہ بھی صورت حال کی نزاکت سمجھ گئی تھی۔
دس' بارہ دن بعد شہوار کی شادی تھی۔ ایسے میں اس کی ممی کو ان کے غلط فیصلے کا احساس دلانا نری حماقت تھی' بس وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ شہوار کی اس موٹے ڈاکٹر سے اتنی اچھی ذہنی ہم آہنگی ہو جائے کہ اسے اپنے فیصلے پر کوئی ملال یا پچھتاوا نہ ہو' شہوار کی اپنی دلی کیفیات بھی کچھ اسی قسم کی تھیں۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ ڈاکٹر ہمایوں کی ظاہری شخصیت کے بے ڈھنگے پن کو ذہن سے جھٹک کر صرف ان کی خوبیوں کے متعلق سوچے' مگر دل اس معاملے میں تعاون کرنے سے انکاری تھا۔ اسے کچھ مہینوں پہلے ممی سے ہونے والی اپنی جھڑپ یاد آئی۔ ممی اسے اپنی

دوست کے بھانجے کے پروپوزل پر راضی کرنا چاہ رہی تھیں، جبکہ وہ اس رشتے سے مکمل انکاری تھی۔

"کیا کمی ہے شہروز میں؟ فارن کوالیفائیڈ ہے۔ خوب صورت ہے۔ صاحب جائیداد ہے۔ لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں ایسے رشتوں کا۔" انہوں نے اسے ہر ممکن طریقے سے قائل کرنا چاہا تھا۔

"فار گاڈ سیک ممی! شہروز کا نام دوبارہ مت لیجیے گا میرے سامنے، جیسے آپ اس کی شہرت سے واقف نہیں، ہر چوتھے دن وہ ایک نئی لڑکی سے افیئر چلا رہا ہوتا ہے۔ اتنے دل پھینک شخص کو آپ میرے لیے منتخب کررہی ہیں۔"

"شادی سے پہلے لڑکے ایسی حماقتیں کرتے رہتے ہیں۔ شادی کے بعد خود بخود میچوریٹی آجاتی ہے اور شہروز کی پرسنالٹی ہے ہی اتنی پرکشش کہ لڑکیاں خود بخود اس کے گلے کا ہار بن جاتی ہیں۔"

"ممی پلیز، مجھے ایسی پرکشش شخصیت والا مرد نہیں چاہیے، بھلے سے آپ میری شادی کسی کالے، ٹھگنے اور گنجے شخص سے کروادیں، مگر میرے لیے ایسا شخص ڈھونڈیں جو صاحب کردار ہو، میری اور کوئی ڈیمانڈ نہیں۔"

اس نے کتنی قطعیت سے ممی کو انکار کیا تھا اور آج اتنے مہینوں بعد اسے لگا، اس کے کہے گئے لفظ ہی اسے منہ چڑا رہے ہیں۔ بعض اوقات انسان دوسروں کے اندر تک جھانک لینے کا دعوا کرتا ہے، مگر زندگی میں کوئی نہ کوئی موڑ ایسا ضرور آتا ہے جب انسان پر اپنی ہی شخصیت کا کوئی نیا پہلو منکشف ہوتا ہے۔ اپنے بارے میں اس کے سارے اندازے اور گمان غلط ثابت ہوجاتے ہیں۔

"تو در شہوار حسن! یہ تھی تمہاری حقیقت تم اپنے آپ کو دوسری لڑکیوں سے منفرد گردانتی تھیں، مگر تمہاری سوچ بھی بالکل عام لڑکیوں والی نکلی، تم میں اور ان میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ صرف ظاہری شخصیت کی چکاچوند سے متاثر ہوتی ہیں اور تمہیں باطنی خوب صورتی رکھنے والا اچھی پرسنالٹی کا شریک حیات چاہیے تھا۔" وہ خود سے مخاطب تھی۔ خود احتسابی کا یہ عمل بہت تکلیف دہ تھا۔

اپنی شخصیت کی یہ کمزوری اسے عجیب سے احساس جرم میں مبتلا کررہی تھی۔ ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کا تصور ذہن کے پردے پر لہراتا تو دل میں دبے سارے ارمان مرنے لگتے۔ دل باغی ہوکر انکار کی راہ سمجھاتا، مگر آخر دل پر دماغ نے غلبہ پالیا تھا۔ اس نے آج تک زندگی میں دانستہ طور پر اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ تو اب وہ کیسے کچھ غلط کرنے کا سوچ سکتی تھی۔ وہ بندہ جیسا بھی تھا، ایک نہایت ہمدرد فطرت رکھنے والا ملنسار شخص تھا۔

ماہین آپی کی باتوں سے ہمایوں کا یہی خاکہ ذہن میں ابھرتا تھا۔ وہ پوری ایمان داری سے اس نیک طینت مرد کی زندگی میں شامل ہوگی اور اس کے ساتھ زندگی کے ہر موڑ پر وفاداری نبھائے گی۔ یہ در شہوار کا خود سے عہد تھا۔ اس نے پورے دل سے خدا سے اپنی استقامت کی دعا مانگی اور فضول سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

میرج ہال میں رنگ و بو کا سیلاب امڈا ہوا تھا، ابھی تھوڑی دیر پہلے اخلاق فیملی بارات سمیت پہنچی تھی۔ ان کی آمد کے فوراً بعد نکاح کی کارروائی عمل میں آئی تھی۔ نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے شہوار کا دل ایک لمحے کو ڈوبا تھا، مگر پھر اس نے میکانکی انداز میں مطلوبہ جگہوں پر دستخط کردیے۔ اس کی ساس، نندیں اس پر واری صدقے جارہی تھیں۔

"ابھی تو سسرال والے بہت پیار کا مظاہرہ کررہے ہیں، اللہ جانے بعد میں کیسے نکلتے ہیں۔" اس کی ایک ننھیالی کزن نے تبصرہ کیا تھا۔

"نہیں بھئی، اس بات کی گارنٹی میں دیتی ہوں، یہ لوگ ہمیشہ ہی شہوار کو اتنا ہی پیار دیں گے۔ ہمایوں کی پوری فیملی ہی بہت ملنسار اور ہنس مکھ ہے، پھر ہمایوں گھر کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کی شادی تو ان کے دل کا برسوں پرانا ارمان ہے۔ پلکوں پر بٹھائیں گے ہماری شہوار کو۔" یہ ماہین تھی جو شہوار کی خالہ زاد بہن کی تسلی کروا رہی تھی۔

"ان کی گارنٹی پر اعتبار مت کرنا شہوار! ڈاکٹر صاحب کے متعلق بھی ہر طرح کی گارنٹی دینے والی تمہاری یہ ماہین آپی ہی تھیں، بعد میں کیا ہوا، کھودا پہاڑ نکلا چوہا، بلکہ چوہا نہیں ہاتھی، بلکہ ہاتھی بھی نہیں گینڈا۔" دانت کچکچاتے ایمان در شہوار کے کان میں گھس کر بولی تھی۔ وہ اس کی سب سے بہترین دوست تھی، مگر ہمایوں کو دیکھ کر اسے اتنا غصہ چڑھا تھا کہ آج اس نے شہوار کی دوسری کزنز کے ساتھ بارات کا استقبال تک کرنے کی زحمت نہ کی تھی۔ وہ برائیڈل روم میں در شہوار کے ساتھ ہی بیٹھی رہی، پھر فوٹو سیشن کے لیے در شہوار کو اسٹیج پر لایا گیا، پھر تو اسٹیج پر اس کے سسرالی رشتہ داروں کا ہی قبضہ ہوگیا۔ ایمان جلتی کڑھتی اسٹیج کے پاس ہی کرسی سنبھال کر بیٹھ گئی۔

"بہت وقت ہورہا ہے، اب دولہا کو بھی سلامی کے لیے بلالیں۔" شہوار کی خالہ نے اس کی ممی کو مخاطب کیا۔ وہ بے چاری ٹشو سے اپنی آنکھوں کے گوشے رگڑے جارہی تھیں۔ ایمان کو ان پر ترس آیا۔ شاید انہیں اب اپنے غلط فیصلے کا احساس ہورہا تھا۔ اس نے ان کے پاس جاکر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بس آنٹی! پریشان مت ہوں، وہ کیا کہتے ہیں کہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئیں کھیت۔"

اس نے انہیں تسلی دی تھی، شہوار کی ممی نے حیران ہوکر اسے دیکھا شاید اس کے منہ سے اتنا مشکل محاورہ سن کر انہیں حیرت ہوئی تھی۔ کے جی ون سے لے کر انٹرمیڈیٹ تک ایمان ہمیشہ اردو کے مضمون میں رعایتی نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔ ان کی حیرانی پر ایمان کھسیا کر پیچھے ہٹی تھی۔ تب ہی شہوار کے پاپا افراتفری کے عالم میں آتے دکھائی دیے۔

"بس اب آپ فوراً رخصتی کی رسم ادا کریں۔" انہوں نے شہوار کی ممی کو مخاطب کیا۔

"ابھی دولہا تو سلامی کے لیے آیا نہیں۔" پاس کھڑی شہوار کی خالہ نے تعجب سے بہنوئی کو دیکھا۔

"بھئی، حالات خراب ہونے کا خدشہ ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس علاقے میں دو مخالف پارٹیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہوا ہے۔ دو بندے شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچائے گئے ہیں، اگر خدانخواستہ وہاں سے کوئی بری خبر آتی ہے تو پورے علاقے میں ایک دم ہنگامے پھوٹ پڑیں گے، بس اس لیے جتنی جلد ہوسکے شہوار کو رخصت کردیں۔" انہوں نے حالات کی سنگینی واضح کی تھی۔

"ٹھیک ہے بھائی جان! لیکن پانچ منٹ کو ہی سہی ہمایوں کو شہوار کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھنا چاہیے۔ تھوڑی سی مووی اور دو، چار تصویریں تو ہوجائیں۔" شہوار کی خالہ اپنی بات پر مصر تھیں۔

"میں نے کہا نا نجمہ! حالات خراب ہوسکتے ہیں، تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" شہوار کے پاپا جھلا گئے تھے۔

"لیکن بھائی! لوگ کیا کہیں گے کہ دولہا کی سلامی کے بغیر۔۔۔"

"اُفوہ نجمہ! گولی مارو دولہا کو۔۔۔" شہوار کے پاپا کا ضبط جواب دے گیا۔

"انکل کا مطلب ہے گولی مارو سلامی کو۔" نجمہ آنٹی کی ہکابکا شکل دیکھ کر پاس کھڑی ایمان نے ان کی بات کی تصحیح کی تھی۔ شہوار کے پاپا نے ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ کچھ غیر حاضر دماغ لگ رہے تھے۔ شاید حالات کی متوقع سنگینی نے انہیں پریشان کردیا تھا۔ اتنے میں عادل بھی وہیں آگیا تھا۔ اس نے بھی شہوار کے پاپا والی بات دہرائی۔

"حالات خراب ہوسکتے ہیں، جلد از جلد رخصتی کی رسم نپٹائیں۔"

اور پھر تو صحیح معنوں میں افراتفری مچی تھی۔ مہمانوں کی اکثریت نے بھی حالات کے پیش نظر میزبانوں سے رسمی اجازت لینا ضروری نہ سمجھی۔ سب کو جلد از جلد گھر جانے کی پڑگئی تھی۔ اکثر تو دولہن کی رخصتی سے پہلے ہی رخصت ہوگئے تھے۔ روتی دھوتی

شہوار کو بھی بڑی سی چادر پہنا کر فافٹ گاڑی میں بٹھایا گیا۔ ایمان کو اپنی سہیلی سے ملنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، نمناک آنکھوں کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھی شہوار کو آخری بار دیکھنے گئی۔ قریبی رشتہ دار وہاں **جمگھٹا** بنائے کھڑے تھے۔ ایمان نے شہوار کی چھوٹے قد والی خالہ کے اوپر سے اچک کر سجی سجائی گاڑی میں بیٹھی اپنی سہیلی پر الوداعی نگاہ ڈالی تھی۔ شہوار کا چہرہ تو چادر میں چھپ چکا تھا، لیکن اس کا ہچکیوں سے لرزتا وجود اس کے بری طرح رونے کا پتا دیتا تھا۔ ایمان کے آنسو بھی اس کے گال بھگونے لگے۔ اتنے میں اس کی نگاہ شہوار کی ممی پر پڑی تھی۔ لیکن شہوار کی ممی کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر تسلی دلاسا دینے والا کون تھا۔ ایمان نے حقیقتاً "اپنی آنکھیں ملی تھیں۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ شہوار کے پاس جانا چاہتی تھی، لیکن جانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

اور پھر وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ شہوار کی چھوٹی نند اور ماہین اس کے ساتھ پچھلی نشستوں پر جا بیٹھے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرنٹ سیٹ سنبھال لی تھی اور چند لمحوں بعد دولہا کی گاڑی کے پیچھے بارات میں شامل دوسرے افراد کی گاڑیاں بھی روانہ ہو گئیں۔ ایمان اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ تب پیچھے سے آکر اس کی امی نے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

"کیا کھڑے کھڑے سو گئی ہو۔ کب سے آوازیں دے رہی ہوں تمہیں۔ تمہارے پاپا غصہ کر رہے ہیں۔ فوراً" گاڑی میں بیٹھو۔" انہوں نے اسے گھر کا تھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے مرے مرے سے انداز میں ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

رسموں کا سلسلہ جانے کب ختم ہونا تھا۔ شہوار کی گردن جھکے جھکے اکڑ گئی تھی۔ اس وقت زندگی کی سب سے بڑی خواہش جھکی گردن کو اٹھانا تھی، حالانکہ سب اس وقت اس سے مطالبہ بھی یہ ہی کر رہے تھے۔

"پلیز بھابھی! ذرا سی گردن اوپر کریں۔ آپ کا چہرہ تو تصویروں میں آ ہی نہیں رہا۔" یہ اس کی چھوٹی نند نشا تھی۔

"ہاں شہوار پلیز۔ تھوڑا سا چہرہ اوپر کر لو۔ ابھی تک تمہاری ڈھنگ کی تصویریں بن ہی نہیں پائی ہیں۔ بلکہ ہمایوں کہاں غائب ہو گیا۔ اسے بلا کر شہوار کے ساتھ بٹھاؤ۔ نکاح کے بعد دلہن کے ساتھ فوٹو شوٹ سے موصوف نے خود منع کر دیا تھا۔ اسٹیج پر دونوں کو ساتھ بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ رخصتی کا غلغلہ اٹھ گیا۔ ارے اب ہی دونوں کو اکٹھے بٹھا کر کچھ تصویریں اتار لو۔" یہ الوینہ آپی تھیں، اس کی سب سے بڑی نند جو اب "گمشدہ" بھائی کو باآواز بلند پکار رہی تھیں۔

"اور کیا۔ کہاں ہیں بھائی.... ابھی تو آرسی مصحف کی رسم بھی باقی ہے۔" دوسرے نمبر والی مائدہ نے یاد دلایا تھا۔

"اف توبہ ایک اور رسم۔" در شہوار **کسمسائی** تھی، لیکن چند منٹوں بعد ہی اس کی ساس، بیٹے کو ساتھ لے آئی تھیں۔

"ایسی بھی کیا تھکاوٹ۔ میرے بیڈ روم میں پاؤں پسارے لیٹا تھا۔ ارے تھک تو میری بچی رہی ہے۔ فافٹ رسمیں ختم کرو اور اسے کمرے میں پہنچاؤ۔" انہوں نے ہمایوں کو اس کے برابر بٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی گردن مزید جھک گئی تھی۔

"جاؤ نشا! جلدی سے آئینہ لے کر آؤ۔ بس آرسی مصحف کی رسم ہو جائے، پھر شہوار کو بیڈ روم میں لے جاتے ہیں۔" الوینہ آپی نے نشا کو مخاطب کیا۔

پھرتیلی سی نشا چند لمحوں بعد آئینہ لے کر آ گئی تھی۔ ہنسی مذاق اور قہقہوں کے درمیان دونوں کو ایک دوسرے کا عکس دیکھنے کا کہا گیا۔

"اب کیا فائدہ۔ پہلے تو تصویر دکھائی نہیں۔" کوئی ہمایوں کے اندر سے بولا تھا۔ مگر اگلے ہی پل اس نے خود کو دل ہی دل میں ڈپٹتے ہوئے آئینے پر نگاہ ڈالی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ آئینے میں موجود دوسرا عکس بھی آنکھیں پھاڑے اسے تک رہا تھا۔ اگلے ہی پل دونوں نے جھٹکے سے گردن اٹھائی اور ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔

وہ بھول چکے تھے کہ سامنے انہیں انتہائی ذوق و شوق سے دیکھنے والے ناظرین کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ہمایوں کو سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ وہ بہنوں اور کزنز کی ذو معنی چھیڑ چھاڑ کا مسکرا کر جواب دینے لگا تھا۔ مگر در شہوار اس اچانک لگنے والے شاک سے سنبھل نہ پائی۔ اس کا سر زور، زور سے گھومنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھامنا چاہا، مگر اگلے ہی پل اس کا سر لڑھک کر ہمایوں کے شانے سے جا لگا۔ اس کی ساس، نندیں گھبرا کر اس کی جانب لپکیں، مگر وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

شدید پیاس سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد اس نے خالی خالی نگاہوں سے گرد و پیش میں نگاہیں دوڑائیں، سامنے صوفے پر نیم دراز وجود پر نگاہیں پڑیں تو سوئے سوئے حواس یک دم بیدار ہو گئے۔ وہ اس وقت اپنے حجلۂ عروسی میں موجود تھی اور کمرے میں موجود دوسری ہستی شاید نہیں بلکہ یقیناً "ہمایوں اخلاق کی تھی۔

وہ شخص جس کو ایمان اور وہ ہمایوں کا ڈرائیور سمجھی تھیں، وہ بذات خود ڈاکٹر ہمایوں تھا۔ کس حماقت بھری غلط فہمی کا شکار ہوئی تھیں وہ دونوں اور چلو اس دن کی غلط فہمی کا تو پھر بھی کوئی جواز تھا، آج تو اسے اپنے حواس قابو میں رکھنے چاہیے تھے۔ شرمندگی سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔

پتا نہیں کس طرح اس کے سسرال والوں نے اسے بیڈ روم تک پہنچایا تھا اور بے چارے ڈاکٹر صاحب کب سے صوفے پر اس غیر آرام دہ پوزیشن میں بیٹھے تھے۔ شہوار نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا تھا، مگر اس نے ابھی اپنے ارادے کو عملی جامہ بھی نہ پہنایا تھا کہ چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز پر ہمایوں نے یک دم آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ یقیناً" جاگ ہی رہا تھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر شہوار نے بے ساختہ اپنی آنکھیں میچ لیں۔

پتا نہیں یہ حیا تھی یا شرمندگی۔ وہ خود میں ہمایوں سے نگاہ ملانے کی ہمت نہ پا رہی تھی۔ ہمایوں اٹھ کر اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ شہوار کا دل اس کا لمس محسوس کرتے ہی بری طرح دھڑکا تھا۔ لیکن وہ بھول چکی تھی کہ اس کا میاں ایک ڈاکٹر ہے، پھر سوتی ہوئی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر وہ منہ دکھائی کے کنگن تو پہنانے سے رہا، وہ اس کی نبض چیک کر رہا تھا، پھر اس کا ماتھا چھو کر دیکھا تھا۔

شہوار کی پلکوں کی لرزش اس سے چھپ نہ پائی تھی۔ وہ جان گیا کہ وہ جاگ چکی ہے۔ مگر آنکھیں نہیں کھول رہی۔ اس معصوم سی حرکت پر ہمایوں کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ مگر ہنسی کا گلا گھونٹتے ہوئے اس نے مصنوعی تشویش زدہ لہجے میں خود کلامی کی۔

"دوسرا انجکشن بھی لگانا پڑے گا۔ طبیعت میں زیادہ بہتری محسوس نہیں ہو رہی۔"

"دوسرا انجکشن" گویا وہ شادی کی پہلی ہی رات اسے ایک انجکشن ٹھونک چکا ہے۔" شہوار نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"وہ آپ اٹھ گئیں۔ کیسا محسوس کر رہی ہیں اب؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ شہوار بنا جواب دیے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ارے ارے لیٹی رہیں۔" ہمایوں نے اسے روکا، مگر وہ اٹھ بیٹھی۔ ہمایوں نے ہی ٹیک لگانے کے لیے اس کے پیچھے تکیے سیٹ کیے تھے۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" وہ دوستانہ انداز میں مخاطب تھا۔

"مجھے کیا ہوا تھا؟" اس نے الٹا سوال جڑ دیا۔

"یہ تو آپ کو ہی بہتر طور پر معلوم ہوگا۔ ویسے آپ کا بی پی لو تھا اور شاید شدید تھکاوٹ سے آپ کے اعصاب جواب دے گئے تھے، لیکن میں نے آپ کو سکون آور انجکشن لگا دیا تھا۔ اب آپ کی طبیعت خاصی بہتر معلوم ہو رہی ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔" ہمایوں پوچھ رہا تھا۔ در شہوار نے دھیرے سے

اثبات میں گردن ہلادی۔

”ممی وغیرہ آپ کے لیے بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ میں نے ابھی ذرا دیر پہلے ہی ممی کو زبردستی کمرے میں بھیجا ہے۔“ ہمایوں نے بتایا وہ ایک بار پھر بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

”پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ آنٹی وغیرہ میرے متعلق کیا سوچ رہی ہوں گے؟“ یہ ہمایوں کے دوستانہ لہجے کا اعجاز تھا کہ اس نے دھیرے سے اپنی پریشانی اس سے شیئر کر ڈالی۔

”آپ بالکل ریلیکس رہیں شہوار! اس بات کی فکر نہ کریں کہ کسی نے آپ کے متعلق کیا سوچا ہے‘ اپنی ممی اور بہنوں کو میں جانتا ہوں‘ وہ صرف آپ کے متعلق پریشان ہو رہے تھے اور وجہ بھی انہیں معلوم ہے‘ آج جیسی افراتفری میں ہماری شادی انجام پائی کسی کے بھی اعصاب شل ہو سکتے تھے اور آپ تو پھر اتنی نازک اندام لڑکی ہیں۔“ ہمایوں نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی تھی۔

”ویسے مجھے لگا کہ آپ مجھے دیکھ کر چونکی ہیں یا آئینے میں میرا عکس ڈراؤنا دکھائی دے رہا تھا۔“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد ہمایوں نے شرارت سے پوچھا۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے ڈھٹائی سے جھوٹ بول دیا۔

”لیکن میں آپ کو دیکھ کر ضرور چونک گیا تھا۔ آپ جانتی ہیں در شہوار! میں آپ کے متعلق اتنے دن کس غلط فہمی کا شکار رہا ہوں۔ ہمایوں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ در شہوار نے اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے ایک بار پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

”اچھا باتیں تو ہوتی رہیں گی‘ پہلے میں آپ کو رونمائی کا تحفہ تو دے دوں۔“ ہمایوں کو اچانک خیال آگیا۔ اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دھرا مخملی کیس اٹھایا تھا۔ لیکن جب اس نے اس میں سے جڑاؤ کنگن نکال لیے تو اندازہ ہوا کہ در شہوار کی نازک کلائیوں کے مقابلے میں کنگن بہت بڑے اور کھلے ہیں۔

”سوری شہوار! فی الحال تو یہ ہی پہن لیں‘ میں پہلی فرصت میں جیولر سے کہہ کر ان کا سائز چھوٹا کروا دوں گا یا پھر آپ خود میرے ساتھ چل کر اس کے بد اپنی پسند کا ڈیزائن لے لیجئے گا۔“ ہمایوں نے کنگن ا کے ہاتھ میں پہناتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں ہیں تو یہ بہت خوب صورت۔ بس سائز تھوڑا سا بڑا ہے۔“ شہوار نے دھیمے لہجے میں جواب تھا۔

”تھوڑا سا نہیں کافی بڑا ہے۔“ ہمایوں کو ہنسی آگئی تھی۔ ”ویسے اس میں میرا کوئی قصور نہیں‘ میرے خیال میں تمہارا سائز یہی ہونا تھا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”میں آپ کے تصور میں اتنی موٹی آتی تھی۔“ شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھی۔

”تصور نہیں میں نے تمہیں حقیقت میں بھی دیکھا تھا۔“ ہمایوں نے بتایا۔

”کب؟“ شہوار نے حیرت سے پوچھا۔ ہمایوں اسے ہنستے ہوئے اپنی غلط فہمی کے متعلق بتانے لگا تھا۔ ساری بات سن کر شہوار کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر گئی۔

”عادل نے مجھ سے کہا تھا شہوار ہانڈی بھون رہی ہوگی اور پروین برتن دھو رہی ہوگی‘ میں نے تو اس کے بیان کی روشنی میں ہی تمہیں پروین اور پروین کو شہوار سمجھا۔ تم خود بتاؤ‘ اس میں میرا کیا قصور‘ پھر ان پروین صاحبہ نے اس روز تم سے تو قیمتی جوڑا ہی پہن رکھا تھا‘ تم تو بالکل سادہ سے حلیے میں تھیں اور جس طرح سر جھکائے دیگچی دھو رہی تھیں میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اسی غلط فہمی کا شکار ہوتا۔“

ہمایوں بولا تو در شہوار کو وہ دن پوری جزئیات کے ساتھ یاد آگیا تھا۔ وہ اس روز مالی بابا کے ساتھ مل کر اپنے من پسند مشغلے یعنی پودوں کی گوڈی میں مصروف تھی۔ واقعی اس روز اس نے بالکل رف سا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اتنے میں ماہین کا فون آگیا۔ اتفاق سے پاپا بھی

کسی کام سے اسی سائیڈ جا رہے تھے۔ وہ بھی فوراً ”ہاتھ جھاڑ کر“ ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ پاپا اسے ماہین کے گھر ڈراپ کر کے آگے نکل گئے۔ ماہین کافی مضمحل اور پژمردہ حالت میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ ملازمہ سے وہ اوپر نیچے کے سارے کام کروا لیتی تھی۔ مگر عادل بھائی کو ملازمہ کے ہاتھ کا کھانا ناپسند نہ تھا۔ شہوار نے ماہین کو زبردستی اس کے بیڈ روم میں بھیجا۔

”اریج سو رہی ہے‘ آپ بھی تھوڑا آرام کر لیں۔ سالن میں بنا لیتی ہوں۔“

”تو میں نے تمہیں فون پر اپنی طبیعت کا اس لیے تھوڑی بتایا تھا‘ میں چاہ رہی تھی تم آجاؤ تو تھوڑی سی گپ شپ لگاؤں گی طبیعت عجیب بوجھل بوجھل سی ہو رہی ہے۔“

”تو ٹھیک ہے نا۔ گپ شپ بھی لگائیں گے‘ پہلے آپ تھوڑا سا آرام کر لیں‘ میں اتنے میں کچن کا کام سمیٹ لوں۔“

اس نے ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہیں اریج کے پاس لٹا دیا تھا۔ کوکنگ سے اسے خاصا شغف تھا‘ سو مطمئن انداز میں کچن کا رخ کیا تھا اور جب ہانڈی اختتامی مراحل میں تھی تو ملازمہ بھی آگئی تھی۔ سنک میں برتنوں کا ڈھیر اکٹھا ہو رہا تھا۔ پروین نے پہلے برتن دھونے کی ہی ٹھانی تھی۔ جب ہی شہوار کی نگاہ اس کی ہتھیلی پر پڑی‘ اس کی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر بڑا سا آبلہ پڑ رہا تھا۔

”یہ کیا ہوا تمہیں؟“ شہوار نے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاتھ جل گیا تھا باجی۔“ پروین نے لاپروائی سے جواب دیا۔

”اور تم اس جلے ہوئے ہاتھ کو پانی میں ڈال رہی ہو‘ پتا ہے زخم بگڑ سکتا ہے۔“ شہوار نے اسے ڈانٹا۔

”پھر کیا کروں باجی‘ مجبوری ہے‘ کام تو کرنا پڑے گا۔“

پروین نے مظلومیت طاری کی‘ ماہین آپی کی یہ نئی ملازمہ اسے کچھ خاص پسند نہ تھی۔ اس میں عجیب سی تیزی طراری تھی‘ فیشن کا بھی ضرورت سے زیادہ ہی شوق تھا‘ اس وقت بھی وہ ماہین آپی کا ایک نسبتاً ”پرانا“ سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ سوٹ اچھا خاصا قیمتی تھا‘ مگر شاید ماہین آپی کو سائز فٹ ہو گیا تھا۔ جب ہی انہوں نے پروین کو دے دیا ہوگا‘ مگر پروین تو ماہین آپی سے بھی زیادہ فربہ تھی‘ پھر بھی اس کی ہمت تھی جو اس نے اپنے بدن پر یہ چست لباس چڑھا لیا تھا۔ لیکن یہ وقت پروین پر ناگواری کا اظہار کرنے کا نہ تھا۔ اسے اس وقت اس پر ترس آرہا تھا۔ بے چاری کا ہاتھ بری طرح جلا ہوا تھا‘ پھر بھی اسے برتن دھونے پڑ رہے تھے۔

چند لمحوں تک تو اس نے پروین کو برتن دھوتے دیکھا تھا‘ پھر اس سے رہا نہ گیا۔

”پروین! تم ہاتھ دھو کر یہاں آجاؤ۔ تم ہانڈی بھون لو‘ باقی برتن میں دھو لیتی ہوں۔“

پروین نے رسمی پس و پیش سے کام لیا‘ مگر پھر شہوار کی ہدایت مان لی۔ اپنی مالکن کی اس بے وقوف سی کزن سے وہ بخوبی واقف تھی۔ ماہین سو رہی تھی‘ سو اس کی کزن کی آفر کا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ وہ چولہے کے پاس آکر ہانڈی بھوننے لگی‘ شہوار برتن دھونے لگی ’یقیناً‘ اسی وقت ہمایوں نے دونوں کو دیکھا ہوگا۔ شہوار کو یاد تھا‘ جب وہ فارغ ہو کر کچن سے نکلی تو عادل بھائی نے اسے بتایا تھا۔

”تمہارے ڈاکٹر صاحب آئے تھے لڑکی! لیکن ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ کوئی کام یاد آیا اور واپس مڑ گئے‘ ورنہ میں تمہاری ملاقات ہی کروا دیتا۔“ ہنس مکھ عادل بھائی ہمیشہ اس سے چھوٹی بہنوں کی طرح پیش آتے تھے۔ مگر آج ان کی بات سن کر اسے شرم آگئی تھی۔

”آپ کا خیال ہے میں ملاقات کر لیتی۔“ اس نے خفگی سے پوچھا۔

”مذاق کر رہا تھا گڑیا۔“

عادل بھائی نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی‘ لیکن اسے کیا پتا تھا کہ اس دن اس کا

برتن دھونا اس کے ڈاکٹر صاحب کو کتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا کردے گا۔ اس نے شرمگیں مسکراہٹ سے ہمایوں کو اس دن کی روداد سنائی تھی، بلکہ نہ صرف اس دن کی بلکہ اس دن کی بھی جب وہ اور ایمان بھی اس کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہوگئے تھے۔ ذرا دیر پہلے عادل نے اس کے چونکنے کا سبب پوچھا تھا۔ تب وہ انکاری ہوگئی تھی۔ مگر اتنے اچھے شریک سفر کو دھوکا دینا بھی تو مناسب نہ تھا' سو اس نے بھی اپنی دلی کیفیات سمیت اسے وہ واقعہ سناڈالا تھا۔

"جتنا شاک مجھے آج آپ کو دیکھ کر لگا ہے اس سے کہیں زیادہ شاک اس دن لگا تھا' پھر پتا نہیں کیوں میں آج بے ہوش ہوئی۔"

وہ استفسار کررہی تھی اور ہمایوں کو اس کی معصومیت پر ڈھیروں پیار آگیا۔

"میری غلط فہمی تو سمجھ میں آتی ہے مسز لیکن آپ کی غلط فہمی سمجھ سے باہر ہے۔ بلاشبہ وہ میری گاڑی تھی' لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ اس وقت گاڑی کی پچھلی نشست پر میں ہی موجود ہوتا۔ کسی سے کنفرم کیے بغیر آپ نے مجھے ڈرائیور سمجھ لیا؟"

"دیکھیں' گاڑی آپ کی تھی اور پچھلی نشست پر جو صاحب بیٹھے تھے ان کی گود میں اسٹیتھسکوپ اور اوورآل بھی رکھا تھا اور پھر وہ جس طرح مالکانہ اسٹائل میں نیم دراز تھے' کوئی بھی دیکھ کر یہ ہی سمجھ سکتا تھا کہ وہ ہی گاڑی کے مالک ہیں۔" شہوار نے اپنی غلطی بلکہ غلط فہمی کو حق بجانب ثابت کیا تھا' ہمایوں کھل کر ہنس پڑا۔

"وہ ڈاکٹر بیگ تھے' میرے سینئر ہیں وہ۔ اس روز ان کی گاڑی خراب تھی' سو میں نے کہا میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں اور اس دن میرا اسپتال کا آف تھا' صرف اپنے ایک مریض کا حال پوچھنے چلا گیا تھا۔ بس اسی لیے میرا حلیہ (casual) عام سا تھا' ورنہ شاید تم غلط فہمی کا شکار نہ ہوتیں۔" ہمایوں نے کہا۔ اس نے سرہلاتے ہوئے اس کی بات تسلیم کی۔

"ویسے میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔ تم نے ڈاکٹر بیگ کو ڈاکٹر ہمایوں سمجھا اور پھر بھی تم مجھ سے شادی پر راضی ہوگئیں۔" وہ ہنسا تھا۔

"زیادہ ہمت آپ کی ہے۔ آپ نے مجھے پروین سمجھا اور پھر بھی مجھ سے شادی پر راضی ہوگئے۔" وہ برجستہ بولی تھی۔ اس بار ہمایوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"ویسے ایک بات بتائیں' اگر میں قمیص شلوار پہنوں تو کیا ڈرائیور' ڈرائیور سا لگتا ہوں۔" وہ اب متبسم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔ میں نے تو آپ کو غور سے دیکھا تک نہیں تھا' وہ تو میری دوست ایمان ہے نا' ایک دم بونگی ہے۔ مجھ سے پیار بہت کرتی ہے' لیکن....." شہوار جلدی جلدی بول کر وضاحت دینے لگی' مگر پھر اس کی نگاہ ہمایوں پر پڑی تھی' اس کی بھوری آنکھیں شرارتی انداز میں مسکرارہی تھیں۔ شہوار کو بے پناہ خفت نے آن گھیرا۔

"بونگی تو میں بھی بہت ہوں۔" کچھ خفگی سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے تسلیم کیا۔

"مجھ سے پوچھیں' آپ کیا ہیں۔" ہمایوں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"میری زندگی کا سب سے حسین مگر غیر متوقع تحفہ' کسی دعا کی قبولیت' کسی نیکی کا صلہ۔" وہ جذبوں سے چور لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

"آپ ڈاکٹر ہیں یا شاعر؟" شہوار نے نگاہیں جھکاتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"آپ ڈاکٹر سمجھیں' شاعر یا ڈرائیور۔ آپ کی خاطر ہمیں سب کچھ بننا منظور ہے۔" اس نے اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

شہوار کے لبوں پر شرمگیں مسکان پھیل گئی۔ وہ خود کو ایک سمجھوتہ بھری زندگی گزارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرکے آئی تھی' مگر اس گھر میں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں اور خوب صورتیوں سمیت اس کا استقبال کرنے کو موجود تھی۔

شہوار مطمئن تھی اور بے تحاشا خوش۔

☆

فرح طاہر

سیج کا درد

"اف کیا خوار کیا ہے چاچو جان نے۔ اسی لیے تو غصہ کو حرام کہا گیا ہے۔ پل بھر کے غصے نے دو زندگیوں کو کیسے دو الگ الگ کناروں پر لا کھڑا کیا۔ بیوی کو طلاق دے کر تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں بے چارے چاچو جان!"

وہ دوپٹے پر لیس ٹانکتی ہوئی مسلسل چاچو کی شان میں قصیدہ خوانی کررہی تھی۔ سطوت آرا مسکراہٹ لبوں میں دبائے متاسفانہ انداز میں بولتی بھتیجی کو دیکھے

جا رہی تھیں۔

"دادی جان اسی خواہش میں قبر میں جا سوئیں کہ کسی طرح میرے سپوت کی شادی ہو جائے۔ یہ بھی باقی بھائیوں کی طرح خوش گوار زندگی گزار سکیں۔ مگر نہ جی! طلاق دینے کے بعد دو سال تو ویسے ہی غمِ طلاق میں گزار دیے، پھر کہیں جا کر دوسری شادی کے لیے تیار ہوئے بھی تو شرط یہ رکھی کہ لڑکی کنواری ہو۔ بیوہ یا مطلقہ بھی چلے گی مگر اس کے ساتھ اولاد نہ ہو۔

کچھ ان کی فرمائش نے اور کچھ ہماری پرانی چاچی جان اور ان کی دلاری بہن نے، جو طلاق لینے کے بعد بھی ہماری پسند کی گئی لڑکی کے گھر پہنچ کر غلط بیانی کر ڈالتی ہیں اور اتنی محنت سے تلاش کی گئی لڑکی جھٹ سے پرائی بن جاتی ہے۔"

لیس اور دوپٹا گود میں رکھے وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر اس وقت افسوس ہی افسوس تھا۔

"سچ میں یہ طلاق دینے کی سزا ہی مل رہی ہے چاچو کو۔ پہلے لڑکی نہیں ملتی تھی اور اب ملی بھی تو اس کا قد اتنا چھوٹا۔۔۔ کہ ہمیں دیکھ کر ہی اعتراض ہوا۔ ہمارے آئیڈیل قد کے مالک چاچو کے ساتھ اس کا میچ بالکل بھی نہیں سجے گا۔ مگر چاچو جان کی قناعت دیکھیں، چھوٹے قد کی لڑکی کو بھی انکار نہیں کر رہے "فوراً" مان گئے۔"

وہ جو دوبارہ بولنا شروع ہو چکی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پر خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ سطوت آرا بھی کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

"کیسے قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے اس کی اور سطوت! آپ بھی بجائے منع کرنے کے ہنس کر اس کو اور شہہ دے رہی ہیں۔۔۔ تنگ آ گئی ہوں میں اس کی اس طرح تڑتڑ چلتی زبان سے۔"

ملکہ بیگم غصے سے بیٹی کو گھور رہی تھیں۔

"امی! میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔" اس نے احتجاج کیا تھا۔ اس سے پہلے ملکہ بیگم بولیں سطوت آرا بول پڑیں۔

"بے شک گڑیا! تم نے کچھ غلط نہیں کہا۔ مگر جو گزر گیا اسے جانے دو نا۔ اور ہم سب جانتے ہیں جو بھی ہو اس میں راشد سے زیادہ شہناز اور اس کے گھر والوں کی غلطی تھی۔ راشد نے طلاق غصے میں دی۔"

"ایک منٹ پھوپھو جان!" گڑیا نے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات درمیان میں روک دی۔

وہ غصہ نہیں تھا، وہ تو ان لوگوں کی للکار کا جواب تھا۔ انہوں نے للکارا۔ "مرد ہے تو ہماری بیٹی کو ابھی طلاق دے" پھر چاچو جان کیسے نا اپنی مردانگی کا ثبوت پیش کرتے، فٹ سے "ایک، دو، تین" کر دی۔۔۔ یہ مردانگی نہیں تھی ان کی۔ اصل مردانگی یہ تھی وہ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں بند کرتے اور ان کے گھر والوں کو نکال باہر کرتے، اگر یہ مردانگی دکھائی ہوتی نا تو یہ چار سال کا بن باس نہ کاٹنا پڑتا اور زیادہ نہیں تو دو، تین چیاؤں میاؤں کے ابا جی بھی بن چکے ہوتے۔"

اس کا زور و شور سے جاری بیان نہ جانے اور کہاں تک پہنچتا کہ ملکہ بیگم نے جھک کر پاس پڑی چپل اٹھائی اور ماہر نشانہ باز کی طرح اس کی کمر پہ داغ دی۔۔۔ اس کی چلتی زبان کو ایک دم ہی بریک لگے تھے۔

"امی۔۔۔" اس کی آنکھوں میں "فوراً" نمی اتر آئی تھی۔

"کب سے منع کر رہی ہوں، مگر مجال ہے جو یہ لڑکی چپ ہو جائے۔ بس بہت بول لیا، لاؤ یہ دوپٹا دکھاؤ، کہاں تک لیس ٹانکی ہے۔"

وہ منہ پھلائے خاموشی سے اٹھی اور دوپٹا ان کے ہاتھ میں دے کر دروازے کی طرف چلی گئی۔

بیچ دروازے پر رک کر پیچھے مڑی تھی۔ "مگر میں آخری بات کہہ کر ہی جاؤں گی۔

خبردار جو آپ لوگوں نے اس لڑکی کا حسب نسب یا اتا پتا چھوٹے چاچو یا اور کسی کو بتایا تو۔۔۔ ورنہ جیسے ہی ان کو لڑکی کا پتا لگے گا چھوٹی چاچی "فوراً" پہنچ جائیں گی اور پھر وہ ہو گا جو چار سال سے ہوتا آیا ہے۔ پھر ہاتھ ملتے رہ جانا آپ لوگ۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ جھپاک سے باہر نکل گئی۔ ملکہ بیگم اور سطوت آرا دونوں ہی ہنس پڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

علیم الدین کی سات اولادیں تھیں، تین بیٹیاں اور چار بیٹے۔

بڑے بیٹے اکرم، دوسرے افتخار، تیسرے راشد اور چھوٹے وقار، اکرم اور افتخار سے چھوٹی سطوت آرا تھی۔ باقی دو بیٹیاں وفات پا چکی تھیں۔ اکرم اور افتخار کی شادیاں الگ الگ گھر میں ہوئی تھی۔ دونوں ہی اپنی فیملی کے ساتھ خوش گوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ جبکہ راشد اور وقار کی شادی ایک ہی گھر میں ہوئی تھی۔ شہناز اور زوبیا دونوں بہنیں تھیں۔

زوبیا تھوڑی تیز مزاج کی لڑکی تھی۔ مگر پھر بھی اس کی وقار کے ساتھ بنتی تھی۔ وجہ تھی وقار کا مصلحت آمیز انداز۔

گوکہ شہناز تیز مزاج نہ تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیا وجہ تھی کہ شروع دنوں کے علاوہ کبھی اس کی اور راشد کی آپس میں نہیں بنی تھی۔ شہناز کا سسرال میں دل کم ہی لگتا تھا۔ اسی لیے وہ زیادہ تر اپنے میکے میں پائی جاتی تھی۔

اور کبھی سسرال میں جلوہ گر ہو بھی جاتی تو چند روز سے زیادہ اس کا قیام سسرال میں نہ ہوتا، پھر کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر ناراض ہوتی اور میکے جا بیٹھتی۔ ایسے حالات کے باوجود ان کی شادی تین سال رہی اور پھر شہناز خود ہی طلاق کی فرمائش کر کے الگ ہو گئی۔

علیم الدین کے تمام بیٹے، باپ کے چھوڑے گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہائش پذیر تھے۔ مگر شہناز کی طلاق کے بعد اس کی بہن زوبیا نے اس گھر میں رہنا پسند نہیں کیا اور اپنے شوہر اور بیٹی کے ساتھ الگ گھر میں جا بسی۔

باقی تینوں بھائی اسی گھر میں موجود تھے۔ اکرم اور افتخار کے پورشن اسی طرح آباد تھے۔ مگر راشد تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ ماں کی وفات کے بعد وہ بالکل ہی اکیلا ہو گیا تھا۔ گو کہ اس کی دونوں بھابیاں اس کا اپنے بیٹے کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ ان ہی کی لگن کا ثمر تھا کہ طلاق کے بعد انہوں نے بے شمار لڑکیاں تلاش کیں، ہر مرتبہ کسی نہ کسی بنا پر کبھی ان کی طرف سے تو کبھی لڑکی والوں کی طرف سے رشتے سے انکار ہو جاتا، پھر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری، یہ اسی بات کا نتیجہ تھا، ایک بار پھر انہوں نے لڑکی تلاش کر ہی لی تھی، جس کا انہیں سو فیصد یقین تھا کہ اس بار راشد کی شادی ضرور ہی ہو جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"بری میں کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے۔۔۔؟"

نائلہ سطوت آرا سے پوچھ رہی تھیں۔ آج وہ بری کا تمام سامان پھیلائے بیٹھی تھیں۔

"کمی کیوں ہو گی نائلہ! ماشاء اللہ اتنا کچھ تو جمع کر لیا ہے آپ دونوں بھابیوں نے، پچیس ریشمی جوڑے، موسم کے مطابق گرمیوں کے سوٹ، میک اپ کا مکمل سامان، پانچ تولے کا سیٹ اور یہ ضروریات زندگی کی تمام چھوٹی موٹی چیزیں سب کچھ تو ہے۔" تمام چیزوں پر ناقدانہ نظریں دوڑاتے ہوئے انہوں نے نائلہ کو تسلی بخش جواب دیا۔ سطوت آرا کا جواب سن کر ملکہ اور نائلہ دونوں مطمئن سی مسکرا دیں۔

"زنیرہ۔۔۔" نائلہ بیگم نے سامنے سے گزرتی زنیرہ کو آواز دی تھی۔

"جی امی۔۔۔" وہ "فوراً" ان کی طرف پلٹی تھی۔

"بیٹا! ذرا اپنے چاچو کو بولو، ادھر ہم ان کو بلا رہے ہیں۔ "فوراً" آ جائیں۔"

"جی امی! میں ابھی چاچو کو بولتی ہوں۔" اس کے جانے کے کچھ دیر بعد راشد ان کے سامنے موجود تھا۔

"بھابھی! آپ نے بلایا؟"

ہاں راشد! آؤ بیٹھو۔۔۔ ہمیں تم سے بات کرنا تھی، تاریخ کے لیے کن کن کو ساتھ لے کر جانا ہے؟"

سوال ملکہ بیگم نے کیا تھا۔
"میں کیا بتاؤں بھابھی! جن کو آپ چاہیں ساتھ لے جائیں۔" انہوں نے سعادت مندی سے کہا۔
"شادی تمہاری ہے' یہ بات تم ہی طے کرو اور ویسے بھی لڑکی کے کون سا ماں' باپ بیٹھے ہیں' بے چاری بالکل اکیلی ہے' تایا کی بیٹی شادی کر رہی ہے۔ انہوں نے زیادہ لوگوں کو بلانے کا نہیں کہا۔" وہ کہنا کچھ چاہ رہی تھیں' مگر کہہ نہ پا رہی تھیں۔
"ملکہ! یہ سب چھوڑیں۔ راشد! تم بتاؤ زویا کو لے کر جانا ہے یا نہیں؟" سطوت آرا نے یہ پوچھ کر گویا ملکہ کی مشکل آسان کردی۔
"زویا کو... ہاں باجی اسے بھی لے کر جائیں۔ اچھا ہے سب مل کر جائیں' وہ بھی دیکھ لے..." راشد نے کہا۔
"ہمیں اسے لے کر جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے راشد! وہ بھی ہماری فیملی کا حصہ ہے' مگر تم بھولو مت۔ زویا نے پہلے کتنی جگہوں سے تمہاری شادی رکوائی ہے اور اس بار ہم نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔ زویا کو پتا نہ لگے' لڑکی کون ہے' کہاں کی ہے۔ ورنہ یہاں تک تمہاری بات نہ پہنچتی۔"
"اور اسے وہاں لے بھی جاتے ہیں تو کیا گارنٹی ہے' وہ کچھ نہیں کہے گی۔ وہ ضرور بھس میں چنگاری والا کام کرے گی۔ تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ اب بات کافی آگے بڑھ گئی ہے۔ ایسے میں خدانخواستہ کچھ ہوتا ہے تو بدنامی بہت ہوگی..." نائلہ نے خدشہ ظاہر کیا۔
کچھ پل کے لیے وہ چاروں خاموش بیٹھے رہ گئے۔ پھر کچھ توقف سے راشد گویا ہوا۔
"آپ کی بات بھی درست ہے۔ مگر بھابھی یہ بھی مناسب نہیں لگتا' ہم اگر زویا کو نہ بلائیں تو زویا ہی کیا' وقار بھی برا مانے گا۔ ایسا کرتے ہیں ہم انہیں سرسری سا بلاوا دیتے ہیں اور مجھے نہیں لگتا۔ زویا جانے کے لیے تیار ہوگی۔ وہ خود ہی انکار کردے گی۔"
راشد کی بات میں دم تو تھا۔ اسی لیے ان تینوں نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔
"جی تو اب میں جاؤں۔" راشد اجازت طلب نگاہوں سے ان کی طرف متوجہ تھا۔
"ہاں جاؤ..."
راشد سرہلاتا کمرے سے جاچکا تھا۔ نائلہ اور ملکہ مل کر سامان سمیٹ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ سطوت آرا سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ان لوگوں کے اندازے کے برخلاف زویا ان کے سرسری بلاوے پر بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی تھی۔
وہ لوگ اپنی بات میں خود پھنس چکے تھے۔
مگر اب کیا ہی کیا جاسکتا تھا۔ سو نا چار تاریخ طے کرنے وہ زویا کے ساتھ لڑکی والوں کے گھر پہنچ چکے تھے۔ جہاں ان کا استقبال اچھے انداز میں کیا گیا تھا۔
ان کے ساتھ آنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ بس گھر کے مرد اور خواتین شامل تھیں۔ لڑکی کے گھر میں بھی زیادہ رش نہ تھا۔ ان کے گھر کے افراد ہی ان کے استقبال کو موجود تھے۔ سلام دعا کے بعد سب بیٹھک میں بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔
"بیگانی کی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔ ہم سب تو یہاں باتوں میں لگے ہوئے ہیں بھئی جس کی شادی ہے؟ جو اس محفل کی "چیف گیسٹ" ہے اسے تو بلاؤ۔"
سطوت آرا نے خوش گوار انداز میں نسیم (ہونے والی دلہن) کو بلانے کا کہا۔
"باجی وہ تیار ہو رہی ہے' بس آتی ہی ہوگی۔" بینش' نسیم کی تایا زاد بہن نے جواب دیا۔ اس کی بات پر اثبات میں سرہلاتی وہ سب دوبارہ باتوں میں مصروف ہوچکی تھیں۔
زویا خاموش نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔
کچھ دیر بعد نسیم کی آمد ہوئی... سطوت آرا' ملکہ اور

نائلہ نے اٹھ کر اسے پیار کیا اور اپنے ساتھ بٹھالیا۔ وہ کچھ دیر ہی ان کے ساتھ بیٹھی' پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔
کھانا لگنے کی اطلاع پر وہ سب بیٹھک سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئے۔ ملکہ اور نائلہ جواب تک زویا پر نظر رکھے ہوئی تھیں۔ ڈائننگ روم میں آنے کے بعد ذرا سی نظر اس سے چوکی اور وہ اپنا کام دکھا گئی۔
وہ سب کھانے میں مصروف تھے۔ زویا واش روم کا بہانہ کرکے وہاں سے ہٹ گئی اور کچن میں جا پہنچی۔ جہاں بینش کھانا ڈشز میں نکالنے میں مصروف تھی۔
"آپ کا واش روم کدھر ہے؟" وہ بات کرنے کا بہانہ چاہتی تھی۔
"ارے آپ نے باہر کسی بچے کو کہا ہوتا' وہ آپ کو سیدھا واش روم لے جاتا۔" بینش بڑے اخلاق سے پیش آئی تھی۔
"کوئی بات نہیں... سب مصروف تھے تو میں خود ادھر چلی آئی۔"
"ویسے آپ نسیم کی کیا لگتی ہیں؟ وہ واش روم کو بھولے تفتیش کا آغاز کرچکی تھی۔
"میں نسیم کی تایا کی بیٹی ہوں۔ نسیم کا بھی کوئی بہن بھائی نہیں اور میرا بھی کوئی بہن بھائی نہیں۔ نسیم کے والدین کا انتقال ہوا تو میں اسے اپنے پاس لے آئی تھی۔" بینش نے تفصیل سے بتایا۔
"اچھا... اور اب آپ اس کی شادی کرکے یہ بوجھ اتارنا چاہتی ہیں۔" زویا نے چالاکی سے پتا پھینکا تھا۔
"بوجھ... ارے نہیں' نہیں۔ نسیم مجھے اپنی بہن کی طرح عزیز ہے۔ اس کی شادی کی عمر ہوگئی ہے۔ اس لیے شادی کر رہے ہیں۔" اس نے زویا کی تصحیح کی تھی۔
"آپ کو بہن کی طرح عزیز ہے' پھر بھی اپنی کنواری بہن کی شادی طلاق شدہ آدمی سے کر رہی ہیں۔" زویا کھل کر سامنے آئی تھی۔ بینش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"آپ کون ہیں...؟" زویا پہلی مرتبہ ان کے گھر آئی تھی اور آج تعارف کے دوران بھی بینش نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اسی لیے اس سے سوال کرلیا۔
"زویا ہوں راشد کی سالی بھی اور چھوٹی بھابھی بھی..." زویا نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔
"راشد کی پہلی بیوی کی بہن..." بینش کا لہجہ بہت دھیما تھا۔
"جی ٹھیک پہچانیں آپ..."
"آپ کی بہن نے طلاق کیوں لی تھی؟"
"میری بہن نے طلاق نہیں لی' راشد نے خود دی' وہ اسے ساتھ ہی نہیں رکھتا تھا۔ شاید اسے عورت ذات کا ساتھ پسند نہیں ہے۔ جب بھی میری بہن اس کے ساتھ رہنے آتی' وہ بہت لڑتا اور مار پیٹ کر واپس امی کے گھر بھیج دیتا... اور پھر خود ہی طلاق دے کر فارغ کردیا اور اب آپ کی طرح میری جٹھانیاں بھی اس کی ذمہ داری اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہیں۔ جب ہی اتنی اتاؤلی ہو رہی ہیں' اس کی شادی کرانے کو۔"
زویا نے غلط بیانی کی انتہا ہی کردی تھی۔
"اچھا میں واش روم جاتی ہوں۔" وہ اپنا کام کرچکی تھی' اس لیے شان بے نیازی سے بینش کو خاموش چھوڑ کر اس کے بتائے راستے کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

جب سب کھانا کھاچکے تو سطوت آرا نے تاریخ کا مطالبہ کیا۔
"معاف کرنا سطوت بہن! ہمیں ایسا کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔ مگر اب یہ شادی ممکن نہیں ہے۔" بینش نے گویا دھماکا کیا تھا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔
"آج ایسے موقع پر انکار کیوں؟" سب کے لبوں پہ یہی ایک سوال تھا۔
"لیکن کیوں... کیوں بینش؟ گھر بلا کر ایسے انکار۔ یہ ہماری بے عزتی کر رہی ہو تم... کیا ہم اس انکار کی وجہ

جان سکتے ہیں؟"

ملکہ بیگم سراپا سوال بنی کھڑی تھیں۔

"انکار کی وجہ تو آپ سب خود بھی جانتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے ہم سے چھپایا گیا اور ہم نے شرافت میں راشد کے متعلق ذرا سی بھی چھان بین نہیں کروائی۔ یہ تو بھلا ہو زویا کا جس نے عین وقت پر ہمیں حقیقت سے آگاہ کردیا۔ یہ ہمیں حقیقت سے آگاہ کردیتی' اسی لیے آپ لوگ آج تک اسے اپنے ساتھ نہیں لائے..." بینش وہ بول رہی تھی جو اس کے کانوں میں ڈالا گیا تھا۔ بدگمانی کی دبیز چادر اس کی عقل پر پڑ چکی تھی۔ وہ کچھ بھی سننے اور سمجھنے کو تیار نہ تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے بینش... یہ زویا۔" سطوت آرا' زویا کی طرف پلٹی تھیں۔

"زویا! تم باز نہیں آئیں نا اپنی فطرت سے... کیوں ہمیشہ غلط بیانی کرتی ہو تم... تمہاری یہ مجال تم ایسے موقع پر اپنے رنگ دکھاؤ۔ ابھی اور اسی وقت ہمارے سامنے جو حقیقت ہے وہ بتاؤ۔" سطوت آرا کے انداز میں ذرا سی بھی لچک نہ تھی۔ مگر وہ زویا ہی کیا جو ڈر جائے' وہ اپنے نڈر انداز میں پھر سے زہر اگلنے کو تیار تھی۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ راشد میری بہن سے کتنا لڑتا تھا' اس سے ناراض ہو کر گھر بیٹھا رہتا تھا۔"

"چھوٹی موٹی لڑائی ہر گھر میں ہوتی ہے زویا! اور میاں بیوی کے رشتے میں بھی لڑائی ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے اور راشد نہیں' تمہاری بہن خود اپنی مرضی سے اپنی ماں کے گھر رہتی تھی' راشد نے کبھی ایسا کرنے کو نہیں کہا۔

بینش! یہ جو کچھ بھی اس نے کہا ہے' سب غلط ہے۔" سطوت آرا بات کو سنبھالنے کے چکر میں تھیں مگر معاملہ ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

"نہیں بہن! ہماری طرف سے معذرت قبول کریں۔" بینش کی طرف کوئی لچک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"اب میں خود بھی یہاں شادی کرنا نہیں چاہوں گی۔ بہتر ہوگا آپ لوگ عزت کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔" خود نسیم کے منہ سے ایسے کلمات سن کر سطوت آرا چپ کی چپ رہ گئیں۔

باقی سب ابھی تک خود کو اس صدمے سے نکال ہی نہیں پا رہے تھے۔ یہ یکدم سے کیا ہو گیا۔ سب کے سب خاموش بیٹھے رہ گئے۔

نسیم کے پیچھے اس کے گھر والے بھی انہیں ڈرائنگ روم میں اکیلا چھوڑ کر جا چکے تھے۔

اور گھر آئے مہمان کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی کی بات اور کیا ہوگی کہ میزبان خود انہیں گھر سے نکلنے کا کہہ کر چلے جائیں۔"

"زویا..." اکرم صاحب کی پکار غیظ و غضب سے بھری ہوئی تھی۔ "تم وہ سانپ ہو جسے ہم اپنی آستین میں پال رہے ہیں..."

"مجھے کچھ مت کہئے گا بھائی صاحب..." وہ بدتمیزی سے بولی۔

"میری بہن کی زندگی برباد کر کے اپنے بھائی کے سر پر سہرا سجانے چلے ہیں آپ لوگ... بہت کوشش کی نا آپ لوگوں نے مجھ سے چھپانے کی... ہوا تک نہ لگنے دی مجھے... اسی لیے ساتھ آنے کے لیے تیار ہوئی تھی میں... میری بہن کو خوشی نہیں ملی تو خوش میں راشد کو بھی نہیں رہنے دوں گی۔" اپنی بات کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں ہتن فن کرتی اکیلی ہی وہاں سے نکل گئی۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

ان سب نے بنا کچھ بولے اپنا سامان سمیٹا اور واپس گھر آ گئے۔

☼ ☼ ☼

پھر جس جس نے یہ سنا حیرت سے دنگ رہ گیا۔ زویا ایسا بھی کر سکتی ہے...

چاچی پہلے پیٹھ پیچھے وار کرتی تھیں۔ اب اتنی ہمت ہوگئی کہ سامنے آ کر انتہا کردی...

بینش نے کس کی بات پر یقین کرلیا... زویا ہماری مخالف ہے اور مخالف کبھی اچھا نہیں کہہ سکتا پھر بھی بینش نے یقین کرلیا... حیرت کی بات ہے۔ سب کو اس رشتے کے ٹوٹنے کا بہت دکھ ہوا تھا۔ اور جب یہ سب خود راشد نے سنا تو چند ثانیے تو وہ بولنے کے قابل ہی نہ رہا... اور جب بولا تو بہت سرد لہجے میں بس اتنا کہا۔

"وقار کی شہ پر زویا کی ہمت بڑھی ہے۔ میں آج اور ابھی زویا اور وقار سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔ آئندہ آپ میں سے بھی کوئی مجھے ان سے ملنے کے لیے نہیں کہے گا..."

راشد نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کرلیا تھا۔ ان کے دکھ کا اندازہ ان سب کو تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی اس ٹوٹے ہوئے شخص کو پھر سے جوڑ سکے ہاں بس اتنا ہوا کہ ملکہ اور نائلہ پھر سے لڑکی کی تلاش میں سرگرم ہو گئیں... اور یہ ان دونوں ہی کی محنت کا نتیجہ تھا کہ اس انکار کے ٹھیک دو مہینے بعد وہ دوسری لڑکی ڈھونڈ لینے میں کامیاب ہو گئیں۔

ان کی سب تیاری پہلے سے مکمل تھی اور لڑکی والے بھی جلد شادی کے خواہش مند تھے' اس لیے فوراً ہی رشتہ طے پا گیا۔ اس بار زویا اور وقار کو بلانے کی بھی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی تھی۔

لڑکی یہ بھی مڈل گھرانے سے تعلق رکھتی تھی' اسی لیے مقررہ تاریخ پر سادگی سے راشد اور ملیحہ کی شادی ہو گئی۔ اور اب ملیحہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر راشد کے گھر پہنچ چکی تھی جہاں بڑوں کے ساتھ پوری بچہ پارٹی نے بھی کھلے دل اور پھیلی بانہوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا تھا۔ اس شادی پر سب سے زیادہ خوش گڑیا تھی۔

"یہ والی چاچی بالکل ٹھیک میچ کرتی ہیں ہمارے آئیڈیل چاچو کے ساتھ... پرفیکٹ جوڑی..." وہ جتنی خوش تھی' اس کا اظہار بھی دل کھول کر کر رہی تھی۔

تمام رسموں کی ادائیگی کے بعد ملیحہ کو راشد کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا' اور اب راشد گھونگھٹ میں چھپی ملیحہ کے سامنے براجمان تھا۔

دھیرے سے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر منہ دکھائی کے نام پر سونے کی خوبصورت سی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

"آپ اور میں زندگی کی نئی شروعات کرنے جا رہے ہیں مگر اس سے پہلے میں چاہوں گا اگر آپ کے دل میں میری گزشتہ زندگی کے متعلق کوئی سوال ہے تو آپ ابھی مجھ سے پوچھ کر کلیئر کریں۔ میں نہیں چاہتا نئی زندگی کی شروعات کے ساتھ آپ کے دل میں کوئی سوال پھانس کی طرح چبھتا رہے..."

ملیحہ نے دھیرے سے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں' پوچھیں آپ جو پوچھنا چاہتی ہیں..."

کچھ بولنے کو وا ہوتے اس کے لبوں کو دیکھ کر راشد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گویا اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

"آپ نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق کیوں دی...؟"

اس کے سوال کو سن کر راشد ایسے مسکرایا جیسے وہ جانتا ہو' ملیحہ کی طرف سے یہی سوال ہوگا...

"شہناز میری بیوی تھی اور ہر نارمل انسان کی طرح میں نے بھی شادی سے پہلے ایک اچھی اور خوشگوار زندگی گزارنے کا خواب دیکھا تھا۔ مگر شادی کے پہلے دن ہی میرا خواب ٹوٹ گیا۔ شہناز ایک ہٹ دھرم اور ضدی عورت تھی پہلے دن میں نے اس سے کہا۔

"تم اپنی امی کے گھر شام میں میرے ساتھ چلنا۔ وہ یہ سن کر شدید غصہ میں آ گئی اور چیخنے لگی۔

"کیا میں آپ کی وجہ سے اپنی ماں سے نہ ملوں... میری ماں وہاں میرے انتظار میں ہوگی۔" میں خاموش ہو گیا۔ یہ پہلا دن تھا۔

"پھر ہمیشہ اسے میری باتوں سے اختلاف رہا۔ وہ ہمیشہ اپنی مرضی کرنا چاہتی تھی۔ یہاں سے زیادہ وہ اپنی ماں کے گھر رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کی بہن میری بھابھی تھی۔ اس نے بھی کئی بار سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ شاید میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔

پھر ایک دن وہ اپنی ماں اور اپنے بھائیوں کے ساتھ آئی طلاق کا مطالبہ کیا اور اپنا سامان اٹھا کر چلی گئی۔۔۔۔"
راشد سب کہہ کر خاموش ہو گیا۔۔۔ کچھ پل اسی خاموشی کی نذر ہو گئے۔۔۔ جب ملیحہ نے راشد کے ہاتھوں میں دبے اپنے ہاتھوں کو جنبش دے کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور واقعی راشد سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
"میں لڑائی جھگڑے سے دور ایک پر سکون زندگی چاہتا ہوں۔۔۔ کیا اس میں آپ میرا ساتھ دیں گی۔۔۔؟"
"جی! آپ ہمیشہ مجھے اپنے سنگ پائیں گے۔۔" ملیحہ نے اسے اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا۔
راشد پر سکون سی ہنسی ہنس دیا۔۔۔

☼ ☼ ☼

راشد، ملیحہ کے سنگ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہا تھا، اس کی شادی کو پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ اسی لیے آج ملیحہ اپنی دونوں جٹھانیوں نائلہ اور ملکہ کے ہمراہ سردی کے کپڑوں کی خریداری کے لیے بازار آئی ہوئی تھی۔
جب وہ ایک دکان میں داخل ہوئیں تو ملکہ کی نظر نسیم اور بینش پر پڑی۔ ملکہ نے ایک دم ہی نائلہ کو ان کی طرف متوجہ کیا تھا۔ دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ایسے سر ہلایا جیسے وہ آپس میں کسی بات پر متفق ہو گئی ہوں۔۔۔ ملکہ نے ملیحہ کا ہاتھ پکڑا اور بینش کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
"السلام علیکم بینش کیا حال ہے آپ کا۔۔۔؟"
بینش اور نسیم چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔
"کیا ہوا پہچانا نہیں کیا۔۔۔؟ ہم وہی ہیں جو نسیم کے رشتے کے لیے آئی تھیں میں ملکہ یہ نائلہ۔۔۔۔" اپنے تعارف کے ساتھ انہوں نے سوال بھی داغ دیا۔
"نسیم کی شادی ہو گئی کیا۔۔۔؟"
کچھ زیادہ عرصہ تو نہ گزرا تھا جو بینش ان کو بھول جاتی۔۔۔ مگر ان کے اس طرح تعارف کرانے پر وہ کھسیا سی گئی۔
"جی جی ملکہ بہن! میں جانتی ہوں آپ اور نائلہ کو۔۔۔ اور نسیم کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔۔۔"
"اچھا مگر آپ اس کو نہیں جانتیں، یہ ہمارے راشد کی دلہن ملیحہ ہے۔ ماشاء اللہ پانچ مہینے ہو گئے ہمارے راشد کی شادی کو۔۔۔" ملکہ بیگم نے نامحسوس انداز میں ملیحہ کو نسیم کے سامنے کھڑا کر دیا۔ مکمل نسیم بھی تھی مگر وہ اپنے قد کی وجہ سے ملیحہ کے سامنے دبی ہوئی لگ رہی تھی۔
"اچھا۔۔۔" بینش بس اتنا ہی کہہ پائی۔ شاید وہ اپنے پچھلے رویے پر شرمندہ تھی۔
"میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں بینش۔۔۔ اور ملیحہ سے متعارف کرانے کا بھی کوئی خاص مقصد نہیں، میں نے آپ کو اس دن بھی یہی سمجھانا چاہا، اور آج بھی وہی کہوں گی۔ کبھی کسی کی بات پر اس وقت تک یقین نہ کریں جب تک خود سچائی کو آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔ کانوں سے سن نہ لیں۔۔۔ میں نہیں جانتی ثوبیہ نے آپ کو کیا کچھ بتایا۔ مگر آج ملیحہ اس بات کا ثبوت ہے کہ راشد ایک اچھا لڑکا ہے، جو واقعی ایک اچھی لڑکی ڈیزرو کرتا تھا۔ اس میں کوئی خرابی ہوتی تو ہم خود ہی اس کی شادی کے لیے نہ پھرتے۔۔۔ خیر! نسیم راشد کے نصیب میں نہ تھی تو آپ اور میں کیسے ان کو ملا سکتے تھے۔ مگر آئندہ زندگی میں میری بات کو ذہن میں رکھ کر کوئی فیصلہ کیجیے گا۔۔۔"
ملکہ سوچ کا ایک نیا در ان کے ذہنوں میں کھول کر جس طرح آئی تھی، اسی طرح ملیحہ کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ گئی۔۔۔ پیچھے نسیم اور بینش خاموش کھڑی ان کے بڑھتے قدموں کو دیکھتی رہ گئیں۔۔۔

عنیزہ سید

اس نے دھلے ہوئے کپڑے نچوڑ کر الگنی پر پھیلانے کے بعد سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان کا رنگ ہلکا نیلا تھا اور اس پر کہیں کہیں بادلوں کا ڈیرا تھا۔ فضا میں اکتا دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جسے کبھی کبھی کسی درخت پر بیٹھا اکادکا پرندہ اپنی آواز سے لمحہ بھر کے لیے توڑتا تھا اور اس کے خاموش ہو جانے کے بعد دوبارہ وہی خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس نے گھر کی بلندی سے نیچے ڈھلوان پر اگی جھاڑیوں اور خودرو بوٹیوں میں چھپے ننھے خرگوشوں کو تلاشنا چاہا جو اکثر ان جھاڑیوں اور بوٹیوں کے اندر ہی اندر ادھر سے ادھر چھلانگیں لگاتے تھے اور ان کی ان چھلانگوں کی وجہ سے کبھی کبھار سرسراہٹ کی آواز ابھرتی اور خاموشی کی فضا کو توڑ دیتی تھی۔ مگر اس دن شاید یہ خرگوش بھی اکتا کر کہیں اپنے بلوں میں جا سوئے تھے۔

کچھ دیر اس ساکت فضا پر غور کرنے کے بعد اس نے بالٹی میں موجود پانی ان جھاڑیوں پر اچھالا اور واپس کمرے میں جانے کے لیے مڑی۔

"ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔" اسی دم ساکت فضا کو

مکمل ناول

ایک تیز‘ نوکیلی اور باریک آواز نے توڑا۔ صباحت کا دل ایک دم ڈول گیا۔

”لو۔۔۔ اس کی کسر باقی رہ گئی تھی۔“ اس نے لرز کر سوچا۔ ”دو دن سے اس منحوس سے چھٹکارا ملا ہوا تھا‘ پھر آگیا۔“

”ٹویٹ‘ ٹویٹ‘ ٹویٹ۔“ چیختی‘ نوکیلی تیز آواز سارے آسمان پر پھرتی سنائی دے رہی تھی۔ صباحت نے تلاشتی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔

”اور مجال ہے کم بخت کہیں نظر آجائے۔ اللہ جانے ہوتا کہاں ہے۔“ وہ دل ہی دل میں اس نادیدہ شے کو کوسنے دے رہی تھی جو فضا میں اس ارتعاش کا باعث بنی کانوں کو ناگوار گزر رہی تھی۔

”صباحت!“ اسے اندر سے شائے ماں کی آواز سنائی دی۔

”جی۔۔۔“ اس نے وہیں سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے جواب دیا۔ عقب سے قدموں کی آواز قریب آنے لگی۔

”صباحت!“ شائے ماں نے دروازے میں کھڑے کھڑے باہر جھانکا۔

”وہ تو آج پھر پکارتا پھر رہا ہے۔“ انہوں نے بھی آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”لو! اس کی پکار پڑی اور بادل جھومنے لگے۔ جلدی کرو بیٹا! کپڑے اتارنے کی کرو۔“ انہوں نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

اور ایسا ہی ہوا‘ پل کے پل میں آسمان پر کہیں کہیں بکھرے بادل جمع ہو کر دبیز چادر بنے اور چھم چھم برسنے لگے۔ صباحت نے بھاگ کر کچھ دیر پہلے پھیلائے کپڑے الگنی سے اتارے اور گیلے کپڑوں کا ڈھیر کندھے پر اٹھائے اندر آتے آتے اپنے بھیگے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے ایک بار پھر اس نادیدہ منحوس کو دل میں جی بھر کر کوسا‘ جس کی پیاس کسی طور بجھتی ہی نہ تھی اور جو ایک دن کا سوکھا مطلع دیکھ کر پکار ڈالنے آجاتا تھا۔

ٹویٹ ٹویٹ ٹویٹ۔

”پیاس‘ پیاس‘ پیاس۔“ رومی نے شائے ماں سے یہ سن کر کہ یہ بارش کا پرندہ ہے‘ جو سوکھے موسم میں پیاسا ہو کر پانی کے لیے پکارتا ہے۔ اس کی نوکیلی چیخ جیسی آواز کا اردو ترجمہ کر رکھا تھا۔

”ٹویٹ‘ ٹویٹ کا مطلب ہوا پیاس‘ پیاس۔“ وہ اس کی آمد پر ہنس کر کہتا اور صباحت پر دوہری جھنجلاہٹ سوار ہو جاتی۔

”بارش کا نہیں‘ یہ نحوست کا پرندہ ہے۔“ وہ غصے میں آکر کہتی۔

”کم بخت ہر وقت اپنی نحوست پھیلائے رکھتا ہے۔ اس کی نہ بجھنے والی پیاس نے اس جگہ کو چراپونجی بنا رکھا ہے اور آئے روز کی بارش نے ہر سمت نمی کا راج بنا دیا ہے۔ ہر چیز نم۔۔۔ ہر طرف دیمک کی بنائی لڑیاں لٹک رہی ہیں۔ کپڑے دھو کر ڈالو‘ دس دن سوکھنے میں لگ جاتے ہیں۔ بستر پر لیٹو لگتا ہے واٹر بیڈ پر دراز ہو گئے ہیں۔ اس منحوس کا کوچ بھی نہیں ہوتا‘ اس علاقے سے کہیں اور۔۔۔ کم بخت ادھر کا رخ کیوں نہیں کرتا‘ جدھر سوکھا پڑتا ہے اور لوگ بارش کی بوندوں کو ترس جاتے ہیں۔“

وہ باورچی خانے میں کام کرنے کے دوران چیزیں پٹخ پٹخ کر رکھتے ہوئے سوچتی اور گاہے بگاہے باورچی خانے کی لان میں کھلنے والی کھڑکی سے باہر نظر ڈالتی۔ شاید تواتر سے گرتی بوندیں کہیں تھم گئی ہوں‘ مگر اس کو اکثر مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ گھاس کے نیچے پہلے سے نم مٹی‘ مزید بارش سے کیچڑ میں تبدیل ہوتی اور کہیں سے ہری‘ کہیں سے زرد گھاس شکست کھائی فوج کی طرح سر نہوڑائے کیچڑ اور پانی میں ڈوبنے لگتی۔ گھاس کے اس قطعے کے اردگرد لکڑی کی باڑھ لگا کر گھر کی حدود کا تعین کیا گیا تھا۔ اسی باڑھ کے وسط میں لکڑی کا چھوٹا سا گیٹ لگا تھا۔ اس باڑھ کے پار برستی بارش میں اپنے کام کاج پر نکلے لوگوں کے رنگ برنگے چھاتے ادھر سے ادھر آتے جاتے نظر آتے۔

”ہر چیز بھیگی ہوئی۔۔۔ انسان‘ حیوان‘ چرند‘ پرند۔“ وہ سبزی کی ٹوکری سے چھلکے کوڑا دان میں منتقل کرتے ہوئے بولی۔

”ہماری تو نظریں‘ کان اور اعصاب اس موسم کے برسہا برس سے عادی ہیں۔“ شائے ماں نے مربے اور چٹنی کے جار ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”ان جاروں کو گاہے بگاہے ہلا دیا کرو۔ جالا پڑنے لگتا ہے۔“ انہوں نے عینک درست کر کے جاروں کے اندر جھانکتے ہوئے کہا اور چیک پرنٹ والے کپڑے کے خصوصی کور جاروں کے منہ پر جما کر اسی کپڑے سے بنے تسموں سے انہیں باندھ دیا۔

”موسم اتنا گیلا ہے کہ ہر چیز میں جالا پڑنے لگتا ہے۔ دالوں کے ڈبے دیکھیں‘ میدے اور بیسن کے جار دیکھیں‘ مسالوں کی شیشیاں کوئی چیز ایسی نہیں جسے روزانہ کھول کر نہ دیکھنا پڑے‘ آدھے سے زیادہ دن اسی کام میں گزر جاتا ہے۔“ صباحت نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کچن کیبنٹ سے مختلف چیزوں کے ڈبے نکال نکال کر شائے ماں کے سامنے رکھنے لگی۔

”صالحہ میں کمال کا سلیقہ تھا بھئی۔“ شائے ماں ایک بار پھر ناک پر عینک جما کر ڈبوں میں بند چیزیں دیکھنے میں مصروف ہوئیں۔ ”وہ ایسی چیزوں میں سیاہی چوس کاغذ (بلاٹنگ پیپر) کاغذ کے ٹکڑے رکھتی تھی۔ مسالوں کے ڈبوں میں کچے چاولوں کے چند دانے ڈال دیا کرتی تھی۔ کچھ نہ کچھ بچت تو ہو ہی جاتی تھی۔“

”وہ اسی تیرتے علاقے کی مچھلی تھیں نا‘ اس لیے انہیں پتا تھا کہ ساری چیزیں کیسے رکھی جانی چاہئیں۔“ صباحت نے کڑھ کر سوچا‘ مگر جواب دے نہ پائی۔ اسے شائے ماں اور ابی جان کا بڑا لحاظ تھا اور اب اتنے عرصے سے ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ ان سے خاصی مانوس ہو چکی تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ شائے ماں کی ان باتوں کا مقصد صالحہ امی کو سلیقہ مند اور صباحت کو پھوہڑ ثابت کرنا نہیں تھا۔ ہاں! دو نسلوں کے سوچنے اور کام کرنے کے انداز کا تقابلی جائزہ لینا ان کا مشغلہ تھا۔

اسی لیے شائے ماں کی باتیں اسے تکلیف نہیں دیتی تھیں۔

”آپ کے اور ابی جان کے جوڑوں کے درد کی بنیادی وجہ بھی یہ موسم ہی ہے۔“ صباحت نے کٹی ہوئی پالک سنک کی ٹونٹی کی دھار کے نیچے رکھ کر دھوتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ تو نہ کہو۔“ شائے ماں نے دالوں کے ڈبوں کے ساتھ کوئی ٹوٹکا آزمانے کے بعد ان کے ڈھکن بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم نے خود اپنے سے پہلی نسل کو اسی جگہ پر بڑھاپے میں توانا‘ صحت مند اور ہشاش بشاش دیکھا ہے۔“

”پتا نہیں۔“ صباحت نے ٹونٹی بند کی اور چولہے کی طرف بڑھی۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے‘ میں چند سالوں میں ہی اس نم آب و ہوا کے زیر اثر چھڑی لے کر چلنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔“

”چھڑی تو میں بھی ”شغلاً“ اور ”عادتاً“ ہی ہاتھ میں پکڑتا ہوں۔“ باورچی خانے کے دروازے پر کھڑے ابی جان نے اس کی بات سنی اور اندر آتے ہوئے کہا۔

”بھئی! ایک کپ گرم چائے پلوا دو تو کئی نیکیاں

تمہارے کھاتے میں لکھے جانے کی دعا کروں گا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی فولڈنگ چیئر کھول کر اس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"موبی کے اسکول سے آنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ اسے کھانا تو بنا لینے دو۔" شائے ماں نے ابی جان کو یاد دلایا۔

"ارے نہیں شائے ماں! میں ایک چولہے پر ککر رکھتی ہوں۔ دوسرے پر چائے بنا لیتی ہوں۔ چائے تو منٹوں میں بن جاتی ہے۔" اس نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔

"دراصل تم صحراؤں کی باشندہ تھیں۔ جب ہی تمہیں یہ بھیگا موسم ناگوار گزرتا ہے۔" ابی جان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"صحراؤں کے پیاسے تو پانی کی بوندوں کو ترستے ہیں ابی جان!" اس نے قہوہ چائے کی پیالی میں چھانتے ہوئے کہا اور ٹی وانٹنر کا ڈبا پیالی کے ساتھ ٹرے میں رکھ کر ان کے سامنے سلیب پر ٹرے رکھ دی۔

"آج کل کے جدید انسان نے کچھ صحراؤں کو بھی نخلستان میں بدل کر رکھ دیا ہے۔" ابی جان قہوے میں شکر ڈال کر ہلاتے ہوئے بولے۔ "صحرا کا جو حصہ خلیجی ریاستوں کو اپنے سینے پر اٹھائے کھڑا ہے' وہ صحرا کا کم اور نخلستان کا منظر زیادہ پیش کرتا ہے۔"

"نخلستان تو چھوٹا لفظ ہے' جنت کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔" شائے ماں نے ڈبوں کے اندر نظر ڈالتے اور سیلن سے ان کو بچانے کے اقدامات کرنے کے بعد انہیں واپس کیبنٹ میں جماتے ہوئے کہا اور پالک کے باریک کٹے پتوں پر چمکتے پانی کے قطروں کو دیکھتے ہوئے صباحت کو اپنا دبئی بری طرح یاد آگیا۔ اپنا دبئی جواب اس کا دبئی نہیں رہا تھا' صحرا میں منگل کا منظر پیش کرتا تھا۔ اس کو اس دبئی سے پاکستان کے اس دور دراز پہاڑی علاقے میں آکر بسے اب تو کئی سال گزر چکے تھے' مگر نہ وہ اپنے دبئی کو اب تک بھلا پائی تھی' نہ اس نم آب و ہوا والے علاقے کو اپنا بنا سکی تھی۔

اسکول سے موبی کی واپسی تک وہ کھانا بنا چکی تھی۔

موبی کے آجانے پر اس نے روٹیاں بنائیں اور میز پر کھانا لگانے کے بعد ایک نظر دوبارہ کھڑکی سے باہر ڈالی۔ پانی کے قطرے گرنا بند ہو چکے تھے۔ بس درختوں میں چھپے پرندوں کی اڑان اور واپس آکر درختوں کی شاخوں پر بیٹھنے کے عمل سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے بھیگے پتوں سے قطرے گرتے تھے اور پھر رک جاتے تھے۔ برآمدے میں موبی کے گیلے جوتے اور جرابیں رکھی تھیں۔ آج اسکول میں گیمز ڈے تھا' جو یقینا" اس بارش کی وجہ سے انڈور گیمز تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہوگا۔ اس نے برآمدے میں جوتوں کے ساتھ لیٹے موبی کے بیٹ کو دیکھتے ہوئے سوچا اور اسے خیال آیا کہ موبی بھی کرکٹ میچ نہ ہونے کی وجہ سے کتنا مایوس ہوگا۔

"آج میں بہت غصے میں تھا۔" کھانے کے کمرے میں واپس آتے ہوئے اس نے موبی کو شائے ماں سے کہتے سنا۔ "اچھا بھلا سورج نکلا ہوا تھا۔ امتیاز سر نے وکٹیں زمین میں گاڑیں اور اسٹور سے بالکل نیا بال ایشو کروایا۔ ڈیوکس کا بال تھا' اصلی کارک بال۔" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے شائے ماں سے مخاطب تھا۔ "میں اپنا بیٹ پکڑے پچ کی طرف جا ہی رہا تھا کہ آسمان سے وہی آواز آنے لگی' ٹویٹ ٹویٹ.... بس جی میں نے کہا لو کام خراب ہوگیا۔" اس نے ایک ہاتھ کا مکا بنا کر دوسری ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" شائے ماں نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو! اب اپنا غصہ دور کرلو۔ صباحت نے تمہارا فیورٹ پالک گوشت بنایا ہے اور بغیر کانٹوں کے مچھلی بھی فرائی کی ہے۔ یہ اچھا سا لنچ تمہارا موڈ ٹھیک کرنے کو کافی ہے؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"ہوں!" موبی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کافی ہوگا اگر ایپل ٹارٹس بھی بنے ہوں چائے کے ساتھ کھانے کو...."

"کوئی ایپل ٹارٹس نہیں بنے۔" صباحت نے جل کر کہا۔ "صبح سے چیزیں اندر باہر کرتے یہ وقت آگیا۔ مشکل سے کھانا بنا ہے بس...."

"ٹویٹ ٹویٹ نے آپ کے موڈ کا بھی ستیاناس کردیا نا!" موبی مسکرا کر بولا۔ "آج اس کے آنے کا امکان کم تھا' جب ہی تو کرکٹ میچ کا پروگرام بنایا تھا امتیاز سر نے۔"

"وہ امکان کہاں دیکھتا ہے کہ ہے یا نہیں ہے۔" صباحت نے کہا۔ "جب دیکھو! منہ اٹھائے آدھمکتا ہے' دہائی دیتا ہوا۔"

"وہ مسکین تو یوں ہی بدنام ہو رہا ہے۔" شائے ماں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ "اس علاقے کا موسم شروع سے ہی ایسا ہے۔"

صباحت نے غصے سے سر جھٹکا۔ وہ اپنے اندر پیدا ہو جانے والی بے زاری کو قابو میں نہیں لا پا رہی تھی۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر باورچی خانے میں رکھتے اور کھانے کی میز صاف کرتے اسے لگا' باہر سورج کی کوئی شعاع آنکھیں کھول رہی ہے۔ اس نے تیزی سے اپنے کام نپٹائے اور فضل دین سے برتن دھو کر کچن صاف کرلینے کا کہہ کر باہر برآمدے میں آگئی۔ سورج نے آخر کار آسمان پر چھائے گہرے بادلوں کو پچھاڑ کر اپنی بالادستی قائم کر ہی لی تھی۔ وہ برآمدے سے نیچے لان میں جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

"کپڑے دوبارہ الگنی پر پھیلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" اس نے گھٹنوں کے گرد بازو باندھ کر ان پر سر رکھتے ہوئے سوچا۔ "کچھ دیر بعد تو شام پڑنے لگے گی۔" وہ یونہی گھٹنوں پر سر رکھے سستی سے کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہی۔

ابی جان اور شائے ماں کھانے کے بعد قیلولے کے لیے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ چکے تھے۔ کچن سے کچھ دیر فضل دین کے برتن دھونے اور رکھنے اٹھانے کی آوازیں آتی رہیں' پھر وہ بھی فارغ ہو کر اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا اور فضا پر پھر وہی سکوت چھا گیا۔

"وہی معمول' وہی خاموشی' وہی فضا۔" وہ سستی طاری کیے بیٹھی سوچتی رہی۔ فضا کے سکوت کو پرندوں کی کبھی کبھار اٹھتی آواز توڑتی تھی یا گھنی جھاڑیوں اور بوٹیوں میں چھلانگیں لگاتے خرگوشوں کی آوازیں کانوں میں پڑتیں۔ موبی سورج کی کرنیں دیکھ کر اپنا ممینو' کرکٹ بیٹ اور بال لیے پچھلی طرف نکل گیا تھا' جہاں اردگرد کے گھروں میں رہنے والے اس کے دوست جمع ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی کوئی اور چیز لینے کے لیے وہ گھر میں بھاگتا ہوا داخل ہوتا۔ اس کے بھاگتے قدموں سے کھانے کے کمرے کے لکڑی کے فرش سے دھڑ دھڑ کی آواز ابھرتی اور ان ہی بھاگتے قدموں سے اس کے واپس باہر چلے جانے پر بند ہو جاتی۔

"کیا ہے؟" صباحت نے سر اٹھا کر فضا میں اڑتے اکا دکا پرندوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ "میں کیوں یہاں موجود ہوں۔" اس کے دل پر اکتاہٹ غلبہ پانے لگی۔ "کم مائیگی کا احساس دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نہ اپنے ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے' نہ یہاں موجود ہونے کی تک سمجھ میں آتی ہے۔ جینا نہ ہوا' روز مرہ کے نمٹائے جانے والے کاموں میں سے ایک کام ہو گیا۔"

وہ کافی دیر وہاں بیٹھی اسی طرح کی باتیں سوچتی رہی اور پھر اٹھ کر آہستہ قدموں سے چلتی اندر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"میرا تمہارا جو رشتہ ہے' اس کی کتنی اہمیت ہے اور کیا اہمیت ہے۔" کمرے میں داخل ہونے پر سامنے کی دیوار کے ساتھ رکھے لکڑی کے بھاری کنسول پر سجی تصویر پر نظر پڑنے پر اس نے فوٹو فریم سے جھانکتے اس چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"محض چند ہفتوں کا ساتھ جن کے دوران کچھ لمحے بہت خوش گوار گزرے اور کچھ بوجھل۔ ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کی مشق میں گزرتے چند ہفتے اور پھر ایک طویل نہ ختم ہونے والی جدائی۔" اس نے فوٹو فریم میں جڑے شیشے کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے سوچا۔

"کیا اس طویل بے رنگ' بے خوشبو زندگی کا کوئی انت بھی ہوگا؟" اس نے بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ وعدے کی کوئی زنجیر تو ابھی بندھی ہی نہ تھی کہ جیسے توڑ دینے کا خوف دل میں سمائے میں آگھے

آ کے چلتی چلی جاؤں، پھر بھی زندگی ہے کہ اسی ڈھنگ سے نیچے چلی جارہی ہے۔وہ آنکھوں پر بازو رکھے بستر پر لیٹ گئی۔

غروب ہوتے سورج کی کرنوں نے اپنا زاویہ بدلتے ہوئے اس کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکا اور اس کی شعاعیں براہ راست فوٹو فریم پر پڑنے لگیں۔ شیشے میں مقید شخص کے شانوں پر سجے سنہری پھول ان کرنوں کی روشنی میں نمایاں نظر آرہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں کوچ کے اڈے پر کھڑا ہوں اور مجھے آپ کے گھر پہنچنے کا کوئی ذریعہ میسر نہیں ہو پارہا۔ بتائیں کیا کروں؟" ابی جان نے موبائل فون پر سے یہ پیغام پڑھ کر شائے ماں کو سنایا۔

"تو نکالیں نا آج اپنی فراری۔" شائے ماں نے حسب عادت دوپٹا منہ پر رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "جس کے آگے پیچھے انجن لگے ہیں اور دونوں ہی بے کار ہوئے جارہے ہیں پڑے پڑے۔"

"ہاں ہاں ابی جان! چلیں فوکسی کو دھکا لگاتے ہیں۔" مولی کو بھی ایڈونچر سوجھا۔

"وہ جو چچا جان کوچ کے اڈے پر کھڑے ہیں یا پھر بیٹھے ہیں انہیں جواب لکھ دیں، ہماری فراری اسٹارٹ ہونے میں پون گھنٹہ لیتی ہے۔ اتنی دیر مزید انتظار کریں۔" اس نے ابی جان کے بازو کو بے صبری سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس کے کل پرزے سب زنگ آلود ہو چکے ہوں گے۔" صباحت نے منہ بنا کر کہا۔ "پون تو کیا دو گھنٹوں میں بھی اسٹارٹ ہو گئی تو کہنا۔"

"چلیں نا ابی جان!" مولی نے صباحت کی بات ان سنی کرتے ہوئے ابی جان سے کہا۔ "میں بابا فضل کو بھی بلا لیتا ہوں۔ ارسلان اور حیدر کو بھی آواز دے لیتا ہوں۔" وہ چٹکی بجاتا ہوا باہر کو بھاگا۔

"منیب!" صباحت کو جب مولی کو ڈانٹنا مقصود ہوتا تھا، وہ اس کا پورا نام لیتی تھی۔

"ارے بھئی! کوشش کر لینے دو بچے کو۔ یوں بات بے بات ڈانٹنا اور ہر بات سے منع کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔" شائے ماں نے سلائی کی ٹوکری سے دھاگے کی ریلیں نکال کر بے ترتیب اور الجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھاتے ہوئے کہا۔

"تم اس مسکین کو تو خبر کرو کہ کوشش کر رہے ہو اس تک پہنچنے کے لیے۔" پھر وہ ابی جان سے مخاطب ہوئیں۔

"میں کیسے اطلاع کروں؟ مجھ سے اس کا میسج کھو گیا۔ لو! ابھی تو سب سے اوپر تھا۔ اب نجانے کہاں گم ہو گیا۔" ابی جان آنکھوں پر چشمہ جمائے، فون آنکھوں سے قریب کیے نمبر ڈھونڈ رہے تھے۔

"فون پکڑائیں صباحت کو۔ وہ خود ڈھونڈ لیتی ہے۔ آپ جا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کچھ تدبیر کریں۔" شائے ماں نے کہا۔

"لو بھئی! دیکھو، اس میں ہے کہیں عمر کا نام۔" ابی جان نے اٹھ کر فون صباحت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"ابی جان کے فون کی عمر پوری ہو چکی ہے۔ اسکرین اندھی ہو گئی ہے اور بٹن دبنے کا نام نہیں لیتے۔" صباحت بڑبڑائی۔

"اس کو بھی علاقے کے موسم کی سیلن چڑھ گئی ہے۔" شائے ماں نے صباحت کے کہے بغیر اس کی طرف سے آنے والا اگلا متوقع جملہ بولا اور حسب عادت دوپٹا منہ پر رکھ لیا۔

صباحت نے رد عمل کے طور پر ہلکا سا سر جھٹکا اور کوشش کرنے لگی کہ اسے کچھ دیر پہلے موصول ہوا پیغام مل جائے۔ اس دوران مولی بار بار دوڑتا ہوا اندر آتا اور کسی نئے اوزار کی فرمائش کرتا۔

"پلاس۔"

"رنچ۔"

"پیچ کس۔"

"ہتھوڑی دے دیں۔" آخری چکر میں وہ بلند آواز میں بولا۔

"گاڑی کا دروازہ نہیں کھل رہا کیا؟" شائے ماں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر بیٹھنے لگے ہو۔"

"اوہو!" مولی نے جھنجلا کر کہا اور ایک مرتبہ پھر باہر بھاگا۔ گیراج سے ایک آواز ابھری تھی، جس نے گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ابی جان کی بیٹل، صباحت کی فوکسی، مولی اور شائے ماں کی فراری انگڑائی لیتے ہوئے اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

صباحت نے اٹھ کر کمرے کے دروازے سے باہر جھانکا۔ سب بچے "یاہو" کے نعرے یوں لگا رہے تھے جیسے شاہد آفریدی نے بھارت کے خلاف کسی بڑے ٹورنامنٹ کے فائنل میں چھکا داغ دیا ہو۔

"چلو مولی! جلدی سے سوار ہو جاؤ۔ کہیں پھر سے نہ بند ہو جائے۔" ابی جان ریگتی گاڑی میں مولی کو سوار ہو جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ مولی کے بیٹھتے ہی گاڑی نے پیچھے کی طرف ایک جھٹکا کھایا، پھر چند فرلانگ آگے جا کر رکی ایک چیخ کے ساتھ دوبارہ اسٹارٹ ہوئی اور پھر اس اونچائی کی ڈھلوان سے نیچے اتر گئی جس پر ان کا گھر تھا۔ پیچھے رہ جانے والے مددگار ہاتھ جھاڑتے ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی معرکہ سرانجام دے دیا ہو۔

"میں دھکا نہ لگاتا تا۔"

"اور میں نٹ نہ کستا تا۔"

"وہ تو میں نے دادا جی سے کہا تھا، کلچ پلیٹ ڈھیلی ہے۔" سب اپنی اپنی بولیاں بولتے ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔

صباحت نے اپنا دھیان ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑے فون کی طرف کیا اس کی اسکرین اب روشن ہو رہی تھی مگر سگنل ڈراپ نظر آرہے تھے۔

"چلو جی! اب اس بے چارے کو کیسے بتایا جائے کہ نظام حیدر آباد اپنی شاہی سواری پر خود اسے ریسیو کرنے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔" اس نے دروازے کے فریم سے ٹیک لگاتے ہوئے شائے ماں کو مخاطب کیا۔

"اسے دو میل دور سے خود ہی پتا چل جائے گا کہ شاہی سواری تشریف لا رہی ہے۔ کسی مواصلاتی پیغام کے بغیر ہی۔" شائے ماں نے سب ریلیں سلجھا کر ٹوکری میں ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ مولی آپ کے دھاگے خراب کرتا ہے۔" صباحت ان کے قریب آگئی۔ "کبھی اپنے بلے کے ہینڈل پر لپیٹ رہا ہوتا ہے تو کبھی پولی تھین بیگز سے بنائی پتنگوں کے سوراخوں میں باندھ رہا ہوتا ہے اور یہ سب کرنے کے مشورے فضل دین دیتا ہے۔"

"اب وہ کیا کرے۔" شائے ماں کے مزاج میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ وہ کسی مسئلے سے گھبراتی تھیں، نہ انہیں کسی اول جلول حرکت پر غصہ آتا تھا۔

"کتنی بار تمہارے ابی جان سے کہا ہے اگر یہاں سے پتنگیں نہیں ملتیں تو مجھے گڈی کاغذ اور ڈور لا دیں میں خود اسے پتنگیں بنا دوں گی۔ بچے کا شوق تو پورا ہو جائے۔" انہوں نے کہا۔

"لیں! آپ کو کہاں آتی ہیں پتنگیں بنانی۔ یہ تو بذات خود ایک فن ہے۔" صباحت نے جواب دیا۔

"آتی ہیں۔ میرے ابا کا ایک دوست عبدالمجید نامی شخص پتنگیں بنایا کرتا تھا۔ اس کا خاندان پتنگ سازی کی وجہ سے لاہور بھر میں مشہور تھا۔ جب ہم بہن بھائی چھوٹے تھے، ابا کے ساتھ اس کے گھر جاتے تھے وہاں گڈی کاغذ، گلو اور بید کے باریک تنکوں کے ڈھیر دیکھنے کو ملتے۔ عبدالمجید چاچا پتنگیں بناتے اور ہم دیکھتے تھے۔ کہو تو مختلف قسم کی پتنگوں کے نام بتا دوں تمہیں۔" شائے ماں نے اسے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں! رہنے دیں۔" صباحت نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کروں گی ان کے نام جان کر۔"

"تمہاری اماں کے دہلی میں اسے "کنکوے بازی" کہا جاتا ہو گا؟" شائے ماں نے شرارت بھرے انداز میں صباحت کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں۔" صباحت نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک بار پھر دروازے کے ساتھ ٹکتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ہاں کبھی اس کا ذکر نہیں ہوا۔"

"کوفتوں کے قیمے میں تھوڑا ہی ملا لیا تھا نا' نرم اور پھولے ہوئے بنتے ہیں۔" شائے ماں کو دوسرا سوال یاد آگیا۔

"جی! ڈال لیا تھا۔"

"بریانی کے لیے گوشت کون سا منگوایا تھا؟ سینے کا یا گڈی کا؟"

"جو فضل دین نے لا دیا' وہ ہی ڈال دیا۔"

"وہ سستی کا مارا آدمی ہے۔ سپلائی سے جو ملا ہوگا' اٹھا لایا ہوگا۔" شائے ماں نے مایوسی سے سرہلایا۔ "اچھا خیر! قہوے کے لیے لیموں تو ہوں گے ہی۔"

"جی! ہیں۔" صباحت نے مختصر جواب دیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان بنے راستوں پر آتی جاتی اکا دکا گاڑیاں تقریباً" بے آواز تھیں اور ابی جی کی گاڑی کا دور دور تک نہ نشان تھا' نہ آواز۔

"چلو! تم ایسا کرو' ذرا آرام کرلو۔ ان کا کیا پتا' کب آئیں۔" شائے ماں نے اسے یوں محو انتظار دیکھ کر کہا۔

"میں ایک دفعہ بستر میں گھس گئی تو پھر آپ جانتی ہیں کہ کل ہی کی خبر لاؤں گی۔" صباحت نے کہا۔

"ارے! میں تمہیں جگادوں گی۔ جاؤ! تم جاکر سوجاؤ۔" شائے ماں کے تسلی دینے پر وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس روز واقعی اتنی تھکی ہوئی تھی کہ بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

اس کے ابا کے پاس ایک پرانے ماڈل کی ٹویوٹا کرونا گاڑی تھی اور ایک کرولا انگلش ایڈیشن بھی' مگر ابا نے ان دونوں گاڑیوں کو خاصا سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ماڈلز پرانے ہونے کے باوجود ان کے تمام کل پرزے بالکل ٹھیک اور چلنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ابا کو اپنی ان دونوں گاڑیوں سے شدید انسیت اور پیار تھا۔ اسے یاد تھا کہ پرانی گاڑیوں کے شوقین کئی بار ان کے گھر آئے اور ان دونوں گاڑیوں کے عوض خاصی معقول رقم کی پیشکش کی' مگر ابا ایسی بات سن کر ہی غصے میں آجاتے۔

"اپنا شوق اور محبت کون بیچتا ہے صاحب!" وہ کہتے اور آنے والے پورچ میں کھڑی گاڑیوں کو ہاتھ لگا لگا کر محسوس کرتے اور ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے رخصت ہوجاتے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے خود بھی پرانی گاڑیوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور ابا کی گاڑیوں سے لگاؤ بھی۔ لیکن اس روز اس پہاڑی علاقے کے ویگن اسٹینڈ پر گاڑی کے نام پر جو عجوبہ اسے لینے کے لیے آیا تھا' اسے دیکھنے سے پہلے اس کے کانوں نے ایک فاصلے سے اسے سنا تھا۔

اس سے پہلے کہ اسے اور اس کے ساتھ کھڑے اکا دکا مسافروں کو کچھ سمجھ میں آتا' ایک چینختی' دھاڑتی چار پہیوں پر رینگتی عجوبہ نما چیز اس کے سامنے آکر رک گئی۔ اس نے ذرا جھک کر اس گاڑی نما عجوبے کے اندر جھانکا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر چچا علی امام فخریہ انداز میں اکڑ کر بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ والی سیٹ پر ایک سات سالہ بچہ جس کی آنکھوں سے ٹپکنے والی ذہانت اور شرارت کو اس نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا تھا۔

"معاف کرنا بھئی! تمہیں اتنا انتظار کرنا پڑا۔" چچا علی امام نے گاڑی کے دروازے سے بمشکل باہر آتے ہوئے کہا۔ دروازہ آدھے سے زیادہ نہیں کھل سکتا تھا۔ انہوں نے باہر آکر اسے گلے سے لگالیا۔

"سامان کدھر ہے تمہارا؟"

اس نے قریب رکھے دونوں بیگز اٹھائے۔

"لائیں! مجھے دے دیں۔ میں رکھتا ہوں۔" بچے نے کھڑکی کے شیشے سے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے کہا اور ایک ایک کرکے دونوں بیگ پکڑ کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیے اور پھر چچا علی امام سے مخاطب ہوا۔

"آپ نے انجن بند کردیا۔ اب یہ کیسے اسٹارٹ ہوگی؟"

"اوہو!" انہوں نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "تمہیں پہلے خبردار کرنا چاہیے تھا کہ گاڑی اسٹارٹ رکھنی ہے۔" اب وہ دونوں کسی بحث میں الجھ گئے۔

"مسئلہ کیا ہے چچا؟" اس نے ان دونوں کی بحث میں کودتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی! یہ گاڑی۔" انہوں نے گاڑی کے بونٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "لاکھ جتن کرو' پھر اسٹارٹ ہوتی ہے۔ اب اس موبی کو دیکھو! اسے پتا تھا' کس طرح یہ اسٹارٹ ہوتی ہے۔ مجھے یاد دلاتا رہتا کہ بند نہیں کرنی۔ نہ اس نے یاد دلایا' نہ مجھے یاد رہا۔ اب اس کو دوبارہ اسٹارٹ کرنا ایک کار دارد ہے۔" انہوں نے کسی مددگار کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریں! میں دیکھتا ہوں۔" عمر نے گاڑی کی ڈکی کا ڈھکن اٹھایا۔ گاڑی میں بیٹھا بچہ ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے سے باہر نکلا اور اس کو مدد کی پیشکش کرنے لگا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی زور آزمائی کے بعد بالآخر گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ عمر کے چہرے' ہاتھوں اور کپڑوں پر گریس اور سیاہی کے اچھے خاصے نشان لگ چکے تھے۔ گاڑی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں سوار ہونے والوں کے لیے صرف ڈرائیونگ سیٹ کا آدھا دروازہ کھلتا تھا اور سب کو ادھر ہی سے اندر داخل ہونا پڑتا تھا۔ سو گاڑی میں بیٹھنا بھی ایک اچھا خاصا مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ ان تینوں کے بیٹھ جانے کے بعد گاڑی نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ اسٹارٹ لیا اور پھر ادھر ادھر ڈولتی گھر کے راستے پر چلنے لگی۔

"میں اور شائے ماں اس کو "فراری" کہتے ہیں۔" بچے نے پیچھے مڑ کر عمر کو مطلع کیا۔ عین اس کی ناک پر لگی سیاہی دیکھ کر عمر کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"اور ابی جان کہتے ہیں یہ "بیٹل" ہے "بیٹل۔" بچہ مسکرایا۔

"ہاں! "بیٹل" تو یہ ہے۔" عمر نے سرہلا کر کہا۔

"پھر اسے "فوکسی" کیوں کہا جاتا ہے؟" عمر ہلکے سے مسکرایا اور بچے کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

"چلو! تمہیں تفصیل سے بتائیں گے' اسے "فوکسی" کیوں کہتے ہیں اور یہ "بیٹل" کیوں ہے۔"

اور شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ سالوں بعد چچا علی امام کے پاس آیا تھا اور اس چھوٹے سے پہاڑی علاقے کے مخصوص راستے اور جانے پہچانے منظر دیکھ کر اسے لگ رہا تھا' جیسے وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

"ان چند سالوں نے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر کا حلیہ بدل کر رکھ دیا' مگر یہاں لگتا ہے وقت بہت کم رفتار کے ساتھ آگے کھسکتا ہے۔" اس نے چچا علی امام سے کہا۔

"ہاں!" وہ مسکرائے "یہاں کے لوگ آہستہ خرامی کے عادی' دھیمے مزاج کی نسلوں کو جنم دیتے چلے آرہے ہیں ہمیشہ سے۔"

"مگر یہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔" عمر نے کہا۔ "کوئی جگہ تو ایسی دیکھنے کو ملی' جہاں وقت چل رہا ہے بھاگ نہیں رہا۔"

وہ اگلی سیٹ پر بیٹھے بچے کو دیکھنے لگا جو راستے میں کہیں کہیں نظر آنے والے اپنی عمر کے کسی بچے کو دیکھ کر یوں ہاتھ ہلا رہا تھا' جیسے سب ہی سے واقف ہو۔

☼ ☼ ☼

وہ علاقہ' وہاں کے لوگ' فضا' ماحول اور موسم ویسے کا ویسا ہی تھا' جیسا اس وقت تھا' جب وہ آخری بار یہاں آیا تھا۔ چچا علی امام کے گھر میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گھر کے چہار اطراف کھڑی لکڑی کی باڑھ پر سبز روغن لگتا تھا' حال ہی میں کرایا گیا تھا۔ گھاس کے چھوٹے سے قطعے سے آگے چار سیڑھیاں تھیں' جو گھر کے اندرونی حصے کے چاروں طرف بنے طویل اور گول برآمدے تک پہنچاتی تھیں۔ برآمدے کے گرد لگی سفید لکڑی کی ریلنگ اور اس میں رکھی اونچی اور بڑی کرسیاں ویسے کے ویسی تھیں۔ گھر کے اندر جانے کے داخلی دروازے سے باہر بنی ایک سیڑھی پر رکھا چھوٹا شومیٹ بھی وہی تھا' جو پچھلی بار اس نے یہاں بچھا دیکھا تھا' جس پر بنے "ویلکم" کے الفاظ اب گھس چکے تھے۔

داخلی دروازے کے اندر ایک بڑا کمرہ تھا' جسے سب گول کمرہ کہتے تھے۔ اسے گول کمرہ کہنے کا جواز عمر کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا تھا' کیونکہ یہ گول سے زیادہ مستطیل نظر آتا تھا۔ یہ گھر میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا کمرہ تھا اور عمر نے محسوس کیا کہ اتنے سالوں میں اس کا حلیہ بھی ویسا ہی تھا' جیسا آخری بار اس نے دیکھا تھا۔ وہی صوفے' کرسیاں' وہی دیوان' وہی سینٹھی وہی میزیں اور وہی پردے۔ صوفوں کی پوشش اور چمڑے کے صوفے کا کور البتہ بدل چکا تھا۔ چچا علی امام کی آرام کرسی پر رکھی گدی کا کور بھی بدلا ہوا تھا باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔

"لڑکے کو یہاں آتے ہی انجینئر سے مکینک بنا دیا آپ نے۔" شائستہ چچی جو خاندان بھر میں شائے چچی شائے ماں' شائے بہن اور شائے ماں کے ناموں سے پکاری جاتی تھیں اور جنہیں عمر خود بھی شائے چی کہہ کر بلاتا تھا' اس سے ملتے ہوئے بولیں۔

"اپنی فراری کو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ ہر آنے والے مہمان کا کم و بیش یوں ہی استقبال کرتی ہے۔" چچا علی امام نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"اس پائپ کو صاف کرنے کا ایک پن بھی ہوتا تھا نا آپ کے پاس چچا؟" عمر کو اچانک یاد آیا۔

"ہاں! اب بھی ہے۔" وہ تمباکو کو دیا سلائی دکھاتے ہوئے بولے۔

"اور وہ کتاب جس میں مختلف قسم کے پائپس کی تصویریں' تفصیلات اور مہنگے اور بہترین تمباکو کی معلومات درج تھیں اور جو چمڑے کی بائنڈنگ میں بند تھی؟"

"پڑی ہے وہیں جہاں پہلے پڑی رہتی تھی۔" انہوں نے پائپ منہ سے نکال کر دھواں چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔

"آتے ہی پائپ اور تمباکو کے قصے چھیڑ کر بیٹھ گئے۔ اپنے اماں ابا کا کچھ احوال سناؤ' بہن بھائیوں کی بات کرو' تمہارا کراچی کیسا ہے یہ بتاؤ۔" شائے چی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہاں وہ۔" عمر کو یاد آیا' ابھی اسے گفتگو کے انتہائی تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا تھا۔ یہ تکلیف دہ مرحلہ رسم تھا یا رواداری کے باب کا ایک لازمی جزو جو بھی تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا اور کیسے کہے۔

"پہلے میں کپڑے تبدیل کرلوں' ذرا منہ ہاتھ بھی دھولیتا ہوں۔" فوری طور پر اس مرحلے سے کچھ دیر کے لیے نجات کا اسے یہ ہی ایک بہانہ سوجھا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" شائے ماں اسے لیے اندرونی کمروں کی طرف آگئیں' فرانسیسی کھڑکیوں اور نیچی چھت والا وہ کمرہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کا مہمان خانہ بنا تھا۔ اس نے کمرے کے مختصر فرنیچر پر نظر ڈالی جسے اپنی مخصوص جگہوں پر رکھا دیکھ کر اسے ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی یہاں آخری بار آمد سے لے کر اب تک کے درمیان کوئی وقفہ آیا تھا' لگتا تھا سلسلہ جہاں ٹوٹا تھا وہیں سے دوبارہ جڑ گیا تھا۔ لیکن نجانے کیوں اس وقت اس کمرے اور کمرے میں موجود ہر چیز سے مانوسیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کا دل اداس ہو گیا تھا۔

"تولیہ!" اس نے اداسی کے اس احساس کو جھٹکنے کی خاطر کہا۔ "تولیہ ملے گا؟"

اس نے مڑ کر دیکھا' شائے چی اسے کمرے میں پہنچانے کے بعد جا چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ لوگ بہت بہادر ہوتے ہیں۔" شائے چی نے اس کے ہاتھ میں پکڑا قہوے کا چھوٹا سا کپ لے کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک کے بجائے دس قربان کردینے کا دعوا بھی کرتے ہیں' مگر میں شاید بہت گناہ گار ہوں۔"

"آپ انسان ہیں شائے چی! سپر ہیومن نہیں ہیں۔ یہ جو رد عمل ہیں نا' اپنے نقصان کا ذکر کرنا' نقصان کے دکھ پر رونا اور ایک عرصے تک اس کے غم سے نہ نکل سکنا' سب قدرتی عمل ہے۔ خود کو اس سے ماورا قرار دینے کا دعوا دینی اور جذباتی تو ہو سکتا ہے' مستقل نہیں۔" عمر نے انہیں تسلی دی۔

"لیکن اللہ تو صبر اور شکر کی تلقین کرتا ہے۔ اللہ کے فرمان سے تو روگردانی ہی کر رہی ہوں نا میں۔" شائے چی نے دکھ سے سر ہلایا۔

"نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے۔" عمر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

"آپ زندگی کے تمام فرائض' تمام ذمہ داریاں نباہ رہی ہیں۔ ہنستی بولتی ہیں' عبادت کرتی ہیں' سب کے دکھ سکھ میں بھی شریک ہوتی ہیں اور ایسا آپ صرف اس لیے کر پا رہی ہیں کہ آپ کو صبر کی دولت بھی عطا ہوئی ہے اور شکر کے وصف سے بھی مالا مال ہیں۔ اسی لیے تو آپ کا سارا نظام چل رہا ہے۔"

"مگر وہ جو دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی رہتی ہے اور کبھی کبھار جو دل شکوہ کناں ہو جاتا ہے' اس کا کیا کیا جائے۔"

"اسے نظر انداز کردیا کریں' کیونکہ ہمارا رب اتنا رحیم و کریم ہے کہ بات بے بات پکڑ کرنا اس کی شان نہیں ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ اللہ آپ سے راضی ہے' جب ہی تو آپ کو کسک بھی عطا کرتا ہے اور پچھتاوا بھی۔"

عمر کی خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چچا علی امام سے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہ پاتے ہوئے بھی وہ شائے چی سے کیسے یہ بات کر پایا تھا۔ نہ صرف کر پایا تھا' بلکہ انہیں تسلیاں دینے کے لیے بھی الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آئے چلے جا رہے تھے۔

"تم شاید سمجھ نہ پاؤ کہ آنے والے سالوں کے لیے ذمہ داریوں کا کیسا انجانا بوجھ ہمارے شانوں پر آپڑا ہے۔" سونے کے لیے اٹھنے سے پہلے شائے ماں نے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

☼ ☼ ☼

"واہ! آج تو سورج کی چھب ہی اور ہے۔" بالوں میں کیچر لگاتے ہوئے اس کی نظر کھڑکی سے باہر پڑی تو اس کا دل ایک دم خوش ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردے ہٹا دیے اور پٹ کھول دیے۔

"سب کمروں کی کھڑکیاں کھولتی ہوں۔ کچھ تو دھوپ آئے گی۔" اس نے سوچا اور اپنے کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف چل دی۔ شائے ماں آملیٹ بنانے کے لیے پیاز اور ہری مرچیں کاٹ رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا آپ سے۔ میں سو گئی تو صبح کی خبر لاؤں گی۔ اور وہی ہوا۔" اس نے آگے بڑھ کر چھری ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا' اچھا ہوا' آرام کرلیا۔" شائے ماں نے کہا اور اٹھ کر ہاتھ دھونے لگیں۔

"آپ کا مہمان کیا سوچتا ہوگا۔ یہ تو سوئے ہوئے لوگوں کا محل ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اسے لذیذ کھانا اور ٹھہرنے کو اچھا کمرہ مل گیا۔ اس کی بلا سے میزبان سوئے ہوئے ہیں یا جاگے ہوئے۔" شائے ماں مسکرا کر بولیں۔

"ابی جان کا طیارہ صحیح سلامت پہنچ گیا تھا نا واپس؟" اس نے مڑ کر شائے ماں کو دیکھا۔

"اس کی نہ پوچھو۔" وہ جواب میں گاڑی کی داستان سنانے لگیں۔

"گھر کی چھتوں میں کچھ خرابی ہے یا دیواروں میں۔ یہاں آوازیں بازگشت کی طرح پھیلتی ہیں۔" ڈائننگ روم میں ناشتے کے انتظار میں بیٹھے عمر نے کچن سے آتی آوازوں کو سن کر سوچا اور اپنے چچا کی طرف دیکھا' جو کھانے کے کمرے میں رکھے ایک پورٹیبل ریڈیو سے کان لگائے اس کی ناب گھما رہے تھے۔

"اس میں ابھی جان باقی ہے کیا؟" اس نے چچا سے پوچھا۔

"ہاں' ہاں! بالکل ہے۔" وہ سر ہلا کر بولے۔ "یہ جو اونچے اونچے ٹاورز لگا رکھے ہیں ٹیلی کام کمپنیوں نے' وہ معاملہ گڑبڑ کردیتے ہیں' ورنہ ریڈیو میں کچھ خرابی

نہیں۔" وہ اٹھ کر ٹیبل کی طرف آتے ہوئے بولے۔
"یہ جینوئین لوگوں کا بنایا ہوا جینوئین ریڈیو ہے۔" اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بتایا۔ "اس میں پچھلے سال کچھ خرابی ہو گئی تھی' میں نے اسے کھولا اور دیکھا کہ جو پرزہ خراب تھا اس کا سیریل نمبر پرنٹ تھا اس کی سلپ پر۔ میں نے ایک عدد خط لکھا کمپنی کو اور ان سے ریڈیو کے ماڈل نمبر اور پرزے کے کوڈ نمبر کا ذکر کیا' جانتے ہو اس کے بعد کیا ہوا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے عمر کی طرف دیکھا۔
"نہیں!" عمر نے سرہلایا۔
"انہوں نے مجھے جوابی خط بھیجا اور ایک پارسل میں نیا پرزہ بھی بھیجا۔ خط میں تشکر اور حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ میرے پاس اس ماڈل کا ریڈیو ابھی تک موجود ہے۔ انہوں نے مجھے یہ ریڈیو خریدنے کی پیشکش بھی کی تھی۔ جو میں نے ٹھکرا دی۔" وہ بے نیازی سے بولے۔
"یہ تو بڑی زبردست خبر ہے۔ کیا آپ کے خاندان میں نوادرات جمع کرنے کا موروثی شوق پایا جاتا ہے یا ذاتی جراثیم ہیں؟"
"موروثی ہوتا تو کیا تم اتنے بدذوق ہوتے؟" انہوں نے اس کو جھاڑ دیا۔
"او ہاں! یہ تو ہے۔ میں۔" وہ ابھی اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ کچن سے ایک اجنبی صورت نکل کر ڈائننگ روم کی طرف آ گئی۔
"ابی جان! آپ نے پرسوں جو انڈے منگوائے تھے' وہ مرغی کے نہیں بطخ کے ہیں۔" ہاتھ میں پکڑا چائے دان میز پر رکھتے ہوئے وہ بولی۔
"السلام علیکم!" اگلے لمحے اس نے عمر کو مخاطب کیا۔ عمر سلام کا جواب دے کر مزید کوئی بات نہ کر سکا کیونکہ وہاں انڈوں پر بحث شروع ہو گئی تھی۔ اسے اپنی توجہ شائے چی اور سامنے رکھے ناشتے پر مبذول کرنی پڑی۔
"اچھا تو یہ تم ہو۔" ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ کر اس نے سوچا۔
"میرے ذہن میں تمہارا کچھ اور ہی خاکہ تھا۔ سارے راستے میں یہ سوچتا آیا تھا کہ تم سے پہلی ملاقات اور پہلی بات کیسی ہوگی' مگر تم تو خاصی اَن ٹریڈیشنل (غیرروایتی) نکلیں۔" وہ سوچ کر بے اختیار مسکرا دیا۔
"لیکن اچھا ہوا' تم سے پہلی ملاقات یوں ہوئی ورنہ میں مشکل میں پڑ جاتا' کیونکہ میں بھی تو اتنا غیر روایتی ہوں۔ رسمی تکلفات اور رسمی گفتگو سے مجھے سخت چڑ سی ہونے لگتی ہے۔" اس نے سوچا اور دروازہ کھلنے کی آواز پر گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی بالٹی اٹھائے باہر نکلی تھی۔
"اتنے کپڑے جمع ہو گئے تھے۔ پیچھے کی پوری الگنی بھر گئی اب مجبوراً" اس طرف بھی پھیلانے پڑیں گے۔" وہ نجانے کس سے مخاطب ہوئی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ پورچ سے ملحق چھوٹے سے اسٹور سے اس نے ایک عارضی الگنی نکال کر گھاس کے قطعے پر جمائی' نائیلون کی رسی تین تین بانسوں کے جوڑ کے ساتھ دائیں سے بائیں بندھی تھی۔ اس نے کپڑے نچوڑے اور جھاڑ جھاڑ کر اس رسی پر ڈالے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔
"گھر کا سارا کام آپ ہی کرتی ہیں کیا؟" عمر کو اس سے مخاطب ہونے کو کوئی اور بات نہیں سوجھی۔
"نہیں! شائے ماں اور فضل دین بھی کرتے ہیں۔" اس نے جواب دیا اور اپنے ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔
"میرے بارے میں تو جانتی ہی ہوں گی آپ۔" عمر نہ چاہتے ہوئے بھی رسمی گفتگو میں پڑ گیا۔
"ہاں! تھوڑا بہت!" اس نے کہا۔
"تھوڑا بہت؟" عمر کو حیرت ہوئی۔ "ولی نے آپ کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"
"نہیں! کچھ بھی نہیں۔" اس نے سر اٹھا کر عمر کی طرف دیکھا۔
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ولی میرا تذکرہ نہ کرے۔" عمر کو یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا۔ "اپنے خاندان کے چیدہ چیدہ لوگوں کے بارے میں تو اس نے بتایا ہی ہو گا نا!"
"کچھ خاص نہیں۔" اس نے سامنے کے منظر پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "ہمارے درمیان بہت زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔"
"ہائیں!" عمر نے ایک بار پھر اس کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔
"ہمارے درمیان کچھ خاص بے تکلفی نہیں تھی' شاید اس لیے۔" وہ عمر کی حیرت کا اندازہ کیے بغیر بولی۔
"اچھا۔۔۔ چھا!" عمر نے اس کی طرف یوں دیکھا' جیسے اس کی بات کا بالکل یقین نہ آیا ہو۔
"شائے ماں بتا رہی تھیں تم مستقل لوٹ آئے ہو؟" اس نے عمر کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔
"تم!" عمر نے اس بے تکلفی کو خاموشی سے حلق سے اتارا۔ "ہاں! میرا اب واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔" اس نے کہا۔
"مگر یہاں کے حالات تو۔۔۔" صباحت نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
"میرا مطلب ہے' یہاں جاب کا مسئلہ ہو گا۔"
"میرے پاس تجربہ ہے اور تعلیم تو خیر ہے ہی۔" عمر نے کہا۔ "مجھے واپس لوٹنے کے فوراً" بعد تین چار جگہ سے اچھی جاب آفرز مل چکی ہیں۔ یہاں سے واپس جا کر ان پر غور کروں گا۔"
"چلو! یہ تو اچھا ہے۔" اس نے کہا اور اندر جانے کے لیے اٹھی۔
"آپ کا ارادہ دبئی واپس جانے کا نہیں ہے کیا؟" عمر نے ایک بے تکا سا سوال پوچھا اور پوچھتے ہی اسے خیال آیا کہ نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔
"نہیں!" اس نے مختصر جواب دیا اور بالٹی اٹھائے اندر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ تو خاصی کم عمر ہے شائے چی!" اس دوپہر کھانے کے بعد عمر نے شائے چی سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "اسے آپ نے اپنے پاس کیوں بٹھا چھوڑا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کو اپنے پاس واپس نہیں بلاتے کیا؟"
"سترہ سال کی تھی' جب یہاں آئی تھی۔" شائے چی کے لہجے میں دکھ تھا۔ "اور ابھی اس کی عمر صرف پچیس سال ہے' مگر اس نے خود پر چالیس سال کی عورت کا سا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ کیا میں یا تمہارے چچا نہیں چاہتے ہوں گے کہ یہ اپنی زندگی ہنسی خوشی گزارے؟" پھر انہوں نے عمر کی طرف دیکھا۔
"مگر صرف ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ بھی تو چاہے۔ اپنا کوئی سرا تو پکڑائے ——— جب ہی تو ہماری ہمت ساتھ نہیں دیتی اس سے کوئی بات کرنے کو۔"
"لیکن یہ تو بے انصافی ہے نا۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کے بارے میں سوچیں۔" عمر کو عجیب سی تکلیف ہوئی۔
"چلو! تم ابھی ادھر ہی ہو نا۔ تم کوشش کر کے دیکھ لو' جو تمہیں اس کے دل کا حال معلوم ہو جائے۔" شائے ماں نے اسے چیلنج کیا۔ "ہم تو اپنی سی کوشش کر ہارے۔"
"میں کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟ مجھے ہی تو بتائے گی جیسے۔" اس نے یہ چیلنج قبول نہیں کیا۔
"بس آ گیا نا۔" اسی دم وہ اسٹور سے باہر نکلی اور تیزی سے آگے جا کر کپڑے الگنی سے اتارنے لگی۔ شائے چی ماتھے پر ہاتھ مار کر آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔
"کدھر ہے؟"
"نظر تھوڑی آئے گا۔" وہ کپڑے اتار کر اپنے شانے پر رکھتے ہوئے بولی۔ "کان لگا کر سنیں' کیسے چلا رہا ہے جیسے کب کا پیاسا ہو۔"
"ہوں!" شائے چی نے منہ بناتے ہوئے سرہلایا۔ "سوچا تھا' آج خوب نکھر کر دھوپ نکلی ہے'

جب ہی تنی چیزیں باہر رکھوائی تھیں کہ ذرا حدت ملے اور ان کی سیلن ختم ہو مگر اس پیاسے کو چین ہی نہیں۔"

"یہ کس ذات شریف کا ذکر ہو رہا ہے؟" عمر کو تجسس ہوا۔

"ارے! یہ ہی جو فضا میں چیخیں مارتا اڑ رہا ہے۔" شائے جی گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھیں۔

عمر نے آسمان کی طرف دیکھا، جس پر کہیں کہیں بدلیاں امڈنے لگی تھیں۔

"آگیا ٹویٹ ٹویٹ۔" ڈھلوان سے اوپر آتے منیب نے پشت پر لٹکے بیگ کے اسٹریپ کو ٹھیک کرتے ہوئے زور سے نعرہ لگایا۔

"ٹویٹ ٹویٹ۔" اب عمر کو بھی وہ آواز واضح سنائی دی جس کا تذکرہ کیا جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھا اور مولی سے ہاتھ ملانے لگا جو اسکول یونیفارم میں کل سے خاصا مختلف لگ رہا تھا۔

"کیسا رہا تمہارا دن؟" عمر، مولی کے ساتھ چلتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔

"آج کا دن تو بہت مزے کا تھا۔" اس نے اسکول بیگ اور پانی کی بوتل اسٹڈی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن آج اسپورٹس کا گھنٹہ نہیں تھا ٹائم ٹیبل میں، اس لیے بریک میں صرف دوڑیں ہی لگائیں۔"

"گیمز کا گھنٹہ کس دن ہوتا ہے؟" عمر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"منگل اور جمعرات کو۔"

"تو پھر کل ہوگا نا گیمز کا گھنٹہ۔" عمر مسکرایا۔

"ہوگا تو مگر یہ "ٹویٹ ٹویٹ" ہونے نہیں دے گا۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"کیوں بھئی! یہ ٹویٹ ٹویٹ بے چارہ کیسے روکے گا تمہاری گیمز؟"

"آپ اسے جانتے نہیں ہیں۔" مولی نے کہا۔ "ٹویٹ ٹویٹ" کا مطلب ہے پیاس، پیاس۔"

"ہائیں!" عمر چونکا۔ "یہ تم سے کس نے کہا؟"

"مجھے خود پتا ہے۔" مولی ہاتھ ہلا کر بولا۔ "یہ پیاس پیاس کرتا ہے اور موسم بدل جاتا ہے۔ بادل چھا جاتے ہیں۔ بارش برسنے لگتی ہے۔ گیمز کے گھنٹے میں صرف انڈور گیمز ہوتی ہیں۔۔۔ اور مجھے ٹیبل ٹینس اور کراٹے بالکل بھی پسند نہیں۔"

"تمہیں کیا پسند ہے؟"

"کرکٹ، کار ریسنگ، نٹ بال اور لان ٹینس۔" وہ پرشوق لہجے میں بولا۔ صباحت نے اسے آواز دے کر اندر بلا لیا۔ عمر نے مسکراتے ہوئے کھلے دروازے سے باہر نظر ڈالی۔ واقعی موسم ایک دم بدل گیا تھا اور چھما چھم بارش برسنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ولی میرا تذکرہ نہ کرے۔" ولی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے صباحت کو عمر کے کہے الفاظ یاد آئے۔

"کیا ہم اتنے بے تکلف ہوئے کہ تم اپنے کزنز، دوستوں اور ملنے والوں کا تذکرہ مجھ سے اور میں تم سے کرتی؟" اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

"تم بہت کم عمر ہو اور ناسمجھ بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، تمہیں کیسے ہینڈل کروں۔" اس کی نظروں کے سامنے پرانے دنوں کے مناظر میں سے ایک منظر گھوم گیا۔

"زندگی کے ساتھی کو سمجھ دار تو ہونا چاہیے ناکہ انسان اس سے دل کی جو بات کرے، وہ اسے سمجھ جائے، نظر سے جو اشارہ کرے اس کی شریک حیات اس کو سمجھ سکے۔ یہ تو دردسری ہوئی ناکہ ہر بات کی تشریح کر کے زوجہ محترمہ کو سمجھانا پڑے۔"

"تم بہت نازک مزاج ہو اور میں ایک رف ٹف انسان ہوں۔ ایک فوجی کی بیوی کو نازک مزاجی چھوڑنی پڑتی ہے۔"

"یار! لگتا ہی نہیں کہ تم دبئی میں رہی ہو۔ اب تک تمہیں چھری کانٹے کا استعمال نہیں آتا۔ میں حیران رہ جاتا ہوں۔ تمہیں اپنے اعتماد کا لیول بڑھانے کی سخت ضرورت ہے۔"

"تمہاری زبان و بیان اور ہر کام پر تمہاری اماں کے دہلی کی ثقافت کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن ٹریجڈی یہ ہے کہ ایک پاکستانی فوجی کی بیوی ہونے کی وجہ سے تمہیں انڈیا کا ویزا بھی نہ مل سکے گا۔"

"زندگی میں شعر و شاعری کی کوئی گنجائش ہی نہیں زندگی ایک حقیقت ہے، جس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گزارنا پڑتا ہے۔ سیدھے اور سادے الفاظ میں بات کرنا ٹھیک رہتا ہے۔ شعروں میں گھما پھرا کر جو باتیں کی جاتی ہیں، ان کو سمجھنے کا تو وقت ہی نہیں ہوتا کسی کے پاس۔"

"وہ اسٹریٹ فارورڈ اور آؤٹ سپوکن (دو ٹوک بات کرنے والا) ہے، بااصول ہے اور اس کی زندگی میں نظم ضبط کا راج ہے۔ تمہیں بھی اس کے مزاج کا عادی ہونا پڑے گا۔"

زندگی نے سترہ سال کی عمر میں جیسے پہلی بار صباحت سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا اصل تعارف کروایا تھا۔ اس سے پہلے شاید وہ شکم مادر میں ہی سانس لیتی رہی تھی۔

اس کے گھر کے ماحول پر دہلی کی ثقافت کا رنگ غالب رہا۔ اماں کی نظر بچوں کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، زبان کی صحت اور رکھ رکھاؤ پر اتنی کڑی تھی کہ وہ دبئی کے ملٹی نیشنل کلچر میں بھی دہلی کی ثقافت کی عملی تفسیر بن گئے۔ انڈین ایمبیسی اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ انگریزی بول چال میں اچھے خاصے طاق ہو جانے کے باوجود گھر میں انگریزی کا کوئی لفظ اردو کے ساتھ ملا کر بولنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ بہن بھائیوں میں بڑی ہونے کی وجہ سے صباحت پر اس چیز کا خیال رکھنے کی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ چھوٹے بہن بھائیوں کے لب و لہجے تک پر کڑی نظر رکھے۔

اماں کھانا پکانے، کشیدہ کاری اور سلائی بنائی کی بھی ماہر تھیں اور اپنا یہ سلیقہ انہوں نے تمام کا تمام صباحت کو بھی منتقل کر دیا تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد صباحت نے جوں ہی کالج میں داخلہ لیا، اماں بیمار پڑ گئیں۔ بلند فشار خون اور اختلاج قلب کے عارضے میں مبتلا ہو جانا ان کے نزدیک اتنی بڑی بیماری تھی کہ انہیں گھر کے تمام کاموں سے دست بردار ہو کر بستر کو پیارا ہو جانا چاہیے تھا۔ ایسے میں صباحت کو تعلیم کو خیرباد کہہ کر گھر کی ذمہ داری اپنے سر لینا پڑی۔

اس نے کئی بار اپنی کوتاہیوں اور ناسمجھی کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔

اس کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا کہ اس کے پاکستانی ابا کی اپنی ایک ہندوستانی کزن سے شادی ہوئی۔ اس کا اس میں بھی کوئی قصور نہیں تھا کہ اس کے پاکستانی ابا نے دبئی میں اپنا کاروبار جمایا اور دبئی ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔

اس کا اس میں بھی کوئی قصور نہیں تھا کہ اس کی دہلی کی رہنے والی اماں نے گھر کو اپنے مذہبی و ثقافتی فکر کے رنگ میں ایسا ڈھالا کہ دبئی کے آزاد معاشرے میں رہنے کے باوجود صباحت ایک ——— ایشیائی مسلم دوشیزہ کے روپ میں ڈھل کر رہ گئی تھی۔

اس میں بھی اس کا کچھ قصور نہیں تھا کہ پاکستانی ابا اور ہندوستانی اماں نے اس کی شادی پاکستان کے شمال مشرقی سرحدی صوبہ میں مقیم ایک خالص پاکستانی خاندان کے ہونہار فوجی سپوت سے اس وقت طے کر دی، جب اس کی عمر صرف سترہ سال تھی اور وہ زندگی کے رومان، خوب صورتی اور آنکھوں میں اترے تازہ اور خوش رنگ خوابوں میں نئی نئی الجھی ہی تھی۔

وہ ایک ایسے ماحول سے نکل کر سسرال پہنچی تھی جہاں اس کا اتنا خیال رکھا گیا تھا کہ اسے اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنا ہی نہیں پڑتا تھا۔ محدود سی ضرورتیں اور محدود سی خواہشات زبان سے اظہار کے بغیر ہی پوری ہو جاتی تھیں۔

اماں صباحت کے بارے میں اتنی محتاط تھیں کہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتیں۔ اماں دبئی کے ماحول سے خائف تھیں۔ دینی تعلیم اور اخلاقیات کے حوالے سے ان کے لیکچر صباحت کے دل و دماغ پر راسخ ہو چکے تھے۔ ہائی اسکول کے بعد اس کی تعلیم اماں

کے حواسوں پر چھائی رہتی۔

"یہاں کی آزادی اور امراء کے بچوں کی روش ہم جیسوں کے بچوں کے لیے عذاب ہی ہے۔" وہ کہتیں۔

اور شاید ان کی پریشانی کو دیکھ کر ہی ان کی ایک پاکستانی دوست نے ولی امام کے رشتے کے بارے میں انہیں بتایا تھا۔ پاکستان میں مقیم ابا کی پھوپھی زاد بہن نے ولی امام کے خاندان کے بارے میں پوری چھان بین کے بعد اس رشتے کے حوالے سے ابا اور اماں کی پوری تسلی کروادی۔

صباحت ابا اور اماں کے ساتھ پہلی بار پاکستان آئی اور رشتے کی پھوپھی کے گھر ٹھہری۔ ولی امام کے والدین کو صباحت اور اس کے گھر والے پسند آگئے اور جھٹ رشتہ طے ہوگیا۔

صباحت کے سامنے والی امام کی تصویر جب پہلی بار لائی گئی، وہ اپنی قسمت پر حیران رہ گئی۔ ابھی تو اس کی آنکھوں نے پوری طرح خوش رنگ اور خوش آئند سپنے دیکھنے شروع بھی نہیں کیے تھے کہ خوابوں کے شہزادے کی طرح کا بانکا سجیلا مرد اس کے جسم و روح کا مالک بننے چلا آیا تھا۔ گھنی مونچھوں اور روشن آنکھوں والا وہ گندمی چہرہ صباحت کے حواسوں پر چھا گیا۔ اسے سوتے جاگتے میں اسی کے سپنے دکھائی دینے لگے تھے۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے، مگر لڑکے اور صباحت کی عمروں میں تفاوت کچھ زیادہ ہے۔" صباحت کے دہلی میں مقیم نانا نے فون پر اماں سے کہا تھا۔

"اچھی بات ہے نا ابا جان! لڑکیاں ایک دم بڑی ہوجاتی ہیں۔ عمروں کا فرق زیادہ ہونا بہتر رہتا ہے۔" اماں اپنے خاندان میں جہان بھر سے زیادہ سیانی خیال کی جاتی تھیں، سو ان کی اس منطق کو بھی انتہائی عقل مندی سمجھ کر قبول کرلیا گیا۔

اماں بہت خوش تھیں۔ وہ اپنے اس مشن میں کامیاب ہونے جارہی تھیں کہ کم عمری میں ہی صباحت کی شادی کرکے اس کے فرض سے فارغ ہوجائیں۔ انہیں ابا کے اور اپنے خاندانوں میں صباحت کے لیے موزوں رشتہ ملنے کی قطعی امید نہیں تھی۔ یہ دونوں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ نزدیک و دور کے عزیزوں میں بھی کوئی مناسب رشتہ نہیں تھا۔ ایسے میں ولی امام کے رشتے کی صورت میں اللہ نے ان کی راتوں کو جاگ کے کی گئی دعاؤں کو قبولیت بخشی تھی۔ منگنی کے بعد دبئی واپسی پر اماں نے صباحت کو ایک نئی قسم کے لیکچر دینے شروع کیے۔ سسرال، شوہر، شادی شدہ زندگی میں کیا درست اور کیا غلط ہوتا ہے۔ فرماں برداری، وفاشعاری، سلیقے اور ہنر کے ذریعے دل جیت لینے کی ہدایت، خاموشی سے نئی زندگی کے معاملات کو سمجھ لینے کے بعد زبان کو بولنے کی اجازت دینے میں مضمر حکمت پر روشنی ڈالنے والے اسباق۔ منگنی اور شادی کے درمیانی وقفے میں صباحت کو اماں نے زندگی کے سب نئے باب پڑھا دینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں صباحت کی سمجھ میں صرف ایک ہی بات آسکی کہ ایک غلط قدم، ایک حرف کی چوک شادی شدہ زندگی کو برباد کردینے کے لیے کافی ہوسکتا تھا۔ وہ آنے والی زندگی کے خوش آئند تصورات میں کھونے کے بجائے اس سے خائف ہوگئی۔ سسرال والے اسے عفریت اور ہونے والا شوہر خوف ناک جن معلوم ہونے لگا۔

دبئی سے وہ اور اس کے دونوں بھائی، اماں اور ابا کے ساتھ شادی کے لیے پاکستان آئے اور رشتے کی پھوپھی کے گھر ٹھہرے۔ ان دنوں وہ پہلی بار شادی کے لیے مہمان بن کر آئے اپنے ابا کے رشتہ داروں سے ملی اور ان کی گفتگو سے اسے لگا کہ پاکستان میں شادی شدہ زندگی گزارنے سے بڑھ کر جوئے شیر لانے والا کام کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے پہلے دریا گنج دہلی کے مقیم اس کے نانا اور نانی دو مرتبہ دبئی ان کے ہاں آئے تھے اور تین، چار مرتبہ وہ دہلی جاچکی تھی۔ نانا، نانی کے عزیزوں اور ملنے والوں میں اسے کبھی کوئی ایسا دکھائی دیا نہ سنائی دیا جو زندگی کے بارے میں خوف ناک باتیں کرتا ہو یا جسے زندگی کے خطرناک تجربوں سے واسطہ پڑا ہو۔ نہ جانے اماں نے وہ سب باتیں کہاں سے سنی اور سیکھی تھیں جو صباحت کے گوش گزار کیں اور ابا کے خاندان کی تو ہر دوسری خاتون سسرال کے ظلم و ستم کا شکار لگ رہی تھی۔ شادی کا دن آنے تک صباحت کا حال ایک ایسے خوف زدہ چوہے کا سا ہوگیا تھا جس کے چاروں طرف چوہے دان لگے تھے اور چوہے دانوں سے بچ جانے پر ان سے آگے دنوں سے بھوکی بلیاں بیٹھی تھیں۔

ابا کی پھوپھی زاد گوجرانوالہ میں رہتی تھیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبے سے بارات علی الصبح چلی اور شام چار بجے رخصت ہونے کو تیار بھی ہوگئی۔ صباحت کے سسر شاید گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتے تھے۔ سو شادی کے دن گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ ان کے فرمان بھی سننے کو ملتے رہے۔ اتنے بج کر اتنے منٹ پر نکاح پڑھا دیا جائے۔ اتنے بج کر اتنے منٹ پر کھانا شروع اور اتنے بجے ختم ہوجانا چاہیے۔ خواتین کان کھول کر سن لیں، اتنے بج کر اتنے منٹ پر ان کی رسومات ختم ہوجانی چاہئیں، کیونکہ ٹھیک اتنے بجے بارات واپسی کا سفر پکڑے گی، جو پیچھے رہ گیا سو رہ گیا۔

"وقت کی پابندی میں بڑی برکت ہے نا جی!"

صباحت کی ساس نے میاں کے فرمانوں کی توجیہہ بار بار پیش کی اور کسی کو ان کی توجیہہ مان لینے میں کوئی تامل محسوس نہ ہوا۔

"تمہارا جوڑا بہت خوب صورت ہے صباحت! مگر ہے ذرا پرانی طرز کا۔ سنا ہے تمہاری ساس کی شادی کے جوڑے کے ڈیزائن پر بنوایا گیا ہے۔" صباحت کی ایک دور کی چچازاد نے تبصرہ کیا، مگر صباحت کا دل اس بھاری بھرکم عروسی جوڑے کے ڈیزائن کا جائزہ لینے کے بجائے آنے والے لمحوں کے خوف سے دھڑک رہا تھا۔

ٹھیک تین بج کر پچپن منٹ پر صباحت کو رخصتی کے لیے گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور ایسا اتنی افراتفری میں ہوا کہ وہ جو کئی دنوں سے وقت رخصتی دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے اپنے دل کے خوف اشکوں کے ساتھ بہانے کا منصوبہ بنانے بیٹھی تھی، اف بھی نہ کرسکی۔ سفید شیروانی اور سنہری کلاہ میں ملبوس وہ دراز قد شخص جو کچھ دیر پہلے اسٹیج پر اس کے ساتھ بیٹھا اس کی رشتہ دار خواتین کے سوالوں کے جواب انتہائی احترام سے دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی خوف ناک جن کے ساتھ زندگی کا سفر شروع ہوگیا تھا۔

"ایزی ہوکر بیٹھیں محترمہ! یہ سفر مختصر نہیں خاصا طویل ہے اور یہاں کی سڑکیں بھی دبئی کی سڑکوں جیسی نہیں۔ لہٰذا اس طرح اکڑ کر بیٹھے رہنے سے امید واثق ہے کہ آپ کی نازک سی کمر کے دو، تین مہرے میرے گھر پہنچنے تک کھسک چکے ہوں گے۔"

اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا، شاید یہ بات انتہائی خوش گوار موڈ میں کہی گئی ہو، مگر صباحت کو یہ بھی آنے والے دنوں کے لیے وارننگ لگی اور وہ مزید سکڑ اور اکڑ کر رہ گئی۔ اس کے اس گریز اور خاموشی کو شاید فوراً بھانپ لیا گیا، شاید اسی لیے باقی کے راستے میں ان دونوں کے درمیان مزید کوئی گفتگو نہ ہوپائی۔

"میری شائے ماں جی نے بہت بڑا رسک لے لیا۔" اس رات جب وہ تختہ ہوتی کمر اور شل ہوتے اعصاب کے ساتھ دولہا کا انتظار کررہی تھی، دولہا کی آمد کے ساتھ پہلا جملہ اسے سننے کو ملا۔

"تم بہت کم عمر ہو۔" وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم سے کمیونیکیٹ (گفتگو) کرنے کے لیے مجھے وہ الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو بڑے بچوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے استعمال کرتے ہیں یا وہ جو میاں اپنی بیوی سے بات کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔"

جواب میں صباحت اپنی خوف زدہ نظریں اٹھا کر لمحہ بھر کو اسے دیکھنے کے بعد انہیں جھکا لینے کے سوا کچھ کہہ نہ پائی۔

"تم اتنی چھوٹی اور معصوم نظر آتی ہو، شائے ماں شاید تمہاری معصومیت اور بے ریائی پر ہی فریفتہ ہوئیں۔" اس نے کہا اور صباحت کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلو زندگی کے کچھ سنہرے اصول آج میں تمہیں بتاتا ہوں۔" وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر صباحت کے کان سن اور اعصاب تھکن سے متاثر تھے۔ اس کی سمجھ میں شاید ہی کوئی بات آئی ہو۔

شادی کے چند دنوں بعد ہی صباحت اور ولی امام کے مزاجوں اور عادات میں واضح فرق نظر آنے لگا تھا۔ صباحت بے فکری کی نیند کی عادی اور ولی صبح خیز اور چاق و چوبند رہنے والا۔ وہ ہر معاملے میں چوکنا اور صباحت کا ذہن کسی بھی معاملے کی نوعیت کو بھانپنے سے بے پروا۔ وہ گفتگو کا شوقین اور صباحت اماں کے پڑھائے اسباق کے تحت ہونٹوں پر مہر لگائے نئی زندگی کے زیر و بم سمجھنے کی متمنی۔

تفاوت کی خلیج بڑھنے لگی۔ شاید ولی امام مقدور بھر کوشش کرتا تھا کہ اسے اپنی بات' اپنا مزاج' اپنی پسند ناپسند سمجھا سکے' شاید وہ دل سے یہ چاہتا بھی تھا کہ والدین کے کیے فیصلے کو خوبی نبھائے لیکن یا تو اسے کہنا اور سمجھانا نہیں آرہا تھا یا صباحت سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے عاری تھی' جو بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔

ولی ڈیڑھ ہفتے میں ہی الجھا اور مایوس نظر آنے لگا۔ ڈیڑھ ہفتے کے بعد اس کے جملوں میں کاٹ اور لہجے میں طنز و تمسخر ابھرنے لگا۔

"کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ تم پیدا ابھی دبئی میں ہوئیں اور اب تک وہیں رہتی رہی ہو۔"

"تمہاری عمر کی خالص پاکستانی لڑکیوں کو بھی کبھی میں نے یوں بات بے بات شرماتے لجاتے اور سہمتے نہیں دیکھا۔"

"لگتا ہے تمہاری اماں ابھی تک تمہارے لب و لہجے اور شین قاف کو ہی درست کرنے میں' مصروف رہیں۔ ان کے خیال میں بیٹی کو کچھ اور سکھانے کا ابھی وقت آیا بھی نہیں ہوگا کہ اس کی شادی سر پر آن پڑی۔"

"ویسے تم انڈین ایمبیسی اسکول کی اسٹوڈنٹ' مارننگ اسمبلی میں بندے ماترم پڑھنے کی عادی۔۔۔ تمہاری شادی کسی پاکستانی فوجی سے ہوگی' ایسا تو تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔"

"تمہارے سامان میں برانڈڈ میک اپ کلیکشن دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ اور ہنسی بھی آتی ہے' کیا کبھی تم ان کا استعمال سیکھ پاؤگی۔"

"تم نے کبھی کسی فوجی کی بیوی دیکھی ہے' فوجی کی بیوی ہونے کے لیے جن گٹس کی ضرورت ہوتی ہے کیا کبھی تم جان پاؤگی۔"

ایسی کاٹ دار گفتگو اور اپنے متعلق ولی کی مایوسی دیکھ دیکھ کر صباحت کا رہا سہا اعتماد بھی ختم ہونے لگا۔ اسے محسوس ہوتا اب تک کی زندگی وہ کسی ٹھہرے پانی کے مقیم مینڈک کی طرح گزارتی رہی تھی۔ اسے کچھ بھی پتا نہیں تھا' اسے شاید کچھ کرنا نہیں آتا تھا۔

"ہاں شاید میں کچھ نہیں جانتی لیکن اگر میں آپ کی انگلی تھام کر چلنے لگوں تو آپ تو مجھے سکھا ہی سکتے ہیں نا!" ڈھائی ہفتوں کے بعد ایک مکمل بات اس نے ولی کے سامنے کی تو وہ لمحہ بھر کے لیے چونک گیا اور پھر مسکرا دیا۔

"شکر۔ میں نے تمہاری آواز ڈھنگ سے سن تو لی۔" پھر اس نے صباحت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ہاں ضرور۔۔۔ کیونکہ میں تمہارا ردہ ہوں اور مجھے ہی تمہاری کوتاہیوں کو ڈھانپنا ہے لیکن اس کی ایک شرط ہے۔" جواب میں صباحت نے سوالیہ نظروں سے اس دیکھا۔

"خود مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں' بے شمار کجیاں' جو شاید میں اپنی خود اعتمادی کی چادر تلے چھپا لیتا ہوں مجھ سے وعدہ کرو جو خامی تمہیں مجھ میں نظر آئے گی' اس کا اظہار کرنے میں کبھی نہیں جھجکوگی۔"

صباحت نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اس لمحے ولی امام صباحت کا آئیڈیل بن گیا اور دونوں کے درمیان سکوت اور گریز کا پردہ ٹوٹنے لگا۔ صباحت نے دیکھا' وہ دل کا بہت اچھا تھا۔ ہاں صاف گو تھا اور لگی لپٹی کے بغیر کہہ دینے کا عادی تھا۔ وہ اپنے والدین کی پچھلی عمر کی اولاد

تھا۔ ابی جان اور شائے ماں کی شادی کے سترہ سال بعد دنیا میں آیا تھا لیکن لاڈ پیار اور نخروں کے ساتھ ساتھ اس کی سخت تربیت بھی ہوئی تھی۔

ابی جان اس پہاڑی علاقے میں چائے کے باغات لگانے والے گروپ کا حصہ بن کر آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے تھے۔ ابی جان کا تعلق کراچی کے ایک پڑھے لکھے معزز خاندان سے تھا۔ شائے ماں ان کی خالہ زاد تھیں۔ دونوں کراچی چھوڑ کر یہاں آئے اور اس علاقے کے ایسے شیدائی ہوئے کہ یہیں کے باسی بن گئے جیسے پرکھوں سے یہیں کے رہنے والے ہوں۔

شادی کے بعد اولاد سے محرومی کے سترہ سال دونوں نے صبر اور شکر سے گزارے تھے سترہ سال بعد ولی امام کی دنیا میں آمد پر بھی تشکر کا سجدہ بجالائے اور مزید اولاد سے مایوس ہونے پر بھی صبر کا دامن پکڑے ولی امام کو شوق و خوشی کے ساتھ پالنے میں مصروف رہے تھے۔

اکلوتے ہونے کی وجہ سے ولی امام کو زندگی کے کسی بھی معاملے میں شراکت کی نہیں حاکمیت کی عادت تھی۔ ماں' باپ نے کڑی تربیت کی تھی۔ صبح خیزی' اپنا کام خود کرنے کی عادت' اپنی چیزوں کو نفاست سے ٹھکانے پر رکھنے کی عادت' وقت پر کھانے' وقت پر اٹھنے' وقت پر سونے' وہ اپنے معمولات میں اتنے نظم و ضبط کا عادی تھا کہ اس کے معمولات میں سیکنڈوں کی سوئی بھی اوپر نیچے نہیں ہوتی تھی۔

ساتویں جماعت تک اس نے اسی علاقے کے ایک اسکول سے تعلیم حاصل کی اور آٹھویں میں اسے کیڈٹ کالج بھجوا دیا گیا۔ وہاں سے فارغ ہونے پر اپنے ابی جان کی خواہش پر فوج میں چلا گیا۔ ملٹری اکیڈمی کی تربیت نے پہلے سے نظم و ضبط کے عادی ولی امام کو اپنی عادات و مزاج میں مزید پختہ کر دیا تھا۔

"شائے ماں کو میری شادی کرنے اور بہو لانے کا بہت شوق تھا مگر ابی جان کا خیال تھا کہ شادی سے پہلے مجھے چار پانچ سال زندگی کے میدان میں تجربوں کی دھوپ تلے گزارنے چاہئیں' تاکہ مجھ میں شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں ... آجائے۔" ولی امام نے صباحت کو بتایا تھا۔

"جب ہی میری شادی قدرے تاخیر سے ہوئی' ورنہ اگر اس وقت ہی ہو جاتی جب شائے ماں نے اس کی خواہش کرنا شروع کی تھی تو تم سے تو ہرگز نہ ہوتی' کیونکہ اس وقت تو تم بالکل بچی تھیں۔"

"سنا ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ پھر تمہاری شادی میں یہ تاخیر اسی لیے ہوئی تاکہ تمہاری شادی مجھ سے ہونی تھی۔"

صباحت نے یہ بات دل میں سوچی' کہی نہیں' کیونکہ ولی امام سے اس کا استادی شاگردی کا رشتہ نیا نیا جڑا تھا اور طفل مکتب ہونے کی وجہ سے اس کے سوال جواب اسے نامناسب بھی لگ سکتے تھے۔

"ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھانا سیکھو' حیرت ہے کہ تمہارے گھر میں ابھی بھی دستر خوان بچھا کر کھانا کھانے کا رواج ہے اور چمچہ' چھری' کانٹے کے استعمال پر ہاتھوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔" ولی امام نے اس کی ٹریننگ شروع کی اور اس کے فرمان اور بھاشن ایک ساتھ جاری ہونا شروع ہوئے۔

"تم اچھی خاصی انگلش پر گرفت رکھتی ہو' مگر اتنی شدھ اردو بولتی ہو کہ تمہاری اردو سن کر میرا منہ دکھنے لگتا ہے۔ لفظوں کی ادائیگی میں اتنی احتیاط یار! اپنے جبڑوں اور زبان پر رحم کیا کرو۔" وہ ہنستے ہوئے کہتا۔

"اور اماں کہتی تھیں کہ خبردار جو ایک زبان میں دوسری زبان کے ٹانکے لگائے تو۔۔۔ زبان و بیان میں ہم رنگی بہت ضروری ہوتی ہے۔"

صباحت سوچتی' مگر وہ خود کو ولی امام کے مزاج میں ڈھال لینے کا عہد کر چکی تھی اور اسے تربیت کے اس مشکل ترین مرحلے سے گزرنا ہی تھا۔

"فوج ایک فیملی کی طرح رہتی ہے۔ ہمارے دکھ سکھ' خوشی' غمی کے ساجھی ہمارے اپنے افسر اور جونیئر ز ہی ہوتے ہیں۔ ہر فوجی کی بیوی دوسرے فوجی کے لیے بھابھی کا درجہ رکھتی ہے اور اسی درجے کا احترام پاتی ہے' سو تمہیں اپنی کم آمیزی اور گم صم

رہنے کی عادت چھوٹنی ہوگی' کیونکہ تمہیں بھی فوج کی فیملی کا حصہ بننا ہے۔" وہ کہتا اور صباحت تابعداری سے سر جھکا دیتی۔

"صباحت! ادھر آؤ۔" وہ تحکم بھرے انداز میں آواز دیتا۔ اپنا بکس اور اپنی الماری کھولو' سب چیزیں نکالو اور دوبارہ سے سیٹ کرو' تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ کم جگہ میں زیادہ چیزیں کیسے رکھتے ہیں۔"

یہ کام بھی صباحت کی تربیت کا حصہ تھا۔ سو صباحت اپنا سب سامان نکال کر دوبارہ سے ولی امام کی ہدایات کے مطابق ترتیب دینے لگتی۔

استادی' شاگردی کا یہ سلسلہ ابھی پروان چڑھنے کے مرحلے ہی میں تھا کہ ولی امام کو فوراً "ڈیوٹی پر حاضر ہونے کی اطلاع آگئی۔ اسے اپنی چھٹیاں ادھوری چھوڑ کر فوراً "اپنی یونٹ میں رپورٹ کرنا تھی۔ صباحت کے خاندان میں اور ملنے جلنے والوں میں دور' دور تک کسی کا فوج سے تعلق نہیں تھا۔ اسے فوج کے معاملات اور اصول وضوابط کا بھی کچھ علم نہیں تھا۔ ولی امام کی چھٹی اچانک ختم ہوجانا اس کے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ پہلی بار صباحت نے اپنی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکنے کے بجائے چھلکنے دیا۔ اگرچہ ولی امام بظاہر زندگی میں شادی جیسی تبدیلی آنے سے قطعی متاثر نظر نہیں آتا تھا مگر صباحت کے آنسو کچھ دیر کے لیے اسے بھی متاثر کرگئے۔

"ارے پاگل! یہ تو معمول کی بات ہے۔ اس کی عادت ڈالو۔" اس نے صباحت کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا مگر ان ڈھائی' تین ہفتوں میں صباحت اپنے اردگرد صرف ولی امام کو دیکھنے اور اسی کو محسوس کرنے کی عادی ہوچکی تھی۔ اس کی شخصیت دوسری ہر چیز پر اتنی حاوی تھی کہ صباحت نے ابھی تک ادھر ادھر نظر اٹھا کر کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری چیز کو دیکھا بھی نہیں تھا۔

"چلو شاباش! ایک اچھی بیوی کی طرح میرا سامان پیک کرو۔" ولی امام نے پہلی بار اسے بچوں کی طرح بہلاتے ہوئے کہا تھا اور وہ حسب معمول ––– اس کا بیگ پیک کرنے لگی تھی۔

"اس سائیڈ پر ٹراؤزرز رکھو' یہاں شرٹس' جرابیں اور رومال وغیرہ اس پاکٹ میں۔" وہ بیڈ پر نیم دراز ہدایات دے رہا تھا اور صباحت کے ہاتھ ان ہدایات پر عمل کررہے تھے' جب رخصتی ہوکر یہاں آنے کے بعد پہلی بار صباحت کے کانوں نے ولی امام کے علاوہ کسی دوسرے کی آواز غور سے سنی تھی۔

"ٹویٹ' ٹویٹ' ٹویٹ۔" باہر کی ساکن فضا میں وہ نوکیلی چیختی آواز آئی تھی۔ صباحت نے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ اسے نظر نہیں آیا مگر اس کی آواز جیسے اس کے کانوں میں کھبی جارہی تھی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ "اللہ! یہ کون سا پرندہ ہے' جس کی آواز اتنی نوکیلی ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔

"کیا ہوا' رک کیوں گئیں؟" ولی کی آواز نے اس کے ہاتھوں کو پھر سے متحرک کردیا' مگر اس کا دھیان باہر سے آتی اسی آواز کی طرف رہا۔ کچھ ہی دیر بعد آسمان پر چھانے والے بادل نے کمرے کو نیم تاریک کیا اور پھر چھم چھم بارش برسنے لگی۔

"بارش برسنے لگی' اب آپ کیسے جاسکیں گے؟" صباحت نے یک دم خوشی سے اچھلتے دل کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مڑ کر ولی امام کو دیکھا۔

"بارش برسنا تو یہاں کا معمول ہے۔" وہ ہنسا۔ "اور فوجیوں کو بارش' آندھی' طوفان کچھ بھی نہیں روک سکتا' بی بی!"

"بارش برسنا یہاں کا معمول ہے۔" وہ اس کی بنیانیں تہ کرکے سلیقے سے رکھتے ہوئے خود سے گویا ہوئی۔ "مجھے کیوں نہیں پتا چلا اب تک؟"

سہ پہر سے شروع ہونے والی وہ بارش اگلی صبح تک برستی رہی تھی' مگر وہی ہوا کہ مسلسل برسنے والی یہ بارش ولی امام کو جانے سے نہیں روک سکی تھی۔

"میں کوشش کروں گا کہ تمہیں اکثر فون کرلیا کروں اور خط جو میں نے کیڈٹ کالج اور اکیڈمی کے دنوں میں لکھنے سیکھے تھے اور اب لکھنا بھول چکا ہوں' وہ بھی لکھ لیا کروں۔" جانے سے پہلے آخری رات ولی

امام نے اسے کچھ یقین دہانیاں کرانے کی کوشش کی تھی۔

"اگر مجھے آگے نہ بھیجا گیا تو میں یہ بھی کوشش کروں گا کہ مجھے گھر جلدی مل جائے' تاکہ میں تمہیں اپنے پاس بلا سکوں۔ گھر نہ بھی ملا تو ایم او کیو تو مل ہی جائے گا۔" اس نے صباحت کو کچھ ایسی اصطلاحات سنائی تھیں جن سے اس کے کان بالکل بھی مانوس نہیں تھے۔

"یہ آگے کیا ہوتا ہے اور ایم او کیو کسے کہتے ہیں؟" وہ پوچھنا چاہتی تھی' مگر اس خیال سے کہ وہ مذاق نہ اڑانے لگے' خاموش رہی۔

"اگر آگے نہ بھیجا گیا تو اگلے ماہ میں چکر لگاؤں گا۔" جانے سے پہلے اس نے صباحت کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا اور رخصت ہوگیا تھا۔

صباحت نے گھر کے برآمدے میں کھڑے اسے ہموار قدموں سے چلتے پہاڑی کی ڈھلوان اترتے اور پھر نیچے وادی میں جاتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل اداسی سے بھر گیا تھا۔

"ٹویٹ' ٹویٹ۔" اسی دم فضا میں پھر سے وہ چیختی آواز ابھری۔ صباحت نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا۔

"یہ آتا ہے تو بارش ساتھ لاتا ہے۔" اسے اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا' اس کے پیچھے شائے ماں کھڑی تھیں۔

"ارے رو رہی ہو؟" صباحت کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ "آجائے گا کسی دن اچانک تمہیں لینے۔" وہ اس کی پشت سہلاتے ہوئے بولیں۔ "اسے سرپرائز دینے کی عادت ہے۔" وہ اسے بتارہی تھیں۔

مگر ولی امام کو اپنی اچانک آمد کا سرپرائز صباحت کو دینے کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار ٹیلی فون پر اپنی خیریت کی اطلاع دیتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موبائل فون اتنے عام نہیں ہوئے تھے اور علاقے میں تو شاید کسی ٹیلی کام کمپنی نے اپنا ٹاور بھی نصب نہیں کیا تھا۔ ولی لینڈ لائن نمبر پر فون کرتا اور ابی جان' شائے ماں سے گفتگو ہونے کے بعد جب تک صباحت کو ریسیور ملتا' کال کا دورانیہ گھٹ کے بالکل کم رہ چکا ہوتا۔

"کیسی ہو؟ اداس مت ہونا' میں کوشش کروں گا کہ آنے والے دنوں میں ایک چکر تو لگا ہی لوں۔" اس کی گفتگو بہت نپے تلے الفاظ پر مبنی ہوتی تھی۔

"اگر یہ بھی فوجی علاقہ ہوتا تو وہ اپنے پیس کام سے زیادہ دیر تک بات کرسکتا تھا۔"

ابی جان اسے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ صباحت کو یہ نئے نئے لفظ سمجھ نہیں آتے تھے۔ اسے جو بات سمجھ میں آتی تھی وہ اتنی ہی تھی کہ وہ اپنے ماں' باپ کی نرم گرم آغوش سے اٹھا کر اس اجنبی علاقے میں پھینک دی گئی تھی' جہاں ہر طرف نمی کا راج تھا۔ بارشیں برستی تھیں اور گھر میں وقت بوڑھے ہوتے میاں' بیوی کے ساتھ گزرتا تھا' جس شخص کے توسط سے وہ اس گھر میں آئی تھی وہ نہ جانے کہاں تھا اور یہ زور زبردستی تھی کہ وہ نہ پیچھے جاسکتی تھی' نہ اس شخص کے پاس کہیں آگے جاسکتی تھی۔

اوپر سے ولی کے جانے کے کچھ دن بعد اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ زندگی میں بھی بدہضمی کا شکار نہیں ہوئی تھی اور وہ وقت ایسا آیا تھا کہ ادھر وہ کچھ کھاتی تھی' ادھر اسے قے آنے لگتی۔ شروع کے کچھ دن شائے ماں تشویش کا شکار ہوتی' اسے قہوہ پلاتی' ہاضمے کو درست رکھنے والی گولیاں اور چورن کھلاتی رہیں' لیکن چند دن بعد ان کی تشویش جیسے کسی انوکھی سی مسرت میں بدل گئی۔

"ہاں جی۔ مبارک ہو' صباحت پر اللہ نے خیر سے کرم کیا۔ ہم مزید سینئر ہونے جارہے ہیں۔"

انہوں نے صباحت کی اماں کو دبئی فون کرکے ایک مبہم سا مژدہ سناتے ہوئے کہا تھا۔ شائے ماں خوش تھیں' ان سے کوئی بات سننے کے بعد ابی جان خوش تھے۔ شائے ماں نے یہ خبر ولی امام کو بھی دی تھی اور شاید وہ بھی خوش تھا۔

"اپنا بہت خیال رکھا کرو' اب تو تم بہت اہم ہوگئی

ہو۔" اس نے شاید اسی خبر کے رد عمل میں ایک دن اسے فون پر کہا تھا مگر صباحت کی طبیعت اور مزاج پر دن بدن بے زاری سی چھائے چلے جا رہی تھی۔

دبئی میں اس کے گھر کے تنفس اور ردھم ماحول سے باہر زندگی تیز رفتار تھی۔ رنگ رنگ کے لوگ تھے۔ شور اور ہنگامہ تھا۔ جدید عمارتیں' کشادہ سڑکیں' بڑے بڑے شاپنگ مالز' جدید گاڑیاں اور خوش باش چہرے تھے۔ جبکہ یہاں نظروں کے سامنے وہی گنے چنے مناظر تھے۔ تاحد نظر اونچے نیچے پہاڑ' پہاڑوں پر اگا سبزہ' اردگرد چھوٹے چھوٹے گھر جن میں سے اکثر پر سرخ یا سبز ٹین کی چھتیں رکھی تھیں اور جن کی ہیت و نقشہ کم و بیش ایک سا تھا۔ اونچے نیچے راستے چیڑ اور چنار کے بلند درخت جو اکثر برستی بارش کے پیچھے اپنے موہوم سے قد اٹھائے سیدھے کھڑے رہتے تھے۔

ولی کے جانے کے ایک' ڈیڑھ ماہ بعد تک صباحت کو ان گنے چنے مناظر کی ایک ایک چیز ازبر ہو چکی تھی اور ہر نئے آنے والے دن کے ساتھ اس کے مزاج کی بے زاری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ابی جان اور شائے ماں سے احترام اور جھجک کا رشتہ تھا۔ وہ دل کی کوئی بات کسی سے بھی نہیں کر پاتی تھی اور سارا دن گھر کے مختلف کمروں میں بے مقصد گھستی نکلتی پھرتی تھی۔

ان ہی دنوں اس نے ابی جان کو پہلی بار یہ کہتے سنا کہ ولی امام کو آگے بھیج دیا گیا تھا۔ دنیا کے کسی بھی ملک کے جغرافیے سے متعلق صباحت کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ دنیا میں کیا سیاست چل رہی تھی' دنیا کے سیاسی و جغرافیائی نقشے کیا تھے۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ ہاں اتنا معلوم تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان اچھے تعلقات قائم نہیں تھے۔ یہ بھی پاکستانی ابا اور ہندوستانی اماں کے درمیان کبھی کبھار ہونے والی بحثوں کے سبب علم تھا۔ ورنہ جس ملک اور ماحول میں وہ پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی وہاں ایسا کوئی دوستی' دشمنی کا معاملہ نہ سننے میں آیا تھا' نہ دیکھنے کو ملا تھا۔

"آگے کیا مطلب ہوتا ہے ابی جان؟" ولی امام کی آنے والی کالز مختصر ہونے لگیں اور ان کے درمیان وقفہ بڑھ گیا تو اس نے ایک دن ابی جان سے پوچھ لیا۔ جواب میں کچھ دیر وہ صباحت کو غور سے دیکھتے رہے' پھر انہوں نے اپنا چشمہ آنکھوں سے اتار کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ صباحت کو لگا وہ تذبذب کا شکار ہو رہے تھے' صباحت کو آگے کا کیا مطلب بتائیں۔

"تم نے کبھی محاذ کا لفظ سنا ہے؟" پھر انہوں نے چشمہ دوبارہ آنکھوں سے لگاتے ہوئے صباحت سے پوچھا۔

"محاذ!" صباحت نے اٹکتے ہوئے یاد کیا۔ "وار فرنٹ (جنگ کا محاذ)" پھر اس نے اس لفظ کی بساط بھر وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں وہی۔" ابی جان کو جیسے اطمینان ہوا کہ انہیں صباحت کو سمجھانے کے لیے بہت زیادہ الفاظ استعمال نہیں کرنے پڑے تھے۔

"محاذ کو تم آگے کہتا ہوں میں۔" پھر انہوں نے صباحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسا وار فرنٹ اور کیوں؟" صباحت کی زبان سے حیرت بھرے سوال نکلے۔ جواب میں ابی جان نے اسے جو سمجھایا اس میں پاکستان اور بھارت کی پرانی سیاسی و جغرافیائی چپقلش' دونوں کے درمیان ہونے والی گزشتہ جنگوں کا احوال' کشمیر اور کارگل جیسے الفاظ بار بار استعمال ہوئے تھے۔ صباحت کو اس ساری بات میں اور کوئی معنی نہیں ملا تھا۔ سوائے اس کے کہ ولی امام مزید کچھ عرصہ گھر نہیں آسکتا تھا۔

"پھر میں یہاں کیوں ہوں؟" اس نے دل میں کھولتے ہوئے ناراضی کے عالم میں خود سے پوچھا تھا۔

"مجھے یہ لوگ میری اماں کے پاس ہی بھیج دیں۔" اسے خیال آیا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی' تمہیں اس اونچے نیچے سفر سے پرہیز ہی رکھنا چاہیے۔ خدا خیر رکھے تو میں وہ وقت آنے پر خود تمہارے پاس آؤں گی۔" اس کی اماں نے فون پر اس سے یہ بات سن کر اسے جواب دیا تھا۔

"نہ کوئی جرم کیا' نہ ارادہ و اعتراف جرم' پھر یہ کیسی سزا بھی کیا ہے یہ تو بن باس ہے' جلا وطنی سزا ہے۔" صباحت نے ان دنوں اپنی ایک ڈائری میں دل کی بات لکھی تھی۔

"دیکھو! مجھے جو خط اس نے لکھا ہے اس میں تمہارا کتنی بار ذکر کیا ہے۔" شائے ماں اس کو یوں بے زار اور الجھی ہوئی دیکھ کر اپنے تئیں اس کی دل جوئی کی کوشش کرتیں۔ "جھجک کی وجہ سے براہ راست تمہیں خط نہ لکھ پایا ہوگا۔" ان کے لہجے میں ولی کے لیے محبت کا دریا موجزن ہو جاتا۔

"لگتا ہے' اسے معلوم بھی ہے کہ اس کے ماں باپ کتنے لبرل اور پوزیٹیو ہیں' پھر بھی تمہیں براہ راست خط نہیں لکھا۔ یہ دیکھو یہ......" پھر وہ سلیقے سے تہ کیا کاغذ کھولتیں' ایک مختصر تحریر جس میں اپنی خیریت کی اطلاع دی گئی تھی اور درجہ بدرجہ سب کا احوال دریافت کیا گیا تھا اور جس کی آخری سطر میں میرا خیال ہے کہ آپ کی صباحت سے خوب دوستی ہو چکی ہوگی اور آپ اس کا خوب خیال رکھتی ہوں گی۔ جیسا ایک جملہ تحریر تھا۔

"دیکھا بہانے بہانے سے تمہاری خیریت اور معمولات کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔" شائے ماں محبت بھرے انداز سے کہتیں اور صباحت کی تھکن اور بے زاری مزید بڑھ جاتی۔ ابی جان سارا دن ریڈیو یا پھر ٹی وی لگائے خبریں سنتے اور دیکھتے رہتے۔ صباحت اپنی مرضی سے کوئی تفریحی پروگرام نہ دیکھ پانے کی کوفت میں ابی جان کی پیشانی پر تفکر کی بڑھتی ہوئی لکیروں کو ایک بار بھی نہ دیکھ پائی۔

"جنگوں کا تو اب زمانہ ہی نہیں رہا صاحب! اب کون دوبدو جنگیں لڑتا ہے۔" ابی جان کے دوست آغا کمال کبھی جب ان کے پاس آکر بیٹھتے تو اس قسم کی گفتگو چلتی۔ "سیاچن کا زمانہ بھی پیچھے رہ گیا۔ قوموں کے اقتصادی حالات دیکھیں' کس کا مغز پھرے گا جو جنگ جیسی مصیبت مول لے گا۔"

آغا کمال شاید ابی جان کا حوصلہ بڑھانے کو ایسی باتیں کرتے تھے۔ صباحت نے کبھی اس بات پر بھی غور نہیں لیا تھا۔ اب وہ سارا دن اپنے جیوب باکس کے ہیڈ فون کانوں سے لگائے ہزاروں بار سنے گانے دن بھر سنتی رہتی تھی۔ اسے اس بوریت اور کوفت سے فرار کا اور کوئی ذریعہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

"اس میں انڈین گانے بجتے ہوں گے۔" صباحت کو کانوں میں ہیڈ فون گھسائے کبھی کسی بستر پر' کبھی کسی صوفے پر اوندھا لیٹے دیکھ کر شائے ماں کبھی کبھار سوال کرتیں۔ اگر صباحت کی نظر ان کے سوال کرتے چہرے پر پڑ جاتی تو کانوں سے نکال کر جواب دے دیتی' ورنہ ان کی آواز تو سنائی بھی نہ دیتی تھی۔

"ایسا ہے بیٹا! کہ اس حالت میں لڑکی کو چاہیے اچھی اچھی باتیں سنے' اچھی اچھی باتیں پڑھے' اللہ کے کلام کی تلاوت زیادہ سے زیادہ کرے' تاکہ اس کے بطن سے ایک نیک روح دنیا میں آئے۔" صباحت شائے ماں کے سوال کے جواب میں اثبات میں سر ہلاتی تو وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ "اور تم تو وہ لڑکی ہو جس کا شوہر انڈیا سے جنگ لڑنے والے فوجیوں میں شامل ہونے والا ہے' تو جب ہم ایک طرف جغرافیائی جنگ لڑ رہے ہیں تو دوسری طرف تفریحی حظ بھی ان ہی کے شاہکاروں سے اٹھا رہے ہیں۔ یہ تو خاصے تضاد کی بات ہوئی نا۔"

صباحت کی سمجھ میں شائے ماں کی یہ بات بھی نہیں آئی تھی۔ آغا کمال تو جنگ نہ ہونے کی باتیں کرتے تھے۔ پاکستان اور بھارت کی حکومتیں اچھے سفارتی تعلقات قائم کرنے کے راگ الاپتی تھیں اور شوہر صاحب جنگ لڑنے جا رہے ہیں۔

"کیسا شوہر اور کیسی جنگ؟" وہ الجھ کر سوچتی۔

"شوہر وہ جو چند دن ساتھ گزار کر ایسا گیا کہ پلٹنے کا نام نہیں لے رہا' اب تو اس کا چہرہ یاد کرنے کے لیے بھی تصویروں کو دیکھنا پڑتا ہے اور جس کی آواز یاد کرنے لگوں تو بھی یاد نہیں آتی اور جنگ وہ جو ہونی ہی نہیں' پھر شائے ماں مجھے یہ کیسی باتیں سناتی ہیں اور کیوں سناتی ہیں۔" اس نے ڈائری میں لکھا تھا۔

"اور یہ تو حق سچ بات ہے کہ ایک مسلمان گھرا۔

میں مسلمان بچہ ہی پیدا ہوتا ہے اور جب مسلمان گھرانے میں پلتا بڑھتا ہے تو آپ سے آپ اچھی باتیں سیکھتا ہی جاتا ہے' یہ بھی کیسا دیو مالائی نظریہ ہے کہ ہونے والی ماں نیک باتیں سوچے تو نیک اولاد پیدا کرے گی۔"

صباحت کی عمر بے نیازی' لاپروائی اور الہڑپن کے حصے میں تھی اسی لیے اسے شائے ماں' ابی جان اور اپنے ابا' اماں کی کہی باتوں کی جتنی سمجھ آتی تھی ان کے جواب میں اس کے پاس بے فکرے پن کے جواز موجود ہوتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ ان باتوں کا اپنی زبان سے کبھی جواب نہیں دیتی تھی۔ کیونکہ اس کی گھٹی میں بڑوں کا احترام اور سر جھکا کر نصیحت سن لینے کا وصف شامل تھا' چاہے من کے اندر کیسے ہی جوابی حملے اور بغاوتیں اٹھتی ہوں۔ اس لیے وہ من کی باتیں اور بغاوتیں ایک ڈائری میں رقم کرکے ان کے بوجھ سے آزاد ہوجاتی تھی۔

"ہمیں تو ٹھیک سے بتایا نہیں جارہا' مگر آگے جنگ شروع ہوچکی ہے۔" ابی جان تشویش بھرے انداز میں کہتے "اور ولی امام کے متعلق کچھ پتا نہیں چل رہا کہ آگے بھیج دیا گیا ہے یا نہیں۔"

"اس کو سرپرائز دینے کی عادت ہے' آجائے گا کسی دن اچانک تمہیں لینے کے لیے۔" صباحت کے بے زار دل کی تہ میں کہیں یہ خوش فہمی کبھی کبھی سر اٹھاتی تھی اور وہ دیکھا جائے گا' جیسے الفاظ سے خود کو ہر فکر سے بے نیاز کرلیتی تھی۔

بے کیف' سستی بھرے' بے رنگ دن ایک ایک کرکے گزرتے جاتے اور کیلنڈر کا صفحہ پلٹ جانے پر اندازہ ہوتا کہ ایک مہینہ مزید گزر گیا تھا۔

ولی امام کو گئے پورے نو ماہ گزر گئے۔ صباحت کی نظروں نے برستی بارشوں اور کانوں نے خود کو ٹویٹ' ٹویٹ کی آواز سے مانوس ہوتے پایا۔ چیڑ اور چنار کے درخت اتنے ماہ میں ایک انچ نہیں بڑھے تھے۔ البتہ جھاڑیاں' بوٹیاں اور گھاس بڑھتی گھٹتی رہتیں اور ان میں چھلانگیں لگاتے چھوٹے چھوٹے خرگوش' گلہریاں اور ان پر رینگتے لیڈی برڈ' ملی بیڈز اور سینٹی پیڈز پیدا ہوتے اور پھر نظروں سے اوجھل ہوتے رہتے۔ صباحت دل میں کبھی کبھار سرپرائز ملنے کی خوش فہمی کے تحت نیچے وادی سے اوپر آتے راستوں پر آتے جاتے لوگوں کو غور سے دیکھتی' شاید جو کسی دن وہ واقعی آجائے۔

"نہ اس سے ڈاک کے ذریعے کچھ رابطہ ہے' نہ فون کے ذریعے۔" "اس کی یونٹ والے بھی شاید مرف تسلی ہی دیتے ہیں۔" ابی جان کی تشویش اور شائے ماں کی نفلی نمازیں بڑھنے لگیں۔ کچھ دن مزید آگے سرکے اور صباحت کو ٹی پلانٹرز ڈسپنسری جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ جہاں کے نرسنگ اسٹاف سے وہ ماہوار معائنے کے دوران خاصی واقفیت حاصل کرچکی تھی۔ ڈسپنسری میں تعینات ہنس مکھ لیڈی ڈاکٹر نے ہنستے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا۔

دوپہر سے رات تک درد میں مبتلا رہنے کے بعد جب اس نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا اور ایک سکون آمیز کیفیت میں جاکر آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد دیکھا۔ اسے وہ چہرے تو شاید اتنے واضح نظر نہیں آئے جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ مگر ڈسپنسری کے اس لیبر روم سے باہر کھلی فضا میں اسے ابھرتی وہ چیختی' چلاتی نوکیلی آواز بہت واضح سنائی دی تھی۔

"ٹویٹ' ٹویٹ' ٹویٹ۔" کوئی خاموشی کی چادر کو اپنی کٹیلی پکار سے توڑ رہا تھا۔ اس کا دل بری طرح لرز گیا۔

"وہ بچہ جسے میں نے پیدا کیا' وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

اسے ایک انجانے سے وہم نے آگھیرا۔

"تم اور تمہارا بیٹا بالکل خیریت سے ہیں۔" ڈاکٹر عنبرین نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"تو میں خوامخواہ وہم کا شکار ہوئی۔" وہ آنکھیں بند کرکے مسکرائی۔ نو ماہ تک اپنے وجود میں رکھنے کے باوجود جس سے وہ مانوس نہیں ہوپائی تھی۔ چند گھنٹوں میں وہ اسے جان سے زیادہ پیارا لگنے لگا تھا۔

"یہ ہمارا ولی منیب ہے۔" ابی جان نے بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اعلان کیا تھا۔ مگر ولی منیب کی آمد کی خوشی بھی ابی جان' شائے ماں اور دبئی سے آئی ہوئی صباحت کی اماں کے چہروں سے تفکر کے نشان نہیں مٹا سکی تھی۔

"ولی امام کو آگے بھیجا جاچکا ہے۔ وہ محاذ پر ہے اور اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں مل رہی۔" منیب کی پیدائش کے دو ہفتوں کے بعد صباحت کی اماں نے اسے بتایا۔ "ہم تمہیں اس لیے نہیں بتارہے تھے کہ تم کمزور ہورہی تھیں' پریشانی تمہیں مزید کمزور کر جاتی۔" وہ سنجیدگی کی چادر اوڑھے صباحت کے سامنے بیٹھی تھیں۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی کے بارے میں کچھ خبر نہ ملے۔ جبکہ وہ اسی دنیا میں موجود ہو۔" صباحت نے ایک ٹک اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

"وہ ایک مشکل محاذ ہے' وہاں تک رسائی حاصل کرنا کٹھن کام ہے' فوج کا البتہ اپنا ایک نظام ہے' وہ کہیں بھی پہنچ سکتی ہے۔" ابی جان نے اسے بتایا تھا۔

صباحت کے خیال میں سب ایسے ہی پریشان ہورہے تھے' ٹی وی پر تو پاکستانی فوج کے وہاں جنگ لڑنے کی خبریں نہیں آرہی تھیں' ٹی وی کچھ اور بتاتا تھا' وہ سب کے برعکس اطمینان بھرے انداز میں چھوٹے چھوٹے بچھونوں' فیڈرز اور ڈائپرز میں مصروف رہتی۔ کئی مہینوں سے طبیعت پر چھائی بیزاری چھٹنے لگی تھی' اس کی گود میں ایک چھوٹا سا سانس لیتا وجود لیٹا رہتا تھا' جو اپنی ننھی منی آنکھیں کھول کر جب اس کی طرف دیکھتا اس پر خوشی کی ایک عجیب سی کیفیت چھا جاتی۔ اسی خوشی کے عالم میں اس نے اس آواز پر بھی دھیان دینا چھوڑ دیا تھا' جو ان دنوں ہر وقت فضا میں گونجتی رہتی "ٹویٹ' ٹویٹ' ٹویٹ۔"

"نجانے کتنے دن سے شور مچا رہا ہے یہ۔ اب بارش نہیں برسائی مالک نے' جب ہی تو نہیں برس رہی' اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی۔" شائے ماں گھر کی مختلف چیزوں کو دھوپ لگواتے ہوئے ہنسیں۔ صباحت کو اس صورت حال پر ہنسی آگئی۔

"سارا دن چیختا' روتا رہتا ہے' بارش نہیں برستی اچھا ہے پیاسا' ٹوٹا کسی اور علاقے کی طرف کوچ کر جائے۔" اس صبح بھی اس نے اس آواز کا تعاقب کرتے ہوئے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اسی دم اس کا دل ایک نئے منظر کو دیکھ کر زور سے دھڑکا' تین جیپیں ڈھلوان والے راستے سے اوپر چڑھتی آرہی تھیں۔

"ولی منیب! تمہارے ابا آگئے۔" اس نے بنا کچھ اور سوچے مڑ کر چھوٹی سی کاٹ میں سوئے ہوئے بچے کی طرف دیکھا۔ لیکن جب وہ جیپیں ان کے گھر کے سامنے آکر رکیں تو ان میں سے ایک سے بھی ولی امام نہیں اترا تھا۔ کچھ اور لوگ تھے جو گھاس کے قطعے پر کھڑے ابی جان سے مصافحہ کرنے کے بعد کوئی بات کر رہے تھے۔ ان میں ایک شخص جس نے ابی جان سے بات کرتے ہوئے اپنے سر سے یونیفارم کی ٹوپی اتاری تھی' اس نے ابی جان سے کیا کہا تھا کہ ابی جان نے قریب رکھی کرسی تھام لی تھی۔

صباحت تجسس سے سوچ ہی رہی تھی کہ اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا تھا اور اس نے دروازے کی طرف دیکھا جس میں اس کی اماں یوں کھڑی تھیں گویا جیتوں میں تھیں نہ مردوں میں۔ اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا' ابی جان کے گرد کئی لوگ جمع ہوچکے تھے۔

"یہ اتنے لوگ کیوں آگئے؟" اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اماں سے پوچھا۔

"ولی امام چلا گیا صباحت! ولی امام شہید ہوگیا" اماں نے بمشکل کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا۔

"شہید ولی امام کی شادی دس ماہ قبل ہوئی تھی اور محض ڈھائی ہفتے قبل اللہ نے ان کو بیٹے سے نوازا' شہید ابھی اپنے بیٹے کو دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ مادر وطن کی ناموس کی خاطر دشمن کا مردانہ وار سامنا کرتے

ہوئے جان' جان آفرین کے سپرد کر گئے۔"
نجانے کتنے دن بعد اس کے کان میں یہ آواز آئی تھی اور اس نے ان جملوں کے مفہوم کو سمجھا تھا۔
"مجھے فخر ہے میں ایک شہید کا باپ ہوں۔"
"میرے دس بیٹے اور ہوتے تو مادر وطن پر قربان کر دیتی۔"
الفاظ' جملے' تعریفیں سلیوٹ' سلام' پھول' تمغے' انعام' گھر' روپیہ پیسہ وہ سب دیکھتی رہی اور سنتی رہی۔ سیاہ منہ' بغیر تاروں اور لمبی تاروں سے جڑے کئی مائیک اس کے سامنے بھی آئے' اس سے بھی سوال کیے گئے مگر اس کے ہونٹوں پر جامد خاموشی چھا گئی تھی۔ دو ڈھائی ہفتوں کی رفاقت اور وہ اعزاز یافتہ ہو گئی تھی یا عمر بھر کے لیے تہی دست' اس کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں اٹھنے والے سوالوں کے جواب نہیں مل پا رہے تھے۔ وقت گزر رہا تھا' وہ اجنبی ملک کے اس اجنبی علاقے اور نامانوس فضا میں آکر آباد بھی ہوئی اور اجڑ بھی گئی۔
ابھی تو رشتوں' محبتوں' رنگوں اور روشنیوں کے متعلق استاد سے شاگرد کے کئی سوال ان کہے ہی تھے کہ استادی شاگردی کا رشتہ ختم بھی ہو گیا۔
ابھی تو جیون بھر کے ساتھی کے چہرے کے خدوخال سے مانوس ہونا باقی تھا کہ وہ چہرہ تہہ خاک ہوا۔
ابھی تو احساسات کو مانوسیت اور مانوسیت کو قبولیت' قبولیت کو محبت اور محبت کو جنون میں بدلنا تھا کہ احساسات کی موت بھی واقع ہو گئی۔
ابھی تو اسے ایک فوجی کی بیوی کی خصوصیات کو سمجھنا اور اختیار کرنا تھا۔ فوج کی فیملی کا حصہ بننا تھا کہ فوجی شہید بھی ہو گیا۔
دنیا میں جنگوں' محاصروں' ہلاکتوں کے باب ختم ہوتے سنائے جاتے تھے پھر یہ کیا تھا جو ہوا اور ہو کر گزر بھی گیا۔ جنگ ختم ہوئی۔ صلح کے تبادلہ خیالات ہوئے' محاذ جنگ بند ہو گیا تھا۔ ساعتیں اور گھنٹے دن میں بدلتے اور دن رات میں ڈھلتا رہا۔ صبحیں' شاموں میں اور شامیں رات کی تاریکی کی چادر اوڑھتی رہیں وقت کی ساعتوں میں کتنے لوگوں کی زندگیاں آباد ہوئیں اور کتنوں کی برباد۔ اس کا حساب انسانوں میں سے تو کوئی رکھ سکا نہ رکھنے پر قادر تھا۔
"صباحت! میں تمہاری عدت تک یہیں رہوں گی' پھر اس کے بعد تمہیں ساتھ لے جاؤں گی' اب تمہارا یہاں کیا کام اور کیا مقام۔" یہ اس کی اماں کے الفاظ تھے اور اس کی نظریں یہ الفاظ سنتے ہوئے امی جان اور شائے ماں کے چہروں پر جمی تھیں۔ دونوں دنوں میں عمر رسیدہ' کمزور اور خوف زدہ نظر آنے لگے تھے۔
"کیسے انہوں نے فخر ہونے اور دس بیٹے مزید وار دینے کی باتیں کی ہوں گی۔"
اس ایک لمحہ کے لیے ان کے حوصلے کی داد دی تھی اور پھر ان دونوں کی نظروں کا تعاقب کیا جو ولی منیب کی کاٹ پر جمی تھیں۔
"جو یہ بھی نہ رہا تو باقی کیا رہ جائے گا۔" اس کے ذہن میں خیال آیا۔
"نہیں اماں! میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"
اس نے اتنے دن میں پہلی مکمل بات کی تھی۔ اس کا لہجہ مضبوط تھا اور پر تیقن بھی۔
"میں یہیں رہوں گی۔"

☼ ☼ ☼

عمر نے کھرپی سے کیاریوں کی مٹی کو الٹ پلٹ کیا اور چھوٹی چھوٹی فالتو بوٹیاں ہاتھ سے اکٹھی کر کے ان کی مٹی کیاری میں جھاڑنے کے بعد انہیں قریب رکھے ٹین میں ڈال دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سامنے موجود صباحت پر پڑ گئی۔ وہ الگنی پر دھلے کپڑے ڈال رہی تھی اور زیر لب بڑبڑا بھی رہی تھی۔
عمر نے کھرپی قریب رکھی اور گھاس پر نیم دراز ہو گیا۔ اب وہ دلچسپی سے صباحت کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ گہری سبز شلوار پر سفید اور سبز پرنٹ کی قمیص پہنے سبز اونی چادر اوڑھے وہ گیلے کپڑے جھاڑتی اور الگنی پر ڈال دیتی اس کے گھنے سیاہ بالوں کی چٹیا اس کی کمر کے درمیانی حصے تک پہنچتی تھی اور اس کی حرکت کے ساتھ حرکت کر رہی تھی' اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے' وہ اس فیشن سے بالکل مختلف تھے جو عمر کراچی میں دیکھ کر آیا تھا۔
"کیا یہ اتنی ہی بے نیاز اور بے غرض ہے جتنی دکھائی دیتی ہے۔" اس نے سوچا۔ یہ حقیقت تھی کہ اتنے دنوں میں وہ اس لڑکی کے بارے میں زیادہ جان ہی نہیں سکا تھا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی تھی۔
شائے جی سے یہ سن کر وہ حیران رہ گیا تھا کہ اتنے سالوں میں وہ نزدیکی قصبے سے ضرورت کی چند چیزوں کی خریداری کے لیے کبھی کبھار جانے کے سوا کبھی یہاں سے نکلی ہی نہیں تھی۔
"تمہارے آغا جی بہت کہتے رہے' بہت چاہتے رہے کہ کبھی یہ کچھ دن کے لیے ہی سہی یہاں سے نکلے' کسی بڑے شہر میں جائے' گھومے پھرے اور کچھ نہیں تو اپنی اماں سے ہی ملنے وہیں چلی جائے' مگر اس نے کبھی ایسی بات پر ہاں ہی نہیں کی۔ اب تو کہنا بھی چھوڑ دیا ہم نے' مگر یوں جانو' دل میں جیسے خود کو مجرم سا محسوس کرتے ہیں' کیسی پہاڑ سی جوانی کے نایاب دن یوں بے کیفی اور بے رنگی میں گزار رہی ہے یہ' شائے ماں نے اس سے کہا تھا۔
"اس نے کبھی ان مراعات' انعامات و اکرامات کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جو شہید کی بیوہ ہونے کی حیثیت سے اس کو ملے۔ سب کا اختیار میرے حوالے کر دیا۔ نہ ان کے بارے میں کبھی بات کی نہ سوال کیا۔ کبھی کبھی میں خود سے سوال کرتا ہوں۔ کیا یہ ہمیں کسی غلطی کی سزا دے رہی ہے یا خود کو کوئی اذیت دے رہی ہے۔ مگر اس سے کچھ کہنے' پوچھنے کا حوصلہ نہیں پڑتا اور اب تو جیسے ہم بھی اس کے وجود سے مانوس سے ہو گئے ہیں۔" آغا جی نے اسے بتایا تھا۔
"تم اتنا بڑبڑاتی کیوں ہو بھئی؟" کپڑے الگنی پر ڈال کر جب وہ اندر جانے کے لیے مڑی تو عمر نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"تمہیں ہر دم سیلن زدہ چیزوں کو دھوپ لگا کر سلھانے کا انتظار کرنا پڑے' گیلے کپڑے بار بار تار پر ڈالنے اور اتارنے کا تردد کرتے رہنا پڑے تو تم بھی بڑبڑ کرنے لگو گے۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔
"بڑبڑ کرنے سے کیا یہ کام آسان ہو جاتا ہے؟" عمر نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
"یہ بڑبڑ نہیں خود کلامی ہوتی ہے' جس کی مجھے عادت ہو گئی ہے۔" صباحت نے وضاحت کی اور سامنے دیکھنے لگی۔
"خود کلامی کی عادت تمہیں کیسے ہو گئی' کیا شروع سے ہے؟"
"پتا نہیں۔" اس نے قریب رکھی بالٹی اٹھائی اور اندر چلی گئی۔
"ویسے میں تم سے عمر میں بڑا ہوں' پھر بھی تم مجھے تم کہہ کر مخاطب کرتی ہو تم دہلی والے تو سنا ہے۔ ادب آداب کے بڑے پابند ہوتے ہو۔" عمر اٹھ کر اس کے پیچھے آگیا۔
"میں دہلی والی ہوں ہی نہیں۔" اس نے کچن کے سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے جواب دیا۔ "اور میں تمہیں عمر نہیں' رشتے کی وجہ سے ایسے مخاطب کرتی ہوں۔"
"تم جانتی ہو کہ میں ولی امام سے پورے پانچ دن بڑا ہوں۔" عمر نے اسے جتایا۔
"اچھا' اچھا۔" اس نے ایک لمحے کو ٹھٹک کر غور کیا۔ "میں تمہیں بھی پانچ دن چھوٹے ہو۔ ویسے" اس نے عمر کی طرف دیکھا "جب تم آئے تھے مجھے آپ کہہ کر کیوں مخاطب کرتے تھے۔ اب تم کیوں کہتے ہو۔"
"میں تمہیں آپ!" عمر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"بس تم اتنی کم عمر ہو کہ تمہیں زیادہ دیر آپ کہا نہیں جا سکتا۔" اسے یاد آیا جب وہ یہاں آیا تھا اس کے ذہن میں صباحت کا تصور ایک بھابھی کا تھا ایک ایسی بھابھی جو اس کے شہید بھائی کی بیوہ تھی' لیکن چند دن میں ہی یہ جھجک اور یہ احساس نجانے کیوں ختم ہو گیا تھا۔
"میں کم عمر نہیں ہوں۔" اس نے مٹر سے بھری ٹوکری اٹھا کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "میں

پورے چھبیس سال کی ہو چکی ہوں اور ایک ساڑھے چھ سال کی عمر کے بیٹے کی ماں بھی ہوں۔"

"اوہ ہاں..... یہ تو سینارٹی کی علامت ہے تم چوبیس سال کی عمر میں اتنے اعزازات حاصل کر چکی ہو اور میں تینتیس سال کی عمر میں بھی چھڑا چھانٹ ہوں۔" عمر نے مسکرا کر کہا۔

"ویسے تم۔" اس نے سر جھٹک کر اپنے الفاظ درست کیے "میرا مطلب ہے کہ آپ تینتیس سال کے نہیں لگتے؟"

"نہیں چھوڑو، تم مجھے اتنی عزت مت دو پلیز، تم ہی ٹھیک ہے میرے لیے۔" عمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

"چلو تم سہی۔" اس نے مٹر کے دانے نکالتے ہوئے شانے اچکائے۔

"اور میں اتنے سال کا اس لیے نہیں لگتا کہ مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ خود مختار ہوں، چھ مہینے کما لیتا ہوں، چھ مہینے کھاتا رہتا ہوں چین کی نیند سوتا ہوں، سکون کے دن گزارتا ہوں" عمر نے اس کی بات کا جواب دیا۔

"ہوں!" اس نے سر ہلایا اچھی بات ہے۔

عمر نے دلچسپی سے صباحت کی طرف دیکھا پچھلے کئی سالوں میں وہ جتنے لوگوں سے ملا تھا ان میں وہ واحد تھی جس نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی تھی۔ شاید وہ اپنی دنیا میں اتنی مگن اور دوسروں سے اتنی بے نیاز تھی کہ اسے کون کیسا ہے اور جیسا ہے ویسا کیوں ہے، قسم کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"تمہیں یہاں کی سیلن زدہ فضا سے اتنی چڑ ہے تو کہیں اور کیوں شفٹ نہیں کر جاتیں۔" وہ جان بوجھ کر اسے بولنے پر مجبور کرنے کی خواہش کے تحت بولا۔

"کہاں جاؤں۔" اس نے مٹر کے چھلکے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جو گھر ملا ہے فوج کی طرف سے، اس میں شفٹ ہو یا پھر کہیں اپنی پسند کی جگہ پر گھر خرید لو، تمہیں کوئی کمی تھوڑی ہے۔" صباحت نے مڑ کر عجیب سی نظروں سے عمر کو دیکھا، وہ نظریں ایسی تھیں کہ کچھ دیر کے لیے وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

"یا پھر اپنی اماں کے پاس دبئی چلی جاؤ۔" گڑبڑاہٹ میں عمر نے وہ تجویز پیش کر دی جو شاید اسے نہیں پیش کرنی چاہیے تھی۔

"ابا کی وفات کے بعد اماں نانا کے پاس چلی گئیں اور مجھے بھارت کا ویزا کبھی نہیں ملے گا۔"

"اوہ ہاں!" عمر نے سر ہلایا۔ "لیکن دبئی جا کر بھی تو وہاں کا ویزا لیا جا سکتا ہے نا!"

"مسئلہ کیا ہے؟" ٹماٹر دھوتے ہوئے اس کے ہاتھ رکے اور وہ مڑ کر عمر کی طرف دیکھنے لگی۔ "کیا میرا یہاں رہنا کسی کو اچھا نہیں لگ رہا یا کوئی مجھ سے جان چھڑانا چاہ رہا ہے۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔" عمر کو لگا انجانے میں وہ اس کا دل دکھا گیا تھا اور اس نے اسے نئے وہم میں ڈال دیا تھا۔

"پھر؟" وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ تمہیں یہاں کا موسم اور فضا جو پسند نہیں ہیں۔" عمر نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"ہم جہاں بھی رہ رہے ہوتے ہیں، ضروری تو نہیں کہ ہمیں وہاں کی ہر چیز ہی پسند ہو۔" اس نے واپس مڑ کر ٹونٹی کھول دی۔ پانی کی تیز دھار سرخ سرخ ٹماٹروں پر پڑنے لگی۔

عمر نے کھسیا کر سر جھکا لیا اور خاموشی سے باورچی خانے سے باہر چلا آیا۔

☼ ☼ ☼

"میں سیلانی آدمی ہوں۔" ایک روز اس نے ابی جان سے کہا "میرے اندر کسی خانہ بدوش کی یا پھر شاید کسی جپسی کی روح ہے۔"

"پھر؟" انہوں نے آنکھوں سے قریب کا چشمہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

"پھرتا ہوں کہ ایک جگہ رکے رہنا میری طبیعت سے نہیں کھاتا۔" اس نے انہیں یاد دلایا "پچھلے کئی سال میں نے ملک ملک پھر کے روزی کمانے اور زمانے میں گزار دیے، یہاں آیا تو آپ سے ملے بغیر واپس جانے کو دل نہیں مانا، مگر اب یہاں آئے بھی کافی دن ہو چکے ہیں۔"

"تو گھومنے پھرنے کو یہاں کیا کم جگہیں ہیں، کچھ دن مزید رکو اور ان علاقوں کو بھی دیکھو، کھوجو اور جانو۔" انہوں نے تجویز پیش کی۔

"ونڈر فل آئیڈیا!" یہ تجویز اس کے دل کو لگی تھی "لیکن ایک شرط پر۔"

"وہ کیا؟" انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"آپ سب لوگ بھی میرے ساتھ چلیں، آپ، شائے جی، صباحت اور منیب۔"

"مگر ہم تو بوڑھے ہو چکے ہم میں خواری کی ہمت کہاں۔" وہ متذبذب انداز میں بولے۔

"آزمائیں تو سہی، آپ خواری کی ہمت نہ پا سکے تو لوٹ آئیے گا۔" عمر نے اصرار کیا۔

"چینج ضروری ہے ابی جان پلیز۔" اس نے ان کی خاموشی پر اصرار کیا۔ اس بار ان کی خاموشی نیم رضا مندی کے برابر تھی۔

"لیکن صباحت نہیں مانے گی۔" ابی جان کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"اسے انکار نہیں کرنا چاہیے۔" عمر نے فوراً کہا "میں نے منیب سے بات کی ہے اور وہ تو بہت پرجوش ہو رہا ہے جانے کے لیے۔"

"تم خاصے سمجھ دار ہو۔" ابی جان مسکرائے۔ "تم نے ہمارا بچہ ٹریپ کر لیا۔"

"یہ ضروری ہے ابی جان!" عمر نے سنجیدگی سے کہا۔ "بہت زندگی ایک سے معمول کے مطابق گزار لی، اب آپ سب کو باہر نکل کر دیکھنا چاہیے دنیا کے کیا رنگ ڈھنگ چل رہے ہیں۔"

ابی جان نے چشمہ کی کمانی کا سرا دانتوں تلے دبایا اور کچھ دیر عمر کی بات پر غور کرنے کے بعد سر ہلایا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس گھر پر چھائے غم، سکوت اور ملال کا قبضہ توڑنے کی خواہش کر رہا تھا، اس گھر کے مکینوں کے چہروں پر نجانے کس کس بات کے غم کا سایہ اور انجانے اندیشوں کا ڈیرا ہمہ وقت نظر آتا تھا۔

"تمہیں اصولاً" اور اخلاقاً" اس ٹرپ کی تجویز کے خلاف اتنی سخت مزاحمت نہیں کرنی چاہیے تھی۔" خشک لکڑیوں کے الاؤ میں مزید کچھ لکڑیاں توڑ کر پھینکتے ہوئے عمر نے صباحت سے کہا۔

"میری مزاحمت سے کیا فرق پڑا؟" اس نے گھٹنوں پر چہرہ ٹکائے الاؤ کی روشنی کو دیکھتے ہوئے جواب دیا "تم ہمیں لے تو آئے یہاں۔"

"میری بات اور ہے۔" عمر نے کہا۔ "میرے دل میں جو بات آ جائے کسی نہ کسی طرح پوری کر کے ہی دم لیتا ہوں۔" لیکن میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہاری طرف سے اتنی مزاحمت دیکھ کر ایک سے دوسری بار کبھی نہ کہتا۔"

"ویسے یہ تو بتاؤ تمہارا دل واقعی نہیں چاہتا وہاں سے کہیں باہر نکلنے کو۔" اپنی بات کے جواب میں صباحت کی خاموشی دیکھ کر عمر نے سوال کیا۔

"دل!" اس نے نظریں اٹھا کر عمر کی طرف دیکھا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"لیفٹ آرٹریز اور رائٹ وینٹریکلز والا دل۔" وہ مسکرایا "تم نے دل کے اسٹرکچر کے بارے میں تو کتابوں میں پڑھا ہی ہو گا۔"

"ہاں پڑھا ہے۔" اس نے گھٹنوں سے چہرہ اٹھا کر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ "بہت تفصیل سے پڑھا ہے، دل کے بارے میں ایک ایک تفصیل پڑھ لینے کے بعد بھی کہیں یہ لکھا نہیں دیکھا کہ یہ خواہش کرتا ہے، یہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ یہ خوش ہوتا ہے اور کئی رازوں کا امین بھی ہوتا ہے۔" اب وہ سامنے دیکھ رہی

تھی دل سے منسوب ایسی باتیں شاعرانہ تعلّی کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"دماغ کا اسٹرکچر پڑھیں تو اس کی تفصیلات میں کہاں درج ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ کرتا ہے، سوچتا ہے، علم حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے، خراب ہو جاتا ہے اور پھٹ بھی جاتا ہے۔" عمر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"سو دل و دماغ کے بارے میں کسی چیز کی چاہت کرنے کا سوال کرنا ہی نہیں چاہیے۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

"ہوں۔" عمر نے کچھ دیر اس کی بات پر غور کیا۔ "چلو یہ بتاؤ ولی امام تمہیں بہت یاد آتا ہے کیا؟"

عمر کے اس سوال پر صباحت نے اسے چونک کر دیکھا۔ شاید اسے اتنے ذاتی سوال کی توقع نہیں تھی۔

"پتا نہیں۔" پھر اس کی طرف سے جواب آیا۔

"کیوں پتا نہیں؟"

"اس لیے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا، میں اس کے بارے میں کیا یاد کروں۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "ایک انسان کے ساتھ ڈیڑھ دو یا ڈھائی ہفتے گزارنے کے دوران آپ اس سے کتنے مانوس ہو سکتے ہیں اور اس کے بارے میں کیا کیا یاد کر سکتے ہیں۔" اس نے عمر سے سوال کیا۔

"یاد کرنے کو اتنے کم عرصے میں بھی بہت سی باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔" عمر نے کہا۔

"مثلاً"۔ ایک اور سوال آیا۔

"مثلاً" یہ کہ اتنے محدود دن اگر اچھے گزرے تو لمحہ لمحہ سے کشید کی گئی خوشیوں کو یاد کیا جا سکتا ہے۔"

"اور فرض کرو، ایسا نہ ہو تو؟" اس نے ابرو چڑھا کر عمر سے سوال کیا۔

"وہ دن اگر برے گزرے تو ان برے دنوں سے حاصل کیے گئے تجربے بھی یاد بن سکتے ہیں۔"

"بری یادیں، تلخ یادیں!" اس نے پوچھا۔

"کیا ایسا تھا؟" عمر نے نیچی آواز میں سوال کیا۔

"نہیں، ایسا بھی نہیں تھا" اس نے سر ہلایا۔ "یہ تو میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔"

"پھر کیا خیال ہے ان دو ڈھائی ہفتوں میں یاد کرنے والی کوئی بات نہیں۔"

"ہیں!" اس نے کہا۔ "مگر مجھے یاد نہیں آتیں۔"

"ولی امام کے معیار پر میں پوری نہیں اتری تھی شاید، اس کی اور میری عمروں میں بہت فرق تھا، ابھی تو بات ادب، آداب، آپ، ہم تک ہی محدود تھی کہ وہ چلا بھی گیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا اور کتنا یاد کروں۔"

"ہوں!" عمر نے اس کی طرف دیکھا۔ "ان ڈھائی ہفتوں نے تمہیں ایک شہید کی بیوہ بنا دیا۔ کیا یہ اعزاز تمہیں فخر نہیں دلاتا؟"

"پتا نہیں۔" اس نے ایک بار پھر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "اگر میں کہوں کہ مجھے یہ اعزاز اس لیے اعزاز نہیں لگتا کہ یہ مجھے اس وقت ملا جب میں نے نہ تو اس کو سمجھا نہ ہی مجھے پتا چلا کہ اس پر میرا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔

ہمارا معاشرہ، ہمارے اردگرد بستے لوگ جب ہمیں بتا رہے ہوتے ہیں کہ کس موقع پر ہمیں کس ردعمل کا مظاہرہ کرنا ہے، ہمیں کسی بات کا کیا جواب دینا ہے، میں اس عمر میں تھی جب ولی امام شہید ہوا۔ میں نے کبھی فوج، جنگ، شہیدوں اور غازیوں کے بارے میں تاریخ کی کتاب کے چند صفحات کے سوا کچھ نہیں پڑھا تھا، ہالی ووڈ کی وہ اکا دکا فلمیں جو جنگوں کی کہانیاں سناتی تھیں، ان میں بھی جنگ میں مر جانے والوں کے بارے میں جان کر میرے جذبات وقتی دکھ محسوس کرنے سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ پھر کوئی مجھ سے کیا توقع کر سکتا ہے کہ ولی امام کی شہادت پر میں کیا محسوس کروں۔"

"تمہیں اندازہ ہے کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھنا کیسا ہوتا ہو گا۔ تم نے کبھی سوچا جب ولی نے موت کو اپنے سامنے پایا ہو گا تو اس کے کیا احساسات ہوں گے، اسے اپنا کون کون یاد آیا ہو گا۔"

عمر کو اس کی سرد مہری اور بے نیازی سخت کھلی تھی۔

"جہاں وہ موجود تھا اس جگہ سے بہت دور اس کا اپنا گھر، اس کے ماں باپ، اس کے عزیز دوست، وہ مانوس مناظر، وہ نرم گرم محبتیں..... اور ان سب کے علاوہ تم اور اس کا وہ بیٹا جسے ابھی اس نے دیکھنا تھا، گود میں اٹھانا تھا، پیار کرنا تھا، جس کے لمس کو محسوس کرنا تھا، کبھی تم نے سوچا کہ وہ آخری احساسات کیا ہوں گے جن کو اپنے ذہن سے جھٹک کر وہ آگے بڑھا ہو گا اور اس نے بانہیں پھیلا کر اپنی طرف بلاتی موت کو لبیک کہا ہو گا، وہ وقت جب زندگی کہیں بہت دور، بہت پیچھے رہ چکی ہو گی اور اس کی نظروں کے سامنے ابدی تاریکی چھا چکی ہو گی۔"

عمر کی آواز بوجھل ہونے لگی اور اس کی آنکھوں میں پانی کے قطرے چمکنے لگے، اس کے حلق سے ایک سسکی سی نکلی اور اس نے سر جھٹک کر ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کی اس بات کے جواب میں صباحت خاموش تھی۔

"جب تم اس سے مانوس ہی نہیں تھیں اور اس کے جانے کا غم بھی تمہیں محسوس نہیں ہوا، تمہیں اس کی یاد بھی نہیں آتی تو پھر تم یہاں کیوں ہو، کس لیے؟" اب عمر مزید جذباتی ہونے لگا، اس کا دل چاہا وہ صباحت کو خوب سنائے۔

"میں یہاں محبتوں کا احترام کرنے کے لیے موجود ہوں، اپنی طرف دیکھتی پر امید نظروں کے جواب میں اثبات کے اشارے کے لیے موجود ہوں، میں یہاں ان وعدوں کو نبھانے کے لیے موجود ہوں جو میں نے ابھی کیے ہی نہیں تھے۔"

اس کی اس بات کا صباحت نے مکمل جواب دیا تھا۔ عمر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ولی امام کے بعد میں نے صرف ایک بات خود اپنے ذہن سے سوچی تھی، کیا میں شائے ماں اور ابی جان کو چھوڑ کر جا سکتی ہوں؟ میرے اور منیب کے چلے جانے کے بعد ان دونوں کا کیا حال ہو سکتا تھا، میں نے اس کا اندازہ کرنے کی کوشش کی تھی اور مجھے لگا، میں ان کو پیچھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں نے ولی امام سے اس کے ماں باپ کا ہمیشہ خیال کرنے کا کوئی وعدہ کیا تھا نہ ہی اس نے ایسا کوئی عہد لیا تھا، میرے پاس ایک شہید کی قربانی کو سیلوٹ کرنے اور اس کے کارناموں کے احترام کا صرف ایک ذریعہ تھا اور میں اسی احترام کے سلسلے میں یہاں موجود ہوں۔"

عمر کو لگا صباحت نے اس کے چہرے پر کھینچ کر طمانچہ مارا تھا۔

"مجھے ہر ملنے والے کے ذہن میں اٹھنے والے اس سوال کا اس کے کہے بغیر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں یہاں کیوں ہوں۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں کسی کو کوئی جواب، کوئی جواز نہیں دینا چاہتی، کیونکہ میرا اپنا انداز ہے، اپنی سوچ ہے، مجھے بڑی بڑی باتیں کرنی نہیں آتیں۔ میں مدلل تقریریں کرنے کے فن سے نا آشنا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے یاد کرنے بھی پر ولی امام کی بہت زیادہ باتیں یاد نہیں آتیں ہم جتنے دن ساتھ رہے، مجھے لگتا رہا وہ مجھے لک ڈاؤن کرتا تھا۔ انسان کی فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ اگر کوئی اسے خود سے نیچا سمجھے تو اس کے لیے اس کے ذہن میں اچھی بات نہیں آتی، اس کو احترام دینا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہوتا، شاید ولی کے لیے میرے جذبات ایسے ہی ہوں، مگر میں اب اپنی ذات سے ہٹ کر اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔ قومیں اپنے ہیروز کو ٹری بیوٹ (خراج عقیدت) پیش کرنے کے مختلف طریقے اپناتی ہیں نا..... میرا طریقہ شاید یہ ہی ہے جس کی وجہ سے میں یہاں موجود ہوں۔"

عمر ایک ٹک صباحت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب تک اسے ایک لاپروا، سرد مہر، مردم بیزار، امیچور سی لڑکی سمجھتا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کی سوچ میں اتنی گہرائی اور احساسات میں اتنی پختگی ہو سکتی ہے۔

"یہ بھی سچ ہے، دنیا کے بڑے بڑے نامور انسانوں

کی قدر اور شخصیات کے پیچھے کتنی خامیاں، کتنی ذاتی ناکامیاں اور کتنے مسائل چھپے ہوں گے۔ ان کی قدر آوری ایسی باتوں پر کسی کی نظر پڑنے ہی نہیں دیتی۔ بڑی بڑی فتوحات کرنے والے، کٹھن معرکے سر کرنے والوں نے زندگی میں کہاں، کہیں کتنوں کی دل شکنی کی ہو گی، کون جان سکتا ہے، کیونکہ تاریخ تو ان کے شان دار معرکوں کے قصیدوں سے بھری ہوئی ہے۔" اس رات اپنے بستر پر لیٹے پہلی بار عمر کو خیال آیا۔

"لیکن ایک بڑا کارنامہ، ایک بڑی قربانی، ایک بڑا قدم انسانی شخصیتوں کی کتنی کجیاں اور غلطیاں ڈھانپ لیتا ہے۔ جب ہی تو انہیں خوش قسمت کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں اس اہم کام کے لیے چن لیتا ہے۔"

اسے اب صباحت کی کسی سرد مہری اور بے نیازی سے اختلاف نہیں رہا تھا۔ بلکہ اب اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ایک بڑے سلیوٹ کا حق دار ولی امام تھا یا صباحت۔

"تم پھر اتنی مردم بیزار کیوں ہو، اتنی بے رنگ زندگی کیوں گزار رہی ہو، زندگی کو زندگی کی طرح کیوں نہیں گزارتیں۔" اسے یاد آیا اس نے صباحت سے پوچھا تھا۔

"انسان کو اپنی فطری خامیوں پر قابو پانے میں بہت وقت لگتا ہے۔ میں یہاں شائے ماں اور ابی جان کی خاطر موجود ہوں اور مجھے اس موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں۔ دوسری طرف مجھے جب یہ خیال آتا ہے کہ سترہ سال کی عمر میں ہی وقت مجھ پر آیا اور آ کر چلا بھی گیا تو مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگتی ہے میں آخر میں ہی کیوں؟ یہ میری بہت بڑی خامی ہے میں مانتی ہوں، مگر ہے، کیا کیا جائے۔" پھر اس نے شانے اچکاتے ہوئے عمر کی طرف دیکھا تھا۔

"اور جب یہ خیال مجھ پر حاوی ہونے لگتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ جب یوں ہی گزر جانی ہے تو پھر کیا فرق پڑتا ہے میں نئے نئے لباس بناؤں یا نہیں لوگوں سے ملوں جلوں یا نہیں، کہیں آؤں جاؤں یا نہیں۔ ایک میری عمر رائیگاں جانے سے اگر شائے ماں، ابی جان اور منیب کی زندگی خوش و خرم گزر سکتی ہے تو چلو یونہی سہی۔"

"جتنی آسانی سے یہ بات تم نے کہہ دی، کیا اس پر عمل اتنا آسان ہے۔" عمر نے تصور میں صباحت کو مخاطب کیا "ان ہیروز کو تو دنیا جانتی ہے جو منظر عام پر آئے مگر تم جیسے بہادروں کو تاریخ شاید کبھی ڈھونڈ نہ پائے۔"

اس نے دل ہی دل میں صباحت کو سلیوٹ کیا۔

"جو اپنے نقصان پر پردہ ڈالے دوسروں کے فائدے کے لیے جیتے ہیں اور اپنا چرچا بھی نہیں ہونے دیتے۔"

وہ صباحت سے مرعوب ہوا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ دو ہفتے انہوں نے مختلف جگہوں کی سیر کرتے، گھومتے پھرتے اور خوش گپیوں میں گزارے۔ ان دو ہفتوں میں منیب ولی عمر سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا، وہ پہلی بار دنیا دیکھنے نکلا تھا اور اس کے ہر ہر انداز میں بے ساختہ جوش اور خوشی ٹپکتی تھی۔ وہ عمر کے اسٹل اور مووی کیمرے چلانا سیکھ رہا تھا، اس کے لیپ ٹاپ پر اپنی کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے چلاتا تھا۔ اونچے پہاڑوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا تھا مگر سردی اور برف باری اسے ایسا کرنے نہیں دیتی تھی۔

"آپ وعدہ کریں چچا! آپ گرمیوں میں دوبارہ آئیں گے اور مجھے بھی یہاں لائیں گے۔" وہ عمر سے بار بار وعدہ لیتا۔ اس کے لیے یہ ہی پوری دنیا تھی اور اس سے زیادہ مزے کے دن کوئی تھے ہی نہیں۔

"تم نے دیکھا، مونی کتنا خوش ہے۔" واپسی سے ایک دن پہلے عمر نے صباحت سے کہا۔ "وہ اس محدود ماحول سے نکلنے کے بعد کتنا اڑا اڑا پھر رہا ہے۔"

"ہاں میں دیکھ رہی ہوں۔" صباحت نے جواب دیا۔

"تو پھر تمہیں کیا لگتا ہے، کیا زندگی کی ان تمام انجوائے منٹس پر اس کا حق نہیں۔"

"تم جانتے ہو کہ معاشرے میں منیب کو کیا مقام دیا جاتا ہے۔ اسے بار بار کیا یاد دلایا جاتا ہے؟" صباحت نے سوال کیا۔

عمر نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ایک شہید کا بیٹا ہے، اسے باپ کے تمغوں اور اعزازات کا مان رکھنا ہے، اسے اسی ڈسپلن کے ساتھ زندگی گزارنی ہے جو اس کے باپ کی شخصیت کا خاصہ تھا یہ سبق دوسرے لوگوں کے علاوہ شائے ماں اور ابی جان اسے پڑھاتے ہیں۔ یوں جیسے بس اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ بڑا ہو اور باپ کی طرح کسی محاذ پر لڑتا ہوا شہید ہو جائے۔ ایک طرہ خاندان کے شملے میں ولی امام نے سجایا، ایک اور منیب سجائے گا۔"

"ضروری تو نہیں کہ۔" عمر نے کہنا چاہا۔

"ہاں ضروری نہیں۔" صباحت نے اس کی بات کاٹ دی۔ "لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بچے کی تربیت کو جنون بنا لیا گیا ہے، اسی لیے میں سمجھتی ہوں کہ اس کو اس ماحول سے باہر نہیں نکلنا چاہیے، باہر نکلے گا اور نئی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا تو کچھ بعید نہیں کہ اس کا ذہن اس ٹارگٹ سے ہٹ جاتے جو اس کے لیے سیٹ کیا گیا ہے۔" صباحت کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"کیا ہے یار۔" عمر نے سر جھٹکا "ہم ایک معصوم بچے کے مستقبل کا نقشہ ابھی سے اپنے ہاتھوں سے کیسے بنا سکتے ہیں۔"

"اور میں نے دیکھا ہے کہ وہ تم سے کچھ زیادہ اٹیچڈ بھی نہیں ہے، وہ شائے جی اور آغا جی کا ہی دم بھرتا ہے۔"

"میں اس کے اور ان دونوں کے درمیان آنا ہی نہیں چاہتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں کیا منیب کو دیکھ کر تمہارے اندر مامتا نہیں جاگتی؟" عمر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پتا نہیں۔" اس نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

وہ اپنی ہر بات سے اس کو حیران کر رہی تھی۔ عمر نے اب تک دنیا کے مختلف ملکوں میں رہتے ہوئے بہت سی خواتین کی نفسیات پر غور کیا تھا، ان کے عمل اور رد عمل کو جانچا تھا مگر صباحت کی نفسیات سب سے مختلف اور انوکھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کی نفسیات کی تشریح نہیں کر پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ روڈ، یہ درخت، یہ پتے اور یہ دیکھیں آبشار جس کا بہتا پانی منجمد ہو کر برف بن چکا تھا اور یہ اس چائے والے کی تصویر جو ایک برتن سے دوسرے برتن میں بار بار چائے منتقل کر کے اس کو پھینٹتا تھا اور اف یہ افغانی نان ..... آپ کو یاد ہے چچا! ایک نان ہم تین لوگوں نے کھایا تھا۔" گھر واپسی کے بعد منیب ہر روز اسکول سے واپس آ کر عمر نے لیپ ٹاپ پر اپنے سفر کی تصویریں، دیکھتا اور ساتھ ساتھ مارے مسرت کے چلاتا جاتا۔

"تمہیں معلوم ہے مونی! یہ تو محض چند علاقے ہیں جو ہم نے دیکھے، نتھیا گلی، ٹھنڈیانی، مبراسی، شنکیاری، باڑیاں اور مری سے آگے بھی ایک دنیا ہے، بہت بڑی اور بہت خوب صورت۔" عمر نے دزدیدہ نظروں سے صباحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ صباحت دھلے کپڑے استری کر رہی تھی اور اس کی پشت عمر اور منیب کی طرف تھی۔

"مجھے سڈنی کرکٹ گراؤنڈ، لارڈز اور اوول کا پتا ہے، وہ بہت بڑے گراؤنڈز ہیں، جن کی باؤنڈری لائن سے باہر گیند مشکل سے ہی جا سکتا ہے۔" مونی نے اپنی محدود معلومات سے خبر باہر نکالی۔

"ہاں وہ بھی اور بہت کچھ۔" عمر نے کہا۔ "یہاں انٹرنیٹ کی سہولت نہیں مل پائی، موبائل سگنلز کا بھی مسئلہ ہے ورنہ میں تمہیں بہت کچھ دکھاتا۔"

"ٹویٹ، ٹویٹ، ٹویٹ۔" عمر کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اچانک باہر کی فضا سے آواز ابھری۔ اس نے دیکھا،

صباحت کا ہاتھ اچانک گرم استری کو چھو گیا۔

"سی!" اس نے ہاتھ میں پکڑا کپڑا چھوڑ دیا۔

"اوہ!" عمر ایک دم اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"احتیاط سے بھئی۔" اس نے کہا اور موبی سے برن کریم لانے کا کہا۔

"احتیاط اس کے سامنے کیا معنی رکھتی ہے۔" صباحت نے غصے سے قرینے سے تہہ کیے کپڑوں کو ہاتھ مار کر گراتے ہوئے کہا۔ "میں خوش تھی کہ کچھ دن سے اس سے جان چھٹی ہوئی ہے، مگر نہیں اس کو چین کہاں۔" اس کے لہجے میں جلنے کی تکلیف سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کی آمیزش شامل ہو گئی۔ "آ گیا پھر اپنا راگ الاپنے اور اس کے آ جانے کے بعد کوئی بھی کام سیدھا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بری طرح جھنجلائی ہوئی تھی۔

"تم اس سے خفا کیوں ہو بھئی، یہ بے چارہ پرندہ جو نظر بھی نہیں آتا تمہیں کیا کہتا ہے؟" صباحت کو برن کریم کی ٹیوب پکڑاتے ہوئے عمر نے نرمی سے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟" اس نے آنسو بھری آنکھوں سے عمر کی طرف دیکھا "یہ ہی تو ہے جو میری زندگی میں سارے برے لمحے لے کر آیا، یہ ہی تو ہے جس کی نحوست اس علاقے پر چھائی رہتی ہے، یہ ہی تو ہے جو یہاں کسی کو خوش ہونے دیتا ہے نہ چین سے زندگی گزارنے دیتا ہے۔" وہ جیسے پھٹ پڑی۔

"یہ۔" عمر نے لاشعوری طور پر باہر دیکھنا چاہا مگر اس کی نظریں بند کھڑکی سے ٹکرا کر واپس آ گئیں۔

"یہ تو کبھی نظر نہ آنے والا بے ضرر سا پرندہ ہے، یہ بے چارہ لوگوں کی خوشیاں اور اطمینان کیسے چھین سکتا ہے۔"

"چھینتا ہے اور چھین چکا ہے۔" جواب میں صباحت نے اپنی بات پر زور دیا۔ "اس نے......" پھر اس نے اپنی زندگی کے ہر اس لمحے کا ذکر سنایا جب اس پرندے کی آمد اس کی زندگی کو ایک نیا اور برا موڑ دے گئی۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔" صباحت کی بات تفصیل سے سننے کے بعد عمر نے کہا۔ "یہ چھوٹا سا بے ضرر پرندہ تو۔"

"یہ چھوٹا اور بے ضرر پرندہ ہی ہے۔ جس کی نحوست نے مجھے زندگی کے کجلی بن میں مسائل کے ہاتھیوں سے نمٹنے پر لگا رکھا ہے۔ میری ان خوشیوں کو بھی یہ کھا گیا جو ابھی میری زندگی میں آئی ہی نہیں تھیں۔" صباحت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

عمر دنگ رہ گیا۔ یہ کیسی نفسیات تھی جو ایک طرف اس سے ایک ان کہا، خاموش ایثار کرائے جا رہی تھی، دوسری طرف اپنی ساری فرسٹریشن ایک معصوم پرندے پر نکلوا رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"دراصل وہ احساسات کی دو انتہاؤں کے درمیان پھنس کر رہ گئی ہے۔" اگلے دن اس نے شائے ماں کو بتایا۔ "اور ان دو انتہاؤں میں اس کو اس کی کم عمری، مناسب راہنمائی کی عدم دستیابی، جذباتی گفتگو، جذباتی نصیحتوں اور معاشرتی رویوں کے عدم توازن نے پھنسایا ہے۔"

"مثلاً" کیسے؟" شائے جی نے اس کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"مثلاً" ایسے کہ ابھی اسے شادی شدہ زندگی گزارنے کا ڈھنگ تک نہیں آیا تھا کہ وہ ماں بن گئی، اسے ابھی اندازہ ہی نہیں تھا کہ ماں اور مامتا کیا ہوتی ہے کہ اسے شہید کی بیوہ کا اسٹیٹس مل گیا، ہماری مخصوص سوچ، مخصوص گفتگو اس کی زندگی کی سمتیں متعین کرتی گئی۔"

"لیکن اس کا اپنا ذہن بھی تو تھا، کیا اس نے اس سے نہیں سوچا۔" شائے جی کو عمر کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

"اس کا ذہن!" عمر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس پر جو سوچ مسلط کی گئی اس نے وہی سوچ لیا۔ سنا تھا ستی ہو جانے کی رسم ہندوانہ ہے، یہاں صباحت کو جو سوچ دی گئی وہ ستی ہو جانے کے ہی برابر تھی صرف ایک

فیصلہ اس نے اپنی مرضی سے کیا اور وہ آپ دونوں کے پاس ٹھہر جانے کا تھا، باقی سب فیصلے اس نے دوسروں کی گفتگو کے رعب میں آ کر کیے، سب رویے دوسروں کی راہنمائی کے مطابق اختیار کیے۔

اور معاف کیجیے، آپ دونوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ ٹھیک نہیں رہا۔" عمر نے شائے جی کی طرف دیکھا جو حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کے پاس اگر وہ آپ دونوں کی خاطر رک گئی تھی تو آپ کو اس کے لیے ساس اور سسر کا لبادہ ماں اور باپ کے لبادے سے بدل لینا چاہیے تھا۔ آپ موبی کے یہاں موجود رہنے میں مگن ہو گئے اور بھول ہی گئے کہ ایک جوان بیٹی پہاڑ جیسی زندگی تنہا گزارے چلی جا رہی ہے، اس کے جذبات و محسوسات کی کچھ فکر کر لیں۔" شائے جی نے منہ پھیر لیا۔

"یہ حقیقت ہے۔ شائے جی! نظریں چرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" عمر نے کہا۔ "آپ کو پتا ہے کہ اس کے اندر سے اٹھنے والی فرسٹریشن نے باہر نکلنے کے لیے ایک معصوم بے ضرر پرندے کا انتخاب کر لیا۔ آپ نے دیکھا وہ ٹویٹ ٹویٹ کی آواز پر کیسے ری ایکٹ کرتی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اس کی زندگی میں ٹھہر جانے والے سب ایسے لمحوں پر جو اس کا بڑا نقصان کر گئے، اس پرندے کی آواز کا سایہ ہے۔"

"یہ سب اس نے ہم سے کیوں شیئر نہیں کیا؟" شائے جی نے بے چینی سے کہا۔

"اس لیے کہ آپ سب نے جو اسٹیٹس اسے دے دیا تھا، یہ سب شیئر کرنے کے لیے اسے اس سے نیچے اتر کر خاک پوست کی انسان بننا پڑتا، دیویوں جیسے عہدے سے دست بردار ہونا پڑتا۔"

"ہم نے ایسا کچھ نہیں کہا اسے۔" شائے جی نے ناک سکوڑی۔

"آپ نے کہا نہیں، بس احساس دلا دیا، آپ نے اسے بیٹیوں کی طرح نہیں سمجھا، ورنہ ایسی اجاڑ، بے رنگ زندگی اسے کبھی گزارنے نہ دیتیں۔" عمر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"کیا کرتے۔" شائے جی نے عمر کی طرف دیکھا۔ "ہم نے اسے نہیں روکا تھا کہ ہمارے پاس ہی ٹھہر جائے، وہ اپنی مرضی سے......"

"ٹھہر ہی گئی تھی تو بیٹیوں کی طرح رکھتیں نا، کچھ وقت گزر جانے کے بعد اس کے لیے کوئی بر ڈھونڈتیں اس کی شادی کر دیتیں کسی اچھے انسان سے۔ وہ بیٹی کی طرح آپ کے پاس آئی، اس کا میکہ بن جاتیں۔" عمر نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کی اس بات نے شائے جی کو ششدر کر دیا۔

"شادی کر دیتے تو جتنی مراعات اس کو ملی ہیں، ختم ہو جاتیں۔" کچھ دیر بعد الفاظ اٹک اٹک کر ان کے منہ سے نکلے۔

"مراعات ایک کم عمر لڑکی کی زندگی سے زیادہ اہم تھیں کیا؟" عمر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"اس کے لیے، اس کے بیٹے کے لیے" شائے جی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ان کی آنے والی زندگی کے لیے۔"

"کون سی زندگی، کون سا مستقبل؟" عمر نے کہا۔ "جس کی کوئی گارنٹی ہی نہیں۔" "آنے والی زندگی کے تصوراتی بھوت سے اسے بچانے کے لیے اس کا آج ویرانی، وحشت اور اذیت کی نذر کر دینا کہاں کی دانش مندی تھی۔"

"اس نے ہم سے کبھی کہا ہی نہیں۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شائے جی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کی اماں فون کرتی رہیں کہ ان کے پاس چلی جائے، انگلینڈ میں بیٹھا بھائی فون کرتا رہا اس کے پاس آ جائے، مگر اس کی ناں ہاں میں نہ بدلی۔ ہم کیسے اسے اپنے منہ سے کہہ دیتے کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔"

"یہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں، اس نے اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر آپ لوگوں کو اپنا لیا، تو آپ اس کے گھر والے کیوں نہیں بنے، جتنے عرصے سے وہ آپ کے ساتھ ہے، اتنا عرصہ تو بہت زیادہ ہوتا ہے ایک ماں کے لیے اپنی بیٹی کے جذبات کو اس کی فرسٹریشنز کو سمجھنے کے لیے۔" عمر کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"اس نے تم سے کہہ دیا' مجھ سے کہتی' کہہ کر تو دیکھتی۔" شائے جی کا لہجہ مزید شکستہ ہوا۔

"اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔" عمر نے سرہلایا۔ "میں نے صرف اس کے رو عمل کو' اس کے محسوسات کو سمجھنے کی کوشش کی' میں چند دن کا آیا سمجھ گیا۔ آپ لوگ اتنے عرصے میں کیوں نہیں سمجھ پائے۔"

"تو پھر بتاؤ' اب بھی تو وقت ہے' اب کیا کیا جائے' وقت ہے بھی کہ نہیں۔" شائے جی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں اب بھی وقت ہے۔" عمر نے سرہلایا۔ "ابھی بہت وقت ہے۔ اس کو سمجھئے' جانئے اور اس کے لیے بہتر فیصلہ کیجئے۔ اسے اپنی بیزاری' کوفت اور اپنی فرسٹریشنز' اپنے نقصانات کا مجرم ایک چھوٹے' معصوم اور بے ضرر پرندے کو ٹھہرانے کے لیے یوں اکیلا نہ چھوڑ دیجئے۔"

☼ ☼ ☼

"تمہیں عمر کیسا لگا' اچھا لڑکا ہے نا؟" شائے ماں نے اسٹرابری کی جیلی بنانے کی ترکیب صباحت کو بتانے کے دوران اچانک پوچھا۔

اس جیلی سے عمر کا کیا تعلق' وہ حیران ہوئی۔ "کیا اس کو یہ جیلی بہت پسند ہے' جو وہ یاد آگیا۔"

"یہ تو مجھے پتا نہیں' اسے پسند ہے یا نہیں۔" شائے ماں نے کہا۔ "لیکن یہ سوال میں کئی دن سے تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی مگر موقع ہی نہیں ملا۔ اب اچانک یاد آیا تو سوچا پوچھ لوں کہیں پھر نہ بھول جائے۔"

"کیا یہ اتنا اہم سوال ہے۔" صباحت نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں عمر' نیب اور اس کے دوستوں کے ساتھ بچہ بنا کرکٹ کھیل رہا تھا۔

"غیر اہم بھی نہیں ہے۔" شائے ماں نے تیار جیلی بھرنے کے لیے شیشے کے جار خشک کپڑے سے صاف کرنے شروع کیے۔

"اچھا بندہ ہے۔" صباحت نے جیلی کے لیے اسٹرابریز نرم کرنے کی خاطر ابلتے پانی میں ڈالیں اور پتیلی میں چمچ ہلایا۔

"جب سے آیا ہے گھر میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے' ابی جان بھی مگن رہتے ہیں اس کے ساتھ اور نیب بھی۔"

"ہوں!" شائے ماں نے سرہلایا "تم سے بھی بات چیت کرلیتا ہے۔"

"ہاں!" صباحت نے کچن کیبنٹ کی دراز میں سے کچھ ڈھونڈتے ہوئے جواب دیا "دنیا ایکسپلور (کھنگالنے) کرنے کے ساتھ ساتھ لگتا ہے اسے انسانوں کے ذہن ایکسپلور کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔"

"یہ بہت اچھا ایتھلیٹ تھا' اس نے اپنی اسکول اور کالج لائف میں بہت ریسز جیتیں' مگر پھر ایک حادثے میں اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹ گئی' بہتیرا علاج کیا کئی بار آپریشنز ہوئے۔ چلنے پھرنے کے قابل تو ہوگیا' لیکن تم نے دیکھا بائیں ٹانگ ابھی بھی ذرا دبا کر چلتا ہے۔"

"ہاں' میں نے نوٹ کیا ہے۔" صباحت نے کہا۔

"اس کے بعد یہ بددل ہوگیا' سرفراز کے پاس جرمنی چلا گیا' وہاں سے اسپین' پھر ہالینڈ اور اس کے بعد نجانے کہاں کہاں' ٹکتا نہیں دیکھا کہیں اس کے بعد' کہنے کو پڑھا لکھا ہے' ہنر مند ہے' کماتا بھی ہے مگر شادی کرتا ہے نہ ایک جگہ زیادہ عرصہ رکتا ہے' یوں جیسے سیلانی ہو۔"

"شادی کیوں نہیں کرتا؟" صباحت نے کیبنٹ بند کرکے پشت اس سے ٹکاتے ہوئے شائے ماں کی طرف دیکھا۔

"کہتا ہے مجھ میں نامحسوس سی ہی سہی جسمانی کجی ہے تو سہی' لڑکیوں کو مکمل مرد کی آرزو ہوتی ہے۔ حالانکہ اس کی شخصیت' خاندانی اسٹیٹس اور پیسے کی وجہ سے کئی اچھے خاندانوں سے اس کے لیے رشتے آئے مگر نہیں مانتا۔"

صباحت نے ایک بار پھر باہر کے منظر پر نظر دوڑائی۔

عمر گلوز اور پیڈز پہنے وکٹ کیپر بنا کھڑا تھا۔

"صباحت ایک بات کہوں بیٹا!" شائے ماں نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے باہر دیکھا۔

"جی۔" صباحت نے ان کی طرف دیکھا۔

"کیا تم عمر سے شادی کرسکتی ہو؟" شائے ماں کے منہ سے الفاظ نکلے تھے کہ باہر زور سے بادل گرجا تھا' آسمان پر بجلی چمکنے لگی تھی' اچانک کالا سیاہ بادل آسمان پر چھا گیا تھا اور اردگرد ہر طرف نیم تاریکی سی چھا گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میرے خواب بہت اونچے تھے۔ میں ملک کا نمبر ون ایتھلیٹ بننا چاہتا تھا' میری ڈویژن میں مجھ سے بہتر سپرنٹر کوئی نہ تھا' ہر نئی ریس کے بعد میرے میٹرز زیادہ اور ٹائم کم ہوتا جاتا تھا' میرے دوستوں' انسپائرز اور عزیز و اقارب کی توقعات کا گراف بڑھتا جارہا تھا۔ ادھر میرا قدم سب سے پہلے فنشنگ لائن پر پڑتا ادھر میرے کانوں میں فتح کی خوشی سے سرشار میرے اپنوں کی آوازیں بلند ہونے لگتیں۔ میں آگے' آگے... بہت آگے کی سوچنے لگا' مگر پھر میرے ساتھ وہ حادثہ ہوگیا۔ میں اس کار میں سیکنڈ سیٹر تھا۔ ڈرائیور موقع پر ختم ہوگیا اور میں زخم' زخم' خون میں نہایا اپنے تئیں اپنے آخری لمحے گزار رہا تھا۔ ان لمحوں میں مجھے بھی اپنوں کی شکلیں یاد آرہی تھیں۔ ایک ایک چہرہ جو کچھ لمحے پہلے میرا اپنا تھا' معدوم ہوا جاتا تھا' میرے کان تالیوں' سیٹیوں' ڈھول' ڈرم کی آوازوں کو کہیں دور سے آتا سن رہے تھے۔ میں جانے والا تھا اور وہ سب کچھ پیچھے رہ جانے والا تھا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ میرے اللہ کو میرے لیے وہ آخری لمحہ منظور نہ تھا' اس نے پھر سے مجھے زندگی بھی عطا فرمادی اور توانائی بھی' میں اپنوں کی طرف واپس کردیا گیا تھا۔"

وہ کہہ رہا تھا اور صباحت بت بنی اس کی گفتگو سن رہی تھی۔

"مگر واپسی کے اس سفر کے دوران میں نے بہت کچھ جان لیا تھا۔ وہ جو واقعی میرے اپنے تھے اور وہ جو ظاہر کرتے تھے کہ وہ میرے تھے' میں نے دونوں کے درمیان تفریق کی ایک واضح لکیر دیکھ لی تھی۔" وہ ہولے سے ہنسا اور سر جھٹک دیا۔

"تفریق کی اس لکیر کے پار رہ جانے والوں میں ارحمند بھی تھی۔"

"کون ارحمند؟" صباحت نے بے ساختہ پوچھا۔

"میں اسے بہت چاہتا تھا' اسے اپنا آبسیشن (Obsession) اپنی سول میٹ (روح کی ساتھی) سمجھتا تھا اور وہ تھی بھی بہت اچھی۔" اس نے سامنے دیوار کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں ہم مزاج تھے' ایک دوسرے کی دکھ' تکلیف اور خوشیوں کو بنا کہے بنا بتائے آپ محسوس کر لینے کی حد تک ہم مزاج۔ میری سوچ' میرے شوق سے ہٹ کر اس سے شروع ہوکر اس ہی پر ختم ہوجایا کرتی تھی۔ ہم دونوں نے مستقبل کے سارے پلان طے کر رکھے تھے' یہ جانے بغیر یہ سوچے بغیر کہ ہمارے پلان اللہ کے پلان سے ہم آہنگ ہیں بھی یا نہیں۔" وہ ایک بے بس سی ہنسی ہنسا۔

"وہ بہت زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔" اس نے صباحت کی طرف دیکھا۔ "مگر مجھے لگتی تھی۔ وہ مسکراتی تو مجھے لگتا' میرا دن روشن ہوگیا' وہ اداس ہوتی تو مجھے لگتا' اردگرد ہر چیز پر اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی ہے۔"

"پھر وہ کہاں گئی' وہ اب تمہاری زندگی میں کیوں نہیں ہے؟" صباحت نے ایک بار پھر بے ساختہ پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ میری زندگی میں آنے کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔" وہ ایک بار پھر بے بسی سے مسکرایا۔ "اس لیے کہ اکٹھے زندگی گزارنے کے ہمارے پلان اللہ کے پلان کے برعکس تھے۔ ہماری زندگیوں میں کسی ٹوٹ پھوٹ نے نحوست نہیں پھیلائی' میں کسی اور چیز کو بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا کہ اس کی وجہ سے میری زندگی میں برے لمحے ٹھہر گئے مگر جو آزمائش آئی

تھی اپنے وقت پر آ کر رہی۔"

"کیوں..... وہ تمہاری زندگی سے کیوں چلی گئی؟"
صباحت کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"اس لیے کہ اسے میں ایک مکمل مرد کے طور پر اچھا لگتا تھا۔ میری مکمل شخصیت اس کو مکمل کرتی تھی ۔ مگر اس حادثے نے مجھے نامکمل کر دیا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب ایسا لگتا تھا کہ میں کبھی چل ہی نہیں پاؤں گا۔ وہ وقت صبر آزما اور مشکل ترین تھا۔ یہ ہی وہ وقت تھا جب میں نے چہروں کے تاثرات اور رویے بدلتے دیکھے۔ حادثے کے آغاز کے دنوں میں ارحمند میرے لیے تسلی اور ہمت کا پیغام تھی مگر جب اسے لگا میں زندگی کی طرف تو لوٹ آیا ہوں، مگر شاید نارمل انسانوں کی طرح کبھی چل پھر نہ پاؤں تو جیسے اسے صرف اپنی پڑ گئی۔ مجھ سے اس کی محبت آزمائش میں پڑ گئی۔ جہاں میرے وہ اپنے جو لکیر کے اس پار تھے، میری ہمت بندھا رہے تھے، مجھے Bravo کی کالز دے دے کر مزید مضبوط ہو جانے کے پیغام دے رہے تھے، ارحمند لکیر سے دور بہت دور ہوتی چلی گئی اور پھر جب مجھے لگا کہ اب وہ مزید برداشت نہیں کر پا رہی تھی تو اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کہتی کہ وہ میرا ساتھ نہیں دے پائے گی میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں نے اسے اپنی محبت سے آزاد کر دیا۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

"تم جانتی ہو صباحت!" اس نے صباحت کی طرف دیکھا اور اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"حادثے کے بعد آجانے والی معذوری سے زیادہ اذیت ناک ارحمند کا رویہ تھا۔" کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولا، اس کی آواز اذیت اور درد کے بوجھ سے لرزنے لگی تھی۔ "جسمانی اعضا کی معذوری زیادہ دردناک ہوتی ہے یا سول میٹ (روح کی ساتھی) کا کھو جانا۔ میں اب تک کیلکولیٹ نہیں کر پایا۔" اس نے اپنی نم آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"مگر پتا ہے اس سارے میں ایک اچھی بات کیا ہوئی۔" دوسرے ہی لمحے اس نے تیزی سے اپنے ہاتھ آنکھوں سے ہٹا کر صباحت کی طرف دیکھا۔

"میرا اپنے اللہ اور اللہ کے فیصلوں پر ایمان مضبوط ہونے لگا۔ جو وہ چاہتا ہے ہوتا وہی ہے اور بے شک وہ جو چاہتا ہے ہم انسانوں کے لیے بہتر ہوتا ہے، ہم نادانوں کی عقلیں اس کو سمجھ نہیں پاتیں۔" اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ جو میرے ساتھ ہوا میں بھی شاید اس سب میں۔ میں پوشیدہ مصلحت کو آج تک سمجھ نہیں پایا، مگر میں نے کوشش کی کہ میں ہر بات کو مثبت انداز فکر کے ساتھ دیکھوں جو میرے ساتھ ہوا اسے ہونا ہی تھا، کار حادثہ نہ ہوتا، کچھ اور ہو جاتا، ارحمند کا اور میرا ساتھ نصیب میں لکھا ہی نہیں تھا، وجہ یہ نہ بنتی کوئی اور بن جاتی۔ انسان اپنی تقدیر کے خطوط پر چلتا ہے، کوشش انسان کا فرض ہے۔ کوشش کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی صوابدید پر ہے۔ جب ہی تو ہر طرف انسان کوشش پیہم میں مصروف ہیں، اگر معاملہ صرف تقدیر پر یقین کر کے ہونی کے انتظار کا ہوتا تو سب انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے آسمان کی طرف ہی تکتے رہتے۔"

صباحت نے پہلو بدلا اور چہرہ بند مٹھی پر ٹکا لیا۔

"لیکن میری سوچ کا رخ مثبت کی طرف مڑنے کا محرک حادثے کے بعد خود پر چھائے زندگی کے آخری لمحات کے تصورات ہیں۔ جب سب ختم ہو جانے کا یقین ہو جائے اور آپ کو دوبارہ سے وہ سب واپس مل جائے انسان تب بھی نہ سمجھے کہ سب کچھ اس خالق و مالک کائنات کے اشارے پر ہوتا ہے تو پھر وہ بد قسمت ہے اور میرے دن رات اس شکر گزاری میں گزرتے ہیں کہ میں ان بد قسمتوں میں شامل ہونے سے بچ گیا۔" وہ نیچی آواز میں بولا اور خاموش ہو گیا۔

"اسی لیے۔" اس نے صباحت کی طرف دیکھا۔ "میں اپنے ساتھ ہونے والے حادثات کا، اپنے نقصانات کا ذمہ دار کسی دوسرے انسان، کسی رویے کو، کسی پرندے یا جانور کو نہیں ٹھہراتا، کیونکہ اللہ کے سوا کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ میرے سفید کو سیاہ میں، میرے اچھے کو برے میں اور میرے غلط کو صحیح میں بدل دے۔

اور میں تم کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ حادثے کے بعد

میری ری ہیبلیٹیشن (صحت یابی) میں میرا سب سے زیادہ ساتھ دینے والا' میرا حوصلہ بڑھانے والا میرا بھائی میرا عزیز ترین دوست ولی امام تھا۔" صباحت چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر میرے پاس رہا' اس کے الفاظ' اس کی باتیں ابھی تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ وہ لطیفے جو وہ مجھے ہنسانے کے لیے سناتا تھا' وہ گانے جو میرا دل لگانے کے لیے گاتا تھا' وہ کہانیاں جو مجھے پڑھ کر سناتا تھا۔ میرے کانوں میں گونجتی ہیں' اس کے قہقہے' اس کی باتیں' اس کا زندگی سے بھرپور سراپا' میں کبھی کسی وقت بھلا نہیں پاتا۔

وہی اکھڑ' خود پسند اور دوسروں کو لک ڈاؤن کرنے والا ولی امام!" اس نے صباحت کو جتایا۔" ایک ماہ کی یادیں اتنی زیادہ ہیں کہ عمر بھر یاد کروں پھر بھی شاید کچھ یاد کرنے سے رہ جائے۔"

صباحت نے منہ پھیر لیا۔

"وہ یقیناً" ویسا نہیں تھا جیسا تم نے اس کو سمجھا' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ عمروں کے واضح فرق کی وجہ سے تم سے اتنے کم عرصے میں بے تکلف نہ ہو پایا ہو اور اس کے دل و دماغ میں آنے والے وقتوں کے لیے تمہارے لیے نجانے کتنی محبتیں' کتنے شیریں الفاظ اور کتنے تصورات کی جھلک موجود ہو۔ لیکن اس کی تقدیر یہ تھی کہ اس کا وقت ختم ہو چکا تھا' اسے جانا ہی تھا' وہ اتنی ہی عمر لایا تھا۔ ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ وہ یونہی کسی سڑک سے گزرتا' کسی حادثے کا شکار ہو جاتا' اسی پہاڑی کی اونچائی سے وادی میں جا گرتا یا کسی جان لیوا بیماری کا شکار ہو جاتا..... مگر اس کی خوش قسمتی دیکھو کہ موت جو اسے اپنے مقررہ وقت اور جگہ پر آنی ہی تھی کیسے روپ میں آئی۔"

صباحت نے اپنی آنکھوں کی نمی کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا۔

"یوں کہ وہ امر ہو گیا' یوں کہ اس کے لیے اور اس جیسوں کے لیے فرمایا گیا" انہیں مردہ نہ کہو' وہ زندہ ہیں مگر تم نہیں جانتے۔"

صباحت نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر منہ سے نکلنے والی آواز کو دبا دیا۔

"اور تم۔" عمر نے صباحت کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارے لیے بھی یہ ہی پسند فرمایا گیا' تمہارا اور ولی امام کا اتنا ہی ساتھ تھا' اس سے آگے بڑھ نہیں سکتا تھا' منیب کے لیے بھی ایسا ہی ہے۔ جو اللہ اپنے پیارے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیدائشی یتیم کا درجہ پسند فرماتا ہے' وہ ہم عام انسانوں کے لیے ایسا کر دے تو کیا ہے۔"

صباحت کے منہ سے اب ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

"لیکن ہاں!" عمر نے صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "دکھ ہونا' غم اور اذیت کا احساس ہونا فطری ہے' کیوں' میں ہی کیوں؟ جیسے سوال ذہن میں آنا قدرتی عمل ہے۔ وہ تم کر سکتی ہو مگر جو ہوا' اس کا غصہ اس پرندے پر نکالنا اور اسے نحوست قرار دینا عجیب سی بات ہے' ایسی عجیب بات جو ہضم نہیں ہوئی مجھے۔" عمر نے ہلکے سے مسکرا کر صباحت کی طرف دیکھا۔

"وہ ایک حقیقت ہے۔" صباحت نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"غلط..... بالکل غلط۔" عمر نے بلند آواز میں جواب دیا" اگر ایسا ہوتا تو اس علاقے کے باسیوں کی زندگی میں کوئی خوشی کبھی آتی ہی نہیں' وہ تو ہر وقت نقصان کا شکار رہنے کے باعث علاقہ چھوڑ کر کہیں اور جا کر آباد ہو چکے ہوتے۔"

"تم نہیں سمجھتے۔" صباحت نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔" عمر نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہارے ساتھ جو بھی برا ہوا' عین ان ہی وقتوں میں اسی جگہ اس ٹویٹ' ٹویٹ کی آواز ابھرنے کے دوران نجانے کتنے لوگوں کی زندگیوں میں خوشیاں اتری ہوں۔ پھر یہ بے چارہ منحوس کیسے ہوا۔"

صباحت نے پہلو بدل کر منہ پھیر لیا۔

"ریشنل (عقل سے کام لینے والی) بنو صباحت! اللہ

پر مثبت یقین کرنے والے ان توہمات میں نہیں پڑتے تمہارے پاس ابھی بہت وقت اور بہت سے مواقع ہیں۔ اپنے لیے خود فیصلہ کرو۔ اللہ نے زندگی تم کو عطا کی ہے اسے اپنے لیے بوجھ بننے سے بچاؤ۔ کوشش تمہارا فرض اور کوشش کا نتیجہ اللہ کی صوابدید پر ہے۔"

وہ کہہ رہا تھا اور صباحت کی نظریں کھلی کھڑکی سے باہر صاف نیلے آسمان پر ٹکی تھیں۔ کئی دن سے ادھر بارش نہیں برسی تھی۔ فضا صاف' آسمان نیلا اور موسم خشک تھا۔

"ارے کتنے دن ہو گئے' وہ آیا نہیں۔" اس کو یاد آیا "کہاں رہ گیا کم بخت' کہیں بیمار تو نہیں پڑ گیا؟" عمر کی گفتگو پر غور کرنے سے بچنے کے لیے وہ اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"Loving and kind in
all his ways
Upright and just to the
end of the day ۔"

(وہ ایک محبت کرنے والی اور نیک شخصیت رکھتا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دن تک وہ سر اٹھا کر جیا۔)

"Sincere and true in
heart and mind
beautiful memories he
left behind ۔"

(وہ مخلص اور سچے دل و دماغ کا مالک تھا اس نے اپنے پیچھے خوب صورت یادیں چھوڑی ہیں۔)

"Deep in our hearts you
will always stay
Loved and remembered
every day ۔"

(تم ہمارے دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ موجود رہو گے۔
ہم تمہیں ہر روز محبت کے ساتھ یاد کرتے رہیں گے۔

"Loved with a love beyond
all telling
Missed with a grief
beyond all tears
We are Proud of you"

(ہم تمہیں محبت کے ایسے جذبات کے ساتھ یاد کرتے رہیں گے جو الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتے۔
آنسوؤں سے ہٹ کر ایک ایسے دکھ کے ساتھ تمہاری کمی محسوس کریں گے جسے بیان نہیں کیا۔
ہم سب کو تم پر فخر ہے۔)

سفید پتھر سے بنی وہ قبر' ماربل کے چبوترے کے نیچے بنائی گئی تھی۔ چبوترے کے ستون سنہرے رنگ کے تھے اور ان ستونوں پر شہید کی زندگی کی اہم تواریخ رقم تھیں۔ ماربل کے سفید کتبے پر سنہرے الفاظ میں درج الفاظ پڑھتے ہوئے عمر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ان الفاظ پر ہاتھ پھیرا اور قبر کے قریب نصب پتھر پر لکھے الفاظ پڑھے۔

"یہ میجر ولی امام (شہید) کی آخری آرام گاہ ہے۔" اس نے اپنے سامنے کھڑی صباحت کو دیکھا جس نے ہلکے گلابی جوڑے پر سفید اور گلابی ڈوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ ڈوپٹا اس کے سر پر سلیقے سے جما تھا اور وہ آنکھیں بند کیے ہاتھ اٹھائے دعا پڑھ رہی تھی۔

"I am proud of him"

"مجھے ان پر فخر ہے" عمر کے قریب کھڑے ولی منیب نے عمر سے کہا۔

"You should be-proud of
your mother too ۔"

(تمہیں اپنی ماں پر بھی فخر ہونا چاہیے۔)

اس نے منیب کے بال سہلاتے ہوئے کہا اور شائے چی کو سہارا دیتے ہوئے باہر لے آیا۔

"کیا آج ہم سرخرو ہیں۔" شائے چی نے عمر کی طرف دیکھا۔

"اپنے دل سے پوچھیے۔" عمر نے کہا۔

اور شائستہ ماں پچھلے چند ماہ کے دوران ہوئے واقعات پر غور کرنے لگیں۔

"مجھ سے اور علی امام سے کیسی غفلت ہوئی۔" انہوں نے سوچا "ہم نے سوچا ہی نہیں کہ ہم ایک کم عمر' نازک سی لڑکی کو اپنے شہید بیٹے کی بیوہ کا روپ دیے اپنے تئیں اس کو فخر کرنے کا جو احساس دیے جا رہے ہیں اس میں اس کے جذبات کیسے کچلے جا رہے ہیں۔ میں اس کی مروم بیزاری' کوفت اور چڑچڑاہٹ کا تدارک کرنے کی ترکیبیں سوچتے ہوئے یہ کیوں بھول گئی کہ ہمارے مذہب میں تو بیوہ کا نکاح پڑھا دینے کا حکم ہے اور پڑھا دینے والے کے لیے یہ سعادت ہے۔ جو یہ خیال کبھی آتا تو معاشرہ اور لوگ کیا کہیں گے کا تصور ہمیں یہ سوچنے سے منع کر دیتا' مگر اس غفلت میں اس بچی کی نیک فطرتی کے سبب کیسی قربانی لی جا رہی تھی ..... اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے عمر کو ادھر بھیج دیا۔"

"میں پہلی بار تمہاری اس آخری آرام گاہ پر آئی ہوں۔ اس سے پہلے میں نے جب بھی ادھر آنے کا سوچا' مجھے لگا میں ان پتھروں سے نظریں نہیں ملا پاؤں گی۔ میں ہی کیوں آخر میں ہی کیوں؟ جیسا میرے اندر اٹھتا سوال مجھے تم سے شرمندہ کروا جاتا تھا کہ تمہاری روح کیا محسوس کرے گی کہ مجھے اپنا تم سے منسوب ہونا اتنا کھلتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ عمر ادھر آ گیا اور میرے ذہن کی بہت سی الجھنیں کھل گئیں۔ جو ہوتا ہے اللہ کی رضا سے ہوتا ہے میرے ذہن و دل نے اس حقیقت کو سمجھ لیا۔ جو عظمت تمہیں ملی' اس تک عام انسان نہیں پہنچ سکتا۔ مگر جو ہوا اسے یوں ہی ہونا تھا کیونکہ یہ تمہارا مقسوم تھا۔ مگر میرا مقسوم کیا ہے' شاید میں سمجھ نہ پاتی اگر عمر ادھر نہ آتا۔ یہ بھی اللہ کی ہی رضا ہے کہ یہ ادھر آ گیا اور میرے ذہن نے مثبت سوچنا شروع کر دیا۔"

صباحت نے قبرستان کے ستون کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑے ہو کر سوچا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں کہ زندگی کے آخری لمحے میں آخری خیال تمہیں کس کا آیا ہو گا۔" عمر نے سوچا تھا۔

"اسی کا جس کو تم پیچھے چھوڑ رہے تھے اپنے بچے سمیت۔ ہاں تم کو اس کا دکھ بھی ہو گا اور فکر بھی۔ تمہیں ہونی بھی چاہیے تھی اور جو وہ آخری لمحہ آخری لمحہ ثابت نہ ہوتا اور زندگی کی طرف لوٹنے کا تم کو ایک بار پھر موقع مل جاتا تو تم اس کی کیسی قدر کرتے' اس کا کتنا خیال رکھتے اور تمہیں رکھنا بھی چاہیے تھا کیونکہ تمہیں اگر علم ہو جاتا کہ تمہارے نام پر وہ کیسی قربانی دینے کا ٹھانے ہوئے ہے تو تم شاید ایک اور عمر بھی ملنے پر اس کے لیے وقف کر دیتے۔ خوش قسمت ہو تم ولی امام! کہ زندگی کی ساتھی ملی تو ایسی' زندگی نے ساتھ چھوڑا تو ایسے کہ ہمہ وقت تمہاری قبر پر ان جانے' اجنبی' اپنے' غیر لوگ تمہارے لیے دعا کرتے ہیں اور یہاں تلاوت بھی کرتے ہیں۔"

اس نے اپنے آنسو ہاتھ سے پونچھے اور منیب کے گرد بازو باندھ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"یار! زندگی تجھے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ زندگی تیرے لیے آگے بڑھ رہی ہے۔" اسے برسوں پہلے کے ولی امام کے کہے الفاظ یاد آئے۔

"اور تجھے کیا پتا' تجھے چلے جانا ہے کہ نہیں' کیا پتا تو ویسا ہی ہٹا کٹا ہو جائے اور میں تجھ سے پہلے چلا جاؤں

Life is so unpredictable۔"

(زندگی غیر یقینی ہے)

"ہاں اگر میں پہلے چلا جاؤں تو وعدہ کر تو میری چیزوں کا خیال رکھے گا اور اگر تو خدانخواستہ چلا گیا تو میں تیری چیزوں کا خیال رکھوں گا۔" یہ بات کہنے کے بعد وہ کتنی دیر تک قہقہہ لگا کر ہنستا رہا تھا۔

"دیکھ لے ولی امام! کبھی کے کہے الفاظ کیسے پورے ہوتے ہیں۔ میں نے تجھ سے وعدہ کیا بھی نہیں تھا اور نبھانے جا رہا ہوں' مجھے یقین ہے کہ تو بھی ایسا ہی چاہ رہا ہو گا کوئی آئے اور صباحت کو اس وعدے کی زنجیر سے آزاد کر دے جو اس نے کیا ہی نہیں تھا کیونکہ اس میں اس کی عمر رائیگاں جا رہی تھی۔"

اس نے قریب آ کر صباحت کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر لے آیا۔

"بہو رخصت کرا کے لایا تھا۔ اب بیٹی رخصت کرنے جا رہا ہوں۔" علی امام نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی گرفت مضبوط کرتے ہوئے سوچا۔ "مگر یہ بہت مشکل مرحلہ ہوتا جو میں اور شائستہ بھی عمر اور صباحت کے ساتھ پنڈی چلے جانے کا فیصلہ نہ کر لیتے۔ منیب کے بغیر زندگی کیسی ویران ہو جاتی۔ سچ ہے کہ اتنے سال صباحت نے ہمارے لیے قربان کر دیے۔ اب باقی کے سال ہم منیب کے لیے قربانی دیتے ہیں۔ اچھا میرے بیٹے اللہ حافظ۔ تم دل کے قریب ہو' چاہے میں ہر روز تمہارے پاس نہ آ سکوں' کیونکہ دوری کے اس فیصلے میں تم خود دیکھو اس کی خوشی کیسی مضمر ہے جس کے چہرے پر برسوں بعد میں شادابی دیکھ رہا ہوں۔" انہوں نے صباحت کی طرف دیکھا جو کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ جیپ میں سوار ہو کر وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ عمر کی کسی بات پر صباحت نے مسکرا کر سر ہلایا۔ اس کے کانوں کا زیور ہلنے لگا۔

"ٹویٹ' ٹویٹ' ٹویٹ۔"

اسی دم' ہفتوں سے خاموش وہ آواز فضا میں ابھری ..... بے ساختہ صباحت نے عمر کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ناخوش نہیں ہیں' مطلب یہ بے چارہ تو یونہی بدنام تھا۔" عمر نے کہا۔ صباحت اس کی اس بات پر ہنس دی۔

عمر کی بے آباد زندگی اس کی اپنی بے آباد زندگی کے ساتھ ملی تو دونوں کی زندگیاں آباد ہو گئیں۔ دونوں ہی کھونے کی اذیت سے دوچار تھے۔ مگر عمر کی مثبت سوچ صباحت کی منفی نفسیات کو خود اذیتی کی چھٹ سے نکال لائی تھی۔

"جو ہوتا ہے' اللہ کی جانب سے ہوتا ہے' دوسرے انسانوں' حالات و واقعات پرندوں' جانوروں میں اتنی طاقت کہاں کہ وہ کسی کے سفید کو سیاہ اور اچھے کو برا کر دیں۔"

اس نے سوچا اور مڑ کر دیکھا۔ سنگ مرمر سے بنی شہید کی قبر پر روشنی کا ڈیرا تھا اور روشنی کے اس ہالے میں ایک چہرہ جیسے مسکراتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ اس روز پہلی بار اسے ٹویٹ ٹویٹ کی آواز بری نہیں لگی تھی۔

"ٹویٹ' ٹویٹ' ٹویٹ۔" فضا میں تیز نوکیلی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ بارش کا پرندہ تھا یا دوسرے پرندوں جیسا ایک پرندہ' وہ لوگوں کی زندگیوں میں غم لاتا تھا یا خوشیاں' اس کا فیصلہ کوئی کیسے کر سکتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ان علاقوں کے باسی پرندوں میں سے ایک تھا' اس کے ساتھی پرندے شاید اس جیسی نوکیلی آواز نہیں رکھتے تھے جب ہی ان کا نوٹس نہیں لیا جا سکتا تھا' مگر اس کا کام تو بلند فضاؤں میں اڑتے ہوئے اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہوئے اپنی مخصوص آواز میں شور مچانا تھا۔ موسموں کے تیور بدلنے کا اختیار بھی اس کے پاس تو نہیں تھا اسے تو بس ان فضاؤں میں ہی اڑنا اور اپنی آواز کے سر بکھیرتے رہنا تھا اور وہ بکھیر رہا تھا۔ اس پہاڑی علاقے کے کاٹیج نما گھروں کی چمنیوں سے دھواں باہر نکل رہا تھا۔ یہ لوگ ایک نئے دن کے کام کاج کا آغاز کر رہے تھے پیڑ' پودے' گھاس سرسبز تھی۔ صباحت کی جیپ اونچے' نیچے رستوں سے گزرتی علاقے سے دور جا رہی تھی اور وہ اسی فضا میں اپنی مخصوص آواز میں ٹویٹ ٹویٹ کی آواز نکالتا اڑ رہا تھا۔

زندگی اپنی تمام تر بشاشت اور چہل پہل کے ساتھ رواں دواں تھی۔ اس نئے دن کے دوران کس کو خوشیاں عطا ہوئی تھیں اور کس پر کوئی آزمائش آئی تھی۔ وہ اس سے بے نیاز اپنے کام میں مگن دائروں کی شکل میں آسمان پر محو پرواز تھا۔ ٹویٹ' ٹویٹ' ٹویٹ۔

فائزہ افتخار

سیف اللہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ وہ نیپال کے دورے پر گئے تو واپسی پر میشا ان کے ساتھ تھی۔ وہ ان کے دوست کی بیٹی تھی۔ اس کے والدین کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تو سیف اللہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ سیف اللہ کی والدہ پرشکوہ خانم نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا مگر ان کی بیوی مہر نے اسے قبول نہ کیا۔ وہ ناراض ہو گئی اور دونوں بیٹیوں زینی اور ایمی کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ سیف اللہ نے اپنی منگیتر کارا کو چھوڑ کر مہر سے پسند کی شادی کی تھی۔ وہ مہر کی جدائی میں راتوں کو جاگنے لگا۔ دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے انتقال پر مہر واپس آ گئی مگر وہ میشا کو اس گھر سے نکال نہیں سکی کیونکہ وہ مکان پرشکوہ خانم کے نام تھا۔ اور وہ میشا کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ مہر نے میشا کی تعلیم چھڑا دی۔ کیونکہ کاروبار مہر کے نام تھا۔ وہ میشا پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پرشکوہ خانم میشا کو گھر ہی میں پڑھانے لگیں۔ انہیں میشا کے خوابوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے خواب پراسرار ہوتے تھے اور اکثر سچے بھی ہوتے تھے۔

علاقے میں میلہ لگا تو مہر، ایمی اور زینی جوش و خروش کے ساتھ وہاں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ میشا بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر مہر اور زینی نے اسے روک دیا۔

ناولٹ
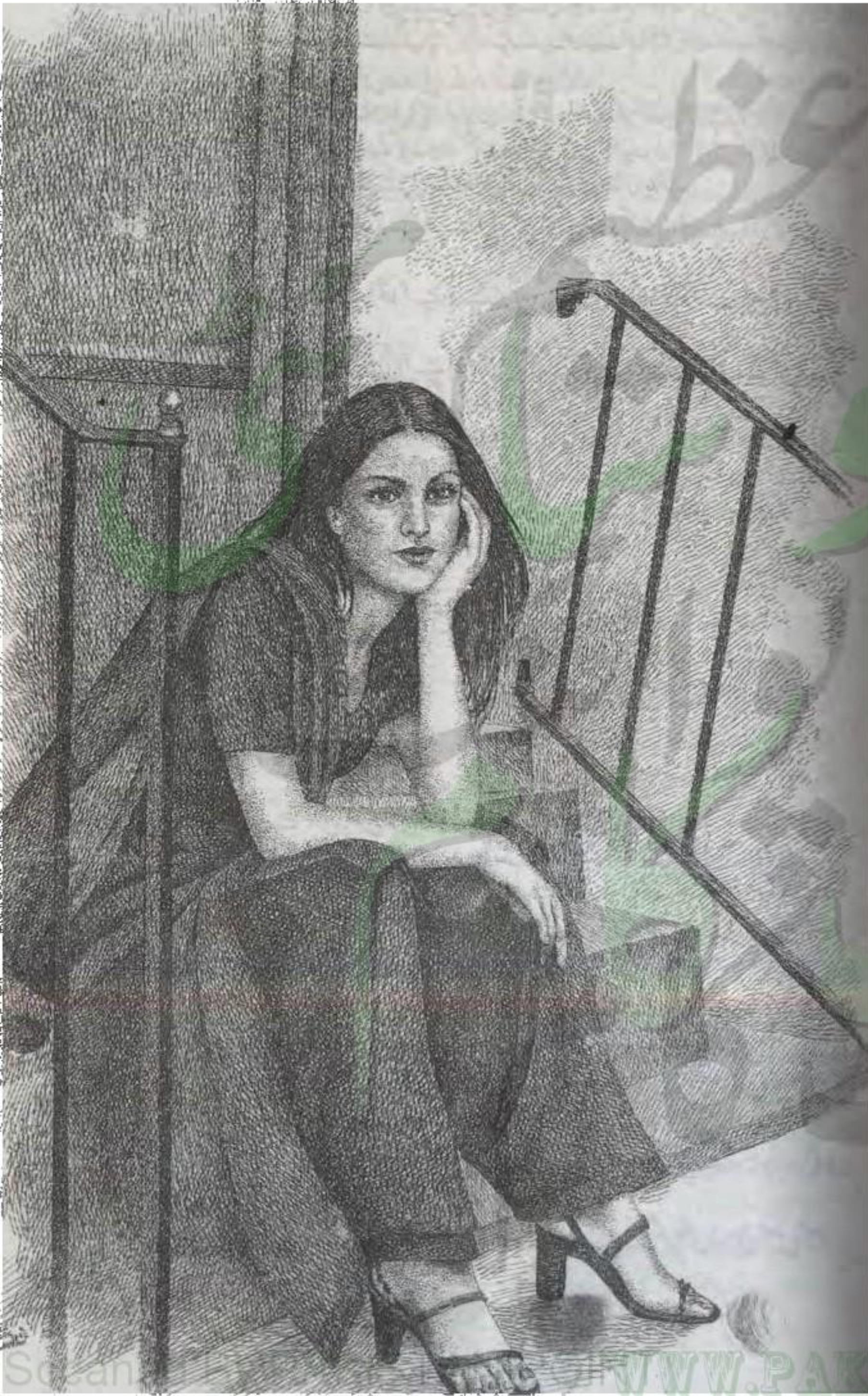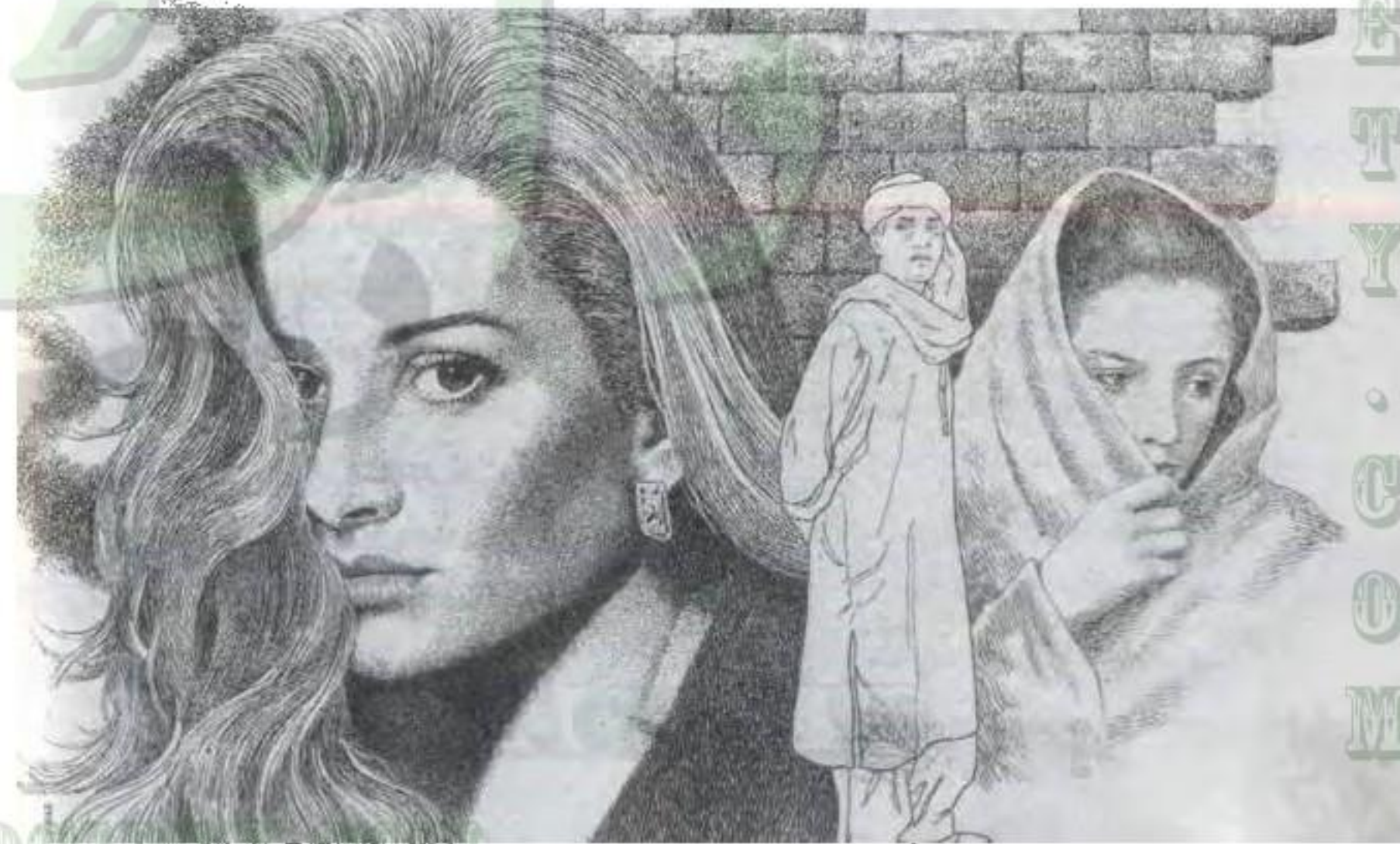
میشا نے تہیہ کرلیا کہ خواہ سب سے چھپ کر سہی، میلے میں ضرور جائے گی۔ میشا نے پُرشکوہ خانم کی پرانی ساڑھی اور مہر کے کمرے کے پردے کاٹ کر ایک خوب صورت لباس تیار کیا اور چہرے پر بھونڈے انداز میں میک اپ تھوپ لیا تاکہ کوئی اسے دیکھے بھی تو پہچان نہ سکے۔ کانوں میں اس نے زینی کے بُندے پہن لیے۔

میشا میلے میں گئی تو اسے وہاں دیر ہوگئی۔ اسے مائر نامی ایک نوجوان ملا۔ میشا نے اسے گھر تک ساتھ چلنے کا کہا، مگر اسے اپنا نام، پتا نہیں بتایا۔ وہ مائر کو اپنے ساتھ کشتی میں لے گئی۔ میشا کشتی سے اتری تو اس کا ایک بندا کشتی میں گر گیا۔ اس کے جانے کے بعد مائر نے وہ بُندا سنبھال کر رکھ لیا۔ میشا نے اپنی بے ساختہ باتوں سے اسے متاثر کیا تھا۔

مہر نے کارا کو دعوت پر بلایا، کیونکہ وہ اس کے بیٹے مائر سے اپنی کسی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ مائر دعوت پر آیا تو میشا بیماری کے باعث اس سے مل نہیں سکی۔

زینی نے وہ بُندا جو اس رات میشا نے پہنا ہوا تھا، اپنے دوپٹے میں بروچ کے طور پر لگایا تو مائر اسے وہی لڑکی سمجھا، جو اسے میلے میں ملی تھی۔

کارا نے خاندان اور قرب جوار کی تمام لڑکیوں کو اپنے گھر مدعو کیا تاکہ مائر شادی کے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے۔ پرشکوہ خانم کا گھرانہ بھی مدعو تھا۔ مگر وہ لوگ میشا کو ساتھ نہیں لے گئیں۔

میشا گھر میں تنہا بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک وہاں رومان آگیا۔ اس نے اپنا تعارف پری زاد کی حیثیت سے کرایا۔ رومان نے پارٹی میں جانے کے لیے میشا کے لباس کا انتظام بھی کردیا۔ زینی نے وہ بُندا لان میں پھینک دیا تھا۔ رومان نے وہ اٹھا کر میشا کے دوپٹے میں لگا دیا اور اسے دعوت میں لے گیا۔ میشا دعوت میں پہنچی تو مائر اسے دیکھ کر چونک گیا۔

ساتویں اور آخری قسط

"شادی ہو نہیں رہی..... ہو رہی تھی اور اب کبھی نہیں ہوگی۔" مائر کے پھٹ پڑنے پہ وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

"نہیں..... نہیں مائر۔"

"نفرت ہو رہی ہے مجھے تمہارے جیسی جھوٹی لڑکی سے۔"

✲ ✲ ✲

پرشکوہ خانم اور میشا دونوں حیران تھیں کہ ان تینوں کی واپسی اتنی جلدی اور اس انداز میں کیوں ہوئی ہے۔ مہر مسلسل انہیں کوس رہی تھی۔ وہ دونوں متواتر ایک دوسرے کو طعنے دے رہی تھیں اور مارنے کو لپک رہی تھیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد زینی کے رونے کی آواز بلند ہوتی تھی۔

میشا اتنی بددل تھی کہ اس نے وجہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی بلکہ دروازہ زور سے بند کرلیا کہ ان کی آوازیں ہی اس کے کانوں تک نہ پہنچیں۔

صبح سارا گھر نیند میں ڈوبا تھا جب وہ اپنے پسندیدہ مقام جھیل پہ چلی آئی اور یہ دیکھ کے حیران رہ گئی کہ مائر اس سے پہلے وہاں موجود تھا۔

"میں جانتا تھا تم مجھے یہیں ملوگی۔"

"پہلے مجھے شک ہو رہا تھا۔ اب یقین ہوگیا ہے کہ رات کو پھر سے تمہارے اور زینی کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔"

"ہاں..... اور کس بات پہ ہوا ہے..... جانتی ہو؟"

"نہیں..... اور مجھے جاننے سے دلچسپی بھی نہیں۔"

وہ جانے کے لیے مڑی۔

"رکو میشا....."

مائر کے پکارنے پر اس نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ ایک پھول توڑ رہا تھا۔

"اوہ..... اب سمجھی..... مگر ابھی تو زینی ہمیں نہیں دیکھ رہی۔"

"کیا مطلب....." وہ میشا کا طنز نہ سمجھ سکا۔

"اس دن کی طرح آج بھی تم زینی کو جلانے کے لیے میرے بالوں میں پھول لگانا چاہتے ہو۔ مگر سوری مائر! یہ تمہارا اور زینی کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم روز روز لڑوگے تو کیا ہر بار ایسے ہی مجھے استعمال کروگے۔ کوئی اور طریقہ تلاش کرو اسے منانے کا۔"

وہ نہ طنز کر رہی تھی۔ نہ اس کے لہجے میں کوئی گلہ تھا۔

"اب سب جھگڑے..... سب غلط فہمیاں دور ہوگئی ہیں میشا۔ بلکہ وہ جھوٹا تعلق ہی ختم ہوگیا ہے جو زینی نے دھوکے سے جوڑا تھا۔ میں اس کی حقیقت جان گیا ہوں اور یہ بات بھی کہ اس رات مجھے جھیل پہ وہ نہیں..... تم ملی تھیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا!" وہ حیران سی رہ گئی۔

"میرا دل تو بہت پہلے سے گواہی دے رہا تھا، اسی لیے تو بار بار تمہاری جانب کھنچتا تھا۔ اب ثبوت بھی مل گیا۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا میشا۔"

"بتا دیتی تو تم یقین کرتے؟"

"اب سچ جاننے کے بعد میں کیسے خود کو یہ کہنے سے روکوں کہ میں نے اس ملاقات میں ہی تمہیں دل دے دیا تھا۔ بس میں تمہیں پہچان نہیں پایا تھا۔ میں اب اپنی غلطی سدھارنا چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کرکے..... بولو..... کیا تم کروگی مجھ سے شادی؟"

میشا کتنی ہی دیر کچھ بول نہ سکی۔ بس گم صم اسے دیکھے گئی۔

وہ کچھ مایوس سا ہوگیا۔

"اوہ..... میں نے یہ جاننے کی کوشش تو کی ہی نہیں کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے یا نہیں۔"

پھر اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر اس میں وہ پھول کسی انگوٹھی کی طرح اس کی دو انگلیوں کے درمیان سجا دیا۔

"اس وقت میرے پاس اس پھول کے علاوہ کچھ نہیں ہے..... میں اسے منگنی کی انگوٹھی سمجھ کے تمہیں پہنا رہا ہوں..... اگر تمہیں اس پر اعتراض نہ ہو کل ایسی ہی ایک انگوٹھی..... میرا مطلب ہے ایسا ہی ایک پھول مجھے دے دینا..... ورنہ اسے پتی پتی کرکے میرے سامنے ہی بکھیر دینا۔ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔"

وہ اس کا ہاتھ احتیاط سے واپس اس کے پہلو میں سجاتا کہہ رہا تھا اور وہ اسی طرح بت بنی اسے دیکھے گئی۔

✲ ✲ ✲

رومان ڈھیٹ سا بنا ان کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

"اتنا بڑا جھوٹ..... وہ بھی اس قدر فضول..... وہ تو بے وقوف ہے جو یقین کر بیٹھی۔ تم تو سمجھ دار ہو۔ ایسی بات تم نے اس سے کی ہی کیوں؟"

"جب اس رات میں نے میشا کو روتے دیکھا تو میں رہ نہیں سکا گرینی! وہ اتنی سچائی اور یقین کے ساتھ خدا سے شکوہ کر رہی تھی کہ اس کی مدد کے لیے کوئی فیری مدد کیوں نہیں آ رہی جیسی سنڈریلا کے لیے آئی تھی تو مجھے ڈر سا لگا گرینی! کہ آج اس کا یہ یقین ٹوٹ گیا تو یہ نازک سی لڑکی بھی ٹوٹ جائے گی..... یہ امید، یہ خواب اس کی زندگی ہے کہ وہ سنڈریلا ہے۔ میں اس کی امید میں رنگ بھرنا چاہتا تھا۔"

"جھوٹ بول کر۔"

"اس کے علاوہ اس کے نزدیک ہونے اور اس کا اعتماد جیتنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں جس دن سے یہاں آیا ہوں..... تب سے اس کو چاہتا ہوں مگر اس سے کہنا تو دور کی بات..... میں اس کے سامنے جا تک نہ سکا..... وہ مجھے ان پھٹے پرانے کپڑوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ بھی ہمیشہ ایک شہزادی لگی۔ میں نے کبھی بھی خود کو اس کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ میں تو بس دور دور سے اس کو دیکھا کرتا تھا۔ اس پہ خوش تھا گرینی..... اور اس کے نزدیک ہوا بھی تو یقین کریں..... صرف اس کی مدد کرنے کے لیے اور اگر میں یہ جھوٹ نہ بولتا تو وہ کبھی بھی ایک اجنبی پہ بھروسا نہ کرتی۔"

اس نے تفصیل سے بتایا۔

"اس نے تم پہ بھروسا اس لیے کیا کہ اس کا دل تمہیں اجنبی مانتا ہی نہیں۔۔۔ رومان۔۔۔ وہ بھی تمہیں چاہتی ہے۔ صرف اپنے آپ سے اعتراف کرتے ہوئے جھجک رہی ہے اس ڈر سے کہ تمہیں کوئی عام انسان نہیں سمجھتی وہ۔"

پر شکوہ خانم کی بات پہ وہ خوشگوار حیرت میں گھر گیا۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں گرینی؟"

"اس نے میرے ہاتھوں میں پرورش پائی ہے رومان! میں اس کے مزاج کا ایک ایک رنگ جانتی ہوں۔ تم وقت ضائع نہ کرو اور اسے سچ بتادو۔"

"اور۔۔۔ اور۔۔۔ ماڑ؟"

"ماڑ اس کا ایک خوب صورت خواب تھا جو آنکھ کھلنے پہ ختم ہو جاتا ہے۔ تم اس کی آنکھیں کھول دو اپنے بارے میں سچ بتادو۔ پھر ماڑ نہیں۔۔۔ تم ہی تم ہو گے۔"

رومان ایک سرور کے عالم میں وہاں سے نکلا اور جھیل کے کنارے اسی پتھر پر بیٹھ گیا۔ جہاں اکثر میشا کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میشا اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو سنبھالتی اس کے پاس آئی۔

"میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔ کب سے۔۔۔"

"اور میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔۔۔ کب سے۔۔۔"

"تمہیں کیسے پتا۔۔۔ میں تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں آؤں گی؟"

"اور تمہیں کیسے پتا تھا، میں تمہیں انتظار کرتا ہوا یہیں ملوں گا؟"

رومان کے سوال پہ اس نے بس لمحہ بھر کو سوچا اور پھر شانے اچکا کر بولی۔

"بس۔۔۔ مجھے لگا۔"

"تمہیں یا تمہارے دل کو۔۔۔؟"

"ہاں! شاید دل کو لگا۔۔۔ تم یہیں ہو گے۔"

"میرے بھی دل نے ہی کہا تھا کہ تم یہیں آؤ گی۔ ہمارے دلوں کو ہماری ساری خبریں ہوتی ہیں۔"

"ہاں! اگر تمہارے دل کے پاس یہ نئی والی خبر نہیں ہوگی۔" وہ اترا کے بولی۔

"کون سی نئی خبر؟"

"تم ٹھیک کہتے تھے رومان! جو ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ اسے ہمارے پاس آنا ہی ہوتا ہے۔ اسے پانے کے لیے ہمیں کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ وہ ہمارے نصیب میں لکھ دیا گیا ہوتا ہے۔"

"ہاں! اور ہم پاگلوں کی طرح اسے ہی پانے کی کوششیں اور دعائیں کر رہے ہوتے ہیں۔ جو پہلے سے خدا نے ہمارے نصیب میں لکھ دیا ہوتا ہے۔۔۔ کسی نعمت کی طرح۔" وہ اسے نظروں ہی نظروں میں جذب کر رہا تھا۔

"اور تم یہ بھی سچ کہتے تھے کہ خواب دیکھنے سے کسی کو بھی روکنا نہیں چاہیے۔ چاہے وہ خواب کتنے ہی اونچے ہوں۔ خواب سچے ہو ہی جاتے ہیں۔"

"ہاں! واقعی، خواب سچے ہو ہی جاتے ہیں۔ آج مجھے یقین آگیا۔"

"مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے رومان۔" وہ مچل رہی تھی۔

"اور مجھے بھی۔۔۔"

"نہیں! پہلے میں بتاؤں گی۔ بلکہ دکھاؤں گی۔"

"کیا دکھانا ہے؟" وہ اس کی بے چینی دیکھ کے مسکرایا۔

"دکھاؤں گی۔ پہلے تم اپنی آنکھیں بند کرو۔"

"نہیں۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔"

"کیوں؟"

"جب میں تمہیں آنکھیں بند کرنے کے لیے کہتا ہوں تو تم کرتی ہو کیا؟ فوراً بہانہ بنا دیتی ہو کہ گرینی نے منع کیا تھا۔ میری گرینی نے بھی مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ کبھی کسی لڑکی کے سامنے اکیلے میں آنکھیں بند نہ کرنا۔ ورنہ وہ بھی تمہیں۔۔۔"

"او ہو شکل دیکھی ہے اپنی، تمہیں کون پاگل لڑکی ڈرکرے گی؟"

"ارے! تمہیں کیا پتا۔۔۔ بڑی بڑی پاگل لڑکیاں میرے ساتھ میں ہیں۔ اور مجھے بھی ڈر ہے کہ اگر بند آنکھوں کے ساتھ میں تمہیں بہت کیوٹ لگا اور تمہیں مجھ پہ بہت سا پیار آگیا اور تم نے تنہائی کا فائدہ اٹھا کے۔۔۔"

میشا سے اس سے زیادہ سنا نہیں گیا۔ غصے کے بجائے ڈھیر ساری شرم آگئی۔

"کوئی نہیں جی۔۔۔ فضول باتیں مت کرو۔ آنکھیں بند کرو۔ ورنہ میں جا رہی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ٹھہرو۔" رومان نے اسے روکا اور فوراً اپنی آنکھیں بند کیں۔

میشا نے دونوں ہاتھ اس وقت سے اپنے پیچھے باندھ رکھے تھے رومان کے آنکھیں بند کرتے ہی فوراً آگے کیے۔ اس کی دونوں انگلیوں کے درمیان ایک پھول نگینے کی طرح سجا تھا۔

"تمہیں پتا ہے، یہ جو۔۔۔" اپنا ہاتھ رومان کے چہرے کے آگے کرتے ہوئے وہ ہیجان آمیز جذبات کے ساتھ بتانے ہی لگی تھی کہ رک گئی۔۔۔ رومان کا چہرہ اس کے بالکل سامنے تھا۔

اس کے سیاہ بال ہوا سے اڑ رہے تھے۔

وہ آنکھیں بند تھیں۔ جس کی چمک اس کو اکثر چندھیا دیا کرتی تھیں۔

اور بند لبوں پہ اس کی مخصوص مسکراہٹ بدستور سجی تھی۔

میشا کے اور اس کے چہرے کے درمیان وہ انگوٹھی سجا ہاتھ تھا اور میشا بے خودی کے عالم میں اسے تکے جا رہی تھی اور ایک کے بعد ایک منظر تتلی کی طرح اڑتا اس کے سامنے آتا جا رہا تھا۔

جب وہ اس کے لباس پہ زری کے بندے کو ٹانک رہا تھا۔ اس کے پہلے لمس کی سنسناہٹ نے میشا کو لمحہ بھر کے لیے کپکپا دیا تھا۔

اور وہ اس کا گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے ہاتھ کی پشت پہ احتراماً لب رکھنا۔ اسے کسی ملکہ والی تکریم دینا۔

اور جب اس نے میشا کو کسی نازک پھول کی طرح تھام کر دیوار سے نیچے اتارا تھا۔

اور جب وہ تنگ آکے اسے بے تکان باتیں سنایا کرتی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے سنتا رہتا تھا کہ اس کی ساری بھڑاس نکل جائے۔ اور جو وہ کبھی کبھی اسے بے تحاشا مارنے تک لگ جاتی تھی اور وہ سکون سے پٹتا رہتا تھا۔

اور۔۔۔ اور وہ جگنو جو رومان کی آنکھوں اور اس کی مٹھی سے بیک وقت آزاد ہوئے تھے۔

اور ہاں۔۔۔ جب بھی وہ اس کے گلے لگ کے آنسو بہاتی تھی اور شانت ہو جاتی تھی۔ یہ سب لمحے تتلیوں کی طرح میشا کے گرد اڑتے اور رنگ بکھیرتے پھر رہے تھے۔ اس کا وجود رنگوں کے اس ہالے میں قید ہو رہا تھا اور وہ سب بھول گئی تھی۔

اسے اپنے اور رومان کے درمیان اب وہ ہاتھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس میں ماڑ کی دی انگوٹھی سجی تھی۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ آگے کیا اور بے خود ہو کے رومان کے رخسار کو چھوا۔ اس کے قدم تھوڑا سا آگے

حنا

نادرہ خاتون

سرک کے اس دوری کو پہلے ہی کم کر چکے تھے اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔

اب رومان کی مسکراہٹ رفتہ رفتہ مدھم پڑ رہی تھی۔ شاید وہ اس سکوت سے حیرت زدہ تھا اور میشا کے چھونے کا سبب جاننا چاہ رہا تھا۔ اس کی بند پلکیں آہستہ آہستہ کپکپانے لگیں۔ جیسے وہ انہیں کھولنا چاہتا ہو اور میشا... اسے احساس تک نہیں ہو رہا تھا کہ وہ دھیرے دھیرے اپنے لب رومان کی آنکھوں تک لاتی جا رہی ہے۔

اور جیسے ہی رومان نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ دھک سے رہ گئی۔

اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ گھبراہٹ میں اس کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ اسے خود سے اتنا قریب دیکھ کے اور اس کے چہرے پہ دل کی سب حکایتیں لکھی دیکھ کے رومان کی حیرت خوشی میں بدل گئی۔

"میشا...؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

اور جیسے میشا کا خواب ٹوٹ گیا۔

وہ چند قدم پیچھے ہٹی اور پھر سرپٹ وہاں سے بھاگ گئی۔ رومان نے اسے روکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

"نہ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت ہے میشا۔ نہ اب مجھے کچھ بتانا ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ اسی طرح بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی۔ اور دروازہ بند کر کے اپنی سانس قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگی' مگر نہ سانسیں قابو میں آ رہی تھیں۔ نہ دھڑکنیں اعتدال میں آ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں زور سے بند کریں' مگر پھر گھبرا کے اگلے ہی پل کھول لیں۔ کیونکہ بند پتلیوں میں بھی وہی منظر جما تھا' جب وہ بے خودی کے عالم میں اس کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ کیا کرنے جا رہی تھی میں... رومان کیا سوچتا ہو گا۔"

"دل کو لگا تم نہیں ہو گے۔"

اپنی ہی آواز ہوا کے دوش پہ دوبارہ اس کی سماعتوں تک آئی۔ وہ مسکرا دی۔

"ہمارے دلوں کو ہماری ساری خبر ہوتی ہے۔"

اور پھر رومان کی آواز...

"مگر ہمیں اپنے دل کی خود ہی خبر نہ ہو سکی۔ تم جو بھی ہو۔ میرے جیسے انسان یا کسی اور دنیا سے آئے ہو۔ اب میں اس سچ سے بھاگ نہیں سکتی کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

اور ماڑ اپنے کمرے میں بیٹھا اس انتظار میں تھا کہ کب اسے میشا کا فون آتا ہے۔ کب وہ اسے خوش خبری سناتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"اتنی بڑی خوش خبری؟" پر شکوہ خانم خوش تھیں۔

"آپ ٹھیک کہتی تھیں گرینی! وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی ہے۔"

"تو اس نے تم سے کہہ دیا؟"

"نہیں! زبان سے تو نہیں..." وہ مسکرایا۔

"لکھ دیا؟"

"نہیں۔" مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

"پھر کیسے؟"

"بس! بتا دیا ناں۔ ہر بات تو آپ سے شیئر نہیں کر سکتا میں۔" اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے اس نے گرینی کی گود میں سر رکھ دیا۔ وہ محبت سے اس کے بال سہلانے لگیں۔

"میں تم دونوں کے لیے بہت خوش ہوں۔ بہت خوش... میشا نے ہمیشہ خود کو سنڈریلا سمجھا۔ کسی پرنس کے خواب دیکھے' جو اسے ایک بڑے سے محل کی رانی بنا کے رکھے۔ مگر ایک خواب میں نے بھی اس کے لیے دیکھا تھا۔ تمہارے جیسے لڑکے کا خواب' جو اسے ٹوٹ کر چاہے۔ جیسی وہ ہے' اسی طرح اور اسے کسی محل کی بجائے اپنے دل کی رانی بنا کے رکھے۔"

"میں آپ کے سب خواب پورے کروں گا گرینی! میں اتنی محبت دوں گا کہ وہ خود کو کسی شہزادی سے کم نہ سمجھے گی۔"

"تم نے اسے اپنے بارے میں بتا دیا؟"

یہ سن کر رومان نے چونک کر ان کی گود سے سر اٹھایا۔

"ارے... یہ بات تو رہ گئی۔ گیا تو میں اسے یہ ہی بتانے تھا۔" یہ سن کر پر شکوہ خانم پریشان ہو گئیں۔

"دیر مت کرو رومان! جلدی بتا دو۔ وہ کتنی الجھن میں ہو گی کہ جس سے محبت کرتی ہے' اسے پا نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ اس کے جیسا عام انسان نہیں ہے۔"

"ویسے گرینی! معاف کیجیے گا۔ آپ کی لاڈلی ہے ایک نمبر کی بے وقوف۔ میں نے جب اس سے یہ جھوٹ بولا تھا تو مجھے بھی یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس پہ اتنی جلدی یقین کر لے گی۔ مجھے لگا ابھی چپل اتار کے مارنے لگے گی کہ آئے بڑے کہیں کے پرنس۔ مگر جب اس نے یقین کر لیا' تب میں نے سوچا' اس وقت وہ جذباتی ہو رہی ہے اور بعد میں جب ٹھنڈے دماغ سے سوچے گی تو اسے خود اس بات پہ ہنسی آئے گی کہ وہ مجھے کیا سمجھ رہی ہے' مگر حد ہے حماقت کی۔ ہمارے درمیان اتنی دوستی ہونے کے بعد بھی اسے ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا کہ میں کون ہوں؟"

"اسے حماقت نہیں... سادگی کہتے ہیں۔"

انہیں نے تو میشا کی حمایت کرنا ہی تھی۔

"آخر کس دنیا میں رہتی ہے وہ۔ اتنا تو کوئی بچہ بھی سمجھتا ہے آج کے زمانے میں کہ ایسا کہیں نہیں ہوتا۔"

"وہ اپنی ہی دنیا میں رہتی ہے۔ اپنے خوابوں اور اپنے قصے کہانیوں کی دنیا میں... شروع سے ہی ایسی ہے اور میں نے بھی اسے اس دنیا سے باہر لانے کی کوشش اس لیے بھی نہیں کی' باہر کی دنیا میں اس کے لیے رکھا کیا ہے سوائے تلخ حقیقتوں کے۔ جو اسے دکھی کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتیں۔ اگر وہ اپنی اس خیالی دنیا میں خوش رہتی ہے تو ایسا ہی سہی...."

"لیکن اب اگر میں اسے یہ بتا دوں کہ میں کوئی پرستان سے نہیں آیا۔ کسی فیری مدر کا پوتا نہیں ہوں نہ ہی کوئی پرا ہوں اور نہ ہی میرے پاس کوئی جادوئی طاقتیں ہیں تو کیا وہ مان جائے گی؟"

اور اس سے پہلے کہ پر شکوہ خانم اس کے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب دے پاتیں۔ اس جانب آتے آتے رک کر رومان کی گفتگو کا آخری حصہ سننے والی سمارا چونک کے بولی۔

"پرا' پرستان' جادوئی طاقت' کیا مطلب؟"

رومان کے ہوش اڑ گئے۔

"سمارا آنٹی...!"

☼ ☼ ☼

ماڑ نے میشا کا نام لے کر کارا کے ہوش اڑا دیے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو تم ماڑ؟"

"میں صحیح کہہ رہا ہوں ماما... میشا ہی وہ لڑکی ہے۔"

"ماڑ! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ میں تمہیں بہت سینس ایبل اور میچور سمجھتی تھی۔ تم بھی زینی میں تو کبھی میشا میں اس لڑکی کو تلاش کرتے پھر رہے ہو' جو شاید ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہو۔" کارا نے سمجھانا چاہا۔

"نہیں! وہ میشا ہی ہے۔ پہلے مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔ اب نہیں۔"

"اگر میشا وہ لڑکی ہے بھی۔ تب بھی میں یہ کہوں گی کہ شادی کرنے کے لیے لڑکی میں اور بہت کچھ دیکھا جاتا ہے' علاوہ محبت کے۔ مجھے تو زینی بھی کبھی اس معیار کے آس پاس نہیں لگی' مگر بہر حال ہے تو وہ ایک اچھے خاندان... سیف اللہ کی بیٹی۔"

"میشا بھی سیف انکل کی بیٹی ہے۔"

"مگر اس کی ماں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے حتیٰ کہ خود میشا بھی نہیں۔ مہر جیسی بھی ہے' آپ کے اور اس کی بیٹی کے بارے میں ہم سے کوئی سوال نہیں کیے جائیں گے۔ البتہ میشا ہمیں دنیا کے سامنے تماشا بنا سکتی

ہے یوتھ سیف اللہ بی بی ہونا ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔"

"مگر وہ میرے سب سوالوں کا جواب ہے مام۔"

"میں نے بہت مشکل سے خود کو زینی کے لیے تیار کیا تھا۔ اور اب میشا۔ ایسا نہ ہو کل کسی اور لڑکی کو تم لے آؤ سامنے۔" کارا سخت مایوس نظر آرہی تھی۔

"ایسا نہیں ہے مام! نہ ہو سکتا ہے۔ اب صرف میشا' ورنہ کوئی بھی نہیں۔"

کارا مائر کے لہجے کی مضبوطی پہ خاموش ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

سمارا سخت طیش کے عالم میں تھی۔ رومان اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مسلسل اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا' وہ آدھی بات سن کے پورا افسانہ نہ بنا لے اور جا کے مہر کے سامنے نشر نہ کر دے۔

"آپ رک کر میری بات تو سن لیں۔"

"تم یہاں یہ سب ڈرامے کر رہے ہو؟"

"ڈرامے نہیں۔ یہ سب تو ایک مذاق تھا۔"

"کیسا مذاق؟" ضرور تمہاری کوئی پلاننگ تھی' جو تم نے انہیں یہ سب بتایا۔ سچ سچ کہو! کیا کرنا چاہتے تھے تم؟ اس فیملی کے ساتھ کوئی فراڈ' انہیں لوٹ کے بھاگنا چاہتے تھے؟

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں؟" اس کا دل چاہ رہا تھا' اپنا سر پیٹ لے۔

"اب ہی تو ٹھیک سمجھی ہوں میں۔ تب ہی تو وہاں جا کے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے تم نے۔ یاد رکھو رومان! تمہاری کسی بھی غلط حرکت کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑ سکتا ہے کیونکہ تم بدقسمتی سے میرے رشتے دار ہو اور میرے ہی گھر سے وہاں رہنے گئے ہو۔"

"آپ خدا کے لیے میری بات تو سن لیں۔ اصل واقعہ کچھ اور ہے۔"

☼ ☼ ☼

میشا کی آنکھوں میں آنسو مگر لب پہ مسکراہٹ تھی۔ بڑی آسودہ سی مسکراہٹ۔

مائر کے دیے پھول کی ایک ایک پتی اس کے پیروں میں بکھری ہوئی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر وہ کمرے سے نکلی اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"تم باہر نہیں جا سکتیں۔" وہاں مہر اور زینی اس کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ دونوں کے تیور ازحد خطرناک لگ رہے تھے۔

"کیوں نہیں جا سکتی؟"

"اس لیے کہ میں کہہ رہی ہوں اور یہ سختی اور پابندی میں نے تمہارے ساتھ پہلے کر لی ہوتی تو آج میری زینی کو یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔"

مہر نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"تو آپ یہ سختی اور پابندی زینی کے ساتھ کریں۔ اسے ضرورت بھی ہے۔"

"زبان چلاتی ہو میرے ساتھ۔" مہر کو اور کچھ نہ سوجھا تو ہمیشہ کی طرح اسے تھپڑ دے مارا۔

"ماما۔ یہ ہمت اور یہ زبان اسے مائر کی وجہ سے ملی ہے۔ اسی کی وجہ سے اکڑ رہی ہے۔" زینی نے شہہ دی۔

"اس کی یہ اکڑ تو میں ابھی توڑتی ہوں اور اس کے سر سے مائر کا بھوت بھی اتارتی ہوں۔ کان کھول کے سن لو لڑکی! اگر تم اپنی گرینی اور کارا کو بھی اپنے ساتھ ملا لو تب بھی میں مائر سے تمہاری شادی کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ اس سے شادی صرف زینی کی ہو گی۔"

"تو کروائیں۔ شوق سے کروائیں۔ مجھے بالکل کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

تنگ آ کے میشا نے ہاتھ جوڑ دیے۔ زینی ٹسوے بہاتے ہوئے کہنے لگی۔

"دیکھا ماما۔ یہ اصل میں مجھے جتا رہی ہے کہ ہم کچھ بھی کر لیں۔ مائر اس کے علاوہ کسی کی جانب دیکھے گا بھی نہیں۔"

"مجھے تمہارے مائر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سنبھال کے رکھو اسے۔ وہ دنیا کا آخری مرد ہوا' تب بھی میں اس سے شادی نہیں کرنے والی۔ کبھی بھی نہیں۔ ہٹیں سامنے سے۔"

اس نے غصے سے کہا اور زینی کو اپنے سامنے سے ہٹاتی گھر سے نکلی۔ مہر اور زینی دونوں اس کا بدلا روپ اور تیور دیکھ کے دم بخود تھیں۔

باغیچے میں دھوپ سینکتی پرشکوہ خانم سے میشا نے بڑی بے تابی سے رومان کی بابت دریافت کیا۔

"یہیں تھا ابھی۔ سمارا کے ساتھ نکلا ہے۔ آتا ہو گا۔" میشا ان کی بات سنتے ہی لکڑی کا پھاٹک کھول کے سیڑھیاں دھڑا دھڑ اترنے لگی۔

"میشا۔ میشا رکو۔ وہ یہیں آرہا ہے۔" اور اسے آخری سیڑھی تک جاتا دیکھ کے افسوس سے بڑبڑانے لگیں۔

"ناحق بتایا اسے۔ جانے وہاں سمارا اور رومان کے درمیان کیا چل رہا ہو گا۔"

☼ ☼ ☼

رومان' سمارا کو مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ پہ جھوٹ بولتا جا رہا تھا۔

"وہ سب ایک مذاق تھا۔ کوئی چال نہیں۔ نہ ہی کوئی فراڈ۔"

"مگر مہر یا اس کی بڑھیا ساس سے تمہارا کون سا مذاق کا رشتہ ہے؟"

"یہ مذاق میں نے ان سے تھوڑا ہی کیا تھا۔ یہ تو صرف میشا کے ساتھ کیا تھا۔ باقی سب لوگ میری اصلیت جانتے ہیں۔"

میشا اسے ڈھونڈتے ہوئے سمارا کے گھر تک آئی تھی۔ جھرنے کے قریب ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھا۔ اپنا ذکر سن کر وہ ٹھٹک کے وہیں شہتوت کے درخت کے پاس رک گئی۔

"سب کو پتا ہے کہ میں ایک عام انسان ہوں۔ کوئی پرا نہیں ہوں' نہ میرے پاس کوئی جادو ہے۔ صرف میشا ہے' جسے اس بکواس پہ یقین ہے اور اسے لگتا ہے کہ میں پرستان سے اس کی مدد کے لیے آیا ہوں۔"

"مگر کیوں؟ کوئی تو مقصد ہو گا تمہارا؟"

"پھر وہ ہی۔؟" وہ زچ ہو اٹھا کہ آخر اس بلا کو مطمئن کیسے کرے۔

"ظاہر ہے! سوائے اسے الو بنانے کے اور کیا مقصد ہو گا میرا۔ اس کے علاوہ مجھے اس سے یہ جھوٹ بول کے اور کیا کرنا تھا۔ مجھے زینی نے بتایا تھا کہ وہ ایک نمبر کی بے وقوف ہے۔ میں نے سوچا' کوئی لڑکی کتنی بھی بے وقوف یا سیدھی سادی ہو' اس بکواس اسٹوری پہ تو یقین نہیں کرے گی۔ مگر وہ تو میرے اندازوں سے بڑھ کے اسٹوپڈ نکلی۔ اصل میں میری زینی کے ساتھ شرط لگی تھی اسے بے وقوف بنانے کی۔ میں شرط جیت گیا۔ مگر اس کے بعد مزا آنے لگا اس کی حماقتوں پہ۔ اس لیے جھوٹ لمبا ہوتا گیا' لیکن سچ یہ ہے کہ اب میرا دل بھر گیا ہے۔ اکتاہٹ ہونے لگی ہے اس ڈرامے سے۔ آپ فکر مت کریں۔ ڈراپ سین ہونے ہی والا ہے۔"

اس نے اچھی خاصی لمبی کہانی سنا دی کہ شاید سمارا مان ہی جائے مگر وہ ہنوز اسے شک بھری نظروں سے گھور رہی تھی۔

اور میشا۔

اس کی کٹورا سی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے اپنے برف ہوتے پیر بمشکل اٹھائے اور واپس جانے کے لیے مڑی۔ اس سے زیادہ سننے کی اس میں تاب نہیں تھی۔

"تمہیں لگتا ہے میں تمہاری اس بے تکی اور فضول کہانی پہ اعتبار کر لوں گی؟" کافی دیر تک اسے گھورنے کے بعد سمارا نے کہا بھی تو یہ۔ رومان زچ ہو اٹھا۔

"ٹھیک ہے! نہ کریں۔ مرضی آپ کی۔" وہ تلخ ہو اٹھا۔ بے کار میں اتنی دیر سے مغز کھپا رہا تھا۔

"میں سچ سننا چاہتی ہوں رومان! آخر مقصد کیا تھا تمہارا۔"

"میشا کو پانا۔" وہ پھٹ پڑا۔

اور سمارا کی آنکھیں بھی پھٹ پڑیں۔

"ہاں! اس کو پانا' اس کے نزدیک جانا' اس سے کسی

بہانے دوستی کرنا۔ بس! اب ہوگئی آپ کی تسلی؟ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور میں نے جو بھی کیا' جھوٹ بولا' ڈراما کیا' دھوکا دیا۔ سب اس کی محبت میں کیا۔ میری نیت میں کھوٹ تھا' نہ دل میں میل۔"

سمارا میں تو اب کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

میشا نے فرش پہ گری ان پتیوں کو ایک ایک کر کے اٹھایا' جو اس نے کچھ دیر قبل نوچ کے بکھیری تھیں۔ ان کو مٹھی میں بند کر کے وہ مائر کی طرف جانے کے لیے نکلی۔ مگر سفید پھولوں والی پہاڑی کی گھاٹی اترتے ہوئے اسے رومان کا سامنا کرنا پڑا۔

"تم بات ادھوری چھوڑ کے چلی گئی تھیں میشا! میں وہ پوری کرنے آیا ہوں۔"

اس کی آنکھیں آج بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ مگر میشا ان کا مفہوم سمجھنے سے انکاری تھی۔

"میں نے بات ادھوری نہیں چھوڑی تھی رومان ...میں نے تو بات شروع ہی نہیں کی تھی۔" وہ حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے میشا! اب تمہیں یا مجھے ایک دوسرے کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ کھل کے سامنے آچکا ہے۔"

"ہاں... سب کچھ کھل کے سامنے آچکا ہے۔ بہت واضح ہو کے' لیکن پھر بھی رومان! میں چاہتی ہوں دل کی باتیں' دل میں نہ رہیں۔ کوئی حسرت باقی نہ رہے کہ میں تمہیں وہ سب نہ کہہ سکی' جو کہنا چاہتی تھی۔"

"ضرور کہو۔ میں بھی تم سے وہ سب سننے کے لیے مر رہا ہوں' لیکن اس سے پہلے میری ایک بات سن لو۔ میں نے تم سے ایک چھوٹا سا جھوٹ بولا تھا۔ دراصل میں..."

"دراصل تم پرے نہیں ہو۔ ایک عام... نہیں... عام نہیں' بلکہ معمولی انسان ہو۔" میشا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"تم جانتی ہو؟" وہ حیران تھا۔

"ہاں... پہلے دن سے۔"

"تو تم نے کبھی ظاہر کیوں نہیں کیا؟"

"جھوٹ تم نے بولا تھا۔ نبھا میں رہی تھی۔ تمہیں کیا لگتا ہے رومان! آج کے زمانے میں کوئی لڑکی اتنی احمق ہو سکتی ہے کہ تمہاری اس بکواس پہ یقین کرلے؛ تم نے کیا سوچا تھا' مجھے الّو بنالو گے؟ مجھ سے کھیلو گے؟"

"نہیں! بخدا ایسا نہیں ہے میشا۔ میں نے وہ جھوٹ اس نیت سے نہیں بولا تھا۔ میں تمہیں دھوکا دینے یا تمہارے جذبات سے کھیلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تم نہیں سوچ سکتے ہو گے' مگر میں نے ایسا ضرور سوچا۔" وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں آج کھنکھناہٹ نہیں۔ ایک کراہٹ تھی۔

"میں نے ایسا ضرور سوچا... تمہیں الّو بنانے کا... تمہارے جذبات سے کھیلنے کا۔"

"میشا؟" وہ حیرت زدہ تھا۔

"ہاں... اور تم بن گئے الّو۔ اسے کہتے ہیں شکاری کا خود شکار بن جانا۔ مزا لے رہی تھی میں تمہارے اس بوگس ڈرامے کا۔ ورنہ تم جیسے کو میں کیوں لفٹ کراتی؛ میں تو تمہیں دوستی کے لائق بھی نہیں سمجھتی۔ جس لڑکی کے سامنے مائر جیسا شخص منتظر کھڑا ہو' وہ تم جیسے کو گھاس کیوں ڈالے گی؟"

وہ اس پہ ایک تیز نظر ڈال کے کہتی وہاں سے چلی گئی۔ اور رومان کے پیر جیسے زمین میں گڑ گئے تھے۔ وہ نہ آگے جا پارہا تھا' نہ پیچھے۔

میشا نے اپنی ہتھیلی مائر کے سامنے پھیلائی تو پھول کو پتی پتی مسلی ہوئی حالت میں دیکھ کے وہ کچھ مایوس ہوا۔

"میشا! یعنی تمہارا... تمہارا جواب انکار میں ہے؟"

"پھول تو مرجھا جاتے ہیں مائر! ان کی زندگی بس اتنی ہی ہوتی ہے' جتنی خوابوں کی ہوتی ہے۔ جیسے آنکھ کھلتے ہی خواب ٹوٹ جاتا ہے' ایسے ہی ہلکا سا چھونے سے پھول ٹوٹ کے بکھر جاتے ہیں اور مجھے تم سے کوئی ایسا کچا رشتہ نہیں جوڑنا۔"

پھر اس نے اپنی ہتھیلی ان مسلی ہوئی پتیوں سے خالی کی اور اس کی جانب بڑھا دی۔

"میرا جواب "ہاں" میں ہے مائر!"

مائر جیسے جی اٹھا۔

اسی وقت وہ اسے کارا سے ملوانے بھی لے گیا۔ کارا نے بڑا پتھر دل پہ رکھ کے اس سے مسکرا کے بات کی' ورنہ یہ حقیقت ہضم کرنا آسان نہیں تھا کہ کل تک جس معمولی سی لڑکی کو وہ گھر کے کاموں میں مدد کے لیے لائی تھی اور ملازموں سے ذرا ہی اوپر کی حیثیت دی تھی۔ آج وہ گھر کی دلہن بننے والی ہے۔ لیکن میشا نے اپنی اداسی میں اور مائر نے اپنی سرشاری میں کارا کے اس تصنع سے بھرپور رویے کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

مائر نے اگر کچھ محسوس کیا بھی... تو میشا کی بار بار گیلی ہو جانے والی آنکھیں... اس کی حزن میں ڈوبی مسکراہٹ۔ اسی لیے اسے واپس چھوڑنے کے لیے جاتے ہوئے وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میشا تم خوش نہیں لگ رہیں۔"

"اچانک ملنے والی خوشی ایسی ہی ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے ظاہر کی جائے۔"

اس نے دور سے ہی رومان کو لکڑی کے پھاٹک پہ روغن کرتے دیکھ لیا تھا۔

"اب تو مام بھی راضی ہیں۔ تم نے مل کے دیکھ ہی لیا۔ انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم آج شام ہی گرینی سے بات کرنے آئیں گے اور تم مہر آنٹی یا زینی کی بالکل پروا نہ کرنا۔ ویسے بھی تمہیں اب ان کو زیادہ برداشت نہیں کرنا پڑے گا۔"

مائر نے گیٹ کے سامنے کار روکی۔ میشا نے نیچے اترتے ہوئے بطور خاص رومان کو سنانے کے لیے باآواز بلند کہا۔

"اور ہاں مائر! یہ دلہن کوئی معمولی دلہن نہیں ہے' اس لیے شادی کی تیاریاں بھی معمولی نہیں ہونی چاہئیں۔ یاد رکھنا! تم ایک پرنسز کو لے جانے والے ہو جو ہر ایک کے نصیب کے بات نہیں۔"

رومان کی آنکھوں میں کڑوا کسیلا دھواں بھر گیا۔

☼ ☼ ☼

گرینی کو یقین ہی نہیں آرہا تھا... انہوں نے غور سے میشا کے چہرے کو کھوجا... وہاں مذاق کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔

"تم نے مجھ سے اجازت لینا تو درکنار... ذکر یا مشورہ تک کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اتنا بڑا فیصلہ کر لیا... تن تنہا کارا سے مل بھی آئیں؟"

"کیا کہتی... آپ سب جانتی تو ہیں کہ میں مائر سے شادی کرنا چاہتی تھی... اور چاہتی ہوں۔"

"میں تو اور بھی بہت کچھ جانتی تھی میشا... تمہارے دل کے ہر موسم سے واقف تھی۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اس جلد بازی میں کیے فیصلے کی وجہ کیا ہے؟"

"کیسی جلد بازی اور کتنا انتظار کرتی میں اپنی قسمت کے دروازے کھلنے کا؟ خوش قسمتی بار بار دستک نہیں دیتی دروازے پہ۔"

"محبت کو بھی ایک بار دستک دے کر واپس لوٹنے کی عادت نہیں ہے۔"

ان کی بات پہ میشا کا دل ایک زینہ نیچے پھسلا۔ مگر اس نے اگلے ہی پل خود کو سنبھال لیا۔

"مائر مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"اور تم...؟" پر شکوہ خانم کا سوال اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ اس لیے جواب سوچ کے بیٹھی تھی۔

"میں بھی۔" مگر لہجے کے کھوکھلے پن کو کیسے بھرنا ہے۔ یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔

"تم مائر سے نہیں' اپنے بچپن کے ان خوابوں سے محبت کرتی ہو' جو صرف وہی پورا کر سکتا ہے۔" انہوں نے میشا کے دعوے کو جھٹلا دیا۔

"ایک ہی بات ہے اور آپ کو اسی بات کا غصہ ہے ناں کہ میں نے آپ سے پوچھے بغیر مائر کو "ہاں" کر دی تو پوچھ بھی لیتی تو کیا فرق پڑتا؟"

اس کی بات پہ ران کے دل پہ خراشیں سی پڑ گئیں۔
"یعنی اب تمہیں میری پسند اور مرضی جاننے سے کوئی بھی فرق نہیں پڑتا؟؟"
"نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں نے اس لیے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا کہ آپ کا جواب میرے جواب سے مختلف تو نہ ہوتا۔"
"مختلف ہوتا۔" پرشکوہ خانم نے پر زور انداز میں کہا۔
"کیونکہ میں ماڑ کو تمہارے لیے بالکل بھی مناسب نہیں سمجھتی۔ تم کبھی بھی اس کے ساتھ خوش نہیں رہو گی۔"
"اوہ..... تو پھر تو اچھا ہی ہوا کہ میں نے آپ سے نہیں پوچھا۔" یشا نے ڈھٹائی سے کہا تو پرشکوہ خانم کے پرشکن چہرے پہ ملال غبار کی صورت بکھر گیا۔
"مجھے یقین نہیں آرہا یشا تم میری وہی معصوم سی بھولی بھالی سی گڑیا ہو' جو آنکھ بند کر کے میری ہر بات مان لیا کرتی تھیں اور جو میرے سامنے ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالتی تھی۔"
"میں اب بھی آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کر رہی..... نہ کرنا چاہتی ہوں۔ صرف اس چانس کو مس نہیں کرنا چاہتی' جو زندگی مجھے دے رہی ہے۔ آپ کیوں یہ چاہتی ہیں کہ میں ساری عمر مہر ملا کے طعنے سنوں اور امی' زینی کے کام کرتے اور ان کی مار کھاتے گزار دوں؟ آپ کیوں نہیں چاہتیں کہ میں اپنے وہ سب خواب پورے کروں' جو آپ کی سنائی کہانیوں نے میرے اندر جگائے تھے؟ میں ان سب کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں کیا ہوں..... جو مجھے اتنا حقیر جانتے ہیں کہ جب دل چاہے مجھے اپنے پیروں تلے روند دیتے ہیں۔ کبھی مجھے' کبھی میرے جذبات کو۔"
"خوابوں اور خواہشوں کے لیے کہیں تم اپنا دل نہ کچل دینا..... دوسروں سے آگے بڑھنے کی چاہ میں پیچھے نہ رہ جانا۔"
"آپ کچھ بھی کہہ لیں..... میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔"
"میری ناراضی کے باوجود؟" انہوں نے آخری بار آزمانا چاہا۔
"جی!" یشا نے بھی دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔ اس وقت بس اور کچھ یاد نہیں تھا..... سوائے رومان کے ہاتھوں اٹھائی ذلت اور سبکی کے سوا۔
"تو ٹھیک ہے..... کرو من مانی' مگر یہ یاد رکھنا کہ اس شادی میں میری رضامندی نہیں ہے۔"

✡ ✡ ✡

مہر اور زینی تک بھی یہ اطلاع پہنچ چکی تھی..... اور زینی نے گویا سارا گھر سر پہ اٹھا رکھا تھا۔
"ماڑ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ صرف مجھ سے۔"
چلا چلا کے اس کے حلق میں خراشیں پڑ چکی تھیں اور کمرے میں کوئی ایسی چیز سلامت نہ رہی تھی' جو ٹوٹنے لائق ہو۔
"خود کو سنبھالو زینی..... اپنا تماشا نہ بناؤ۔" مہر نے اسے سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کی۔
"تماشا تو میرا ساری دنیا کے سامنے بن گیا ہے۔ میں نے سب کو بتا دیا تھا کہ ماڑ کی اور میری شادی ہونے والی ہے اور کل صبح ایک ایک کو پتا چل جائے گا کہ وہ تو یشا سے....."
"اس یشا کی بچی کے تو میں ابھی ہوش ٹھکانے لگاتی ہوں۔ کل کیسے اکڑ کے کہہ رہی تھی کہ مجھے ماڑ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" مہر نے دانت کچکچائے۔
"ہے کیا وہ؟ نہ شکل نہ عقل۔ اس کا اور ماڑ کا کیا جوڑ ہے؟ ماڑ نے اسے میرے مقابلے پہ لا کے اچھا نہیں کیا۔"
"تمہارا اور اس کا کوئی مقابلہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ میں کارا سے بات کروں گی..... وہ کیا بے وقوفی کرنے جا رہی ہے؟ اپنے اتنے اونچے خاندان کی بہو ایسی لڑکی کو بنانے جا رہی ہے جس کی ماں کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔"

سیڑھیاں اترتے ہوئے یشا نے مہر کے آخری الفاظ سن لیے اور تنفر سے کہا۔
"پلیز! آج کے بعد میری ماں کے بارے میں کچھ بھی الٹا سیدھا نہ کہیں..... اب مجھ پہ آپ کا کوئی احسان نہیں رہنے والا..... وہ جو دو وقت کا کھانا آپ دیتی ہیں' وہ بھی اپنے پاس رکھیں۔"
"یہ تنتنا جو تم دکھا رہی ہو نا! صرف ماڑ کے بل بوتے پہ..... اسے تو میں ایک جھٹکے میں ختم کر سکتی ہوں۔ کارا میری بات ضرور سمجھ جائے گی اور مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے سے باز رہے گی۔ پھر تمہارا سارا خمار اتر جائے گا۔"

✡ ✡ ✡

"رومان! یہ سب کیا ہو گیا ہے.....؟ اور کیسے؟ تم تو اس سے اپنے دل کی بات کہنے والے تھے؟"
پرشکوہ خانم نے رومان کو بلوایا تھا۔ وہ مضمحل سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا تھا۔
"اس سے پہلے ہی یشا نے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ وہ ماڑ سے محبت کرتی ہے۔"
"تم نے اسے اپنے بارے میں بتایا؟"
"نہیں' ضرورت نہیں پڑی۔ وہ پہلے سے سب جانتی تھی۔"
"کیا جانتی تھی؟"
وہ حیران ہوئیں۔ یشا کے کسی انداز سے کم از کم انہیں تو ایسا نہیں لگا تھا۔
"اسے یہ سب ایک دلچسپ مذاق اور کھیل لگا تھا۔"
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کیسے کسی سے کھیل سکتی ہے۔ اس کا دل تو بہت حساس ہے۔"
اس کا دل اب اس کے پاس رہا کہاں ہے۔ اسے تو ماڑ کے حوالے کر چکی ہے۔"
"جھوٹ بولتی ہے وہ..... مجھے یقین ہے وہ ماڑ کو نہیں چاہتی..... اس شادی کے پیچھے کوئی اور وجہ ہے۔"
ہاں..... ہو سکتا ہے [illegible]
خواب..... اس کی خواہشات' مگر یہ وجہ بھی کم نہیں ہے۔ مجھے اس کے خواب توڑنے یا اس کی خواہشات کو ادھورا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے گرینی..... میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ وہ ماڑ سے شادی کر کے خوش رہے گی۔"
اس کی شکستگی پہ انہیں بہت دکھ ہوا۔
"تم نے اتنی جلدی ہمت ہار دی؟"
"جب دل ہار دیا..... تو سب ہار دیا۔"

✡ ✡ ✡

کارا' مہر کو خلاف توقع اپنے گھر میں دیکھ کے حیران رہ گئی۔ یہ اندازہ تو تھا کہ وہ کسی اچھے مقصد سے تو ہرگز نہیں آئی ہوگی۔
"جو کچھ تم نے اور تمہارے بیٹے نے زینی کے ساتھ کیا ہے' اس کے بعد میرا تم سے ہمدردی جتانے کا کوئی جواز تو نہیں بنتا' مگر کیا کروں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ تمہیں گڑھے میں گرتے نہیں دیکھ سکتی۔"
"کیسی ہمدردی؟ کیا گڑھا؟"
"سنا ہے تم نے یشا کو بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے تم سے اس بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔ میں تو تمہیں بہت سمجھ دار اور زمانہ شناس سمجھتی تھی۔"
"اولاد کی محبت کے سامنے ساری سمجھ داری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ماڑ یشا کی محبت میں..... اور میں ماڑ کی محبت میں مجبور ہوں۔" کارا نے بے چارگی سے کہا۔
"تم ماں ہو..... ماڑ کو حقیقت بتانا تمہارا فرض ہے۔"
"کیسی حقیقت؟" وہ چونکی اور مہر نے تیر نشانے پہ جاتا دیکھ کے مسکرا کے بتایا۔
"تمہاری ہونے والی بہو یشا کی حقیقت۔"

✡ ✡ ✡

رومان اپنا سامان باندھ رہا تھا۔

سامان اس کے پاس تھا ہی کتنا.....
گنتی کے چند جوڑے.....
اور ان گنت یادگاریں.....
ایک ایک پل کو سینت سینت کے دل کے اندر چھپاتے ہوئے وہ ہیشا کی آنے والی زندگی کے لیے دل سے دعائیں کر رہا تھا۔

مہر کے بھرنے پہ کارا سیدھی پر شکوہ خانم کے پاس اپنا سوال نامہ لے کر جا پہنچی.....

"یہ ہیشا کا ہاتھ مانگنے آئی ہو یا گڑے مردے اکھاڑنے؟" وہ ناگواری سے بولیں..... کارا سے انہیں یہ امید نہیں تھی۔

"اب دو خاندانوں میں رشتے ناتے طے ہوتے ہیں تو یہ سوال اٹھائے ہی جاتے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہو گا۔"

"کیا اتنا جاننا تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ ہیشا کے نام آگے سیف اللہ کا نام ہے..... میرے بیٹے کا۔"

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیا ہیشا کی ماں کے نام کے آگے بھی سیف اللہ کا نام تھا یا نہیں...؟ ان دونوں کی کبھی شادی بھی ہوئی تھی یا نہیں؟"

"یہ خناس کس نے تمہارے دماغ میں بھرا ہے؟"

"اپنے بیٹے کی شادی کرتے ہوئے اتنا جاننا تو میرا حق ہے..... اگر آپ کہتی ہیں کہ سیف اللہ نے ہیشا کی ماں سے شادی کی تھی تو اسی شادی کا کوئی تو ثبوت ہو گا آپ کے پاس کوئی تصویر' نکاح نامہ۔"

کارا کے استفسار پر شکوہ خانم نے لاجواب ہو کے نظر جھکا لی تو اسے مہر کے دعووں پہ یقین سا ہو گیا۔

"آنٹی..... مجھے کم از کم آپ سے اس غلط بیانی کی امید نہیں تھی۔ مجھے لگا مہر ہمیشہ کی طرح..... لیکن آپ تو واقعی اپنے بیٹے کے گناہ کی نشانی کو میرے سر پہ فخر سے تھوپ رہی ہیں۔"

کارا کے ملامت بھرے لہجے پہ وہ غصے میں آ گئیں۔

"میرے مرحوم بیٹے کو گناہ گار مت کہو کارا..... اپنی زبان پہ کنٹرول رکھو' ورنہ میں بھول جاؤں گی کہ میرا تم سے کیا رشتہ ہے۔"

"اس لڑکی کی خاطر آپ ویسے بھی سب رشتے بھلا چکی ہیں۔"

"کارا! مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم ہیشا کو اپنی بہو بناتی ہو یا نہیں..... مگر ایسی لغو باتیں کر کے میرے بیٹے کی روح کو تکلیف مت دو..... میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

کارا کے پاس اگلنے کو ابھی بہت سا زہر باقی تھا مگر پر شکوہ خانم کے بندھے ہاتھ اس کے لبوں کو بھی باندھ گئے۔

☼ ☼ ☼

"جانتی ہو' تمہاری وجہ سے آج مجھے کیا کچھ سننا پڑا!"

رات کو انہوں نے نم آنکھوں کے ساتھ ہیشا کو بتانا چاہا مگر وہ نجانے کیسے اتنی پتھر دل ہو گئی تھی۔

"جو بھی آپ سے ایسی بات کہے..... کہہ دیں کہ ہیشا کو جا کے سنائے..... میں سن لوں گی۔"

انہیں تاؤ سا آ گیا۔

"تم سن لو گی؟ چپ چاپ سن لو گی وہ سب کچھ؟ زندگی کوئی فیری ٹیل نہیں ہے ہیشا..... یہاں پہ شہزادے تمہارے ناپ کی سینڈل ہاتھ میں لیے نہیں گھوم رہے۔ کارا نے تم پہ..... تمہارے وجود پہ تمہاری حیثیت پہ ایسے ایسے سوال اٹھائے ہیں کہ تم سن لو تو خود مائر سے شادی کرنے سے انکار کر دو..... اگر تم میں ذرا سی بھی شرم ہو..... یا عزت نفس اور خودداری نام کی کسی چیز سے تم اب بھی واقف ہو تو..... مائر کی محبت اور ضد میں مجبور ہو کے کارا تمہیں بیاہ کے لے بھی گئی تو جو بے عزتی اس نے تمہاری اور سیف اللہ کی اب کی ہے' وہ آگے بھی کرتی رہے گی۔ وہ نہیں چاہتی تم اس گھر میں جاؤ۔"

"مگر مائر تو چاہتا ہے' میں چاہتی ہوں..... اور کیسی بے عزتی؟ کیسی ذلت؟ جو کچھ یہاں ہوتا ہے میرے ساتھ' وہ کیا ہے؟ ایک آپ کا سہارا تھا اور اب آپ بھی بدل گئی ہیں۔ آپ کو بھی مجھ سے پیار نہیں رہا۔"

"اصل میں تمہیں پیار کی پہچان ہی نہیں رہی..... اب کیوں رو رہی ہو..... وہ جس کے کاندھے سے لگ کے تم اپنی پریشانیاں اور دل ہلکا کیا کرتی تھیں۔ جس کے دامن پہ سارے خوف اور سارے آنسو بہا دیا کرتی تھی..... اسے تو تم نے خود ٹھکرا دیا ہے جیسے ناقدرے اور ناشکرے لوگ نعمت کو ٹھکرا دیا کرتے ہیں۔"

ان کا اشارہ کس جانب تھا..... وہ ہیشا بخوبی بھانپ گئی اور چپ چاپ ان کو وہیل چیئر لیے کمرے سے نکلتے دیکھتی رہی..... پھر ہارے ہوئے انداز میں بیڈ پہ گر گئی۔

"گرینی کیوں نہیں سمجھ رہیں کہ روماں نے مجھے جس طرح میری ہی نظروں سے گرایا ہے' اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ میں مائر کا ہاتھ تھام لوں..... کسی اور کو نہیں خود کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ میں اتنی گری نہیں ہوں۔ گرینی کبھی نہیں جان سکتیں کہ کارا آنٹی اور مہر ماما میری وہ بے عزتی کیا کریں گی جو روماں نے کی ہے..... میں اس پہ' زینی پہ' سب پہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میں....."

زینی اور مہر کے اچانک دروازہ کھول کے اندر آنے پہ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ دونوں کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔

"بہت اونچی اڑان بھر رہی ہو..... شاید تمہیں بچپن کے وہ کوٹھڑی کے حبس میں گزارے دن..... اور سردیوں کی کھلے آسمان کے نیچے گزاری راتیں بھول گئی ہیں۔" مہر نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

"اسے بہت کچھ یاد دلانے کی ضرورت ہے ماما!"

زینی نے اس کے بالوں کو مٹھی میں بھر کے جھٹکا دیا۔

ہیشا کی کراہ نکل گئی..... مہر نے اس کی کمر میں پوری قوت سے دھموکا جڑا۔ وہ اپنی بے ساختہ چیخ نہ روک سکی۔

انیکسی سے اپنا سامان لے کر نکلتے روماں تک آواز پہنچی' اس نے بیگ وہیں پھینکا اور تیر کی طرح لپک کے وہاں پہنچا۔ مہر اور زینی دونوں وحشیانہ طریقے سے ہیشا پہ ٹوٹی ہوئی تھیں۔

"چھوڑیں اسے..... پاگل ہو گئی ہیں آپ دونوں۔"

وہ اسے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ مہر نے اسے زور کا دھکا دیا۔

"روماں! تم نکلو یہاں سے..... یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔"

"گھروں میں اس طرح جارحیت نہیں ہوتی..... میں یہ سب نہیں ہونے دوں گا۔" اس نے ایک جھٹکے سے ہیشا کو کھینچا اور ان دونوں کی گرفت سے نکال کے اپنی اوٹ میں چھپا لیا۔

"خبردار! جو کسی نے اب اسے ہاتھ بھی لگایا تو....."

"تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے والے؟ نکلو یہاں سے۔"

مہر آگ بگولا ہو گئی اور ہیشا کو اس کے عقب سے نکالنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا جو روماں نے تھام لیا۔

"تم دو ٹکے کے ملازم..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری ماما کا ہاتھ پکڑنے کی؟" زینی چلائی جس پہ روماں نے دھمکی دی۔

"ابھی تو صرف پکڑ کے روکا ہے..... ہیشا کی جانب دوبارہ انگلی بڑھائی تو توڑ کے رکھ دوں گا۔"

اس کے شعلے لپکاتے لہجے پہ ہیشا نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔ روماں کے چہرے کا ایک ایک عضو بھڑک رہا تھا۔ جیسے اس کے اندر کوئی جوار بھاٹا امڈ رہا ہو۔

"میرے گھر میں رہتے ہو..... میرا دیا کھاتے ہو..... اور اس گھٹیا لڑکی کی خاطر مجھے سنا رہے ہو..... ہاں! یاد آیا' کل ہی تو سمارا نے میرے سامنے انکشاف کیا تھا مگر میں سمجھی تم اس سے شادی کے لیے نہیں مانتے اسی لیے وہ دل کی کھولن نکال رہی ہے۔ اب جیسے تم اس کی حمایت میں لڑنے مارنے پر اتر آئے ہو۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔"

"ہیشا! تم جاؤ گرینی کے پاس۔"

روماں نے ہیشا کو وہاں سے روانہ کرنا چاہا جبکہ ہیشا کا دھیان مہر کی ادھوری بات میں اٹکا تھا..... لیکن جب روماں دوبارہ سخت لہجے میں بولا۔

"میشا..... سنا نہیں، تم گرینی کے پاس جاؤ..... یہاں تم محفوظ نہیں ہو۔"

تو اسے باہر قدم بڑھانے ہی پڑے۔

"کون سی بات ماما! کیا بتایا تھا سمارا آنٹی نے آپ کو اس کے بارے میں؟"

مگر زینی کے سوال نے اسے دروازے کے باہر ہی ٹھٹک جانے پہ مجبور کر دیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ رومان نے اسے جس طرح بے وقوف بنایا اور اس کی محبت کا مذاق بنایا۔ کیا یہ بات سمارا نے ان سب کو بھی سنا دی ہے؟

"یہی کہ یہ اُلّو اس منحوس کے عشق میں گرفتار ہے۔" مہر کے بتانے پہ زینی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیا، یہ بھی؟"

میشا کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔

اسے اپنی سماعتوں پہ بھروسا نہ رہا کہ جو وہ اس وقت سن رہی ہے وہ سچ ہے یا جو اس وقت سنا تھا وہ سچ تھا۔

"اوہ..... تو یہ جو گھر اور شہر چھوڑ کے اچانک روانہ ہوا جا رہا ہے، وہ عشق میں ناکامی کی وجہ سے ہے۔" زینی نے ٹھٹھا لگایا۔

"ابھی تم اسی لڑکی کی وجہ سے مجھ پہ برس رہے تھے رومان! جس نے تمہیں پناہ دی۔ سہارا دیا، اسی کے لیے نمک حرامی کر رہے ہو جو تمہیں ٹھینگا دکھا کے مائر سے شادی کرنے جا رہی ہے۔"

"پلیز! میشا کا ذکر ان الفاظ میں مت کریں۔ میرے اور اس کے درمیان جو کچھ بھی ہو..... میں اس کے خلاف کچھ نہیں سن سکتا۔"

رومان کی بات پہ میشا کا دل بھر آگیا۔

"اور مائر..... جس سے میشا کی شادی ہونے والی ہے وہ کیا کیا سن سکتا ہے میشا کے بارے میں؟"

زینی کے گہرے سوال پہ میشا اور رومان دونوں ہی چونکے تھے۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

"وہ ایک بڑے گھر کی بہو بننے جا رہی ہے..... بڑے لوگوں کے نخرے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ کارا آنٹی تو ویسے بھی ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں..... مائر کی بھی کچھ کچھ عادتیں ان کے جیسی ہیں۔ اگر اسے پتا چلے کہ اس کی ہونے والی بیوی معصوم، سیدھی سادی، بھولی بھالی میشا کا چکر گھر کے ایک معمولی ملازم سے چلتا رہا ہے تو؟"

"میشا کا مجھ سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ صرف میری دوست ہے۔"

رومان نے تڑپ کے کہا۔ اس کے چہرے سے کتنی پریشانی ہویدا تھی۔ یہ میشا بغیر دیکھے اس کے لہجے سے ہی بھانپ سکتی تھی۔

"یہ تو تمہارا کہنا ہے مگر میں مائر پہ یہ ثابت کر سکتی ہوں کہ میشا کا اور تمہارا تعلق....."

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی، کچھ بھی نہیں..... ورنہ میشا کے خواب ٹوٹ جائیں گے..... بکھر جائیں گے۔ میں اس کے خواب نہیں ٹوٹنے دوں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لیے اس کی پوری مدد کروں گا..... اور میں مر کے بھی اپنا وعدہ نبھاؤں گا..... میں آپ کو یا کسی اور کو میشا اور مائر کے درمیان نہیں آنے دوں گا۔"

میشا روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

میشا اس کیفیت سے چاہ کے بھی نکل نہ پا رہی تھی۔

"اتنا چاہتا ہے وہ مجھے کہ میرے ساتھ ساتھ اسے میرے خوابوں سے بھی پیار ہے..... اتنی محبت ہے اسے مجھ سے کہ اپنا دل ٹوٹنا گوارا ہے اسے..... مگر میری امید ٹوٹنا گوارا نہیں ہے۔ یہ کیسی محبت ہے۔ جو اپنی ذات سے نکل کے دوسرے کی ذات کو خود پہ حاوی کر لیتی ہے۔"

اس نے خود کو جو دھوکا دیا تھا۔ رومان کی چاہت کو نفرت کے لبادے میں چھپانے کا..... وہ دھوکا اب وہ مزید نہیں دے سکتی تھی۔ کیسے چھپائے وہ اب اس چاہت کو جو کورے پیالے میں سے چھلک چھلک کے باہر آ رہی تھی۔

"نہیں..... ساری عمر اس دھوکے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے رومان کو بتانا ہو گا کہ جو ہوا ایک غلط فہمی..... "

رات کے سناٹے میں فون کی تیز گھنٹی نے اسے طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

"ہیلو۔"

"میشا..... تم ٹھیک ہو نا، پتا نہیں کیوں تمہارے بارے میں سوچ کے میرا دل گھبرا رہا تھا جیسے..... جیسے کچھ غلط ہوا ہے۔ یا غلط ہونے والا ہے۔"

دوسری جانب مائر تھا جو بے تابی سے کہتا میشا کو یہ احساس دلا رہا تھا کہ اس دھوکے اور غلط فہمی کی لپیٹ میں صرف اس کے اور رومان کے دل ہی نہیں آئے تھے بلکہ ایک تیسرا فرد بھی آیا تھا۔

مائر.....

وہ چپ چاپ ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔

"میشا..... مام اور میں صبح آ رہے ہیں..... تمہیں منگنی کی انگوٹھی پہنانے..... اور اسی ہفتے کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دیں گے۔ میں مزید کسی قسم کی تاخیر نہیں چاہتا۔"

میشا نے مردہ ہاتھوں کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔

چند الفاظ ہی تو تھے..... کہہ دیتی..... مگر دل ٹوٹنا کیا ہوتا ہے اس کا کرب کچھ دن پہلے ہی تو سہا تھا اس نے کہ ہاتھ آئی محبت کو کھونا کیا ہوتا ہے۔ ابھی ابھی تو جانا تھا اس نے..... اسے پتا تھا کیا گزرتی ہے دل پہ..... کیسے وہ اپنے ہاتھوں یہی اذیت..... یہی کرب..... یہی عذاب کسی اور کو سونپ دے..... مائر سے کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔

☼ ☼ ☼

شکوہ خانم پریشان کم اور حیران زیادہ تھیں کہ کل کے واقعے کی اتنی تلخی کے بعد بھی کارا کیسے مان گئی۔ انہیں شک سا ہو رہا تھا کہ کل اس کے آنے پہ کوئی پنڈورہ کھلے گا۔

سیف اللہ..... مجھے معاف کرنا میں تمہاری امانت کی اس طرح حفاظت نہیں کر سکی..... جیسے مجھے کرنی چاہیے تھی اور شاید اب میں تمہارے اس راز اور عہد کی پاس داری بھی نہ کر سکوں کیونکہ اس عہد اور راز سے زیادہ اہم کسی کا وقار اور بھرم ہے۔"

☼ ☼ ☼

اور رومان نہیں گیا.....

اسے جانا تھا..... اس نے جانے کا ارادہ بھی کر لیا مگر ابھی نہیں۔ جو حالت مہر اور زینی نے میشا کی کی تھی اس کے بعد اس کا حوصلہ نہیں ہوا میشا کو ان کے نرغے میں اکیلا چھوڑ کے جانے کو..... میشا اور مائر کی شادی تک اس نے یہیں رکنے کا فیصلہ کیا۔ ساری رات اس نے کھلے آسمان تلے جگنوؤں سے باتیں کرتے گزاری..... اور صبح گرینی کو لائبریری کی کتابیں دینے کے بہانے وہاں آ گیا۔ گرینی کی زبانی اسے پتا چلا کہ وہاں اس کی ضرورت بھی تھی۔ کارا اور مائر کچھ ہی دیر میں آنے والے تھے۔ میشا صبح سے کمرے میں بند تھی۔ رومان کا خیال تھا اس کا فی الحال کمرے میں بند رہنا ہی ٹھیک تھا..... میشا نے گرینی کو مہر اور زینی کی کل والی حرکت کے بارے میں نہیں بتایا، اس بات کا اندازہ کر کے رومان نے بھی بتانا مناسب نہ سمجھا..... اور خاموشی سے مہمانوں کے استقبال کی تیاری میں لگ گیا۔ مہر، امی اور زینی کو لیے احتجاجاً گھر سے چلی گئی تھی۔

کارا ایک پر اسرار سنجیدگی کے ساتھ پر شکوہ خانم کے سامنے بیٹھی تھی۔

دونوں کے درمیان ایک تکلف اور گریز سا نظر آ رہا تھا۔ کارا تو مائر کی وجہ سے مارے باندھے بیٹھی تھی۔ وہ بے چارہ ماحول کو خوش گوار کرنے کے لیے اپنی سی کوششیں کر رہا تھا۔

"میشا کیا خود کو ابھی سے دلہن سمجھ رہی ہے۔ جو اندر چھپ کے بیٹھ گئی ہے۔"

لیکن اس کے چہکنے پہ بھی دونوں خواتین کی سنجیدگی پہ رتی برابر فرق نہ پڑا۔ خجل سا ہو کے مائر کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"گرینی! آپ میشا کو بلائیں تاکہ میں اسے منگنی کی انگوٹھی پہناؤں۔ پھر ڈیٹ آپ دونوں مل کے فائنل کر لیں۔"

"لیکن اس سے پہلے مجھے آنٹی سے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔ جو اس دن وہ نہیں دے پائی تھیں۔"

کارا نے یہی کہنا تھا اور یہی کرنا تھا۔ اس کی توقع شکوہ خانم کو پہلے سے تھی۔ جب ہی تو وہ تیار بیٹھی تھیں۔

"فکر مت کرو کارا! آج تمہیں تمہارے سارے سوالوں کے جواب ملیں گے۔"

"کیسے سوال..... کیسے جواب....." ماژ کی سمجھ سے بالاتر تھا یہ معاملہ.....

"بتائیے آنٹی کیا ہے میشا کی حیثیت' کون تھی اس کی ماں' کیا اس کا ماضی اتنا تاریک اور بھیانک ہے کہ سیف اللہ اس عورت کا نام تک لینے سے گھبراتا تھا؟"

"سب سے پہلے تو میں یہ واضح کردوں کہ میشا کی ماں جو بھی تھی' جیسی بھی تھی۔ ہمیں اس کے بارے میں اس انداز سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیا پتا اس کا دامن ہم سے بھی اجلا ہو۔"

"جس کی جنم دی اولاد کو اس کا نام تک نہ ملے۔ وہ ماں کتنی قابل احترام ہو سکتی ہے بھلا؟ آخر سیف اللہ نے اپنی اس دوسری بیوی یا معشوقہ میں کوئی تو ایسا عیب دیکھا ہو گا جو میشا کو نہ صرف اس سے الگ کر دیا بلکہ اس کے بارے میں کچھ بتایا تک نہیں۔"

"مام..... آپ یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں۔" ماژ جھنجلا اٹھا۔

"یہ سب جاننا بہت ضروری ہے ماژ! لڑکی معمولی صورت کی ہوتی تو میں برداشت کر لیتی..... مگر معمولی نسب کی ہو' یہ قابل قبول نہیں ہے میرے لیے۔"

"مگر میرے دل میں میشا کے لیے کیا جذبات ہیں ان کے بارے میں تو سوچیں آپ؟"

"تمہارے جذبات کا خیال کر کے ہی میں یہاں تک آئی ہوں ورنہ میشا میں ہے کیا..... نہ تعلیم نہ ذہانت..... نہ کوئی اور گن..... نہ حیثیت' نہ مقام..... یہ سب باتیں بھی میں نے پتا نہیں کیسے نظرانداز کیں..... مگر اب یہ بات بالکل بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اس کا تعلق کسی ایسی ویسی عورت سے ہے۔"

"کارا! میں نے تم سے پہلے ہی کہا ہے کہ اس عورت کا ذکر ان الفاظ میں مت کرو۔"

"مہر کے بارے میں تو میں نے جب بھی کچھ کہا آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اپنی اس دوسری بہو سے آپ کو کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہے؟"

"وہ میری بہو نہیں تھی۔" اور کارا نے فوراً ان کی بات کو پکڑ لیا۔

"دیکھا..... آخر آپ نے تسلیم کر لیا کہ سیف اللہ نے اس عورت سے شادی نہیں کی تھی۔"

"ہاں..... نہیں کی تھی۔" انہوں نے تحمل سے کہا۔

"ماژ! کیا اب بھی تم کہو گے کہ تمہاری مام غلط ہیں؟ میری بات کتنی صحیح نکلی۔ دیکھ لینا میرا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہو گا کہ وہ کسی اچھے قماش کی عورت نہیں تھی۔ تب ہی تو سیف اللہ جیسے شریف انسان کو بھی اپنے دام میں....."

"بس کارا..... اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کروں گی۔ میرا سیف اللہ اس عورت کو..... یعنی میشا کی ماں کو جانتا تک نہیں تھا..... نہ ہی اس کا اس سے کوئی تعلق تھا۔ اس نے تو اس عورت کو دیکھا تک نہیں تھا کبھی۔"

کارا اور ماژ تو دنگ تھے ہی..... اپنے کمرے سے نکلتی میشا بھی بت بن کے رہ گئی۔ اسے رومان نے کتنی دستکیں دینے کے بعد دروازہ کھولنے پہ مجبور کیا تھا۔

"کیا' دیکھا تک نہیں..... تو..... یہ..... میشا؟"

"سیف اللہ کو میشا جب ملی تو اس کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہو چکا تھا..... میشا چھ سال کی تھی اور نیپال کے کماری میلے میں ملی تھی سیف اللہ کو۔"

"کماری میلہ؟ مطلب Living goddess کے فیسٹول میں؟" ماژ اس میلے کے پس منظر سے واقف تھا۔

”ہاں..... وہاں کے مذہب اور روایت کے مطابق اس بار انہوں نے ننھی میشا کو Living goddess کے طور پہ چنا تھا۔ سیف اللہ چونکہ ان دنوں نیپال میں تھا اور اس فیسٹول کی شہرت سن کے دیکھنے گیا تھا اور ہاتھی کی سواری کرتی ’دیوی کے لباس میں ملبوس‘ سر پہ تاج پہنے میشا کو دیکھ کے اسے اپنی بچیاں امی اور زینی یاد آگئی تھیں..... اس کا اتنا دل دکھا تھا جب اس نے بچی کو چاکلیٹ دی تھی اور وہ معصوم اس چیز کے ذائقے تک سے ناواقف تھی اور جب ذائقہ بھایا تو اگلی رات اپنے کماری پیلس کے اتنے پہرے توڑ کے نجانے کیسے وہ باہر نکل آئی۔ صرف سیف اللہ سے دوبارہ وہ چاکلیٹ لینے ..... سیف اللہ سے برداشت نہ ہوا کہ ایک معصوم بچی اس دور میں بھی ایسی جاہلانہ رسم کی وجہ سے اپنے بچپن ’اپنی معصومیت اور اپنی فطرت سے دور رہے..... کسی معمول کی طرح دیوی کے کردار میں رنگ بھرتی رہے اور لوگ اس کے آگے ماتھے ٹیکتے‘ ناریل پھوڑتے رہیں..... اور وہ پرشاد بانٹتی رہے اور پھر نئی کماری دیوی کے آنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کماری پیلس میں قید ہو جائے۔ وہ ننھی میشا کو وہاں سے لے کر بھاگ آیا۔“

وہ چپ ہوئیں تو ماحول پہ کتنی ہی دیر ایک سکوت چھایا رہا..... کوئی کچھ کہنے کے قابل نہ تھا.....

میشا کے قدم لڑکھڑائے جیسے اس کا وزن سہارنے کے قابل نہ ہوں۔ رومان نے فوراً“ آگے بڑھ کے اسے سہارا دیا اور بیٹھنے میں مدد دی۔

”لیکن اس بات کو اتنا چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟“

آخر مائر نے سوال داغا۔ جس کا جواب رومان نے دیا۔

”شاید آپ لوگ کماری دیوی کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں۔ یہ نیپال کے ہندو مذہب کی سب سے پرانی شاید لاکھوں سال پرانی روایت ہے۔ وہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی یا بغاوت برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر سیف انکل یہ راز مہر آنٹی کو بھی بتا دیتے تو شاید وہ اسے راز نہ رکھ پاتیں اور کسی کے سامنے اس راز کے آنے کا مطلب ہوتا..... میشا کے ساتھ ساتھ ان سب کی تباہی جو اسے کماری پیلس سے دور رکھنے کی وجہ ہیں۔ ان ہی سب سے بچنا چاہا انہوں نے۔ وہ تو شاید آج بھی میشا کی تلاش میں ہوں گے۔“

یہ سن کے کارا اور مائر دونوں نے خوف زدہ انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

میشا نے واضح طور پہ مائر کا رنگ سفید پڑتا دیکھا تھا۔

”مطلب اس شادی کے بعد ساری عمر میرے بیٹے کے سر پہ تلوار لٹکتی رہے گی کہ کسی دن میشا کی حقیقت سامنے آگئی تو اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی لپیٹ میں آجائے گا؟“

”میرا خیال ہے۔“ مائر نے حلق تر کرتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

”سر پہ لٹکتی اس تلوار کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے معاملے کو آر یا پار کر لیا جائے۔“

”وہ کیسے؟ واضح کرنے کی زحمت کریں گے آپ؟ میشا نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔

”کیوں نہ ہم وہاں جا کے تمہاری پوزیشن کلیئر کر دیں اور ان سے باہمی رضا مندی کے ساتھ..... میرا مطلب ہے ان کی اجازت سے شادی کریں۔ ورنہ ساری عمر ایک خوف کے سائے تلے زندگی گزرے گی۔“

”بہت خوب! تو آپ کو لگتا ہے اپنے عقیدے اور مذہب سے ٹکرانے والوں کو وہ ہنسی خوشی اجازت دے دیں گے؟“ رومان نے طنز سے کہا۔

کارا نے بھی مائر کو جھاڑ کے رکھ دیا۔

”پاگل مت بنو مائر..... تمہیں لگتا ہے تم وہاں اجازت لینے جاؤ گے تو سب جاننے کے بعد وہ تمہیں زندہ واپس آنے دیں گے؟“

پھر وہ پر شکوہ خانم سے مخاطب ہوئی۔

آنٹی! مجھے آپ سے جو گلے تھے وہ سب کے سب آج دور ہو گئے کیونکہ آپ نے یہ سچ بتا کے مجھے اور میرے بیٹے کو ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہ کر دیا۔

مائر..... یہ سب جاننے کے بعد تو میں کسی بھی صورت اس لڑکی کو تمہاری زندگی میں شامل نہیں ہونے دوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے تمہارے ساتھ زبردستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ چلو میرے ساتھ۔“

وہ اس کا بازو تھام کے لے جانے لگی۔ مائر بے بسی سے میشا کو دیکھے جا رہا تھا‘ جو سپاٹ اور بے تاثر چہرہ لیے بیٹھی تھی..... اس کی نگاہوں میں ایسی کوئی پکار نہیں تھی‘ جو مائر کو رک جانے یا ماں کے سامنے ڈٹ جانے پہ مجبور کرتی۔

”مام! ایک منٹ ہم بات تو کر سکتے ہیں۔ شاید کوئی نہ کوئی حل نکل آئے اس مسئلے کا۔“

”اس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے سوائے اس کے کہ جیسے دس بارہ سالوں سے میں میشا کی اصلیت چھپائے اس ڈر کے ساتھ زندہ ہوں کہ اس کو ڈھونڈتے ہوئے وہ لوگ کہیں یہاں تک نہ آن پہنچیں ‘ایسے ہی باقی کی ساری زندگی گزار دی جائے۔“

گرینی کے کہنے پہ میشا اٹھی اور مائر کے سامنے جا کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔

”بولو مائر! ایک منٹ ہے تمہارے پاس..... ہاں یا ناں۔“

”ایک منٹ۔“ وہ گھبرا اٹھا۔

”مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت تو دو۔“

”نہیں یہ فیصلہ سوچ سمجھ کے نہیں..... دل پہ ہاتھ رکھ کے چند لمحوں میں کرنے والا ہے..... ایک منٹ جس کے بہت سے سیکنڈ گزر چکے ہیں مائر!“

مائر ہڑبڑا کے رہ گیا۔ اس کا ایک بازو ابھی بھی کارا کی گرفت میں تھا۔

”رومان.....“ میشا کی نظریں مائر کے رنگ اترے چہرے پہ جمی تھیں۔ بنا پیچھے مڑے اس نے رومان کو پکارا۔

”رومان! تمہارے پاس ایک منٹ بھی نہیں ہے صرف دس سیکنڈ ہیں۔ تم کرو گے مجھ سے شادی..... لو گے یہ خطرہ؟“

”ہاں۔“ اور رومان نے اپنے حصے میں آئے چند سیکنڈ بھی سوچنے میں صرف نہ کیے۔

میشا کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی اور مائر کو اب محسوس ہوا کہ وہ کون سی چیز تھی جو وہ اتنے دنوں سے میشا کے چہرے پہ مس کر رہا تھا۔

یہی مسکراہٹ.....

کارا نے اس کے بازو کو ایک اور جھٹکا دیا اور وہ بے جان وجود کی طرح اس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا..... گرینی کے گھر سے اور میشا کی زندگی سے..... اس کے خوابوں سے تو وہ پہلے ہی جا چکا تھا مگر مائر کے خواب میشا کے تصور سے کبھی خالی ہوں گے نہ ہی زینی ان میں اب کبھی اپنی جگہ بنا سکے گی۔ مفاد پرست اور خود غرض مہر اور زینی کے تمام حربے ناکام ہو چکے تھے۔ وہ خالی ہاتھ تھیں۔

میشا نے گردن موڑی۔

رومان کی آنکھوں میں آج پھر سے جگنو چمک رہے تھے..... وہ مسکرا اٹھی۔

یہ مسکراہٹ اپنے اندر بہت سے اقرار چھپائے ہوئے تھی۔

پرشکوہ خانم نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔

”اور آج خدا نے میری میشا کو بڑا کر ہی دیا..... اب وہ خوابوں کی دنیا سے نکل آئی ہے۔“

”جب حقیقت خواب سے زیادہ سہانی ہو تو کوئی خوابوں میں کیا ڈھونڈنے جائے گا گرینی!“ اس نے رومان کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”سنو!“

”سناؤ.....“ وہ مسکرایا۔

”ڈر کے بھاگ تو نہیں جاؤ گے یار!“

”اوں ہوں..... یار نہیں کہنا مجھے..... مجازی خدا ہوں تمہارا اور ہاں اب مجھ پہ ہاتھ بھی نہیں اٹھانا۔“

”اور اگر اٹھایا تو کیا کرو گے۔ ناراض ہو جاؤ گے؟“

”کیسے ہوں گا ناراض..... اتنی تو کیوٹ ہو تم۔“

اور دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑے۔

شہزادی عباس خلجی

چوکھٹ کے پار

آخری بار پلٹ کر مضطرب سی نظر نیم تاریک کمروں میں ڈال کر سب کے سو جانے کا یقین کیا اور بے حد آہستگی سے وہ سایہ سرکتا ہوا بیرونی دروازے پر جا پہنچا۔ رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ تاریکی میں کہیں کہیں سے ابھرتی جھینگروں کی آواز کے علاوہ وہ اپنے دل کی تیز دھڑکن بھی صاف طور پر سن سکتی تھی۔ دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھ کے اس نے پھر مڑ کے نیم تاریک گھر پہ نظر ڈالی اور ہونٹوں پہ زبان پھیر کر گہرا سانس لیا۔ گویا ہاتھوں سے پھسلتی ہمت کو پھر سے مجتمع کیا اور دھیرے سے کنڈی کھولنے لگی۔

اس دوران اس نے احتیاط کا دامن سختی سے تھام رکھا تھا کہ کہیں بھی ہلکی سی بھی کوئی آہٹ یا آواز پیدا نہ ہونے پائے۔ کنڈی کھل چکی تھی۔ اس نے اپنی سیاہ و میرون امتزاج والی بڑی سی چادر اور اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لی، جو پچھلے سال بڑے بھائی سعودی عرب سے اس کے لیے لائے تھے۔ اس کے جسم پر ہلکے نیلے رنگ کا لباس تھا۔ جس کے دامن پر اس کی بہن نے بڑے شوق سے کڑھائی کی تھی۔ وہ پوری کی پوری "اپنوں" کے احساس سے لپٹی تھی مگر جذبات کی شورش نے باقی ہر جذبے کو سلا کر اس خود سر اور منہ زور محبت کی پٹی خرد کی آنکھوں پر کس کے باندھ دی تھی۔

دہلیز سے قدم باہر رکھتے ہوئے بے ساختہ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ چوکھٹ پر دھرا اس کا ہاتھ لرز گیا۔ اندر اٹھتی وحشت کو دباتے ہوئے اس نے ایک بار پھر خود کو یہ باور کروانے کی سعی کی کہ وہ ٹھیک کر رہی ہے اور دروازہ پار کر گئی۔

ناولٹ
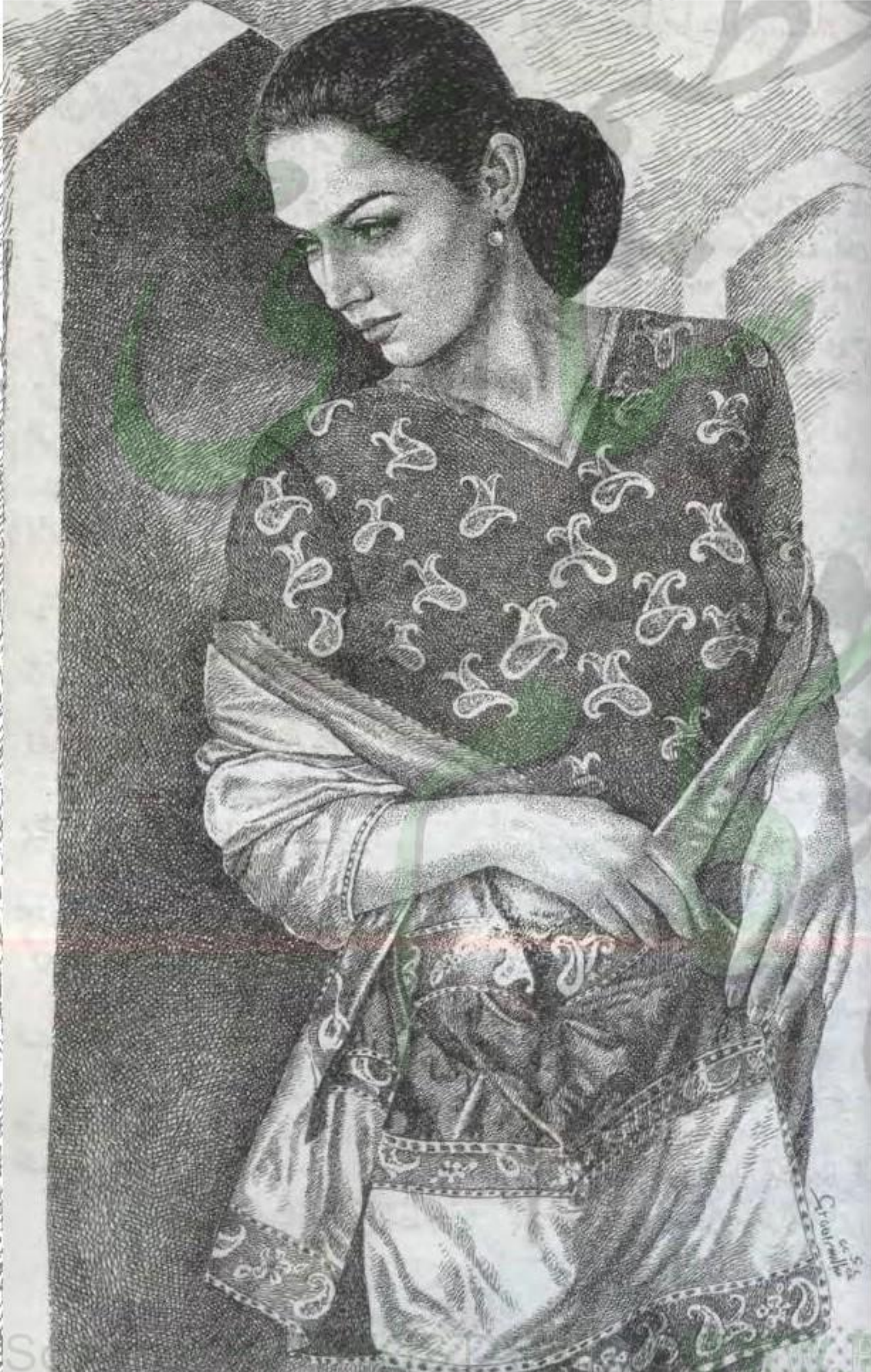
گلی زیادہ کشادہ نہ تھی۔ اندھیرے میں تیز تیز مگر دبے قدموں سے چلتی وہ دائیں جانب کو نکلتے رستے پر ہولی' جہاں طے شدہ وقت کے مطابق وہ نکڑ پر کھڑا تھا۔ اندھیرے میں اس کے ہیولے کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ پاس کھڑی موٹر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ ہیولے نے قریب پہنچ کر بنا ایک لفظ کا تبادلہ کیے موٹر سائیکل کی پچھلی نشست سنبھالی اور اگلے ہی لمحے بائیک فراٹے بھرتی پچھلی گلی سے نکل کر مین روڈ پر آگئی۔

سڑک پر لگی لائٹس روشن تھیں۔ زرد دھیمی روشنی میں بائیک پر بیٹھے بیٹھے اس نے مڑ مڑ کر ان راستوں کو دیکھا جہاں شاید اب کبھی وہ پلٹ کر نہ آسکے۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہو گئی۔ لب بھینچ کر وہ پیچھے کی طرف جاتے درختوں کو دیکھنے لگی۔ ہر چیز چھوٹ رہی تھی۔ ہر شے پیچھے چھوڑے وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی' کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی رکشا یا گاڑی ان کے پاس سے گزر جاتی۔ رات کے اس پہر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

سڑکوں کا جال چپ چاپ خود پر دوڑتے اس موٹر سائیکل اور اس کے سواروں کو حیرت سے تک رہا تھا۔ یہ سنسان و اجاڑ سا منظر پھر اس کا دل ہولانے لگا۔ وہ کیا کر آئی تھی' وہ کیا کرنے جا رہی تھی' کیا یہ ٹھیک تھا یا وہ زندگی کی سب سے فاش غلطی کر بیٹھی تھی؟

اب یہ سب سوچنے کا وقت تھا ہی نہیں مگر پھر بھی پریشانی کی خوف ناک ڈائن اسے دبوچنے لگی۔

"سب سے پہلے کون دیکھے گا کہ میں گھر میں نہیں ہوں؟ شاید امی یا آپا۔" وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی۔ ویسے ویسے اس کا دماغ گھر میں اٹکا جا رہا تھا۔

"ابو پہ کیا گزرے گی؟" پھن اٹھائے ناگ نے اسے ڈسا تھا۔

آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی چادر کے کنارے میں جذب ہونے لگے' جس کو اس نے منہ پر بھی ڈال لیا تھا۔

بھیگی آنکھوں سے اس نے اپنے ساتھی کی پشت کو دیکھا۔ اس وقت سے اب تک وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ مکمل خاموشی سے بائیک چلانے میں محو تھا۔ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانے کی دھن نے اس کا سارا دماغ اسی جانب لگا رکھا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ پیچھے بیٹھے وجود کو یکسر بھول بیٹھا تھا۔ لڑکی کی نظر اس کی پشت سے ہوتی ہوئی ہینڈل پر رکھے اس کے ہاتھوں پر جا ٹھہری۔

یہی تو وہ انسان ہے' جس کے سنگ زندگی کو خوب صورت بنانے کے خواب وہ جاگتی آنکھوں سے دیکھتی آئی تھی۔ جس کی ہمراہی میں اپنی پوری حیات بسر کرنے کی حسرت اسے راتوں کو تڑپاتی تھی۔ آج وہ شخص اس کے ساتھ ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

اس نے مڑ کر پیچھے بیٹھی چادر میں لپٹی لڑکی کو مسکرا کر دیکھا اور بولا۔

"ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

"گھبرا رہا ہے دل۔"

"تمہیں مجھ پر اعتماد ہے نا' پھر کیوں پریشان ہوتی ہو؟"

"کیا ہم صحیح کر رہے ہیں عمر!" تفکر نے اس کے چمکتے چہرے پر جیسے ریت ڈال دی تھی۔

"اگر ہم ایسا نہ کرتے تو کیا وہ ہونے دیتے جو ہو رہا تھا؟ میں یوں ہی کیسے تمہیں خود سے الگ کر دیتا۔"

لڑکے نے بائیک کی رفتار کم کر دی تاکہ وہ اس کی بات آرام سے سن سکے۔ لڑکی خاموش رہی۔

"اب سوچنا چھوڑ دو کہ کیا صحیح ہے کیا غلط.... جو ٹھیک لگا وہ ہم نے کیا اور تم ہی دیکھو کہ ہم اب ساتھ ہیں۔ اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنے والے ہیں۔ جو خواب ہم دونوں نے دیکھا تھا وہ پورا ہونے والا ہے۔"

اب وہ کسی چورنگی کے گرد سے گزر رہے تھے۔ لڑکے نے رفتار بڑھا دی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں مہر اور ہمیشہ رہوں گا۔"

بائیک کے ہینڈل سے دایاں ہاتھ اٹھا کر اس نے کندھے پر دھرے لڑکی کے ہاتھ کو تھپتھپایا جو بائیک

کے شور میں اس کی آواز اب بمشکل سن پا رہی تھی مگر ستور خاموش تھی۔ یک دم اس کا ڈر غائب ہو گیا تھا۔ یشوں' وسوسوں' واہموں کے ناگ بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ آئندہ زندگی کی خوش گمانی اسے ہوا میں اپنے ساتھ اڑائے لیے جا رہی تھی۔

❋ ❋ ❋

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے پر محیط ان کا سفر قدرے مضافاتی علاقے کے ایک چھوٹے مگر تازہ تازہ روغن کیے گئے دروازے پر ختم ہوا تھا۔ درمیانے قد کی قدرے فربہی مائل خاتون نے تیسری دستک پر دروازہ کھولا۔ اتنی رات کو بھی وہ جاگ رہی تھیں۔ شاید انہیں ان کی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے دی گئی تھی۔ خاتون نے ڈری سہمی لڑکی کو اپنے ساتھ لپٹایا۔ ماتھے پر بوسہ دے کر وہ انہیں اندر لے آئیں۔

"یہ نعمان کی پھپھو ہیں۔" اس کی الجھن دیکھ کر لڑکے نے آہستہ سے بتایا۔ خاتون کا رویہ ان کے ساتھ بہت مشفقانہ سا تھا۔

"بات تو یہ غلط ہے بیٹا! مگر میں اب تم لوگوں کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مجھے گھنٹہ پہلے نعمان کا فون آیا تھا۔ تب سے ایک بار بھی آنکھ نہیں جھپکی۔ اللہ بس تم دونوں کے ساتھ کو ہمیشگی کرے' جس کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔" وہ متاسف سی تھیں۔ مگر جو ہونا تھا وہ تو اب ہو چکا تھا۔

پھپھو کی ہمراہی میں وہ راہ داری عبور کر کے صحن سے گزرتے ہوئے سامنے بنے دو کمروں میں سے ایک میں داخل ہو گئے۔ کمرا کافی کشادہ تھا۔ دیواروں پر پلستر نیا نیا سا تھا۔ اطراف کی دونوں دیواروں کے ساتھ رنگین پایوں والے دو پلنگ پڑے تھے جس پر بچھی سفید چادر پر ہلکے سبز رنگ کے پھول تھے۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک پرانا سنگھار میز رکھا تھا۔ اس کے ساتھ تپائی پر پانی کا جگ اور گلاس دھرا تھا۔ درمیان کی بچی جگہ پر ایک چٹائی بچھی تھی جس پر چادر سر سے پاؤں تک تانے کوئی وجود محو خواب تھا۔ وہ دونوں دائیں دیوار کے ساتھ والے پلنگ پر بیٹھ گئے۔

پھپھو نے تپائی سے جگ اور گلاس اٹھا کر پانی سے بھرا اور انہیں دیا۔

"کھانا کھاؤ گے پتر؟" سوال لڑکی سے ہی تھا۔ مگر وہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔

"ہاں پھپھو! بہت بھوک لگی ہے۔ پریشانی میں رات کو کھانا نہ میں نے کھایا' نہ اس نے کھایا ہو گا۔"

اس نے ایک پریشان سی نظر اس پر ڈالی۔

خاتون باہر نکل گئیں۔ ان کا شوہر گزشتہ کئی سالوں سے ابوظہبی میں تھا۔ فوری طور پر وہ اسے اپنے گھر نہ لے جا سکتا تھا۔ اس لیے دوست کی پھپھو کے ہاں لے آیا کیونکہ وہ ایک مہربان خاتون تھیں اور عمر سے ہمیشہ بہت محبت سے ملتی تھیں۔ ان کی اس حرکت پر جو لعن طعن کرنی تھی' وہ نعمان سے فون پر کر چکی تھیں۔ اب کچھ بھی کہنے کی ہمت وہ خود میں نہ پاتی تھیں کیونکہ ان کے چہرے سے ہویدا گھبراہٹ اور بے چینی یہ عیاں کرنے کو کافی تھی کہ اپنے اس اقدام کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ وہ خود بھی نہیں کر پا رہے۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا' کیوں خوف زدہ ہو رہی ہو۔" لڑکے نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر پھر تسلی دی۔

وہ دھیرے سے مسکرا کر پر خیال نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمائے اثبات میں سر ہلائے گئی۔ نئی زندگی کے لیے وہ اس حد تک قدم اٹھائے گی' اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔

کھانا کھا کر وہ باہر چلا گیا۔ شاید اس کا بستر دوسرے کمرے میں لگایا گیا تھا۔ خود وہ اسی پلنگ پر لیٹ گئی۔ دوسرے پلنگ پر پھپھو لیٹی تھیں۔

"ساری رات کی جاگی ہو' اب سو جاؤ بیٹی!" پھپھو کی آواز اس کے کانوں میں پڑی' مگر سوچوں کے بے لگام سرپٹ دوڑتے گھوڑے کو روکنا بہت مشکل تھا۔ اس کا بچپن' لڑکپن اور جوانی کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں جامد ہو گیا۔ آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔ ایک شخص کے لیے اس نے اپنا سب کچھ تیاگ دیا

تھا۔
اجنبی ماحول' اجنبی بستر' اجنبی فضا' اسے بے چینی ہونے لگی۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ اور بھیگی آنکھیں جانے کب نیند میں ڈوب گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

بے ہنگم سے شور سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ منہ پر سے چادر اٹھائے وہ نامانوس سے ماحول کو دیکھ کر سوچے گئی کہ وہ کہاں ہے۔ پھر ایک جھماکے سے رات کے تمام واقعات اس کے دماغ کی اسکرین پر روشن ہوگئے۔
"اب تک تو سب کو پتا چل گیا ہوگا۔۔۔ جانے کیا حال ہوگا' شاید مجھے ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے ہوں۔"
"اٹھ گئی بیٹی! آجا' ہاتھ' منہ دھولے' میں تیرے لیے کھانا نکال دوں۔" پھپھو کی آواز نے اس کی سوچ کو جھٹکا۔ وہ شاید صفائی کرکے فارغ ہوئی تھیں۔ بھیگے پائنچوں والی شلوار ٹخنوں سے اوپر اڑسے وہ ملامت سے اسے تک رہی تھیں' جیسے اس کے دماغ میں اٹھتی سوچ کو پڑھ سکتی ہوں۔ اس نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔
"پریشان ہو؟" اس کی صورت بھانپ کر وہ بولیں۔
"سب ٹھیک ہوجائے گا۔ عمر بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے۔ تمہارا بہت خیال رکھے گا اور ایک بار شادی ہوجائے تو تم گھر والوں سے معافی مانگ لینا جاکر۔ کوئی اپنے خون سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا۔" اس کے پاس بیٹھ کر وہ دھیرے دھیرے سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ بے اختیار ہی اس کا دل بھر آیا۔ وہ تو اس اندھے کی طرح تھی جو بنا لاٹھی کے اس بھیڑ میں نکل آیا ہو جہاں افراتفری' نفسانفسی کا عالم ہو۔ پھر ٹھوکریں اس کا مقدر بنیں یا کوئی راہ گیر اس کا ہاتھ تھام کر اسے منزل تک پہنچادے۔۔۔ یہ اس کا مقدر۔
مگر نہیں۔۔۔ وہ اتنی بے آسرا نہیں تھی۔ محبت کی طاقت اس کے ساتھ تھی اور محبوب کی رفاقت کچھ ہی گھنٹوں میں ہمیشگی اختیار کرنے والی تھی۔

"اٹھ گئی ہو۔ اچھا منہ ہاتھ دھولو' ہم گھر جارہے ہیں۔" عمر نے اندر داخل ہوکر اس سے کہا۔ شاید وہ اپنی ماں کو فون کرچکا تھا مگر فون پر اطلاع دیتے ہی اماں کی طرف سے ڈانٹ پھٹکار اور لعنت ملامت پر اس نے چپ سادھ لی تھی۔ وہ مہر کو بتا کر اور پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"ارے بیٹا! اب کچھ کھا تو لینے دو۔"
"نہیں پھپھو! آپ کا بہت شکریہ! بس اب گھر جاکر ہی کھائیں گے کھانا۔ وہاں دوست نے نکاح خواں کا بندوبست کر رکھا ہے' اسی لیے جلدی نکلنا ہے۔"
اس نے اٹھ کر منہ دھویا اور چادر سے منہ ڈھانپ کر ساتھ چل پڑی۔ قدم تو وہ اٹھا چکی تھی۔ اب اسے سوچ سوچ کر اذیت میں مبتلا ہونے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔
سفر ایک بار پھر شروع ہوچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

عمر اکرام سے اس کی ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ جو اپنے ایک دوست کی بہن کے لیے داخلہ فارم اور دیگر ضروری معلومات لینے آیا تھا۔ لائن کافی طویل تھی۔ چنانچہ اس نے ساتھ ہی لڑکیوں کی مختصر سی لائن میں موجود سب سے پچھلی لڑکی کو دیکھا۔ وہاں سے مدد کی درخواست کرنے پر باقیوں کی طرح صاف انکار نہیں آیا تھا۔ لڑکی نے سادگی سے اسے فارم اور باقی معلومات فراہم کرنے میں اس کی معاونت کی تھی۔ ان کی اگلی ملاقات کالج کے ہی گیٹ پر ہوئی تھی۔ پھر یہ معمول بننے لگا۔ اب انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے یا بات کرنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں پسندیدگی صاف محسوس کرسکتے تھے۔ پھر کب یہ پسندیدگی محبت میں بدل گئی' انہیں خبر نہ ہوئی۔ جوانی کے منہ زور امڈ امڈ کر آئے جذبات دونوں کے چھپ چھپ کر ملنے کا محرک بننے لگے۔
مہر اقبال کی زندگی میں آنے والا پہلا لڑکا عمر ہی تھا۔ مخالف جنس کی کشش نے اسے بھی بے بس کردیا تھا۔

اتنی محبت' اتنی چاہت اسے کبھی کسی کی طرف سے نہ ملی تھی۔ وہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔
عمر گریجویٹ مگر بے روزگار تھا۔ نوکری کے لیے جوتے چٹخاتے اسے کئی برس بیت گئے تھے۔ ایسی صورت حال میں وہ اس قابل نہ تھا کہ آگے بڑھ کر مہر کے گھر والوں سے رشتہ مانگ لیتا۔
یہ میل ملاقات کا سلسلہ چلتا رہتا' اگر یکایک مہر کی بہن کے سسرالی رشتے داروں کی آمد پر ان کی پھپھو اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے مہر کو پسند نہ کرلیتیں۔ رشتہ بے حد معقول تھا۔ قبول کرنا ناگزیر تھا۔ یوں ایک ہی بار میں دونوں بیٹیوں کے فرض سے خوش اسلوبی سے سبکدوش ہوتے باپ کے چہرے پر جہاں اطمینان کی سرخی میں اضافہ ہوا تھا' وہیں پیسوں کا انتظام کرنے کے لیے بھاگ دوڑ بھی بڑھ گئی تھی۔
پندرہ روز بعد کی شادی کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ سب جھٹ پٹ ہوا تھا۔ صورت حال گمبھیر تھی۔ مہر کا کالج جانا بند ہوچکا تھا۔ یک دم پڑنے والی اس افتاد پر حواس باختہ سی مہر کے لیے یہ صورت حال قبول کرنا ناممکن تھا۔ تاریخ طے ہونے کی گہما گہمی میں چپکے سے کھسک کے گھر کے اندھیرے اور خاموش گوشے میں کھڑے ہوکر اس نے محض تین' چار منٹ کی کال میں عمر پر تمام صورت حال عیاں کردی۔
اچانک یہ فیصلہ اس کے بھی اوسان خطا کردینے کو کافی تھا۔ وہ بھی اسی طرح تڑپ گیا تھا' جس طرح کچھ گھنٹوں سے وہ بن جل مچھلی بنی سر پٹخ رہی تھی۔ انکار کی اس میں ہمت نہ تھی اور اقرار کے لیے اس سے پوچھا نہ گیا تھا۔ یہ اس کے گھر کا دستور نہ تھا۔
اقبال محمد بہت مشفق باپ تھے مگر ان کا ماننا تھا کہ کم عقل بچے اپنی بہتری کا فیصلہ خود نہیں کرسکتے۔ اس لیے یہ ذمہ داری بھی والدین کی ہوتی ہے۔ جو ہاتھوں میں سما جانے والے ننھے سے کومل وجود کو اپنے لہو سے سینچ کر پالتے پوستے ہیں۔ پروان چڑھتے یہ پھول ہی تو ان کی امید و خوشی کا محور ہوتے ہیں۔ پھر بھلا ماں' باپ بھی اولاد کے لیے کوئی غلط فیصلہ کرسکتے ہیں۔ مگر جوانی کے تالاب میں اترے قدم عقل بہالے جاتے ہیں۔ اولاد کو وہ تمام تکالیف فراموش کروادیتے ہیں جو والدین نے ان کی بہتر پرورش کے لیے اٹھائی ہوتی ہیں۔ چند روزہ محبت کے پجاری سالوں تک اپنے ساتھ جڑے رہنے والے رشتوں کی حرمت کو پامال کرکے خود غرضی کے اس بت کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں جو بے حسی سے تراشے ہوئے پتھر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔
کم سنی میں عروج پر پہنچے جذبات انسان سے وہ خطائیں بھی کروادیتے ہیں جن کی بھرپائی تمام عمر بھی کی جائے تو مداوا ممکن نہیں ہوتا۔
پھر فیصلہ ہوگیا۔
نادانی کے چند پلوں نے خوش کن محبت کی مہکتی رنگین ردا رسوائی و خوف کے برہنہ بدن پر ڈال کر فیصلہ کروالیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دربار کے سفید مرمریں چکنے فرش پر شان سے ایستادہ قطار اندر قطار کھڑے ستونوں کے درمیان بنے محرابوں میں سے ایک کے پاس گھٹنوں میں سر نہواڑے بیٹھے وہ فرش کی سفیدی کو غائب دماغی سے گھور رہی تھی۔ سرخ آنکھوں کے کٹوروں سے لہو رس رس کر دربار کے فرش پر بدنما دھبے ڈال رہا تھا۔ خشک سفید پڑتے لب سختی سے باہم پیوست تھے۔ جیسے کسی نے بے دردی سے سوئی گزار کر انہیں سی دیا ہو اور اب وہ انہیں کبھی نہ کھول پائے گی۔
خوب صورت چہرے کے نقوش تلخ حالات سے بگڑ کر یوں ہوگئے تھے جیسے کچی مٹی سے بنی مورت کو سوکھنے سے پہلے ہی بگاڑ کر مسخ کردیا گیا ہو۔۔۔ اس کی بدقسمتی کا سولہواں گھنٹہ شروع ہوچکا تھا۔
اذان مغرب سے اکٹھے ہونے والے نمازیوں کی بڑی تعداد اب واپس پلٹ رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر موجود برآمدے میں زائرین سپارے ہاتھوں میں لیے تلاوت میں محو ہوچکے تھے۔ کچھ حالات کی ستم ظریفی کے ستائے ہوئے برآمدے کی دیواروں کے

ساتھ بڑے وقت گزار رہے تھے۔ کچھ من کی مرادیں پانے کے لیے جھولی پھیلائے کھڑے تھے۔ کچھ اپنے گناہوں کے بوجھ سے لدے گریہ وزاری میں ڈوبے تھے۔ ہر کوئی یہاں لینے آیا تھا۔ ہر کوئی حاصل کر لینے کا ذائقہ چکھنا چاہتا تھا۔ کوئی سکون کا طلب گار تھا' تو کوئی مال کا۔ کسی کو عزت کی تمنا تھی' تو کوئی اولاد کے حصول کے لیے بلک رہا تھا۔ کسی کو محبوب کی چاہت تھی' تو کوئی گناہ بخشوانے کے لیے دامن بھگو رہا تھا۔

ہر کوئی غرض سے یہاں آیا تھا... ہر کسی کو پانے کی چاہ یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ ایک وہی تھی جو خالی دامن' خالی دل اور خالی آنکھیں لیے سر جھکائے وہاں بیٹھی تھی۔ ایک وہی تھی جو سب کچھ کھو کر وہاں پہنچی تھی اور اب کچھ بھی پالینے کی حسرت سے مستثنیٰ تھی۔

کچھ دور دیار کے علاقوں سے آنے والے سادہ لوح زائر بوسیدہ رنگ کے کپڑوں کی گٹھڑیاں باندھے اپنی اپنی عورتوں کے پاس بیٹھے تھے جو پلوؤں میں چہرے چھپائے روتے ہوئے بچوں کو چمکارتی پچکارتی گٹھڑیوں پر سر رکھوائے سلانے میں مصروف تھیں تاکہ وہ بھی اٹھ کر داتا صاحب کے مزار کو بوسے دے کر اپنی عقیدت کا اظہار کر سکیں۔ ٹوٹ کر دعا مانگ سکیں کہ اتنی بڑی ہستی کے طفیل ان پر بھی رحمت کر دی جائے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ بیٹھے لوگ گیٹ نمبر ایک کے ساتھ بنے لنگر خانہ سے ملنے والی نیاز پلاسٹک کی تھیلیوں اور ہاتھوں میں لیے پیٹ بھرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔ یہاں سب ہی کچھ ملتا تھا... سکون' چاہت' مرادیں' پناہ اور پیٹ بھرنے کا سامان زندگی بھی...

"داتا کی نگری" میں آنے والا کوئی شخص خالی دست نہ لوٹتا تھا مگر وہ لٹ جانے کا درد لیے تار تار روح سمیت بکھری پڑی تھی۔ بوسیدہ و خستہ حالت' تنہا لڑکی بہت سوں کو بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔ کچھ ہولناک نگاہیں بڑی دیر سے چادر میں ملفوف اس وجود پر جمی تھیں۔ تب ہی ایک ادھیڑ عمر عورت چادر میں لرزتی' روتی' بلکتی لڑکی کے پاس آبیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں نمکین چاولوں والی ایک تھیلی تھی۔

☼ ☼ ☼

اب کی بار موٹر سائیکل ڈھائی مرلے کے قدرے خستہ حال ٹوٹے پھوٹے کناروں کی چھت والے ایک گھر کے آگے رکی تھی۔ مسلسل سفر سے اس کی کمر اینٹھ گئی تھی مگر اس نے پروا نہ کی۔ ایک ہاتھ سے چادر کا پلو سنبھالتے وہ جھجکتے ہوئے عمر کے پیچھے سبز اڑے روغن والے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ عمر کی ہی معیت میں اس نے چھوٹی سی تنگ راہداری ختم ہونے کے بعد دائیں جانب موجود کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر جوتی اتار دی تھی۔ مختصر سے کمرے میں زمین پر رنگین دری بچھی تھی اور فرنیچر کے نام پر وہاں موجود لکڑی کے واحد صوفے پر لیٹا بھاری بھرکم وجود سر پر کس کے دوپٹا باندھے آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ جو آہٹ پر چونک کر اٹھ بیٹھا۔

وہ بے حد نروس ہو رہی تھی۔ عمر کی ماں کے چہرے پر کوئی خیر مقدمی مسکراہٹ نہ تھی۔ ان کے چہرے کے کرخت نقوش انہیں دیکھتے ہی غصے سے سرخ ہونے لگے۔ ایک سرسری سی نظر چادر والی لڑکی پر ڈال کر بنا سلام کا جواب دیے وہ تابڑ توڑ شروع ہو گئی۔

"آگیا تو...؟ میرے چٹے جھاٹے میں سوا (راکھ) ڈال کے سکون مل گیا تجھے؟"

اس کی ماں صبح فون سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئی تھی مگر عمر کو ان کا سامنا تو کرنا ہی تھا' چنانچہ فون پر سننے کی بجائے وہ مہر کو گھر لے آیا' تاکہ آرام سے انہیں منا سکے۔

"اماں! تم اس طرح مت شور کرو۔ میں رات سے خوار ہو رہا ہوں' اب تم مت شروع ہو جانا۔"

"میں بولنا بند کردوں اور تو...؟ تو جو مرضی کرتا پھرے؟ نا... مجھے یہ بتا عمر! تجھے ذرا حیا نہ آئی' بیوہ ماں کے بڑھاپے کا ذرا پاس لحاظ نہ کیا تو نے؟"

عورت کی کرخت اور پاٹ دار آواز سے وہ لرزنے لگی۔ مہر کو اپنے ماتھے پر پسینہ آتا محسوس ہوا۔ ایسا ردعمل متوقع تھا۔ تمام رستے عمر اس کا ذہن بناتا آیا تھا۔ اب بھی وہ چپ چاپ سر جھکائے عمر کے پیچھے کھڑی رہی۔ وہ اس کی ڈھال بنا کھڑا تھا۔ وہ اس کا وکیل تھا' اس کا محافظ۔ وہ جانتی تھی فیصلہ اسی کے حق میں ہونا تھا۔ کیونکہ عمر اس کے ساتھ تھا۔

"وے عمر! میں نے تجھے اس دن کے لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ ہمارے منہ پر کالک مل کریوں کسی کی دھی بھگا لائے؟ اور یہ بے غیرت لڑکی... اسے ذرا بھی نہ خیال آیا اپنے ماں' باپ کا... ان کا جنھوں نے اسے جنا' کھلایا پلایا' پڑھایا لکھایا' یہ لڑکی ان کی نہ بن سکی تو تیری کیا خاک بنے گی؟" گولے برساتا رخ اب مہر کی جانب ہو گیا۔

"اماں! خدا کے واسطے چپ کر جاؤ۔" عمر جھنجلا کر بولا مگر ان کا بولنا جاری رہا۔

"کیسی تربیت کی تھی تیرے ماں' باپ نے؟ بول... آخر کون سا حرام کھلایا تھا جو تو نے انہیں یوں ذلیل کر چھوڑا ہے؟"

پھنکارتی ہوئی وہ براہ راست اب اس پر چڑھ دوڑیں۔ مہر کے دل میں پیوست ہوتی ذلت کی برچھیاں اس کے ماں' باپ کی عزت کو دو کوڑی کا کر رہی تھیں۔ یہ مول تو اس نے خود لگایا تھا اپنا اور اپنی عزت کا۔

"اماں بس کرو۔ اس بے چاری کو کچھ مت کہو۔ یہ شریف گھر کی ہے۔ وہ تو اس کے گھر والے..." اس کے حق میں بولتے عمر کی بات لبوں میں ہی رہ گئی کیونکہ اس کی ماں خونخوار نظروں سے مہر کو تکتی ہوئی آگے بڑھی تھیں۔

"شریف لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ کسی کے بھی ساتھ منہ اٹھا کر فرار ہو جائیں؟ لعنت ہے ایسی بیٹیوں پہ کیہ ان کی وجہ سے زمانہ ان کے ماں' باپ کے منہ پر تھو تھو کرتا پھرے۔"

روتی ہوئی مہر ڈر کے مارے اور عمر کے پیچھے چھپ گئی۔

"میں اس سے نکاح کرنے لگا ہوں اماں! پھر یہ میری عزت ہو گی اور میں اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتا ہوں' پھر کسی کی مجال نہیں ہو گی کہ اس پر انگلی اٹھا سکے۔"

عمر کے یہ کہنے پر اس کی ماں بری طرح سے غصہ سے کانپنے لگی۔ عمر کو احساس ہو گیا کہ اس نے گھر آکر غلطی کی تھی۔ اسے سیدھا مسجد جانا چاہیے تھا۔

"نکاح کرے گا اس سے؟ او بے غیرتا! تجھے یاد بھی ہے کہ تیرے وٹے میں تیری بہن بھی گھر بسائے بیٹھی ہے؟ تین بچے جان کے ساتھ چپکائے' چوتھا پیٹ میں لیے تڑپ رہی ہے۔ اس عمر میں طلاق کا دھبہ لگوانا چاہتا ہے تو اس پہ؟"

اگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کی آواز چنگھاڑ میں بدلتی جا رہی تھی تو مہر کی لرزتی ٹانگوں کی کپکپاہٹ میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اتنے میں داخلی دروازہ دھڑ سے کھلا اور چند لمحوں بعد دو بچے گھسیٹتی ایک کو گود میں اٹھائے تیس بتیس سال کی عورت روتے ہوئے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ شاید اس کی ماں اسے بھی اطلاع کر چکی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے گود والا بچہ زمین پر پٹخا' جو یوں بے دردی سے پھینکے جانے پر اور زور سے رونے لگا اس نے آگے بڑھ کر اپنا دوپٹا عمر کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔

"یہ... یہ کیا کر رہی ہو باجی؟"

"عمر! تجھے رب دا واسطہ! یہ ظلم نہ کر' میرے بچے رل جائیں گے۔ یتیموں جیسی زندگی بسر کریں گے۔ یہ زیادتی نہ کر۔"

اس کے پیروں میں گری وہ عورت زور' زور سے رونے لگی۔

"باجی! تمہارے بچے کیوں رلنے لگے... خدا کے لیے ایسا مت کرو تم سب۔ یہ لڑکی میری خاطر اپنا گھر' بہن' بھائی سب کچھ چھوڑ آئی ہے۔ میں اسے اپنانے کے لیے ساتھ لایا ہوں۔ تم سب مجھے اس طرح مجبور مت کرو۔ میں نہیں ہٹوں گا اس بات سے۔ بہتر ہے تم لوگ اسے تسلیم کر لو۔"

کافی دیر سے بے بس کھڑے عمر نے جی کڑا کرکے کہہ ہی دیا۔ مخالفت کی اسے بھی توقع تھی مگر اس پہلو پر تو اس نے غور ہی نہ کیا تھا کہ اس کی بہن کا گھر بھی اجڑ سکتا ہے۔ بچپن میں ہوئے اس وٹے سٹے کے رشتے کو وہ کب کا فراموش کرچکا تھا۔ جذباتیت میں وہ قدم تو اٹھا بیٹھا تھا مگر اب اسے نبھانے کے لیے ثابت قدم رہنا بے حد دشوار لگنے لگا تھا۔ وہ ایک چوراہے پہ آکھڑا ہوا تھا۔ بہن کا گھر بساتا یا اپنا... یہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اپنی اس دنیا کے لیے جو ابھی بسی ہی نہ تھی وہ بہن کی سالوں سے بسی گرہستی کس ہمت سے اجاڑ سکتا تھا۔

"تو ایک لڑکی کے لیے مجھے طلاقن بنانا چاہتا ہے... میرے بچوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑنا چاہتا ہے؟ تو جانتا ہے رشید اپنی بہن کو تیرے ساتھ بیاہنے کے لیے درجنوں دفعہ پوچھ چکا ہے اور اماں اس سال کا وعدہ کرکے بیٹھی ہے اس سے... اب یہ خبر اسے ملے گی تو وہ کھڑے کھڑے مجھے گھر سے نکال باہر کرے گا یا مجھے قتل کردے گا۔ اس سے تو بہتر ہے تو خود ہی میرا گلا کاٹ دے تاکہ میں تو مروں ہی ساتھ ہی میرے اندر پلنے والا یہ نیا سیاپا بھی ختم ہوجائے۔"

اس لڑکی کے لیے ڈٹ کر کھڑے بھائی کی آنکھوں میں اتنی عزیمت دیکھ کے بھپر کے وہ اٹھی اور کمرے سے ملحقہ ڈبا نما باورچی خانے سے چھری نکال لائی اور جارحانہ انداز میں چیختے ہوئے اپنی نبض پر رکھ لی۔ عمر سمیت اس کی ماں چیختے ہوئے اس کی طرف دوڑے جو ہذیانی انداز میں اب مہر کو گالیاں بک رہی تھی۔ جب تک وہ اس تک پہنچے چھری پھر چکی تھی۔ کند ہونے کے باعث نبض نہ کٹ سکی تھی مگر کھال کے کٹنے سے خون کے گرم گرم چھینٹے فرش پر گرنے لگے۔ اس کی ماں نے لپک کر اپنا دوپٹا اس کی کلائی پر باندھا اور روتے ہوئے نیم جان حاملہ وجود کو لے کر صوفے پر بیٹھ گئی جو اب بھی نڈھال سی گھر بچانے کی دہائی دیے جارہی تھی۔

صورت حال ایک دم ہی انتہائی صورت اختیار کرگئی تھی۔ فق رنگ لیے مہر ساکت سی دیوار کے ساتھ جا لگی۔

اس عورت نے اپنے کانپتے ہاتھ ایک بار پھر اپنے بھائی کے سامنے جوڑے۔ وہ ایک بار پھر رونا شروع کرچکی تھی۔ مہر نے عمر کو آگے بڑھ کر اپنی بہن کا دوپٹا اٹھا کر اسے اوڑھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی صورت سے ہار ٹپک رہی تھی۔ اپنی بہن اور اس کے ساتھ جڑی زندگیوں کو خطرے میں دیکھ کر اس پر منوں برف پڑ گئی تھی۔ کیا وہ اپنی بہن کو بسانے کے لیے شکست تسلیم کرچکا ہے؟ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمر کو دیکھے گئی۔

پچھلے آدھے گھنٹے میں اس کی ماں نے اپنی زبان کے پتھروں سے اس پر سنگ باری کی تھی مگر وہ بے یقینی سے تکتی صرف اس مرد کے چہرے کے تاثرات سے لہولہان ہوتی جارہی تھی جو یکدم ہی تھکا ہارا، سرد سا دکھائی دینے لگا تھا جیسے بازی ہار جانے کے بعد جواری ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑے بیٹھا رہ جاتا ہے۔

تو کیا وہ "ہار" گیا تھا؟

کیا اس نے نادانستگی میں کی گئی غلطی کے اعتراف پر سر خم کردیا تھا؟

کیا وہ اپنی جلد بازی اور نادانی پر پچھتا رہا تھا؟

وہ یک ٹک اس کی صورت دیکھے گئی جو اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے بچے کو زمین پہ سے اٹھایا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ تھکا تھکا سا... نڈھال نڈھال سا... مہر نے سر جھکا کر اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔

باپ کی عزت کو بھلا کر ماں کی رسوائی کے ڈر کو بھلا کر وہ خالی ہاتھ گھر سے نکل آئی تھی۔ خالی ہاتھ...!

اسے لگا یہی شخص تو اس کی دولت ہے، وہ اس کی عزت کا امین، اس کی چاہت کا طلب گار، اس سے وصل کا تمنائی... مگر وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں... وہ تو اس کے لیے کسی "کھوٹے سکے" جتنا بھی کام نہ آسکا تھا۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ اب لب بھینچے رخ

موڑے بیٹھا تھا اور اس کی ماں، بہن کے کوسنے جاری تھے جن کی حصے دار اب صرف وہ تھی۔ تذلیل توہین، رسوائی، بدنامی... سب کچھ اس نے ایک شخص کے لیے اپنے گلے میں ڈال لیا تھا۔ اس طوق کے بوجھ سے وہ اس حد تک جھکی جارہی تھی کہ اس سے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

"عمر...!" اس تمام عرصے میں پہلی بار اس نے لب کھول کر اس شخص کو پکارا تھا، جو اس کی پہلی اور آخری امید ہوچکا تھا۔ جسے چھوڑنے کے تصور سے ہی اس کی جان نکلتی تھی۔ جسے پانے کے لیے اس نے اپنی بائیس سالہ زندگی کی ساری آسائشات، ساری خوشیاں، راحتیں اور محبتیں تج دی تھیں۔ جس کے لیے اس نے اپنی عزت داؤ پر لگادی تھی۔ اس کی بھیگی آواز بھی اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ لاسکی۔

"عمر... میری بات سنو۔" اس کا گلا پھر رندھنے لگا۔

"اے لڑکی! یہ چالاکی اب نہیں چلنے کی تیری۔ عمر کو جتنا بے وقوف تو نے بنانا تھا، بنا لیا۔ اب نکل یہاں سے۔" اس کی ماں چیخی تھی۔

"میں تمہارے لیے اپنا گھر، اپنے والدین، اپنا سب کچھ چھوڑ کر آئی ہوں عمر! تم ایسا کیسے کرسکتے ہو میرے ساتھ؟ تم... تم کیوں خاموش ہو کر بیٹھ گئے ہو؟"

دماغ نے اس کے بند ہوتے دل کو کچھ سہارا دیا تھا۔ خاموش تماشائی بنے رہنے کا ارادہ معطل کرکے وہ چیخ پڑی تھی۔ اب بھی اگر نہ بولتی تو اسے گمان تھا کوئی انہونی ہوجائے گی۔ ایسی انہونی جو اس کی زندگی پر "فل اسٹاپ" لگا سکتی تھی۔ اسے لگا وہ عمر کو کھودے گی۔ جبکہ اس کا جھکا سر اور ڈھلکے شانے یہ سمجھانے کو کافی تھے کہ وہ اسے کھو چکی تھی۔ مگر دماغ کی بات کو بری طرح جھٹلاتے وہ آگے بڑھ کر اس کا کندھا جھنجھوڑنے لگی۔

اس سے اس کی گود میں بیٹھا بچہ سہم کر ایک بار پھر زور زور سے رونے لگا۔ مٹی کے بت میں تب بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ سر مزید جھک گیا اور نہایت پست آواز میں اسے یہ بازگشت بہت دور سے آتی سنائی دی۔

"تم واپس چلی جاؤ مہر!" کسی نے پگھلا ہوا سیسہ صرف اس کے کانوں میں نہیں انڈیلا تھا بلکہ اس کے پورے جسم پر ڈال دیا تھا۔ وہ دھڑ دھڑ جلنے لگی۔

"واپس... واپس کیسے جاسکتی ہوں میں؟" شاک کے کچھ لمحوں کے بعد وہ دوہری اذیت سے چیخی تھی۔

"اپنے پیچھے تو میں سارے دروازے بند کر آئی ہوں۔ کس کے پاس واپس جاؤں میں اور کیسے جاؤں؟" اس کا سر پھٹنے لگا۔ شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ جھوٹ ہوجائے جو ابھی ابھی عمر نے کہا۔

"تم لائے ہو نا مجھے گھر سے بھگا کر... پھر قصوروار صرف میں کیسے ہوں؟ صرف میں ہی کیوں بھگتوں یہ سزا؟ مجھ پر ہی کیوں اٹھیں یہ انگلیاں؟" وہ نیم پاگل سی اب اس کا گریبان جھنجھوڑ رہی تھی اور وہ کسی پتلے کی طرح بے بس نگاہیں جھکائے مٹی ہوا بیٹھا تھا۔

جب آدم کی اولاد میں سے حیا، مروت و خلوص اور پاکی اٹھ جائے تو وہ انسان کے بجائے صرف مٹی ہی رہ جاتے ہیں... اور بھلا مٹی کب جواب دیتی ہے۔ وہ بھی لب بستہ رہا۔ اس کی ماں تیزی سے آگے بڑھی اور کھینچ کر اس کے ہاتھ عمر کے گریبان سے ہٹائے۔

"ہٹ ادھر سے بے غیرت! بے شرمی تو تم آج کل کی چھوکریوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کیسی دیدہ دلیری سے ایک مرد کا گریبان پکڑے کھڑی ہے مردود!"

اس کی ماں کو ایک طرف ہٹا کر وہ پھر سے عمر کی آستین پکڑنے لگی۔ وہ بہت سارا چیخنا چاہتی تھی۔ بہت سارا رونا چاہتی تھی۔ کھڑے کھڑے چند منٹوں نے اس پر زیاں کا حساب کھول کر رکھ دیا تھا۔

اب کی بار ماں سمیت اس کی بہن نے بپھری ہوئی مہر کو پکڑ کر گھسیٹا اور زور کا دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ وہ بری طرح لڑکھڑاتی دروازے کے قریب چلی گئی۔ اگر دیوار کا سہارا نہ لیتی تو منہ کے بل گرتی۔

"عمر...!" وہ ہذیانی انداز میں حلق کے بل چلائی۔ ایسا تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ شخص جس کے لیے اسے اپنی زندگی بھی حقیر لگتی تھی، وہ اپنی غرض، اپنی بہن کا گھر بسانے کے لیے اسے اجاڑ

سکتا تھا۔ اس سے بچ رہنے میں لاحق ہو سکتا تھا۔ اس نے برے سے برے وقت کو تصور کرتے ہوئے بھی کبھی نہ سوچا تھا کہ جس کے لیے اس نے زمانے بھر کی رسوائی مول لی' وہ اسے یوں بھی رسوا کرسکتا ہے۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والا' اس کی ایک جھلک کے لیے کالج کے گیٹ پر گھنٹوں کھڑا ہونے والا یوں اسے بھڑکتی آگ میں جھونک سکتا ہے.... وہ کہتا تھا اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں خود کو ختم کرلوں گا' آج خود اسے ختم کرسکتا ہے' اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر انسان جو تصور نہ کرسکے' وہ ٹل نہیں سکتا' ہو کر ہی رہتا ہے۔ اگلا پڑنے والا دھکا اسے تنگ راہداری میں لے آیا تھا۔

"کلموہی! میرے بھائی کی جان سے چمٹنے ہی لگی تھی۔ بے حیا! چل دفع ہوجا یہاں سے۔"

اس کی بہن نے بازو سے پکڑ کر اسے دروازے سے دھکیل کر دروازہ بند کرلیا۔ چادر ڈھلک کر اس کے شانوں پر اتر آئی۔ وہ اب تک بے یقینی سے بند دروازے کو تک رہی تھی۔ جس کے لیے وہ پیچھے سارے در مقفل کر آئی تھی' اس نے بھی اس پر دروازہ بند کردیا تھا۔ اسی محبت نے کھلے آسمان تلے اسے برہنہ لا کھڑا کیا تھا۔ دھکے کھاتے وجود کو اتنا ہوش نہ تھا کہ کمرے کے باہر پڑی جوتی پہن لے۔ نہ اسے اتنی مہلت دی گئی تھی۔ جب روح ہی تار تار کردی گئی ہو تو انسان جسم کے زخمی ہونے کے خوف سے بے بہرہ ہوجاتا ہے۔

بعض لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں ٹھوکر لگنے سے قبل ہی سنبھال لیا جاتا ہے۔ وہ اللہ پاک کے محبوب بندوں میں سے ہوتے ہیں۔ مہر اقبال ان بندوں میں سے نہ تھی۔ ٹھوکر کھانا اس کا مقدر تھا۔ اور ٹھوکر کھا کر بھی وہ سنبھل پائے گی۔ یہ ابھی طے ہونا باقی تھا۔

ننگے سر و پیر لیے خود کو گھسیٹتی وہ سامنے چلنے لگی۔ آنسو ایک رفتار سے اس کا چہرہ بھگونے لگے۔ بعض اوقات آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے' یہ بھی اچھا ہے ورنہ اگر آنسو تھم جائیں تو پھر اکھول ہو رہتا ہے۔ آنسوؤں کی چادر میں اسے آگے کا رستہ نظر آنا بند ہوگیا اور اس نے شدت سے خواہش کی کہ اسے سانس آنا بھی بند ہوجائے۔

اس کے ایک جانب محبت کھڑی اس پر قہقہے لگا رہی تھی تو دوسری طرف عزت کھڑی ترحم بھری نظروں سے اسے تک رہی تھی۔ محبت کے لیے اگر عزت کو روند دیا جائے تو نہ عزت دوبارہ اس شخص کے ماتھے پر چمکتی ہے اور نہ محبت ہی اس کا دامن بھرتی ہے۔ ایک چیز کو ٹھکرانے والا خود بخود دوسری سے بھی دستبردار ہوجاتا ہے۔

گلی پار کرکے سڑک پر اسے وین مل گئی۔ بغیر سوچے سمجھے وہ اس پر سوار ہوگئی۔ وین کہاں جارہی تھی اسے کچھ پتا نہ تھا' بے سمت تو وہ تب ہی ہوگئی تھی جب وہ اپنا مرکز چھوڑ آئی تھی۔

وین نے اسے جہاں اتارا' وہ آخری اسٹاپ تھا۔ آزادی مینار شام کے ملگجے غبار میں لپٹا حیرت سے جنت سے نکلی حوا کی بیٹی کو تک رہا تھا' جو اپنا سب کچھ گنوا کے بے نشان رستے پر چلتی جارہی تھی۔ کنڈیکٹر بڑی دیر تک اس سے کرائے کا تقاضا کرتا رہا تھا۔ پھر غائب دماغی سے اسے تکتے پاکر باآواز بلند گالیاں بکتا وین آگے بڑھا لے گیا۔ بہت سے لوگوں نے مڑ کر اس نسوانی وجود کو دیکھا تھا جو اردگرد سے بیگانہ بے نیاز بھیڑ میں چلتی جارہی تھی۔ اب پاپیادہ سفر ہی اس کا مقدر تھا۔ گھر کی دہلیز کو روند کر نکلنے والی لڑکیوں کو رستے یونہی روند دیتے ہیں۔

اسی بھیڑ کو پاٹتے ہوئے اس کی نظر حضرت داتا گنج بخش کی سفید عمارت پر پڑی۔ وہ سیدھی "داتا کی نگری" میں داخل ہوگئی' جو اس جیسے بے شمار بے آسرا اور ٹھوکریں کھاتے حرماں نصیبوں کے لیے ایک "پناہ گاہ" تھی۔

☆ ☆ ☆

ادھیڑ عمر کی پکی شکل کی عورت تجربہ کار تھی۔ اس کی زیرک نگاہوں نے ایسی کئی ہی لڑکیوں کو مار کر "منزل" تک پہنچایا تھا۔ داتا کی نگری میں قدم دھرنے والی ایسی بے سہارا جوان لڑکیوں کو اپنے طریقے سے "سہارا" دینا اس کا پیشہ تھا۔ چادر میں لپٹی روتی بلکتی کم سن سی لڑکی پر اس کی نظر بڑی دیر سے تھی۔ پاس بیٹھ کر اس نے اپنے کرخت نقوش میں خود ساختہ سی نرماہٹ اور شفقت سمو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"اے چھوری! کیوں رو رہی ہے رے؟" مہر نے سر اٹھا کر اس اجنبی عورت کی جانب دیکھا اور پھر جھکا لیا۔

"دیکھ! میں جانتی ہوں تجھ جیسی مصیبت کی ماری نمانی چھوری کن حالات میں ادھر کا رخ کرتی ہے۔ تو مجھے اپنی ماں جیسی سمجھ اور بتا کیا معاملہ ہے؟" محبت سے اس کا چہرہ چھو کر وہ پوچھنے لگی۔ ایسی لڑکیاں محبت کے دو بولوں اور ذرا سے سہارے سے ہی ماری جاتی ہیں۔

بعض اوقات انسان کو کسی ہمدرد و غمگسار کی یوں ہی اشد ضرورت پڑتی ہے خواہ وہ کسی بھی صورت' کسی بھی روپ میں کیوں نہ ہو۔ "ماں جیسی" کے لفظ سے اس کی آنکھوں کی پھیلی پتلیوں میں ایک نرم سا ممتا سے لبریز پیکر ساکن ہوگیا۔ ہچکیاں بندھے وجود نے پھر سے چادر میں منہ چھپالیا۔

"ارے ارے لاڈو! میری چندا مجھے بتا کیا ہوا ہے۔ ایسے رو کر وقت ضائع مت کر۔ دیکھ! رات پڑگئی ہے اور تیری جیسی حسین اور جوان لڑکی تنہا یہاں بیٹھی ہے۔"

اس کے پچکارنے پر مہر کو حالات کی سنگینی کا ہولناک انکشاف ہوا۔ واقعی وہ تنہا یہاں کب تک بیٹھ سکتی تھی۔ جبکہ رات کی سیاہی نے پورے دربار پر سائبان تان دیا تھا۔ ماتم کرنے کو ساری عمر پڑی تھی اور اب تو رہتی سانس تک ماتم کرنا اس کا مقدر ٹھہر چکا تھا۔ اس کا تھکا ہوا دماغ لڑکھڑاتے ہوئے چلنے لگا۔

واپسی کا ہر دروازہ خود پر بند کرکے اب وہ کہاں جاسکتی ہے۔ گھر.... گھر جانے کے لیے اب وہ پاک صاف عزت کا پاس رکھنے والی مہر کہاں سے لائے۔ یا پھر کسی پل سے نیچے چلتی ٹریفک سے بھری سڑک پر چھلانگ لگادے۔ کیا اس کی قسمت میں حرام موت مرنا ہی لکھا تھا۔ کیا اس جیسی عزتوں سے کھیلنے والیوں کا ایسا ہی انجام ہوا کرتا ہے۔ کوئی اسے جیسے بالوں سے پکڑے کنکریٹ پر دور تک گھسیٹتا جارہا تھا۔

پھر اس کے ذہن میں وہ تمام ادارے گھومنے لگے جہاں گھروں سے بھاگی ہوئی لڑکیاں اور زمانے کی ستائی ہوئی عورتیں اپنی زندگی کی گاڑی گھسیٹتی ہیں۔ کیا وہ بھی دارالامان اور اسی جیسی کسی عمارت میں سسکتی ہوئی زندگی بسر کرے گی؟ لیکن وہاں بھی پناہ دینے کی آڑ میں ان سے کیا کیا اور کس کس نوعیت کے کام لیے جاتے ہیں' یہ سوچ کر ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

سب سے محفوظ تو عورت کا اپنا گھر ہوتا ہے اگر وہی چھوڑ دیا جائے تو دنیا کا کوئی کونا اسے تحفظ فراہم نہیں کرسکتا۔

"مت رو میری گڑیا۔ ارے کیسی موہنی صورت ادھر رل رہی ہے۔ میں صدقے میں واری۔" عورت نے بلاوجہ نثار ہوتے ہوئے اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔ غلیظ اوڑھنی سے اٹھتی بدبو سے اس کا جی الٹنے لگا مگر اس وقت اس اجنبی عورت کا ڈھارس بندھاتا لہجہ اسے کسی نعمت سے کم نہ لگ رہا تھا۔

"لے تھوڑا سا کھانا کھالے' جانے پچھلی دفعہ تو نے کب کھایا ہوگا۔"

اس کی بات پر اس کے دماغ نے واقعی سوچنے کی کوشش کی کہ پچھلی بار اس نے کھانا کب اور کہاں کھایا تھا۔ کل رات سے اب تک اس کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ تک نہ گیا تھا۔ یکایک اس کا معدہ جلنے لگا۔ بھوک کے شدید احساس پر بھی غم کا پہاڑ کھڑا اسے دبا رہا تھا مگر اب اسے لگا' نقاہت کے مارے اس سے رویا بھی نہیں جائے گا۔

عورت نے نمکین چاول والی تھیلی سے ہاتھ میں چاول لے کر اس کے منہ کی جانب بڑھائے اور مہر صدیوں کے بھوکوں کی طرح منہ بھر بھر کر کھانے لگی۔

ہر نوالے پر آنسو بہہ نکلتے، ہر لقمے پر وہ انہیں پیتی جاتی۔
"اچھا چل اٹھ شاباش ہمت کر..... کسی حادثے سے زندگی ختم تو نہیں ہوتی۔ آجا میرے ساتھ، خود کو بے سہارا نہ سمجھ دیکھ میں تیری ماں کی طرح ہوں۔" چاول کھانے کے بعد اس عورت نے بڑے پیار سے کہا۔ مہر کا دل پھر بھر آیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"پریشان مت ہو۔ اُدھر تیری جیسی بے شمار لڑکیاں ہیں۔ میڈم جی بہت اچھی ہیں۔ میں تیرے رہنے کی بات کرلوں گی۔ باقی پاپی پیٹ ساتھ جڑا ہے اسے بھرنے کو ہر لڑکی کام کرتی ہے تو بھی کرلینا۔"

مہر خالی الذہنی سے اسے دیکھے گئی۔ عورت کا خلوص ہی تھا جس نے اسے تھک ہار کے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کردیا تھا۔ اب قسمت اسے جہاں بھی لے جائے۔ اور شاید یہ عورت اس کے لیے غیبی مدد کی صورت بن کر ہی پاس آئی تھی۔ نیم رضا مندی اس کے نقوش سے جھلکنے لگی۔

"یہ معاشرہ گھر سے بھاگی لڑکیوں کو جینے نہیں دیتا مگر میڈم جی انہیں سہارا دیتی ہیں۔" وہ بھلی عورت معلوم ہوتی تھی مگر "گھر سے بھاگی لڑکی" کے لفظوں پر مہر نے بری طرح گھبرا کر اس کی صورت تکی۔

"تو بہت بھولی گائے ہے چندا! تم جیسیوں کی صورتوں پر ان کی بربادی کی داستان رقم ہوتی ہے۔" اس کی بات پر مہر پھر سے شرمندگی کی اندھی کھائی میں گرنے لگی۔

"یہ لوگ اب تجھے عزت کی زندگی جینے نہیں دیں گے۔ ان گدھوں کے معاشرے میں بے عزت ہوجاؤ تو عزت کی آس پھر آخری سانس تک پوری نہیں ہوتی۔ گو خود کو زندہ رکھنے کے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنی زندگی ڈٹ کر گزارو، اپنی غیرت مار کے، ورنہ یہ جو مرد ہیں ناں مفت میں تیری بوٹیاں نوچ کھائیں گے۔"

مہر سرتاپا لرز گئی۔

"چل اب اٹھ....." عورت کے دوبارہ کہنے پر اس نے اپنا سن ہوا پیر ہلا کر سیدھا کیا۔ اس کی باتیں یقیناً سوفیصد صحیح تھیں۔ اب کون اسے یوں تنہا جینے دے گا۔

"آجا میرے ساتھ۔ جب خود کو لاش بنا کر اپنی بوٹیاں نچوانی ہی ہیں تو مفت میں کیوں، روپے لے کر کیوں نہیں۔" عورت کھڑے ہوتے ہوئے بولے گئی مگر اس کی بات پر پاؤں زمین پر جما کر اٹھتی مہر کے سختی سے بھینچے لبوں پر مزید قفل لگ گئے۔

پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرانی سموئے وہ اپنی اس نام نہاد غم گسار کو دیکھے گئی، جو شاید اس کے پاس بیٹھی ہی اسی لیے تھی۔ عورت کا اس کے متعلق ہر اندازہ درست ہوا تھا مگر وہ اپنی عزت کے آبگینے کے بھی ٹکڑے کرواچکی ہے، یہ اندازہ قطعی غلط ثابت ہوا۔ تیر نشانے سے چوک گیا تھا۔ عورت اٹھتے ہوئے اس کی کلائی پکڑ کر ساتھ اسے بھی اٹھانے لگی تو جیسے وہ ہوش میں آئی تھی۔

"اٹھ ناں لاڈو!" مہر ٹس سے مس نہ ہوئی تو وہ عورت اطراف میں نظر دوڑانے لگی۔ قریب ہی سامنے والے ستونوں کے پیچھے اس کے دو کارندے اس پر نظر جمائے کھڑے تھے۔ اسے اطمینان ہوا۔ اب بس اس کا کام بہلا پھسلا کر لڑکی کو گیٹ سے باہر لانا تھا، پھر بھیڑ میں کون کہاں غائب ہوجائے، کیا خبر ہوتی ہے۔

مہر نے عورت کی شاطر نگاہوں کے تعاقب میں وہ ہٹے کٹے، مکروہ صورت آدمی دیکھ لیے تھے۔ وہ جی جان سے لرز گئی۔ اتنا ڈر تو اسے تب بھی نہ لگا تھا جب وہ گھر کی چوکھٹ پار کررہی تھی۔

اتنی برگزیدہ ہستی کے مقدس احاطے میں بلاخوف و خطر وہ آسرا دینے کی آڑ میں لڑکیوں کو گمراہ کررہے تھے۔ جو عشق کے روگ میں گھر سے بھاگی ہوتی ہیں اور دھوکا کھائے، شکست تسلیم کیے یہاں آپڑتی ہیں یا کاری قرار دیے جانے والی عورتیں سزا سے بچنے کے لیے فرار ہوکے یہاں پناہ گزین ہوتی ہیں۔ جانے اب تک کتنی لڑکیاں ان گروہوں کے ہتھے چڑھ چکی تھیں اور کتنی چڑھنا باقی تھیں۔

مہر اپنے بے جان پیروں پر زور ڈال کر کھڑی ہوئی تو عورت کے ساتھ چلنے کے بجائے اپنی کلائی چھڑا کے تیزی سے کھلے صحن کی طرف بڑھ گئی جہاں دربار کے محافظ کھڑے نظر آرہے تھے۔ وہ عورت اور مرد تیزی سے اس کی جانب لپکے۔ تیز تیز چلتے ہوئے وہ مسلح محافظ کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی۔ تینوں افراد جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ عورت اب اسے شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہی تھی جیسے ایک بار مہر اسے مل گئی تو وہ اس کا حشر کردے گی۔

کچھ لمحوں قبل اس سے ہمدردی دکھانے والی اب کس قدر سفاک لگ رہی تھی۔ ایک بار پھر بے یقینی سے وہ سارے منظر کو دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ کیا ہونے جارہا تھا۔ ان سولہ گھنٹوں میں اعتبار کی جانے کتنی منزلوں سے گر کر وہ زخمی ہوئی تھی۔ جانے کتنی بار بھروسا ٹوٹنے پر یونہی بے یقینی سے منجمد ہوئی تھی۔ کیا وہ دنیا میں اب محض دھوکے بازوں کے چنگل میں پھنسنے کے لیے رہ گئی تھی۔

"کوئی مسئلہ ہے بی بی؟" محافظ نے اپنے پاس کھڑی خوبصورت لڑکی کے پسینہ پسینہ ہوتے چہرے کو ہولناک نظروں سے دیکھا۔

حسن کا پیکر اس کے اتنے قریب تھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، باچھیں خواہ مخواہ چر گئیں۔ مہر نے سراسیمگی سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور بے ساختہ دو تین قدم پیچھے ہٹی اور سامنے والے گیٹ سے اندر آتے زائرین کے ایک ریلے میں تیزی سے شامل ہوکر ان جرائم پیشہ گروہ کی خونخوار نظروں کی حد سے یکدم غائب ہوگئی۔ وہ پچھلی جانب موجود گیٹ سے نکل بھاگی تھی۔

اب اس کے قدم خود بخود ان رستوں کی تلاش کے لیے بگٹٹ بھاگ رہے تھے، جہاں اس نے اپنے ابو کی انگلی تھام کر اپنا بچپن گزارا تھا۔ ٹریفک کے اژدھام کو پار کرکے وہی جانے پہچانے رستے تلاش کرنے لگی جو اس کی اصل "پناہ گاہ" تھے مگر ایک روز قبل اور اب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ محض سترہ گھنٹوں میں اس نے اپنی زندگی کا سب سے سیاہ دن دیکھا تھا۔ اس ایک دن میں اس نے چہروں پر سے نقاب الٹتے اور مکروہ صورتیں سامنے آتے دیکھی تھیں۔

پھولی سانسوں کے ساتھ زاروقطار روتے ہوئے وہ اپنی ماں کو پکارے گئی جنہوں نے ہمیشہ اسے دنیا کی اصلیت بتلائی تھی، جسے وہ تلخ اور فرسودہ کہہ کر ہمیشہ سر جھٹکتی آئی تھی۔ وہ لوٹ رہی تھی اسی گھروندے کی جانب جس میں پروان چڑھ کر اس نے زمانے کے سرد و گرم کو کبھی جانا ہی نہیں تھا، حقیقی زندگی تو کتابی باتوں اور رنگین فلمی دنیاؤں سے ہٹ کر بہت تلخ تھی بہت بھیانک.....

وہ جانتی تھی اب اسے گھر میں کس نظر سے دیکھا جائے گا۔ اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایک فاش غلطی وہ کرچکی تھی مگر زندگی بھر کسی جرائم پیشہ گروہ کے ساتھ گناہ کرتے ہوئے وہ نہیں جی سکتی تھی۔ وہ سوچ چکی تھی۔ اس کے ماں باپ اسے زدو کوب کرکے جان سے مار ڈالیں، اسے منظور تھا۔ مگر اسے عمر بھر اپنی عزت کا سودا کرنا منظور نہ تھا۔ محبت کی چنگاری نے تو اس کا وجود جلا کر خاکستر کر ہی دیا تھا۔ اسے بدنامی کے کنویں میں دھکیل ہی دیا تھا مگر کیا پتا ابھی سب کچھ تباہ نہ ہوا ہو.....

کیا پتا دن کے ان بارہ گھنٹوں میں بدنامی اس کے گھر کی منڈیروں سے باہر نہ نکلی ہو۔

کیا پتا اس کے گھرانے کی تذلیل بھری داستان گلی گلی، نکڑ چوراہے کی زینت نہ بنی ہو۔

اپنی عصمت کی ردا تو وہ ان سڑکوں پر تار تار کروا آئی تھی مگر کیا پتا اس کے گھر والوں کی عزت کا آبگینہ ابھی سلامت ہو.....

کیا پتا.....

سعدیہ ملک

"اف خدایا! نادیہ! کچن کس قدر پھیلایا ہوا ہے' میں گھر کے کسی کونے کو تھوڑی دیر چھوڑ دوں تو وہ تتربتر ہو جاتا ہے میں کہتی ہوں' اگر میں گھر میں نہ ہوں تو نجانے یہ گھر کیسے چلے؟ دیکھو نادیہ! ساتھ ساتھ کچن سمیٹنے کی عادت ڈالو۔" یہ اس کی ساس کا تبصرہ تھا۔ وہ رشتے میں اس کی پھوپھی بھی تھیں۔

"جی پھوپھو! ابھی سمیٹ دیتی ہوں۔ صبح سے تو میں کھانا پکانے میں مصروف ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ہاں بھئی! آج کل کی لڑکیوں کے نخرے۔ ورنہ اسی کچن میں ہم نے ساری زندگی پکایا ہے۔ شیشے کی طرح چمکتا تھا۔"

"بھابھی! کھانا کہاں تک پہنچا؟ بچوں نے بھوک بھوک کا شور مچایا ہوا ہے۔" اس کی نند زرفشاں کھانے کے وقت پروارد ہوئی تھی' ورنہ صبح سے تو ان سب ماں بیٹیوں نے کچن کے قریب سے گزر کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ویسے بھی آج ویک اینڈ تھا' سو اس کی تین شادی شدہ نندیں حسبِ معمول اپنے درجن بھر بچوں کے ساتھ موجود تھیں اور صبح سے بند کمرا اجلاس جاری تھا۔ جہاں ان کے خود ساختہ مسائل حل کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ ہر بہن اپنے اپنے تجربہ و علم کے مطابق ایک دوسرے کو مفت اور نادر مشوروں سے نواز رہی تھی کہ کس طرح شوہر کو قابو کرنا ہے اور سسرال سے جان چھڑانی ہے۔ بہرحال نادیہ کے نصیب میں تو کچن کی گرمی اور کھانا پکانے کی مشقت سہنا ہی لکھا تھا' سو وہ بری طرح مصروف تھی۔ سب سے چھوٹی غیر شادی شدہ نند مدحت تھی اس کے نخرے الگ تھے۔

"بھابھی! آپ نے سالن ٹھیک سے بھونا نہیں۔ اس کا تو رنگ ہی ٹھیک نہیں لگ رہا؟" زرفشاں نے پتیلی کا ڈھکن اٹھایا۔

"بھونا تو اچھی طرح تھا۔ نجانے کیوں رنگ ٹھیک نہیں آیا۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا! چلیں ٹھیک ہے۔ اب جیسا بھی ہو' کھانا تو ہے۔ ورنہ جب تک کھانے کا رنگ روپ اچھا نہ ہو مجھے تو کھانا اچھا ہی نہیں لگتا۔ بہرحال آپ روٹیاں ڈالیں۔ جب بن جائیں تو مجھے آواز دے دینا میں کھانا لگا دوں گی۔" زرفشاں نے ارشاد فرمایا۔

"جب پک گیا ہے تو لگ بھی جائے گا۔" نادیہ نے دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے سوچا۔ "نجانے کیسی ناشکری عورتیں ہیں۔ پکا پکایا کھانا بھی ان کے مزاج پر بھاری ہے۔ شکر ہے کہ یہ ساری محفل ہفتے میں ایک ڈیڑھ دن لگتی ہے' ورنہ..." اس نے دل کو سمجھایا۔ "کل شام تک چلی جائیں گی۔ صبر اور ہمت سے کام لو۔"

☼ ☼ ☼

"نادیہ! میں ذرا بازار تک جا رہی ہوں' پھر شاید واپسی پر خالہ انوری کی طرف چکر لگاؤں۔ گھر کو دیکھ لینا اور صفائی اچھے طریقے سے کرنا۔ خیر سے بچے آئے ہوئے تھے تو گھر ذرا زیادہ ہی پھیل گیا ہے۔ اور ہاں! کھانا بھی ساتھ ساتھ شروع کر لو۔ مدحت تو یونیورسٹی سے آتے ہی بھوک بھوک کا شور مچا دیتی ہے اور پھر مد کا ٹائم بھی ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔"

"اچھا پھوپھو! میں ابھی سمیٹتی ہوں سب..." اس نے دل ہی دل میں آہ بھری۔

"اور ہاں! آج شاید زرفشاں اسکول سے واپسی پر کسی سہیلی کے گھر جائے گی۔ کوئی کام تھا اس کو۔ اس کے بچے اسکول سے واپسی پر ادھر ہی آئیں گے' ان کو بھی کھلا پلا دینا۔" انہوں نے نئی خبر دی۔

"یہ کون سا آج کا مسئلہ ہے۔ زرفشاں کے بچے تو ہر روز ہی ادھر ہوتے ہیں۔ ان کا ایک کھانا ہر روز ہی ادھر ہوتا ہے یا جب دل چاہا' بنا بنایا سالن اٹھا کر چل پڑتی ہیں۔"

نادیہ نے کڑھ کر سوچا' پھر کاموں کی طرف نظر دوڑائی تو سر گھوم گیا۔ گھر کی حالت تو ابتر تھی ہی' کچن کا بھی برا حال تھا۔ اللہ کا نام لے کر کمر کس لی۔ جب کافی بھاگ دوڑ کے بعد گھر اپنی اصلی حالت میں

واپس آیا تو سکھ کا سانس لیا اور سوچا کہ ایک کپ چائے ہی پی لوں تاکہ کچھ ہمت تو پڑے۔ گھڑی کی طرف نظر پڑی تو ساڑھے بارہ کا ٹائم دیکھ کر پھر دوڑ لگادی۔ ابھی تو کھانا پکانا باقی تھا اور سب کے واپس آنے میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے۔ ہر ہفتے نندوں کا بال بچوں سمیت قیام سارے گھر کو تتر بتر کردیتا۔ ابھی گھر سنبھلنے میں نہ آتا کہ دوبارہ ویک اینڈ شروع۔۔۔۔

ایسا بھی نہ تھا کہ نادیہ کوئی بہت ہی مسکین اور غریب لڑکی تھی جو چپ چاپ ظلم سہنے پر مجبور تھی۔ وہ صرف دو بہن بھائی تھے۔ ماں باپ اور بھائی کی لاڈلی تھی۔ اگر گھر میں بہت خوشحالی نہیں تو تنگی بھی نہ تھی۔ چھوٹا سا خاندان خوشحال اور پرسکون تھا۔ وہ ایم اے پاس اور زمانہ طالب علمی میں ایک بہترین مقررہ بھی تھی لیکن یہاں اس نے سب کچھ پس پشت ڈال دیا اور گھرداری ہی کو اپنا نصب العین بنالیا تھا۔ اپنی ذات اور انا کو محفوظ رکھنے والی اور اپنے حق کے لیے لڑنے والی آج اس طرح خاموش تھی جیسے وہ کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

☆ ☆ ☆

نادیہ روٹیاں ڈال رہی تھی کہ دروازے پر بیل بجی۔ پھوپھی بازار سے واپس آگئی تھیں۔

"نادیہ! ایک گلاس پانی لادو۔ باہر بہت گرمی ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

نادیہ نے چولہا آہستہ کیا اور پانی لے کر آگئی۔

"ارے! تم نے آج ڈسٹنگ نہیں کی کیا؟ دیکھو تو صوفے پر کس قدر گرد جمی ہے۔"

"پھوپھو صفائی کرنے میں اتنا وقت لگ گیا۔ پھر کھانا بھی پکانا تھا۔ میں نے سوچا' ڈسٹنگ بعد میں کرلوں گی۔"

"ارے! یہ کون سا بڑا کام تھا۔ ہم نے تو چھ چھ بچے پال لیے' پھر بھی گھر کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتے تھے۔"

نادیہ کا دل جل کر کباب ہوگیا۔ اس گھر میں جو کچھ بھی کرلو' نتیجہ وہی صفر ہی رہتا تھا۔

مدحت یونیورسٹی سے واپس پہنچی۔

"بھابھی! جلدی سے کھانا لگادیں سخت بھوک لگی ہے۔" پیچھے پیچھے زرفشاں بچوں کو اسکول سے لے کر وارد ہوئی۔ وہ خود بھی خیر سے ٹیچر تھی۔

"امی! میں نے اسکول سے چھٹی کرکے بچوں کو لیا' پھر سیدھا ادھر ہی آگئی۔ صارم کو رات دیر سے آنا ہے۔ میں نے سوچا' امی کے پاس ہی کھانا کھالوں گی۔"

"ہاں۔ ہاں! کیوں نہیں۔۔۔ تم منہ ہاتھ دھولو۔ نادیہ ابھی کھانا لگاتی ہے۔"

زندگی دن بدن مشکل سے مشکل تر بنتی جارہی تھی۔ شادی کے دو سال اسی طرح گزر گئے۔ خدا نے ابھی تک اولاد کی نعمت سے بھی نہ نوازا تھا کہ زندگی کا کوئی الگ ڈھنگ ہی مل جاتا۔

اپنی امی سے جب بھی وہ مشکل حالات کا تذکرہ کرتی وہ اس کا حوصلہ اور ہمت بڑھاتیں۔

"بیٹا! گھر بہت مشکل سے بنتے ہیں۔ عورت کو صبر اور برداشت سے کام لینا پڑتا ہے۔ دیکھو! تمہاری ساس تین بہنیں تھیں اور چوتھی ان کی ماں۔ میرے حالات تم سے بھی بدتر تھے' لیکن میں نے صبر سے ہی کام لیا اور اب دیکھو! اللہ نے ہمیں کس قدر نوازا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم دونوں بہن بھائی اچھی تعلیم سے آراستہ ہو۔ اچھے جیون ساتھی ملے ہیں۔ اسد خود تو بہت اچھا ہے نا! لیکن وہ مجبور ہے۔ تمہیں ہی ہمت سے کام لینا پڑے گا۔"

وہ اسی طرح کی باتیں سمجھاتیں۔ نادیہ اسد کے آنے پر اس کے ساتھ دوبارہ اسی گھر میں نئے حوصلے کے ساتھ روانہ ہوجاتی اور دوبارہ کمر کس لیتی۔

☆ ☆ ☆

اسد کو ہفتہ بھر کے لیے اپنی کسی کانفرنس کے لیے اسلام آباد جانا تھا۔ نادیہ بہت پریشان تھی کہ اس گھر میں اسد کے بغیر تو اسے ایک لمحہ بھی گزارنا مشکل لگتا تھا۔

اسد کے جانے کے بعد دو تین دن تو بس اسی طرح

مصروفیت میں گزرے۔ تیسرے دن نادیہ کے کان میں ہلکا سا درد اٹھا۔ پھر بھی وہ کام میں لگی رہی اور ایک آدھ گولی کھالی۔ رات کے وقت تو کان کے درد سے بے حال ہوگئی' لیکن کسی کو نہ جگایا کہ اس وقت کسی کو کیا تکلیف دوں۔

صبح ناشتے کے وقت اس نے اپنی ساس کو آگاہ کیا تو وہ بولیں کہ۔

کوئی دوا ڈال لو یا سرسوں کا تیل گرم کرکے ڈال لو میں تو ذرا ماہین کی طرف جارہی ہوں۔ نجانے کس حال میں ہوگی میری بچی۔ نجانے کیسے ناقدرے داماد ہیں ہمارے کہ ہر وقت میری بیٹیوں پر حکم ہی چلاتے رہتے ہیں۔ اس کو شوگر اور بلڈ پریشر کی کئی بیماریاں ہیں لیکن پھر بھی خیال نہیں رکھتے۔ ارے اگر کھانا گھر میں نہ پک سکے تو تنور کس لیے ہیں بھئی۔۔۔ لیکن نہ جی نہ شہزادے گھر کی پکی مانگتے ہیں۔ ماہین کی تو جان ہلکان کردی خدمتیں کروا کروا کر۔ میری بچیوں کی تو قسمت ہی خراب تھی۔ ساس سسر اگر ساتھ نہیں تو کیا ہوا۔ میاں ہی اس قدر چلتر ملے ہیں کہ ہر رشتے پر بھاری ہیں۔ بہرحال! ذرا گھر کا خیال رکھنا۔ شاید مجھے شام ہوجائے ادھر۔" نادیہ پھوپھی کی شکل دیکھتی رہ گئی کہ جنہوں نے اس کی بیماری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی اور چلتی بنیں۔

درد کی ایک اور گولی کھائی اور گرم تیل بھی ڈال لیا پھر سے "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق کاموں میں جت گئی کہ اگر گھر کا کام نہ ہوا ہوتا تو ایک ہنگامہ اس کا منتظر ہوتا۔

سارے کام نمٹاتے دوپہر ہوگئی اور درد تھا کہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اب کوئی گھر آئے تو میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلے کہ اکیلے اس کو کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔

دوپہر کو مدحت اور زرفشاں کا اپنے دو بچوں سمیت نزول ہوا۔ زرفشاں نے اپنا گھر میاں سے آٹھ سالہ ناراضی کے بعد ماں کی پچھلی گلی میں سیٹ کروایا تھا۔ اسی شرط پر محترمہ نے ناراضی ختم کی۔ اسی لیے وہ زیادہ تر اپنی ماں کے پاس ہی رہتی۔ دل کرتا تو گھر چلی جاتی ورنہ میاں کے پاس ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ وہ خود ہی ہوٹل سے دو روٹیاں پکڑ کر کھالیتا۔ یہ محترمہ ماں کے گھر سے ہی خود بھی اسکول روانہ ہوتیں اور بچوں کو بھی بھجوادیتیں۔ اسی لیے نادیہ کے اوپر کاموں کا بوجھ کچھ زیادہ ہی تھا۔

سب لوگوں کو کھانا کھلا کر اس نے مدحت سے درخواست کی۔

"مدحت پلیز! میرے ساتھ نزدیکی کلینک تک چلو میں درد سے بے حال ہوں۔" تھوڑی سی پس وپیش کے بعد وہ تیار ہو ہی گئی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو کہا۔

محترمہ! آپ نے کان کا انفیکشن بہت بڑھالیا ہے کہ کان کا سوراخ سوجن سے بند ہورہا ہے۔ اب اس کی صفائی کرنی پڑے گی۔" نادیہ کی آنکھوں میں آنسو ہی تو آگئے۔

بہرحال دوائیں اور کان کی صفائی کے بعد دونوں گھر واپس آئیں وہ دوا کھا کر لیٹ گئی اور اس کی آنکھ بھی لگ گئی کہ درد کی شدت سے بے چین ہی رہی تھی۔

اچانک اس کے کمرے کی لائٹ آن کی گئی۔ وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی۔ دیکھا تو کمرے میں زرفشاں سمیت پھوپھی کھڑی تھیں۔ ان کے تیور کچھ عجیب سے ہی تھے۔

"السلام علیکم! آپ آگئیں؟"

"وعلیکم السلام! میں تو آگئی لیکن تم نے پیچھے سے کیا ڈراما رچائے رکھا؟ ارے! میری بچیاں اسکول' یونیورسٹی سے تھکی ہاری آئیں تو تم ان کو لے کر چل پڑیں سیر کرنے۔۔۔ ارے ایسا کیا ہوگیا تھا۔"

"پھوپھو! میرے کان میں شدید درد تھا۔ آپ کو صبح بتایا تو تھا۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کان میں درد تھا' موت تو نہیں آرہی تھی؟ مگر تم نے کچھ نہ کچھ ڈراما تو گھڑنا ہی ہوتا ہے' جب تک چار پیسے نہ اڑالو۔ تمہیں بھلا چین کیوں پڑے گا۔"

"نہیں پھوپھو! ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے واقعی

شدید درد تھا۔" وہ ماں بیٹی تو چلتی بنیں، لیکن رات بھر اس کا تکیہ بھیگتا رہا۔

رات بھر غم منانے کے بعد صبح پھر وہی کچن اور گھر کا کام۔ وہ خاموشی سے لگی رہی۔ اسی آس پر کہ اسد کے آنے میں ایک دو دن ہی باقی تھے۔

☼ ☼ ☼

اسد اسلام آباد سے واپس پہنچے تو سب سے پہلے تو سٹنگ روم میں اپنی ماں بہنوں اور زرفشاں کے بچوں کے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ اور ہنسی مذاق میں مصروف رہے۔ نادیہ بھی کھانا بنانے اور لگانے میں لگی رہی۔

رات کے کھانے کا سارا کام سمیٹ کر وہ کمرے میں آئی اور اسد کا انتظار کرنے لگی۔ رات کا ایک بج گیا۔ اسد کمرے میں نہ آئے۔ آخر تھوڑی دیر بعد آہٹ ہوئی۔

"نادیہ! سو رہی ہو کیا؟"

"آپ کو کیا؟ ہفتہ بھر باہر رہنے کے بعد یہ وقت ہے کمرے میں آنے کا۔"

"یار! میں ذرا امی کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ تمہیں تو پتا ہے کہ ماہین اور زرفشاں کے گھر کے مسئلے چھڑے ہی رہتے ہیں۔ باپ سر پر ہے نہیں تو پھر مجھے ہی سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" اسد بولا۔

"آپ خیال رکھیں، لیکن میں بھی آپ کی بیوی ہوں۔ آپ کی وجہ سے ہزار باتیں سہتی ہوں۔ آپ کے پاس میرے لیے وقت ہی نہیں۔۔۔"

"اچھا! چھوڑو نا۔ اب آ تو گیا ہوں۔ تم اس طرح گلے شکوؤں سے میرا استقبال کرو گی۔ ادھر منہ کرو میری طرف۔۔۔"

"ہٹیں اسد۔۔۔ یہ وقت چونچلوں کا نہیں ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ میرے کان میں کس قدر تکلیف رہی ہے۔" نہ چاہتے بھی اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ اسد نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"ویسے امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ تم تو چھوٹی چھوٹی بیماریوں کو لے کر بیٹھ ہی جاتی ہو۔ اس طرح کے مسائل چلتے ہی رہتے ہیں۔ اب انسان واویلا کرنے بیٹھ جائے۔۔۔ پھر دوائیاں لے ہی آئی تھیں نا تم! امی بتا رہی تھیں۔"

"ہاں ہاں! لے آئی تھی جس پر عزت افزائی بھی اس قدر ہوئی۔"

"اچھا بابا! مجھے صبح دفتر جانا ہے۔ اس لیے شب بخیر۔۔۔"

اسد کروٹ بدل کر سو گیا کہ وہ اس کی یہ باتیں سننا ہی نہ چاہتا تھا۔ رات بھر نادیہ کا تکیہ بھیگتا رہا۔ اسد کی بے حسی اور بزدلی پر وہ ساری رات کڑھتی رہی۔ وہ ماں بہنوں کی جذباتی بلیک میلنگ میں بری طرح گم تھا۔ آتے جاتے اس کی ماں، باپ کی وفات، دامادوں کے ظلم اور بڑے بھائی کی لاپروائی اس کے گوش گزار کرتی رہتیں۔ اپنی بیٹیوں کے قصور بھی دامادوں کے ظلم میں لپیٹ لپیٹ کر سنانا ان کا شیوہ تھا۔

اسد ان ماں بہنوں کی سیاست سمجھ نہ پا رہا تھا۔ اگرچہ نادیہ سے محبت کا دعوے دار بھی تھا اور اس کا خیال بھی رکھتا تھا، لیکن گھر میں اس کے حقوق کے لیے کبھی آواز نہ اٹھائی تھی۔ ایک آدھ دفعہ اس کے حق میں بولا بھی تو ماں بہنوں نے اس طرح باتیں سنائیں کہ آئندہ اس کی ہمت نہ ہو۔

شاید اسی وجہ سے اسد، نادیہ کی باتوں کو سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھی اور نظراندازی سے کام چلا رہا تھا۔ لیکن یہ اسد کی کیسی محبت تھی۔ کیا جس سے محبت کی جاتی ہے اس کے ساتھ ناانصافی، ظلم و زیادتی سے اسی طرح نظریں چرائی جاتی ہیں۔ نادیہ ان حالات میں لمحہ بہ لمحہ پستے تھک چکی تھی، لیکن فرار کا رستہ کہیں نہ تھا۔ وہ کیا کرے، کیسے اپنے حقوق کا مطالبہ کرے؟ اس کی ساری ذہانت، سمجھ داری صفر ہو جاتی۔

ایم اے گولڈ میڈلسٹ ہونے کے باوجود وہ عملی زندگی کی گرہوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دوپہر کا کھانا لگا کر نادیہ نے سب کو آواز دی۔ سب

باری باری دسترخوان پر جمع ہوتے گئے۔ سالن ڈالتے ہوئے زرفشاں بولی۔

"نادیہ! کیا تم سالن کو بھونتی نہیں ہو؟ پتلا شوربا تیر رہا ہے اور چاول تو دیکھو! بالکل بیٹھ گئے ہیں۔"

"زرفشاں! تم بھی تو ادھر ہی ہوتی ہو۔ اگر میرا سالن کسی ۔۔۔ کو پسند نہیں تو تم بنا لیا کرو۔" کچھ کچن کی گرمی اور کچھ تھکاوٹ سے زرفشاں کے نخرے اس سے برداشت نہ ہوئے تو آج اس نے بھی زبان کھول ہی لی۔

"نادیہ! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔۔۔ تمہاری یہ مجال کہ میری اس مسکین اور مظلوم بیٹی کو ہر وقت یہاں رہنے کا طعنہ دو۔ ارے! یہ ان کے باپ کا گھر ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔۔۔ اور تم سارا دن گھر میں فارغ رہ کر کھانا بھی نہ بناؤ۔ کیوں، تم اتنی نواب زادی ہو؟ یہ بے چاری تو شوہر کے ظلم و ستم سہ کر اپنی روزی بھی خود کمائی پھر رہی ہیں۔ تمہاری طرح گھر بیٹھ کر عیش نہیں کر رہی۔"

"میں کون سے عیش کر رہی ہوں پھوپھو! سارا سارا دن کچن میں جان کھپاتے گزر جاتا ہے۔" نادیہ آہستہ سے بولی کہ فساد بڑھ رہا تھا۔

"ارے! تو یہ کون سا احسان ہے تمہارا۔ گھر کا کھانا پکانا تو ہر عورت کی ذمہ داری ہے۔ اگر نہیں کر سکتیں تو جاؤ! ماں باپ کے گھر جا کر مفت کی روٹیاں توڑو۔ ویسے بھی تمہاری ماں کے سارے سبق ہیں یہ۔ وہی تمہارا پیٹ بھر کر بھیجتی ہے۔ میں خوب جانتی ہوں، کیسی چلتر عورت ہے تمہاری ماں! میرے بھائی کو ایسے مٹھی میں کر رکھا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر سانس نہیں لیتا وہ شخص۔۔۔"

اس قدر بے عزتی سن کر نادیہ کی آنکھوں سے آنسو برس پڑے۔ اس کی نندیں اور بچے تو بے حسی سے کھانے میں مصروف ہو گئے، لیکن آج اس کی برداشت کی حد ختم ہو چلی تھی۔ وہ کمرے میں گئی۔ اپنا ضروری سامان سمیٹا، پھر سامنے والی پڑوسن کو اپنی امی کا فون نمبر لکھوایا کہ وہ اس کے گھر پیغام دیں کہ مجھے جلدی آ کر لے جائیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کا بھائی آ گیا۔ وہ اسد کا انتظار کیے بغیر چپ چاپ اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

ساری روداد سن کر اس کے ماں باپ اور بھائی بھابھی چپ چاپ افسردہ سے بیٹھے تھے۔ ان سب کی "چپ" اور "صبر" نے ان کی بیٹی کی زندگی عذاب میں ڈال دی تھی۔

"صبر، چپ اور خدمت گزاری۔۔۔ یہ سب پرانے فلسفے ہیں۔" اس کا بھائی شہروز بولا۔

"زندگی میں دوسروں سے اپنا حق منوانا پڑتا ہے۔ ناقدرے اور بے حس لوگ کبھی بھی خدمت گزاری اور صبر سے نہیں جیتے جاتے، بلکہ ایسے لوگ ان چیزوں کو کمزوری سمجھ لیتے ہیں۔ تم نے اچھے اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل کی ہے۔ تم تو نفسیات کی اسٹوڈنٹ تھیں، پھر کیوں لوگوں کی نفسیات کو نہ سمجھ سکیں؟"

"شادی کے بعد تم نے خواہ مخواہ اپنے اوپر ذمہ داریوں کا بوجھ لادا۔ اگر تم شروع سے متوازن رویہ اپناتیں تو آج تمہیں ان مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ زندگی کے ہر میدان میں ایک دیانت دارانہ سوچ ہونی چاہیے تاکہ کوئی تم سے غلط توقعات وابستہ نہ کرے۔ ہمارا مذہب عورت کو پورے حقوق دیتا ہے۔ بیوی ہونے کے ناتے تم اسد سے اپنے جائز حقوق اور الگ گھر کا مطالبہ کر سکتی ہو۔ یہ اسد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے والدین، بہن بھائیوں اور تمہارے درمیان کس طرح توازن قائم کرے۔ میرے خیال میں وہ ایک باشعور مرد ہے۔ اگر تم نے سمجھ داری سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ یقیناً سمجھ جائے گا۔ تمہیں اسد سے بگاڑے بغیر اپنے حالات سنوارنے کی کوشش کرنا ہے۔"

بھائی جان کی یہ ساری باتیں قطرہ قطرہ بن کر اس کے دل میں اتر رہی تھیں۔ واقعی یہ اس کی غلطی تھی کہ وہ متوازن رویہ نہ رکھ سکی اور ضرورت سے زیادہ

بوجھ خود پر لاد لیا۔ اب اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔

اس نے اسد کو فون کر کے کہا کہ طبیعت خراب ہونے کی بنا پر وہ امی کی طرف آگئی تھی۔ اسد شام کو اسے لیتے ہوئے گھر جائیں۔

✡ ✡ ✡

اسد کی واپسی پر نادیہ کو ساتھ دیکھ کر ساس اور دونوں نندوں کو یک گونہ اطمینان ہوا کہ گھر کا کام تلپٹ پڑا تھا' لیکن اس کے ساتھ غصے اور کھولن کا بھی احساس ہوا کہ میاں کو نہ جانے کیا کیا بھڑکایا ہوگا۔

"صبح تو بڑی بڑی باتیں کر کے گئی تھیں۔ ماں باپ کے لیے دو وقت کا کھانا دینا بھی مشکل تھا۔ چار دن تو رکھ لیتے ناک کی خاطر۔"

نادیہ نے اسد کی طرف دیکھا کہ شاید وہ کچھ بولے' لیکن وہ خاموش رہا۔

"امی اور بھائی تو بہت روک رہے تھے' لیکن اسد نے کہا کہ ان کے کام کون کرے گا' پھر کھانے پینے کا بھی مسئلہ ہے کون پکائے گا۔ اس لیے آگئی۔" نادیہ اطمینان سے کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ تلملاتی رہ گئیں۔

صبح اسد کا ناشتا تیار کر کے اس نے خود بھی ناشتا کیا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ نو بجے تک اٹھی تو حسب معمول ساس صاحبہ سو رہی تھیں۔ مدحت کی بھی آج کل یونیورسٹی کی چھٹیاں تھیں۔ کچن اور گھر کی حالت ابتر تھی' لیکن نادیہ نے بھی آج دلچسپی نہ لی جب گھر میں اور کسی کو فکر نہ تھی تو اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ اسے اب کیا کرنا ہے۔

گیارہ بجے وہ دونوں ماں بیٹی آگے پیچھے اٹھیں اور آکر کچن میں اٹھا پٹخ شروع کر دی۔ پہلے نادیہ یہ شور سن کر ڈر کے مارے فوراً" کچن کی طرف دوڑتی تھی' لیکن آج اس نے سنی ان سنی کر دی اور ادھر ادھر اپنے کمرے کی چیزیں سمیٹنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد پھپھو نے کہا۔

"ارے! کوئی فکر ہی نہیں ہے یہاں کسی کو۔ ذرا گھر کی حالت تو دیکھو۔ اب میں بوڑھی جان, بہو کے آگے پکا کر تو رکھنے سے رہی۔ اگر تم لوگوں کا یہ خیال ہے تو یہ بھول ہے تمہاری۔۔۔"

"پھپھو! میں کھانا پکا لیتی ہوں۔ آپ مدحت کو صفائی اور برتن دھونے کو کہہ دیں۔ مجھ سے سارا کام نہیں ہوتا۔" یہ سن کر وہ چپ سی ہو گئیں۔ بہو کے تیور کچھ اور کہہ رہے تھے۔

نادیہ نے کھانا پکا لیا' لیکن صفائی اور برتن پڑے رہے۔ آخر کافی دیر بعد مدحت نے بڑبڑاتے ہوئے برتن دھوئے' لیکن گھر اسی طرح پڑا رہا۔ نادیہ نے بھی کوئی نوٹس نہ لیا۔ ساس حسب معمول آج پھر اپنی بڑی بیٹی ماہین کے گھر روانہ ہو گئیں' شاید دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔

نادیہ نے دوپہر میں اپنے اور مدحت کے لیے چار روٹیاں ڈالیں۔ کھانا کھا کر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نماز پڑھی اور پھر لیٹ گئی۔

تین ساڑھے تین بجے دروازے پر گھنٹی بجی' لیکن وہ چپ کر کے پڑی رہی۔ مدحت نے ہی دروازہ کھولا نادیہ کا اندازہ درست تھا کہ اس تپتی دوپہر میں زرفشاں اپنے تین عدد بچوں کے ساتھ تشریف لائی ہوگی۔ زرفشاں نے نادیہ کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پا کر کچن میں گھس گئی۔ روٹی تو پکائی ہی نہ تھی۔ زرفشاں نے مایوس ہو کر پتیلی سے سالن نکالا اور ڈونگا بھر کر چلی گئی کہ روٹیاں تنور سے منگوا لے گی۔

شام پانچ بجے اسد دفتر سے لوٹا تو نادیہ کو کھانا لانے کو کہا۔ نادیہ کو پتا تھا کہ سالن تو زرفشاں لے گئی ہے۔ اس نے دو روٹیاں ڈالیں۔ آملیٹ بنایا اور سلاد اچار کے ساتھ ٹرے تیار کر کے اسد کے سامنے رکھ دی۔

"یہ کیا؟ نادیہ تم نے کھانا نہیں پکایا آج؟"

"میں نے تو پکایا تھا' لیکن دوپہر میں زرفشاں آئی تھی' وہ ہی لے گئی ہے۔"

"لیکن کیوں؟ کیا اس کے گھر کھانا نہیں پکتا۔۔۔؟ پھر کچھ تو بچا جاتی۔"

"یہ تو روز کا معمول ہے۔ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ روزانہ میں ان کو روٹی بنا کر دیتی ہوں تو وہ کھا کر چلی جاتی ہے اور کچھ سالن بچ جاتا ہے۔ آج روٹی نہیں تھی تو وہ پورا سالن لے گئی۔"

اسد نے بددلی سے کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر اسد آرام کرنے چل دیا۔ نادیہ نے نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر ہلکا پھلکا میک اپ کر کے چائے لے کر کمرے میں آگئی۔

"آج تو میری بیگم بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ خیریت تو ہے! کہیں جا رہی ہیں آپ؟" اسد مسکرایا۔

"جانا کہاں ہے۔ آج ویسے ہی دل چاہ رہا تھا۔ آپ کو اچھا نہیں لگا کیا؟"

"ارے نہیں یار! میں تو ترس ہی گیا ہوں تمہیں اچھے حلیے میں دیکھے۔"

"کیا کروں اسد! کچن سے ہی فرصت نہیں ملتی' پھر بھی پھپھو مجھ پر ناراض ہی ہوتی رہتی ہیں۔ مدحت تو پڑھائی میں مصروف رہتی ہے۔ میں کتنا بھی پکا لوں سب ختم ہو جاتا ہے۔ زرفشاں روز کھانے کے وقت آجاتی ہے یا بنا بنایا اٹھا کر چل پڑتی ہے۔ اس طرح تو اسد کام ختم ہی نہیں ہوتا' پھر گھر کا بجٹ بھی ڈسٹرب ہوتا ہے۔ کچھ آپ ہی امی کو احساس دلائیں۔"

آج وہ دونوں بڑے دنوں بعد سکون سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور شاید وجہ یہ بھی کہ ایک تو نادیہ نے کچن کی دردسری نہ پالی تھی۔ اس کی ساس گھر میں نہ تھیں' ورنہ وہ تو ان دونوں کو کبھی سکون سے بیٹھنے ہی نہ دیتیں۔ اسد خاموش ہو گیا۔ شاید اس کے دل کو بھی یہ باتیں لگی تھیں۔

✡ ✡ ✡

"ارے نادیہ! کہاں ہو تم؟ یہ کچن میں کیا حشر برپا ہے۔ گھر بھی ایسا ہی پڑا ہے' نہ کھانا پکا ہے۔ میں ایک دن گھر سے کیا نکلی' پیچھے سے سب ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔" امی کی آواز سن کر اسد بھی باہر آگیا۔

"پھپھو! کیا ہوا؟" نادیہ آہستگی سے بولی۔

شام کے کھانے کی کوئی فکر ہے کہ نہیں؟ اور یہ تیار شیار ہو کر کہاں جا رہی ہو؟"

"پھپھو! میں نے سالن بنا لیا تھا۔ دوپہر میں زرفشاں سارا سالن گھر لے گئی۔"

"ہاں! تو وہ دوپہر میں ادھر تھکی ہاری آئی' لیکن کسی نے کھانے کا بھی نہ پوچھا تو بے چاری کیا کرتی۔۔۔ سالن لے گئی۔"

"دوپہر میں میں سو رہی تھی۔ مدحت روٹی بنا دیتی۔ ویسے بھی وہ روز ہی ادھر کھانا کھاتی ہے۔ میری ذمہ داری نہیں ہے وہ۔"

"زرفشاں اپنے گھر میں کھانا کیوں نہیں بناتی امی؟" اسد جو چپ چاپ سب سن رہا تھا بول پڑا۔

"اچھا! تمہیں بھی بیگم نے پٹیاں پڑھا ڈالیں۔ یہ اس کی ماں کا گھر ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ میری بیٹیاں یہاں آئیں گی۔ تمہاری بیوی تو چاہتی ہی یہ ہے کہ کوئی گھر میں قدم نہ رکھے۔"

"امی! نادیہ نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ زرفشاں سارا سالن لے گئی تھی۔ میں نے بھی دوپہر میں آملیٹ کھایا ہے۔" اسد کو غصہ آگیا۔

"اسد! دیکھا آپ نے سارا تماشا۔۔۔ میں تھک گئی ہوں یہ سب سہتے سہتے۔ روزانہ زرفشاں اس کے بچے ہر ویک اینڈ پر ماہین باجی اور ان کے بچے۔۔۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ کبھی میں بھی گھر سے نکلوں؟ آپ کے ساتھ کہیں گھومنے جاؤں؟ کھانا پکانا' گھر کے کام اور اوپر سے ہر وقت طعنے تشنے۔۔۔ بس یہی کچھ رہ گیا ہے میری زندگی میں۔"

✡ ✡ ✡

ٹرن۔۔۔ ٹرن فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ نادیہ نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف ماہین باجی تھیں۔

"کیا حال ہے باجی! آپ ٹھیک ہیں؟" نادیہ بولی۔

ماہین نے حال احوال بتا کر اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"نادیہ! امی کو بتا دینا کہ ہم کل ویک اینڈ گزارنے

آئیں گے۔"

"اچھا! لیکن باجی! اسد تو کہہ رہے تھے کہ کافی عرصہ ہوا ہمیں گھر سے باہر نکلے ہوئے تو اس دفعہ ہم سب ماہین باجی کے گھر جائیں گے۔"

نادیہ نے جان بوجھ کر بات بنائی۔ ہر ویک اینڈ پر جو قیامت مچتی تھی' اس دفعہ اس کو کنٹرول کرنا تھا۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں؟ آپ لوگ ضرور آئیں۔" (ان کے لہجے میں مایوسی بھی تھی۔ ظاہر ہے سیر سپاٹا کا پروگرام ختم ہوا تھا۔) "پھر آپ لوگ کھانا ادھر ہی کھائیے گا۔ کب آئیں گے؟"

"شاید اتوار کے دن....."

"ٹھیک ہے! پھر میں دن کا کھانا بنا لوں گی۔" ماہین باجی بولیں۔ نادیہ بھی فون بند کرکے مسکرا دی۔

"اچھا ہے ذرا آپ بھی کچن کی گرمی برداشت کریں۔" اب اسد کو منانا اس کا کام تھا۔

اس طرح کے حربے استعمال کرکے نادیہ کو اپنا آپ بھی نندوں جیسا لگا' لیکن ایسا کرنا بھی مجبوری تھی۔

☼ ☼ ☼

اتوار کے دن سب لوگ زرفشاں اور اس کے بچوں سمیت ماہین کے گھر روانہ ہوئے۔ نادیہ کی ساس نے صبح ہی صبح شور مچا دیا۔

"ارے! وہ بے چاری اکیلے اتنے سارے لوگوں کا کھانا کیسے بنائے گی؟ جلدی نکلو سب۔ بہن کی مدد کروا دینا۔"

حالانکہ ہر ہفتے اتنا ہی کھانا نادیہ اکیلے بناتی تھی' لیکن بیٹیوں اور بہو کے بارے میں اس کی ساس کے اصول مختلف تھے۔ بالآخر یہ ساری فوج بارہ بجے تک ماہین کے گھر پہنچ گئی اور ماہین کے گھر کا عالم دیکھنے والا تھا۔ اتنے عرصے بعد آکر بھی نادیہ کو وہاں کوئی بہتری نظر نہ آرہی تھی۔ پردے ایک دو ہکوں کی مدد سے آدھے لٹکے' آدھے گرے پڑے تھے۔ ڈرائنگ روم میں بھی صوفہ بے ترتیبی سے پڑا تھا۔ ٹی وی ٹرالی ٹی وی کے علاوہ بے شمار چیزوں' دوائیں' اخبار اور اسی طرح کی دیگر فضول چیزوں سے بھری پڑی تھی۔

بیڈ رومز کا نقشہ بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ بیڈ پر کپڑوں کے ڈھیر تھے۔ کچھ کپڑے گٹھڑیوں کی صورت میں بیڈ کے نیچے گھسے پڑے تھے۔ کونے میں ایک چارپائی لگا کر اس پر میلے بستروں کا ایک ڈھیر تھا' جس پر چادر پھیلا کر چھپایا گیا تھا۔ ماہین باجی چیزیں سمیٹ سمیٹ کر ان کے بیٹھنے کی جگہ بنا رہی تھیں اور نادیہ کی ساس جو ہر وقت نادیہ کو طریقے سلیقے کے سبق پڑھاتی رہتی تھیں۔ اس سارے بکھرے ماحول کو ماہین کی خود ساختہ بیماریوں کے پیچھے دبانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

حالانکہ یہ سارا گھر ایک بدسلیقہ اور پھوہڑ عورت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ یہاں آتے ہی ماں بیٹیاں زرفشاں اور مدحت سب فعال ہوگئیں۔ بھاگ بھاگ کر ماہین کے ساتھ کاموں میں جت گئیں۔ نادیہ جان بوجھ کر بیٹھی رہی۔ ہر ہفتے ان سب کے میلے میں کبھی کسی نے نادیہ کا ہاتھ نہ بٹایا تھا۔

"السلام علیکم اسد بھائی اور بھابھی! کیسے ہیں آپ لوگ؟" یہ ماہین کے شوہر شفیق بھائی تھے جو بہت شریف اور سادہ سے انسان تھے' لیکن سسرال میں ان کے اکھڑپن کے قصے بہت مشہور تھے۔ انہوں نے گرمجوشی سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہیں آپ بھائی! آپ نے تو کبھی چکر ہی نہیں لگایا ہماری طرف۔" نادیہ اور اسد نے سلام کا جواب دیا اور پھر نادیہ نے پوچھا۔

"بس بھابھی! چھٹی کے دن بھی ہزاروں کام نکل آتے ہیں' لیکن آپ کی باجی اور بچے تو ہر ہفتے چکر لگا آتے ہیں۔"

"بھائی جان! آپ بھی ساتھ آجایا کریں نا! باجی کے آجانے سے آپ کو بھی کھانے کا مسئلہ ہو جاتا ہوگا۔" اسد بولا۔

"نہیں! کوئی بات نہیں..... کھانا تو ہمارے ہاں عام طور پر ہوٹل سے آتا ہے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ تلخی سے ہنسے۔

[نا]دیہ نے حیرت سے اسد کی طرف دیکھا۔ پھر وہ [ا]پنے ہی بات بڑھانے کو بولی۔

"شفیق بھائی! آپ کی بہن کیسی ہیں؟ اسی شہر میں [ہیں] تو وہ۔ ان کا چکر وغیرہ تو لگتا رہتا ہوگا؟"

"جی بھابھی! وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ہی جا کر مل [آتا] ہوں۔ دراصل چھٹی والے دن ہی سب کا نکلنا ہوتا [ہے] تو اس دن ماہین اور بچے آپ کی طرف چلے جاتے [ہیں] تو وہ بس عید وغیرہ پر چکر لگا لیتی تھیں' مگر اس دفعہ تو عید پر بھی ہمارے گھر میں تالا تھا۔ سو وہ عید پر بھی نہ [آ س]کیں۔"

نادیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسد بھی کچھ شرمندہ نظر آرہا تھا۔ یہاں آکر اس کو بھی حقیقت کچھ اندازہ ہو رہا تھا' ورنہ ہر ہفتے ماں بہنوں کی میٹنگ میں تو کچھ اور ہی سننے کو ملتا تھا۔ دن گزار کر شام میں وہاں سے واپسی ہوئی۔ نادیہ اسد سے ماہین اور اس کے میاں اور گھر کی گندگی پر حیرت کا مظاہرہ کیے بغیر نہ رہ سکی اور اسد بھی حیرت زدہ ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

آج نادیہ کو اسد کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ سستی اور متلی سی محسوس کر رہی تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہوا تھا چنانچہ اس نے اسد سے کہہ کر ڈاکٹر سے وقت لے لیا تھا۔

جانے سے پہلے اس نے ساس سے اجازت مانگی۔ مدحت بھی پاس ہی بیٹھی تھی۔

"پھپھو! ہم ذرا جا رہے ہیں ڈاکٹر کے پاس..... مدحت! تم شام میں ذرا کچن دیکھ لینا۔"

"ارے! کیوں بھئی؟ اب تمہیں کیا ہوگیا؟" لہجہ حسب معمول طنزیہ تھا۔

"آج تو شام میں زرفشاں اپنے میاں سمیت آرہی ہے۔" اسد بھی جانے کو تیار پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔

"امی! آج ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔ کل میرے پاس ٹائم نہیں ہوگا۔ پھر زرفشاں کا اپنا گھر ہے۔ مدحت! تم اور زرفشاں مل کر کھانا بنا لینا۔" نادیہ کے بجائے اسد بولا۔

"اس وقت ڈاکٹر کے ہاں جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" وہ تیکھے لہجے میں بولیں۔

"امی! شاید قدرت ہم پر مہربان ہو جائے اور ہمارے گھر میں بھی بچوں کی قلقاریاں گونجیں۔" اسد بولا۔

"ہاں' ہاں! اسی طرح بیویاں شوہر کو نخرے دکھاتی ہیں۔ دو سال سے تو اولاد ہوئی نا! اب کیا ہونا ہے۔" اسد کو برا تو لگا' لیکن وہ خاموشی سے نادیہ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نائلہ نے اسد کو باپ بننے کی خوش خبری سنائی اور ساتھ ہدایت بھی کی۔

"نادیہ! آپ کو بہت احتیاط سے وقت گزارنا ہے۔ بہت زیادہ تھکنے والے کام نہیں کرنے ہیں۔ خوراک کا خاص خیال رکھیں اور ٹینشن سے دور رہیں۔"

اسد اور نادیہ کی خوشی دیدنی تھی۔ واپسی پر اسد' نادیہ کو ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہاں ان دونوں نے رات کا کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر گھر دیر سے واپسی ہوئی۔ مدحت نے آکر دروازہ کھولا اور چپ چاپ چلی گئی۔

اسد اور نادیہ تو گھر میں موجود نہ تھے۔ زرفشاں نے پیچھے سے ماں کو خوب بھڑکایا۔ ساتھ مدحت بھی مل گئی۔

"امی! اتنی دیر تک تو یہ ڈاکٹر کے پاس نہ بیٹھے ہوں گے۔ ضرور کہیں کھانا کھا رہے ہوں گے۔ انہیں آپ دونوں کا ذرا خیال نہیں ہے۔ کیا تھا' اگر آپ کو بھی ساتھ لے جاتے۔" صبح ناشتے پر ہی انہوں نے خبر لی۔

"آگئے رات کو بیگم کے ساتھ سیر سپاٹے کرکے..... ڈاکٹر کے بہانے تم دونوں کھانا کھانے چل دیے۔ ارے! ہم زیادہ تو نہ کھا جاتے' اگر ہمیں بھی ساتھ لے جاتے۔"

"امی! آپ ناراض نہ ہوں۔ واپسی پر اچانک پروگرام بن گیا۔ پہلے سے ارادہ نہ تھا۔ اچھا! چھوڑیں ساری باتیں۔ آپ کو ایک خوش خبری سنانا تھی۔ آپ سنیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ آپ دادی بننے والی ہیں۔"

"اچھا! شکر ہے اللہ کا کہ اس گھر کو بھی کوئی خوشی کی خبر ملی۔" ان کے لہجے میں خوشی کا عنصر مفقود تھا۔
اسد نے بھی محسوس تو کیا، لیکن وہ چپ ہو گیا، پھر نادیہ کو آواز دی، جو کچن میں ناشتا بنا رہی تھی۔
"نادیہ! جلدی سے ناشتا لاؤ۔ دفتر سے دیر ہو رہی ہے۔"

✡ ✡ ✡

دوپہر میں زرفشاں اسکول سے سیدھی ادھر آئی۔ کھانا کھا کر آرام کیا، پھر شام کی چائے پی کر ماں، بہن سے اچھی طرح گپ شپ لگا کر شام ڈھلے گھر کو روانہ ہوئی۔ اسے میاں کے آنے جانے کا بھی کوئی خیال نہ تھا۔ نادیہ کے پوچھنے پر بے نیازی سے بولی۔
"اشفاق کے پاس دوسری چابی ہے۔ اگر وہ پہلے آجائیں تو انہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"
میاں کا دفتر سے واپس آکر صرف گھر میں داخل ہونا تو مقصد نہیں ہوتا۔ ہر شوہر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ واپسی پر بیوی بچے گھر میں ملیں اور اسے کوئی تو کھانے پانی کا پوچھنے والا ہو، لیکن یہ باتیں زرفشاں کو کون سکھاتا۔ ماں تو بیٹیوں کو صرف شوہروں سے لڑنے کے طریقے ہی سکھاتی تھیں۔ باقی حقوق و فرائض کا انہیں کچھ خیال نہ تھا۔ اسی لیے بیٹیوں کے گھروں میں سارا سال لڑائی ہی چلتی رہتی، پھر ان کے نصیب کا رونا رویا جاتا۔
بہر حال زرفشاں روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی غصے سے تنتناتے ہوئے واپس آگئی اور ماں کے سامنے خوب واویلا کیا۔ اسد کو بھی شامل کر لیا گیا۔ واویلے کی وجہ یہ تھی کہ آج جب زرفشاں نے گھر جا کر تالا کھولنے کی کوشش کی تو چابی نہ لگی۔ آج اس کا میاں تالا بدل کر لگا گیا تھا۔ شاید اس نے اپنے غصے کا اظہار اس طرح کیا تھا اور زرفشاں اپنے دیر سے گھر جانے پر بجائے شرمندہ ہونے کے، خوب شور مچا رہی تھی اور ماں، بہن ہر بات پر ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ اسد بھی اس بحث میں شاید ان ہی کا ہمنوا تھا۔

"بس لعنت بھیجو اس منحوس پر۔ میری بیٹیوں کی تو قسمت ہی خراب ہے۔ شاید ان کی قسمت میں اچھے مرد لکھے ہی نہ تھے۔ لوگ تو اپنی بیویوں کے پیچھے دیوانے ہوئے پھرتے ہیں۔"
نادیہ چائے لے کر آئی تو بطور خاص اس کو سنایا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے چائے رکھ کر پلٹ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس ساری بات چیت میں اس کو بھی لپیٹ لیا جائے گا۔
"اسد! آپ زرفشاں کو سمجھائیں۔ ہر روز میاں سے لڑائی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اپنے بچوں کا ہی کچھ خیال کر لے۔ اگر آپ دفتر سے واپس آئیں اور میں ہر روز گھر پر نہ ہوں، کھانا تیار نہ ہو تو کیا آپ کو غصہ نہیں آئے گا؟ روز روز ہوٹل کا کھانا صحت پر برا اثر ڈالتا ہے۔ آپ جانتے ہیں نا! باہر کے کھانے کیسے ہوتے ہیں۔ آپ زرفشاں کو شہہ مت دیں۔ خدانخواستہ اس کا گھر خراب ہو گیا تو بچوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ آپ کو اشفاق بھائی سے بھی بات کرنی چاہیے اور اصل معاملہ پوچھنا چاہیے۔"
یہ بات اسد کے دل کو لگی۔ اس نے اشفاق کا نمبر ملایا اور اس کو فون کر کے گھر آنے کو کہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد آگیا۔
اسد نے تحمل سے اس سے حال احوال پوچھا۔ نادیہ چائے لے آئی۔ باقی سب کو تو اس کا آنا ناگوار ہی گزرا۔ تھوڑے حال احوال کے بعد اسد اصل بات کی طرف آگیا۔
"اشفاق بھائی! کیا مسئلہ ہوا ہے آج؟ زرفشاں گھر گئی تو وہاں تالا تبدیل تھا۔"
"اسد! میں نے ہی تالا تبدیل کیا ہے۔ زرفشاں کے گھر آنے کا کوئی ٹائم نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی سرائے ہے، جہاں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے لیے جب جس کا دل چاہے، وہ آئے۔ ہر روز دفتر سے واپسی پر گزر، خالی گھر میرا استقبال کرتا ہے۔ ایک پیالی چائے کو دل چاہے تو خود بنا کر پینا پڑتی ہے۔ صبح زرفشاں اور بچے اسکول کے لیے نکلتے ہیں اور رات گئے واپس آتے

ہیں۔ میں روزانہ ہوٹل سے کھانا لے کر کھاتا ہوں۔ زرفشاں کو گھر کا' میرا کچھ احساس نہیں ہے۔ اب آپ خود بتائیں کہ میں کیا کروں؟"

ساری تفصیل سن کر اسد کو حیرت کے ساتھ شرمندگی بھی ہوئی کہ ماں بہنیں تو بالکل مختلف حالات بتایا کرتی تھیں اور اسد بھی اپنے کاموں میں مصروف رہ کر اتنی تحقیق اور سوچ بچار نہ کرپایا کہ اصل مسئلہ کہاں پر ہے؟

"زرفشاں! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تمہیں کم از کم گھر کا کچھ تو خیال ہونا چاہیے۔ میاں کے آنے پر کھانا دینا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"بھائی! میں نوکری کرتی ہوں۔۔۔ تھک جاتی ہوں تو اس لیے ادھر آجاتی ہوں۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"اگر نوکری اتنی مشکل ہے تو یہ بے شک چھوڑ دے۔ جتنی بھی میری آمدنی ہے۔ میں گھر اور بچوں کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی اس کو مجبور نہیں کیا۔" اشفاق بے چارگی سے بولا۔

"زرفشاں! تم نوکری کرنا چاہتی ہو تو گھر کے معمولات بھی ٹھیک کرو ورنہ نوکری چھوڑ دو۔ شوہر اور بچوں کی ذمہ داری تمہارا پہلا فرض ہے۔۔۔ اور یہ ہر روز ادھر آنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنا گھر سنبھالو۔" اسد تھوڑا غصے سے بولا۔

زرفشاں کو برا لگا۔ ماں بہن نے بھی پہلو بدلے لیکن اسد کے سامنے خاموش رہیں۔ ظاہر ہے' وہ واحد کماؤ پوت بھی تو تھا۔

منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے زرفشاں غصے سے اشفاق کے ساتھ روانہ ہوئی۔ اسد نے بھی کوئی پروانہ کی۔ اس کے جانے کے بعد ماں نے اسد کی کلاس لی' لیکن اسد نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔

✲ ✲ ✲

نادیہ کی طبیعت آج کل خراب چل رہی تھی۔ رات کا کھانا بنا رہی تھی تو کھانے کی خوشبو سے متلی ہونے لگی' پھر الٹی آگئی۔ اسد نے دیکھا تو اس کو آرام کی ہدایت کرکے مدحت کو کھانا بنانے کو کہا۔

رات خیریت سے گزری۔ صبح نادیہ اٹھی تو کچھ بہتر تھی' پھر کچن میں چل دی۔ آج پھر ساری بہنیں اولاد سمیت براجمان تھیں۔ نادیہ نے ناشتا بنانا شروع کیا۔ چائے پراٹھے تو بنا دیے تھے' لیکن جوں ہی انڈے فرائی کرنے لگی تو پھر الٹیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ باتھ روم میں نادیہ الٹیاں کررہی تھی کہ اسد آواز سن کر بھاگا آیا۔

"کیا ہوا نادیہ؟"

"وہ ناشتا بنا رہی تھی تو خوشبو سے پھر۔۔۔"

"جب پتا ہے کہ طبیعت خراب ہوتی ہے تو کیوں کچن کی طرف چل پڑتی ہو؟" اسد نے اس کو پکڑ کر بیڈ پر لٹایا۔

"پھر کیا کروں؟ ہر وقت مجھے کوئی بیڈ پر پڑنے دے گا؟ پتا نہیں ہے آپ کو؟"

"اچھا! کچھ نہیں ہوتا۔ بس تم ادھر آرام کرو۔ اب کچن کی طرف مت جانا۔ میں تمہارے لیے ناشتا بھجواتا ہوں۔"

نادیہ لیٹی تو کمزوری سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر وہ سو گئی۔

باقی سب نے ناشتا کیا یا نہیں' اسے معلوم نہ تھا۔ کافی دیر بعد آنکھ کھلی تو بھوک محسوس ہوئی۔ کچن کی طرف گئی تو ناشتے کے برتنوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے سے ماں بیٹیوں کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ گھر کی کسی کو فکر نہ تھی۔ نادیہ نے چائے بنائی۔ دو سلائس سینکے اور ناشتا کرنے لگی۔

ابھی ناشتا شروع ہی کیا تھا کہ ساس آن پہنچیں اور پاس ہی چلتے پھرتے بڑبڑانے لگیں۔

"دوپہر کا ایک بج رہا ہے اور بہو کو کسی کام کی خبر ہی نہیں ہے۔ پتا بھی ہے کہ گھر میں بچیاں آئی ہوئی ہیں۔ کم از کم بندہ خود ہی خیال کرلیتا ہے۔"

"میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ صبح ناشتا بھی مشکل سے بنایا ہے۔" نادیہ بولی۔

"اب ایسا تو ہوگا۔ نو ماہ بستر پر تو نہیں گزارے تھے۔ ہر عورت اسی مرحلے سے گزرتی ہے۔ گھر کے کام بھی خود ہی کرتی ہیں سب۔۔۔ اس طرح تو گزارہ نہیں ہوتا۔"

"الٹیاں کرکے میرا برا حال ہے۔ آپ زرفشاں وغیرہ سے کہہ دیں' وہ اپنے لیے کھانا بنالیں۔" نادیہ کچھ غصے اور کچھ کمزوری سے بولی۔

"پہلے میں ہی کرتی تھی سارا کام۔۔۔ اب نہیں ہوتا تو کیا کروں؟"

"میری بچیاں دو دن آجائیں تو تمہیں تکلیف ہونے لگتی ہے۔ ہر طریقے سے تم انہیں تنگ کرتی ہو اور اب تو اسد کے کان بھی بھرنے لگی ہو۔"

ان دونوں کی آوازیں سن کر اسد بھی کمرے سے نکل آیا تھا۔ زرفشاں اور ماہین بھی بھاگی آئیں۔

"بھابھی! آپ امی سے کیوں لڑ رہی ہیں؟"

"تم امی سے بدتمیزی کیوں کررہی ہو نادیہ؟" ماہین باجی بولیں۔

"دن چڑھے اٹھ کر امی سے کیوں لڑنا شروع ہوگئی ہو تم؟ ایسی ساس ہوگی کوئی' جو اس وقت تک بہو کو سونے دے؟"

"میں لڑ نہیں رہی تھی۔ یہ تو آپ کی امی مجھے دیکھتے ہی شروع ہوگئیں۔ صبح میں نے ناشتا بنایا تو میری حالت خراب ہوگئی۔ اسد نے خود ہی مجھے آرام کا کہا تھا۔ ویسے بھی یہ لڑائی آپ سب کی وجہ سے ہے۔ ہر ہفتے یہاں جو میلہ لگتا ہے۔ آپ کی ماں کا گھر ہے۔ خود پکاؤ اور کھاؤ۔ مجھ پر کس بات کا رعب ہے؟ اپنی نندوں کو تو کبھی منہ نہ لگایا۔۔۔ ساس سسر سے کبھی عید کے عید بھی نہ ملیں۔ میاں کو کبھی وقت پر کھانا نہیں دیا۔ مجھ سے بڑی توقعات ہیں۔"

"اسد! کبھی آپ نے اپنی بہنوں کو ان کے فرائض بتائے ہوتے تو اس طرح ہر وقت مجھے یہاں تنگ نہ کیا جاتا۔ آپ کی امی کی ہر وقت کڑوی کسیلی باتیں میں برداشت کرتی ہوں۔ ہر لمحہ مجھ پر تنقید ہوتی ہے۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟ سارا دن میں کام کرتی ہوں کبھی کسی نے اس کی تعریف کی؟ مجھ سے تو سیدھے منہ بات تک نہیں کی جاتی۔" نادیہ رونے لگی۔ اس کا رنگ پیلا پڑگیا۔ غصے' نقاہت اور کمزوری سے وہ ہانپنے لگی۔ اس کا ناشتا وہیں پڑا رہ گیا اور آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

اسد اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک دم گھبرا گیا۔ بھاگ کر اسے پانی پلایا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی شاید اس کا بی پی لو ہوگیا تھا۔ اسد اسے اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے اسے ڈرپ لگائی اور کہا۔

"یہ پریگننٹ ہیں' ان کے آرام اور خوراک کا بہت خیال رکھیں۔ یہ سب کمزوری کی وجہ سے ہے۔ فروٹ اور دودھ لازمی دیں۔" نادیہ کے سامنے رکھا ناشتا اسد کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ شاید نادیہ نے رات سے کچھ بھی نہ کھایا تھا۔ چلو! نادیہ کا خیال نہ رکھیں' نہ سہی۔ گھر میں لڑائی جھگڑا تو نہ کریں۔

شادی کے بعد سے اب تک نادیہ نے اس کی ہر بات مانی تھی۔ وہ ماں بہنوں کو بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اوپر والا پورشن جو کرائے پر تھا' اس کو خالی کرا کے اپنا گھر سیٹ کیا جائے تاکہ روز روز کی اس ٹینشن سے نجات ملے۔

اسے یقین تھا کہ ماں بہنوں کو گھر سنبھالنا پڑا تو دو دن میں ہی انہیں نادیہ کی قدر آجائے گی۔ پھر ان کے رویے تبدیل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔

"اسد!" نادیہ نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔

"ہاں نادی! تم ٹھیک تو ہو نا؟ پریشان مت ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اسد نے اس کا ہاتھ تھاما۔

نادیہ نے سکون سے آنکھیں موندلیں۔ شاید اس کے صبر کا امتحان ختم ہوا چاہتا تھا۔

آمنہ ریاض

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کا دن رات نوکری کی چکی میں تپتے گزر رہا ہے۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینہ کی مریض ہے۔ جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور مجتبی خاتون ہیں۔ ولی' جولید اور اینیا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں اینیا سے دوستی

ہوجاتی ہے۔

شبیہہ العباس طبعتاً "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ' تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہوجاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ' تنوی کا منگیتر ہے' وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے' لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد' جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی۔

ثروت' دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن' ثروت کو فون کرکے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہوگئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ' ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس' ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ' رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ' ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جاکر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کردیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں' لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً" ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ' ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں' جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے.... ماوی' ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان' ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ' ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر' نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہوجاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے' وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد' بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو' رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہوپاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت تند آور ہورہی ہے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کرسکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کرلیں۔ جو ذہنی

معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کردیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ماوی آئرش نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آجائے گی۔

ثمینہ نے ماوی سے کہا' وہ اس کی شادی جلال سے طے کرچکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہوگا تاکہ حویلی جاسکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کرسکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھاکر خودکشی کی کوشش کی۔

ماوی بالآخر ثمینہ کی بات مان کر حویلی چلی گئی۔ جنت بیگم گاؤں سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مستقیم بھٹی اور دیگر لوگوں نے ماوی کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ وہ سب رجب اور ثمینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رجب کی جائیداد ماوی کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم شبیہہ العباس کو یہ منظور نہیں۔ وہ جنت بیگم کے آنے تک کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ماوی کا دشمن ہوگیا اور اس نے اپنی تمام کزنز کو ماوی سے بات کرنے سے منع کردیا۔ ماوی کو یہ پتا چلا تو اس نے مستقیم بھٹی سے اس کی شکایت کردی۔ انہوں نے ماوی کے سامنے شبیہہ العباس کو ڈانٹا۔

فیضان ملک میں واپس آگئے۔ وہ سیدھے ثمینہ کی انیکسی پہنچے۔ انیبا نے انیکسی کی چابیاں ان کے حوالے کردیں۔ مگر ثمینہ کے انیکسی چھوڑ کر چلے جانے کا نہیں بتایا۔

ماوی کو حویلی کے ایک حصے اور ملازمین کے رویے میں عجیب پر اسراریت کا احساس ہوا تو اس نے تمام حالات جاننے کے لیے ایک خاص ملازمہ تسنیم سے دوستی کرلی۔

وہ جنت بیگم کی حویلی میں واپسی کی شدت سے منتظر تھی' جب ہی ایک صبح اسے شبیہہ کے ساتھ جنت بیگم نظر آئی۔ جنت بیگم کے ساتھ جلال بھی تھا۔ وہ ماوی کو حویلی میں دیکھ کر حیران رہ گیا تاہم اس نے اپنے تاثرات ظاہر نہ ہونے دیے۔ جنت بیگم نے ماوی کو یہاں دیکھ کر مستقیم بھٹی پر بے حد غصہ کیا۔ جنت بیگم نے تنہائی میں ماوی سے حویلی آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کو وہ اپنے باپ کے قاتل کا سراغ لگانے اور جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہے۔ جنت بیگم نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے حرم کی شادی کے بعد حویلی سے باہر نکال دے گی۔

فیضان' ماوی کی پراسرار گمشدگی سے پریشان ہیں۔ ثمینہ ان سے کہتی ہیں کہ ماوی پاکستان میں ہی ہے لیکن انیبا انہیں بتاتی ہے کہ ثمینہ نے اسے بتایا ہے وہ آئرلینڈ واپس چلی گئی۔

رات کے وقت جلال' ماوی سے ملنے اس کے کمرے میں گیا تو شبیہہ نے اسے وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ شبیہہ نے جلال سے بازپرس کی تو جلال نے اسے بتادیا کہ وہ ماوی سے نکاح کرچکا ہے۔ جب وہ شبیہہ کو یہ بات بتارہا تھا تو تنوی نے سب کچھ سن لیا۔ اس نے حرم اور نمل کو بھی بتایا مگر انہیں یقین نہیں آیا۔ فیضان کو پتا چل گیا کہ ماوی حویلی میں ہے۔ فیضان' ثمینہ پر بے حد ناراض ہوئے۔

ماوی نے حویلی کی خاص ملازمہ تسنیم کو آمادہ کرلیا کہ وہ اسے حویلی کے تمام رازوں سے آگاہ کرے گی۔ حرم کی مہندی کی تقریب ہورہی تھی۔ سب لوگ اس میں مصروف تھے جب تسنیم نے ماوی کو ملنے کا اشارہ کیا۔ ماوی حویلی کے عقبی حصے میں گئی تو وہاں اسے تسنیم کے بجائے ایک لاغر سا ڈھانچہ نما شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہوگئی۔

وہ تسنیم کا باپ ہوتا ہے۔ تسنیم بتاتی ہے کہ جنت بی بی نے کئی سالوں سے اسے اس کال کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے۔

برابر والے گاؤں کے چوہدری فیاض نے جنت بی بی کی زمینوں کا پانی بند کردیا۔ یہ قضیہ نمٹانے کے لیے جنت بی بی رجب علی اور رب نواز کو بھیجتی ہے۔ وہاں طیش میں آکر رب نواز پستول نکال لیتا ہے۔ رجب علی منع کرتا ہے اور اس سے پستول چھینتا ہے۔ اس چھینا جھپٹی میں گولی چل جاتی ہے اور چوہدری فیاض کا آدمی ہلاک ہوجاتا ہے۔ رب نواز

یہ الزام رجب علی پر لگاتا ہے مگر ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر جنت بی بی کے سامنے اقرار جرم کرلیتا ہے۔ جنت بی بی اسے زبان بند رکھنے کا حکم دیتی ہے اور دونوں کو بچالیتی ہے' تاہم رجب کے سر پر احسان ڈال دیتی ہے۔
انیبا دانیال حسن سے ماں کو واپس لانے کو کہتی ہے۔ وہ سختی سے منع کردیتے ہیں۔ دوسری طرف ثروت بھی مصالحت
تسنیم کے باپ نے ماوی کو رجب علی کا خط دیا۔ ماوی نے اپنے کمرے میں جاکر ابھی خط کھولا ہی تھا کہ جنت بیگم اور دیگر لوگ ادھر آگئے۔ ماوی نے سب کے سامنے جنت بیگم کو اپنے باپ کا قاتل کہا اور ثبوت کے طور پر وہ خط پیش کیا۔ تاہم اس خط میں رجب علی نے لکھا تھا کہ میں خودکشی کررہا ہوں۔ جنت بیگم نے کہا کہ میں اسے یہ الزام لگانے پر سزا دوں گی۔ دانیال حسن نے ولید اور انیبا کی گفتگو سنی تو انہیں پتا چل گیا کہ ولید نے فیضان اور انیبا کے تعلق کے بارے میں دانیال حسن سے جھوٹ بولا تھا' کیونکہ انیبا نے بھی ان سے ولید کی شکایت لگائی تھی۔
دانیال حسن نے اشتعال میں ولید کو مارا تو وہ گھر چھوڑ کے چلا گیا۔
شبیہہ ایک کام کے سلسلے میں شہر آیا ہوا تھا۔ اس نے ولید کو تین مشکوک لڑکوں کے ساتھ دیکھا۔ اس نے ان کا پیچھا کیا تو دیکھا کہ وہ لڑکے ولید کو زخمی حالت میں ایک سنسان جگہ پر ڈال گئے تھے۔ وہ اسے اسپتال لے گیا۔
فیضان نے دانیال حسن سے ملے بغیر انیکسی چھوڑ دی اور ایک اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوگئے۔ وہاں جانے کے بعد انہیں پتا چلا کہ ولید اسپتال میں ہے۔
ماوی حویلی چھوڑنے سے پہلے تسنیم اور اس کے باپ سے ملنے گئی تو باہر سے کسی نے دروازہ بند کردیا۔

— ۲۸ —
اٹھائیسویں قسط

ماوی نے ہراساں ہو کر دروازہ پیٹ ڈالا۔
لیکن جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ کوئی بھی کوشش بیکار رہے گی۔ دروازے کو باہر سے بند کیا گیا تھا اور اس کام میں اتنی احتیاط برتی گئی تھی کہ دروازے کے نزدیک بیٹھے ہونے کے باوجود وہ کنڈی لگنے کی آواز نہیں سن سکی تھی۔ کچھ دیر دروازہ بجانے اور مدد کے لیے پکارنے کے بعد وہ تھک کر اور قدرے مایوس ہو کر بیٹھ گئی۔ تسنیم کا باپ دوبارہ گہری نیند میں جاچکا تھا۔ گو کہ اگر وہ جاگ بھی رہا ہوتا تو بھی کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا کیونکہ وہ تو ماوی سے بھی زیادہ بے بس تھا۔
وہاں بیٹھ کر ماوی کو اپنی حماقت اور الجھی ہوئی زندگی کا احساس از سر نو ہوا تھا۔ ابھی وہ ان ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ معاً دروازے کے دوسری طرف اسے کھٹکے کا احساس ہوا۔ ماوی سرعت سے دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ کھلا اور جو چہرہ اسے دکھائی دیا' وہ جلال کا تھا۔
"چلو....." اس سے قبل کہ وہ صورت حال کا تعین کرپاتی' جلال نے اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا اور فوراً آگے بڑھ گیا تھا۔
"جلال۔" ماوی نے اسے بے ساختہ پکارا تھا۔
"جلال! پلیز میری بات سنو۔" ماوی دو قدم اس کی طرف بڑھی۔ شاید بات کرنے کے لیے اس سے اچھا موقع اسے دوبارہ نہ مل پاتا لیکن جلال آگے بڑھتا رہا تھا۔ یہاں تک وہ دونوں حویلی کے مرکزی حصے کے قریب پہنچ گئے۔
"رکو جلال! تم میری بات کیوں نہیں سن رہے۔" ماوی نے تیزی سے سامنے آکر اس کا راستہ روکا۔
"تمہاری ضروری باتیں میں پھر کسی وقت بھی سن سکتا ہوں۔" جلال نے جھنجلا کر کہا۔ "لیکن اگر بی جان کو خبر مل گئی کہ میں نے تمہیں اس کوٹھڑی سے آزاد کروالیا ہے تو وہ پھر تمہیں وہیں پہنچادیں گی اور میں کچھ بھی نہیں کر

سکوں گا اور اس کے بعد تمہارا وہی حشر ہوگا جو تسنیم کے باپ کا ہو رہا ہے......"
جلال نے کچھ لمحوں کا توقف کیا تھا۔ ماوی کی آنکھیں کچھ پھیل سی گئی تھیں۔ وہ چشم تصور سے خود کو اس چارپائی پر بے یارومددگار لیٹا ہوا دیکھ رہی تھی جو تسنیم کے باپ کے لیے مخصوص تھی۔
"اس سے پہلے کہ کوئی آجائے' ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" جلال نے کہا۔
ماوی نے بنا سوچے سمجھے اس کی تقلید کی۔ حویلی کی دو چار راہداریاں مڑنے کے بعد جلال اسے ایک کمرے میں لے آیا۔
"جب تک میں واپس نہ آؤں' اس کمرے سے باہر نکلنے کی حماقت مت کرنا....."
"لیکن جلال.....!" ماوی نے کہنا چاہا مگر جلال جلدی میں تھا۔
"پھر بات کریں گے ماوی! ابھی میں جلدی میں ہوں۔ تم پلیز باہر نہ نکلنا۔"
وہ باہر چلا گیا۔ ماوی نے لاک لگنے کی آواز سنی تھی پھر وہ گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایک کمرے سے نکال کر وہ دوسرے کمرے میں قید کردی گئی تھی اور ایسا کیوں ہوا تھا وہ یہ نہیں جانتی تھی' صرف وجوہات کے متعلق قیاس آرائی کرسکتی تھی سو کررہی تھی کیونکہ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

شبیہہ اسپتال کے کاریڈور میں کھڑا تھا' جب اس نے اپنے موبائل فون پر جنت بیگم کی کال ریسیو کی۔
"شبیہہ! تم واپس کب آرہے ہو؟"
"میں جس کام کے لیے آیا تھا وہ ابھی پورا نہیں ہوا۔"

شبیہہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا تھا۔ اس کی نظریں اس دروازے پر مرکوز تھیں جہاں ولید کو رکھا گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کی ملاقات انیبا سے ہوئی تھی۔ اس نے شبیہہ کا شکریہ ادا کیا تھا کہ وہ بروقت نہ صرف ولید کو اسپتال لے آیا تھا بلکہ انہیں اطلاع بھی دے دی تھی۔ دانیال حسن نے البتہ ایسی کوئی زحمت گوارا نہ کی تھی۔
"بی جان! شاید دو تین دن مزید رکوں۔" شبیہہ نے کہا تھا۔
"کیا کوئی بہت ضروری کام ہے؟" جنت بیگم نے پوچھا۔
"نہیں' کوئی اتنا خاص بھی نہیں۔" شبیہہ کو جنت بیگم کے انداز میں کچھ خاص بات کا احساس ہوا تھا۔
"ٹھیک ہے پھر تم واپس آجاؤ....."
"خیریت تو ہے نا بی جان؟"
"ہاں! خیریت ہے لیکن حویلی میں تمہاری زیادہ ضرورت ہے اس لیے میں چاہتی ہوں' تم ابھی واپس آجاؤ۔" جنت بیگم نے حکمیہ انداز میں کہا تھا۔
"میں ابھی نہیں آسکوں گا بی جان! ابھی کام باقی ہے۔" شبیہہ نے کہا تھا۔
"کام پھر کبھی کرلینا۔ میں نے کہا نا' یہاں تمہاری موجودگی زیادہ ضروری ہے۔"
"لیکن..... اچھا ٹھیک ہے۔" شبیہہ نے اپنی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔
"میں تمہارا انتظار کررہی ہوں۔" جنت بیگم نے فون بند کردیا تھا۔
شبیہہ نے فون جیب میں رکھتے ہوئے بے زاری سے نفی میں سر ہلایا۔ کبھی کبھی جنت بیگم اپنے احکامات سے اسے زچ کرکے رکھ دیتی تھی۔ وہ بے زار ہوتا یہی سوچ رہا تھا جب یونہی اس کی نظر کاریڈور کے کنارے پر پڑی۔

انیبا کی معیت میں حواس باختہ سی ثروت آ رہی تھیں۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اڑ کر ولید تک پہنچ جائیں۔ شبیہہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا' انہیں آتا دیکھ کر وہ سیدھا ہوا لیکن ثروت اس پر نظر ڈالے بغیر کمرے میں چلی گئیں۔ شبیہہ کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ غیر ارادی طور پر وہ چاہتا تھا کم سے کم ثروت اس کے سر پر ہاتھ ہی پھیر دیں لیکن ان کے انداز میں صرف ولید کے لیے فکر مندی تھی۔ صرف اس کے لیے آنسو تھے۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی ولید اسے خود سے زیادہ خوش قسمت محسوس ہوا تھا اور اس بات نے اس کے دل میں پہلے سے موجود حسرتوں کو اور بڑھا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

جلال نے فی الفور شبیہہ کو کال کی تھی۔

"تم کہاں ہو شبیہہ! واپس کب تک آنا ہے؟" اس نے بعجلت پوچھا۔

"کیا قیامت آ گئی ہے بھئی۔" شبیہہ جھنجلا گیا۔ "ابھی بی جان کا فون آیا تھا' وہ بھی یہی پوچھ رہی تھیں۔"

"اچھا بی جان نے بھی تمہیں کال کی تھی؟" جلال کچھ حیران ہوا۔ "حیرت ہے۔"

"بعد میں حیران ہو لینا۔ پہلے مجھے بتا دو' آخر معاملہ کیا ہے۔"

"نہیں فون پر بتانے والی بات نہیں ہے۔ تم واپس آجاؤ تب ہی بات ہوگی۔ کتنی دیر میں پہنچ جاؤ گے؟" جلال نے بتا کر پوچھا۔

"میرا آج واپسی کا ارادہ نہیں ہے لیکن بی جان کا آرڈر ہے کہ آج ہی واپس آجاؤں۔" شبیہہ کا انداز اکتاہٹ آمیز تھا۔

"لیکن تم تو آج ہی واپسی کے ارادے سے گئے تھے۔ میرا خیال تھا اب تو واپسی کے لیے نکل بھی گئے ہو گے۔"

"ہاں ارادہ تو خیر یہی تھا کہ آج ہی واپس آؤں گا لیکن یہاں ایک مسئلہ ہو گیا تھا۔"

اس نے مختصر لفظوں میں ولید کے متعلق اسے بتا دیا۔

"جب تک پولیس انکوائری مکمل نہیں کر لیتی۔ میرا نکلنا مشکل ہے۔ آئی وٹنس کے طور پر میرا بیان لیا جائے گا اور یہ بات میں بی جان کو نہیں بتا سکتا۔ وہ تو سنتے ہی قیامت کھڑی کر دیں گی کہ میں..... امی کی فیملی کے ساتھ ہوں۔"

اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو یقیناً "جلال اس کے منہ سے ثروت کے لیے امی کا لفظ سن کر خوش ہوتا لیکن اس وقت تو وہ خود الجھا ہوا تھا۔

"ہاں! تمہارا وہاں رہنا ضروری ہے لیکن شبیہہ! مجھے بھی یہاں تمہاری ضرورت ہے۔ تم کسی بھی طرح واپس آنے کی کوشش کرو۔"

"آخر ہوا کیا ہے۔ بی جان کو تو خیر اپنی بات منوانے کی عادت ہے تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے۔"

جلال نے حقیقت حال سے آگاہ کرنے سے پہلے ایک گہری سانس لی تھی۔

"تم نے بتایا تھا کہ بی جان ماوی کو سزا دینے کا ارادہ رکھتی ہیں لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا پلاننگ کر رہی ہیں اور میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ماوی کو قید کر کے رکھیں گی۔"

"کیا مطلب.....؟" شبیہہ الجھا۔

"یار! بی جان نے ماوی کو پچھلی کوٹھڑی میں بند کروا دیا تھا غیر معینہ مدت کے لیے۔ وہ تو مجھے تسنیم نے خبر دے دی اور میں نے بروقت ماوی کو وہاں سے نکال لیا ورنہ بی جان نے تو کانوں کان خبر نہ ہونے دینی تھی کہ ماوی کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔"

"تو یہ کون سی نئی بات ہے۔ بی جان ہمیشہ سے ملازمین کو سزا دینے کے لیے وہاں قید کرواتی رہی ہیں۔" شبیہہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"غلط طریقہ کار تو وہ بھی تھا لیکن ہم میں سے کسی نے بھی کبھی ان کو ان کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی۔ سب نے آنکھیں اور کان بند رکھے کہ جو ہو رہا ہے جیسے ہو رہا ہے اسے ویسے چلنے دیں....."

جلال کے یہ اعتراضات نئے نہیں تھے۔ وہ اکثر اس طرح کی بات کیا کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ شبیہہ نے کبھی اس کی باتوں پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ جنت بیگم کا سب سے بڑا حمایتی تھا لیکن آج اسے جانے کیوں جنت بیگم کی زیادتیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید ثروت کو والہانہ ولید کی طرف بڑھتا دیکھ کر اس کے اندر کی محرومیاں جاگ اٹھی تھیں اور اسے ہر انسان کے عمل میں برائیاں نظر آنے لگی تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو پھر ملازمین اور ماوی کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بی جان کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"بات حیثیت کی نہیں انسانیت کی ہے۔" جلال نے کہا۔ "بہر حال تم آجاؤ۔ بی جان کو صرف تم ہینڈل کر سکتے ہو۔ میرے لیے یہ کام بہت مشکل ہے اور پھر پتا نہیں' وہ ماوی کے بارے میں کیا سوچ بیٹھی ہیں۔ انہوں نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا شبیہہ!"

"اچھا اچھا اب فلمی ہیروز کی طرح زیادہ ایموشنل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماوی اس وقت کہاں ہے؟" شبیہہ نے اسے لتاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں نے اسے تمہارے کمرے میں چھپایا ہے۔ بی جان تو یہی سمجھ رہی ہیں کہ وہ کوٹھڑی میں ہے۔ انہوں نے تسنیم کو دھمکا کر ماوی کو وہاں بند کروایا تھا لیکن تسنیم نے مجھے بتا دیا..... اگر بی جان کو ابھی اطلاع ملی کہ ماوی وہاں نہیں ہے تو وہ قیامت اٹھا دیں گی۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں تم آجاؤ۔ ان کے غصے کو قابو کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔" شبیہہ نے ناچار ہامی بھر لی تھی۔

☼ ☼ ☼

شبیہہ نے پولیس اہلکاروں کو آتا دیکھ کر فون بند کر دیا تھا۔ انہوں نے آتے ہی رسمی انکوائری شروع کر دی تھی۔ دانیال حسن کی چونکہ یہاں موجودگی ضروری تھی' سو انہیں بھی بلوا لیا گیا تھا۔ رسمی بات چیت کے بعد پولیس اہلکاروں نے شبیہہ کو جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن دانیال حسن اس معاملے میں کچھ تذبذب کا شکار تھے۔ شبیہہ نے اس بات کو صاف محسوس کیا تھا۔ تب ہی جب دانیال حسن نے آفیسر سے اکیلے میں بات کرنا چاہی تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

"دانیال صاحب کو آپ سے متعلق کچھ تحفظات ہیں مسٹر شبیہہ! اس لیے وہ چاہتے ہیں جب تک ان کے بیٹے پر حملہ کرنے والے اصل افراد کا پتا نہ چل جائے' آپ کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہ دی جائے۔" آفیسر نے چند منٹ بعد کہا تھا۔

شبیہہ کا غصہ عود کر آیا تھا۔

"واٹ ربش..... آخر اس بات سے دانیال صاحب ثابت کیا کرنا چاہ رہے ہیں؟ کیا ان کا خیال ہے میں نے ان کے بیٹے کو زخمی کیا ہے۔" اس نے طیش سے پوچھا تھا۔

"وہ آپ کے بارے میں شکوک کا شکار ہیں لہٰذا جب تک اصل مجرموں کا پتا نہیں چل جاتا' آپ آؤٹ آف اسٹیشن نہیں جاسکتے۔"

"دیکھیے! میرا جانا بہت ضروری ہے۔" شبیہہ نے قدرے تحمل سے کہا تھا۔

"سوری اس معاملے میں ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ جب تک مدعی مطمئن نہیں ہوجاتا آپ کو پرمیشن نہیں دی جا سکتی۔"

شبیہہ کی اکتاہٹ میں اضافہ ہوگیا لیکن اس نے اس لمبی بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھا مگر اس کے غصے میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا۔ اپنی تمام تر لاتعلقی کے باوجود وہ ولید کو نہ صرف اسپتال لے آیا تھا بلکہ اس کا خیال بھی رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس پر شک کیا جا رہا تھا جیسے اسی نے ولید کو نقصان پہنچایا ہو۔

"ٹھیک ہے میں دانیال صاحب سے خود بات کرلیتا ہوں۔" اس نے کہا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ شبیہہ نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے آتی آوازوں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ گو کہ یہ بہت معیوب بات تھی لیکن وہ کان لگا کر سننے لگا کیونکہ اندر اسی کا ذکر ہو رہا تھا۔

"شبیہہ' مستقیم بھئی کا بیٹا ہے۔ وہ بھلا میری یا میرے بیٹے کی بھلائی کیوں چاہے گا۔" دانیال حسن کی آواز طیش سے بھری تھی۔

"اگر وہ آپ کی یا آپ کے بیٹے کی بھلائی نہ چاہتا تو ولید کو ہاسپٹل کیوں لے کر آتا؟" ثروت کی آواز بھی تیز تھی۔

"ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں ڈیڈی! جس وقت وہ مجھے اسپتال لے کر آئے۔ میں ہوش میں نہیں تھا لیکن میں جانتا ہوں اس سب میں شبیہہ بھائی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔" ولید کی نڈھال آواز اسے سنائی دی۔

"فیروز اور ابتاج سے کچھ عرصہ پہلے ہی میری دوستی ہوئی تھی اور وہ لوگ پیسے کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ بیس ہزار چھیننے کے لیے مجھے قتل بھی کرسکتے تھے۔ اس میں شبیہہ بھائی کا کوئی قصور نہیں ہے۔" ولید مستقل اس کی طرف داری کر رہا تھا۔

"تم خاموش رہو ولید! تم ابھی بچے ہو۔ اس خاندان کی فطرت سے واقف نہیں ہو۔ وہ گھٹیا اور احسان فراموش....." دانیال حسن کی بات نے جیسے اسے بے قابو ہی کردیا تھا۔

"آپ کو بولتے ہوئے احتیاط کرنا چاہیے۔" وہ ایک جھٹکے سے اندر داخل ہوگیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ چھپ کر ہماری باتیں سنو۔" دانیال حسن بھڑک اٹھے۔ ثروت ایک دم پریشان ہو اٹھیں۔

"مجھے چھپ کر آپ کی باتیں سننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی باتیں سارا ہاسپٹل سن رہا ہے۔" شبیہہ نے بھی سابقہ انداز میں کہا تھا۔

"غلطی تمہاری نہیں ہے' اس خاندان کی ہے۔ جس سے تم تعلق رکھتے ہو۔ اس تربیت کی ہے۔ جو تمہیں ملی ہے۔ تم اور تمہارا باپ....."

"میرے باپ کو بیچ میں مت لائیں۔" شبیہہ نے بمشکل اپنا غصہ قابو کیا ہوا تھا۔

"ثروت! اس سے کہو یہاں سے چلا جائے ورنہ میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔"

"تم جاؤ شبیہہ.....!" ثروت نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ مجھ سے جانے کے لیے کہہ رہی ہیں جبکہ میں کوئی اختلافی بات بھی نہیں کر رہا۔" شبیہہ نے صدمے سے کہا تھا۔

"تم چلے جاؤ۔ تمہاری یہاں موجودگی میرا گھر خراب کردے گی۔" ثروت رونے لگیں۔

"کون سا گھر ممی!" انیبا بول اٹھی۔ "وہ گھر جس کی بنیادیں اتنی کمزور ہیں کہ اٹھارہ سال بعد بھی آپ کو اس کے ڈھے جانے کا خدشہ رہتا ہے۔"

"تم خاموش رہو انیبا....." دانیال حسن غرائے۔ "اور تم اگر ابھی نہیں گئے تو میں ثروت کو طلاق دے دوں گا۔"

"ڈیڈی....." ولید اور انیبا ایک ساتھ ہراساں ہوئے تھے۔

"یہ حیثیت ہے آپ کی اس آدمی کے نزدیک۔" شبیہہ نے ثروت کو دیکھا تھا۔ "بہت رعب سہہ لیا اس کا۔ آپ چلیں میرے ساتھ۔"

"تم جاؤ شبیہہ!" ثروت رو رہی تھیں۔

"نہیں! میں آپ کو لے کر جاؤں گا۔" اس نے ثروت کا ہاتھ پکڑ کر باقاعدہ انہیں ساتھ گھسیٹنے کی کوشش کی۔

"تم جاؤ شبیہہ!" ثروت مستقل رو رہی تھیں۔

"نہیں! آپ چلیں۔"

"شبیہہ میں....."

"میں اس ذلیل آدمی کے ساتھ آپ کو نہیں رہنے دوں گا۔"

وہ انہیں ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن اسی پل ثروت کا ہاتھ اٹھا اور اس کے چہرے پر نقش ہوگیا۔ شبیہہ گال پہ ہاتھ رکھے ہکا بکا انہیں دیکھ رہا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ سب کا یہی حال تھا۔

☆ ☆ ☆

شبیہہ آ گیا تھا۔ جنت بیگم واقعی غصے میں تھی نہ صرف جلال ان کے غصے سے پریشان تھا بلکہ مستقیم اور منصور بھئی کو بھی فکر لاحق تھی۔ سب انہیں اپنے ارادوں سے باز رکھنے کی اپنی اپنی سی کوشش کرچکے تھے لیکن جنت بیگم کی ایک ہی رٹ تھی۔

"جب تک اس لڑکی کو سزا نہیں دوں گی' مجھے سکون نہیں آئے گا۔ ہمت کیسے ہوئی ان ماں بیٹی کی کہ مجھ پر انگلی اٹھائیں۔"

"ٹھیک ہے پھر جو آپ کا دل چاہے' وہ کریں۔" شبیہہ نے چڑ کر کہا۔ وہ وہاں سے تھپڑ کھا کر آیا تھا۔ اگلے پچھلے سارے زخم ہرے ہوگئے تھے۔ انہوں نے اس شخص کے لیے اسے تھپڑ مارا تھا جس سے وہ ساری زندگی خار کھاتا آیا تھا۔ پہلی بار ماں کے لیے دل میں دبی محبت نے جوش مارا تھا اور پہلی ہی بار اس نے منہ کی کھائی تھی۔ تضحیک کا شدید ترین احساس رگوں میں بہنے لگا تھا۔

زندگی میں ہر نعمت سے نوازے جانے کے باوجود خود ترسی جو ساری زندگی اس کے ساتھ رہی اس وقت اور بھی زور آور ہوگئی تھی۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی کہ کوئی اور میرا ساتھ دے نہ دے تم ضرور میرا ساتھ دو گے۔"

جنت بیگم نے فخریہ نظروں سے اسے دیکھا۔ کسی نے بھی اس بات پر تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں کی حتیٰ کہ خود شبیہہ نے بھی نہیں۔ وہ تو بے زاری سے ناک پر سے مکھی اڑا کر فارغ ہو بیٹھا تھا۔ صرف جلال تھا جو ہراساں ہوا لیکن جنت بیگم کے اگلے مطالبے نے تقریباً" سب کو ہی ہکا بکا کر دیا تھا۔

"منصور! تم شام تک کسی نکاح خواں کا انتظام کر لو۔ میں چاہتی ہوں آج رات تک ماوی کا نکاح شبیہہ سے کر دیا جائے۔" جتنے سکون سے جنت بیگم نے یہ بات کہی تھی' اتنا ہی سب کو جھٹکا شدید لگا تھا۔

"مگر ..... کیا کہہ رہی ہیں آپ بی جان .....!" شبیہہ نے سب سے پہلے زبان کھولی تھی۔ اس کے انداز میں بے یقینی بھی تھی اور ناپسندیدگی بھی۔

"ماوی کو حویلی میں رکھنے کا ایک یہی واحد راستہ ہے۔ اسے بھی سزا ملے گی اور اس کی ماں کو بھی۔"

شبیہہ نے فرداً" فرداً" سب کی طرف دیکھا اور اس پر انکشاف ہوا کہ اس نئے مطالبے سے صرف وہ ناواقف تھا یا جلال' جس کا اس بات پر باقاعدہ منہ ہی کھل گیا تھا۔

شبیہہ کا دل چاہا کھینچ کر اسے ایک تھپڑ رسید کرے جس میں بس اتنا ہی حوصلہ تھا کہ چھپ چھپا کر نکاح کر سکے۔ اس نکاح کو تحفظ دینے کا حوصلہ بالکل نہیں تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ حیران رہ گیا' جب جلال نے مضبوط لہجے میں نکتہ اعتراض اٹھایا۔

"یہ آپ ماوی کو سزا دیں گی یا شبیہہ کو..... اور اس سے ہو گا بھی کیا؟ میں تو یہ ہی نہیں سمجھ پا رہا۔" اس کا لہجہ تیز تھا۔

"تم خاموش رہو جلال!" جنت بیگم نے ڈپٹ کر کہا۔ اس کا اس طرح اچانک بولنا خود ان کے لیے بھی باعث حیرانی تھا۔

"میں خاموش نہیں رہوں گا بی جان!" جلال نے کہا۔ "آخر آپ دوسروں کی زندگی کا فیصلہ اتنی آسانی سے کس طرح کر لیتی ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ آپ کے فیصلوں کا ان پر کیا اثر پڑے گا۔"

"تمہیں کس نے اجازت دی کہ میرے معاملات میں دخل دو۔" جنت بیگم کا غصہ اور شدید ہوا۔

"آپ نے اجازت دی ہو یا نہیں۔ لیکن اس معاملے سے آپ مجھے کسی طرح الگ نہیں کر سکتیں کیونکہ....."

جلال نے پل بھر کا توقف کیا تھا اور لحظہ بھر کے لیے ہی شبیہہ کی جانب دیکھا تھا۔

"کیونکہ ماوی میری منکوحہ ہے..... اور میں کسی قیمت پر اس سے دست بردار نہیں ہوں گا۔" اس نے جیسے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

☼ ☼ ☼

فیضان سے توقیر صاحب نے اسپتال چلنے کے لیے کہا تھا۔ وہ تذبذب میں پڑ گئے۔ دل سے تو خیر راضی تھے لیکن کوئی تو بات تھی جو ان کی مرضی کے راستے میں بھی حائل ہوتی تھی۔

"میرا نہیں خیال کہ میرا وہاں جانا مناسب ہے۔ دانیال بھائی کا کچھ پتا نہیں۔ اگر اسپتال میں ہی مجھ سے مس بی ہیو شروع کر دیا تو شاید میں بھی اپنا غصہ کنٹرول نہ کر سکوں۔"

"یار! تم کوئی نفسیاتی مریض تھوڑی ہو کہ خود پر قابو ہی نہ رکھ سکوں۔" توقیر صاحب نے جھنجلا کر کہا۔

"ایسی بات دانیال کہتا تو چلو میں مان بھی لیتا کہ گزرے ماہ و سال نے اسے کسی حد تک نفسیاتی مریض بنا ہی دیا ہے۔ جو انسان کسی ایک ہی بات کو لکیر بنا کر زندگی بھر پیٹتا رہے' وہ اس کے نفسیاتی بگاڑ کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے۔

دانیال ایسا ہی ہے۔ بھی اپنی زندگی کو پرسکون بنانے کی اس نے کوشش ہی نہیں کی ورنہ ثروت بھابھی کی پہلی شادی کو نظر انداز کرنا کیا مشکل تھا' وہ بھی اس صورت میں جب کہ پہلی شادی کی کوئی نشانی بھی ان کے پاس نہیں تھی ..... میں دانیال کی زندگی کے حالات سے واقف رہا ہوں۔ اسی کے توسط سے ثروت بھابھی پر جو کچھ گزرا' اس سے آگاہ ہوں۔ وہ اتنی بڑی باتیں نہیں تھیں جتنی دانیال گردانتا رہا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا واویلا کیا جائے تو وہ بڑی بن جاتی ہیں.....'' توقیر صاحب نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا تھا۔

''ان سب باتوں کے باوجود انیبا اچھی لڑکی ہے..... شاید تمہیں اس سے بہتر شریک حیات نہ مل سکے۔''

فیضان نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''میں سمجھا نہیں توقیر بھائی!''

توقیر صاحب ہنس دیے۔

''اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بات نہیں سمجھائی جاسکتی۔ تم اچھے خاصے ذہین آدمی ہو' نا سمجھی کا مظاہرہ کرو تو بات دوسری ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تمہیں انیبا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ ولید نے اپنے بچپنے میں گو کہ ایک نامعقول بات کی تھی لیکن میرا خیال ہے اس سے معقول بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ تم اس بارے میں سوچو' دوسری صورت میں میں خود فیاض سے بات کروں گا۔ انیبا میں ایسی کوئی بات نہیں کہ بے وجہ اسے نظر انداز کیا جائے..... تم جیسے نالائق سے لو میرج کی توقع ہی فضول ہے اس لیے ارینج میرج ہی سہی..... ورنہ تم تو ساری زندگی چھڑے ہی پھرتے رہو گے۔'' توقیر صاحب کا انداز کچھ ایسا تھا کہ فیضان کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

''ہنس رہے ہو' اس کا مطلب راضی ہو؟''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔'' فیضان نے خوش دلی سے کہا۔

''تو کیا اس کا مطلب انکار ہے؟''

''ایسی بھی بات نہیں ہے۔'' اس بار فیضان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا توقیر صاحب کے چہرے پر بھی دبی دبی مسکراہٹ تھی جیسے سب سمجھ رہے ہوں۔

''مجھے تھوڑا وقت دیں توقیر بھائی! زندگی کے معاملات اتنی جلدی کیسے طے کیے جاسکتے ہیں۔''

''خدا کو مانو یار! اپنی عمر دیکھو اور اپنے ارادے سنو..... تمہاری عمر کے لڑکے اپنے بچوں کو ہائی اسکول بھیجنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور تم شادی کا فیصلہ ہی نہیں کر پا رہے۔''

''اب اتنا بھی عمر رسیدہ نہیں ہوں میں۔'' فیضان نے جل کر کہا۔

توقیر صاحب خوب دل کھول کر ہنسے۔ پھر بولے۔

''جو بھی فیصلہ کرو خوب سوچ سمجھ کر کرنا۔ اسپتال چلتے ہو؟ میں ذرا ولید کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہا ہوں۔'' انہوں نے پوچھا۔

''جی میں بھی چلتا ہوں۔ آپ گاڑی اسٹارٹ کریں۔ میں یہ برتن ذرا کچن میں رکھ کر آرہا ہوں۔'' توقیر صاحب سر ہلا کر باہر کی جانب بڑھ گئے۔ فیضان کچن میں آگئے۔

☆ ☆ ☆

جلال کی آواز گونجی تھی اور سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

جنت بیگم ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟''

''یہ بکواس نہیں ہے بی جان! حقیقت ہے کہ میں ماوی سے نکاح کر چکا ہوں۔''

''تو تم ہو وہ جس نے اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو میرے مقابل کھڑا کیا۔ اور اسے حویلی لے کر آئے۔'' جنت بیگم کی بے یقینی کسی طرح نہ جاتی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے بی جان!'' جلال نے احترام سے کہا تھا۔ مبادا اس کے بولنے کو گستاخی نہ سمجھ لیا جائے۔

''جس وقت میں نے ماوی سے نکاح کیا' ہم دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ ماضی کی کوئی کڑی ہم دونوں سے جڑی ہوئی ہے۔ ہم..... ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور میں یہ بھی جانتا تھا آپ پسند کی شادی کی اجازت نہیں دیں گی۔ اسی لیے میں نے خود فیصلہ کیا کہ مجھے شادی کر لینا چاہیے۔''

''اپنی مرضی کر ہی لی ہے تو اب ایک کام اور کرو۔ اپنا بوریا بستر سمیٹو اور حویلی سے دفع ہو جاؤ۔'' جنت بیگم غصے میں جیسے پاگل ہی ہو گئی تھیں۔ یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ پوتے نے اتنا بڑا فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر کر لیا۔

''اپنی مرضی سے شادی کرنا کوئی گناہ نہیں ہے بی جان!'' شبیہہ نے بھی زبان کھولی۔

''تم خاموش رہو شبیہہ! اور کوئی اس معاملے میں نہیں بولے گا۔ آج تک اس حویلی میں کسی پرندے نے میری مرضی کے بغیر پر نہیں مارا اور اس کی اتنی ہمت کہ شادی کر کے بیٹھ گیا۔ اس میں اتنی عقل بھی نہیں کہ یہ سمجھ سکتا' وہ لڑکی اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہی ہے۔''

''آخر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے۔ جلال کے نکاح پر یا آپ کی مرضی کے بغیر نکاح پر؟'' شبیہہ نے چڑ کر پوچھا۔

''ہر بات پر.....''

''غصہ مت کریں بی جان! اتنی بڑی بات نہیں ہے یہ۔''

''تم خاموش کیوں نہیں ہو جاتے شبیہہ! اور تم.....'' انہوں نے جلال کی طرف دیکھا۔

''تمہارے پاس دو راستے ہیں یا تو حویلی چھوڑ دو یا ابھی کے ابھی اس لڑکی کو طلاق دے دو.....''

گو کہ جلال کا انکشاف سب ہی کے لیے حیران کن تھا لیکن جنت بیگم کے اس نئے مطالبے پر سب ہی ہکا بکا رہ گئے تھے۔

''اماں! آپ بے کار کی ضد کر رہی ہیں۔'' مستقیم نے کہا۔

''جسے میری ضد بے کار لگ رہی ہے۔ وہ بھی ان دونوں کے ساتھ دفع ہو جائے۔''

"اللہ کے لیے بی جان! ہر معاملے میں بچوں کی طرح ری ایکٹ کرنا چھوڑ دیں۔" شبیہہ نے کہا۔
"جلال تو اس نکاح کے لیے راضی بھی نہیں تھا۔ میں نے ہی اسے فورس کیا تھا کہ بی جان کو اپنے بچوں کی خوشیاں عزیز ہیں۔ وہ اعتراض نہیں کریں گی۔" اس نے ہوا میں تیر چلایا تھا۔ جنت بیگم کے لیے ایک اور دھچکا۔
"تو گویا تم بھی شامل تھے اس نکاح میں۔"
"جی میں بھی شامل تھا اور اب آپ یہ ناحق ضد چھوڑ دیں۔ ساری زندگی اپنی من مانی کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ کا ہر فیصلہ درست تسلیم کیا جائے۔" وہ بھی اگلا پچھلا حساب آج ہی بے باق کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔
"تم میرے فیصلوں کو غلط قرار دے رہے ہو۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرا شبیہہ میرے کسی فیصلے کو غلط قرار دے۔" جنت بیگم کی آواز صدمے سے چور تھی۔
"اس لیے کیونکہ آج تک میں آپ کے دماغ سے سوچتا رہا ہوں۔ میں نے وہی دیکھا جو آپ مجھے دکھاتی رہیں۔ وہ بولتا رہا جو آپ کی زبان سے نکلتا تھا۔ میں نے کبھی اپنی عقل تو استعمال ہی نہیں کی بی جان! جو آپ نے کہا وہ سچ مان لیا۔ جو آپ کا حکم ہوا اس کو بجا لایا۔ آپ کی ہاں میں ہاں ملاتے میں نے کبھی سوچا نہیں کہ میں کتنے لوگوں کو ہرٹ کر رہا ہوں۔"
اسے نجانے کون کون سے پچھتاوے ستا رہے تھے۔ اپنی اگلی ساری غلطیاں یاد آنے لگی تھیں۔
"میں جیسی بھی ہوں، ٹھیک ہوں۔" جنت بیگم نے غصے سے کہا تھا۔ "یہ طے ہے کہ جلال کو اس حویلی سے جانا ہوگا اور جسے میرے اس فیصلے پر اعتراض ہے، وہ بھی اس کے ساتھ جا سکتا ہے۔"
"بی جان! آپ غصہ نہ کریں۔" جلال نے کہنا چاہا۔
"خبردار! جو تم نے دوبارہ مجھے بی جان کہا۔ کوئی رشتہ نہیں ہے تمہارا ہم سے۔"
جنت بیگم کا غصہ بجا سہی لیکن غیر معمولی ضرور تھا۔ شبیہہ متعجب سا ہو کر انہیں دیکھتا رہا۔ وہ تو ہمیشہ اسی طرح ہی کرتی تھیں پھر آج ہی اسے عجیب کیوں لگ رہا تھا۔
"بی جان! پلیز..."
"تم بھی خاموش رہو شبیہہ! میرے فیصلوں کو غلط سمجھتے ہو تو تم بھی ان دونوں کے ساتھ چلے جاؤ۔" جنت بیگم کا لہجہ اسے سلگا گیا۔
"ٹھیک ہے۔ آپ یہ چاہتی ہیں تو میں بھی چلا جاتا ہوں۔" وہ بھی ان کا پوتا تھا اور غصے میں ان سے دو ہاتھ آگے تھا۔ اس نے ثابت کیا۔
"شبیہہ...!" جلال نے کہنا چاہا لیکن شبیہہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔
"پاگل مت بنو شبیہہ! اماں اس وقت غصے میں ہیں۔ انہیں نہیں پتا، وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ تمہارے جانے کا دکھ ہوگا انہیں۔" مستقیم بھٹی نے دبی آواز میں کہا۔
"مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ جب یہ دونوں میری مرضی کے بغیر فیصلے کر سکتے ہیں تو پھر اپنی زندگی خود جئیں۔" جنت بیگم نے غصے سے کہا تھا۔
"سن لیا آپ نے؟ انہیں کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔" شبیہہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ "باری باری سب کو نکالنے سے بہتر ہے، آپ سب کو ایک ہی بار اس حویلی سے نکال دیں۔ کیونکہ آج نہیں تو کل سب آپ کو آپ کے غلط فیصلوں کی وجہ سے چھوڑ ہی دیں گے۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو میں نے بہت غلط فیصلے کیے ہیں۔" جنت بیگم کا انداز عجیب تھا۔ "اور سب سے غلط فیصلہ تنوی کو تم سے منسوب کرنا تھا۔ میں اب اپنے اس فیصلے کو درست کرنا چاہتی ہوں۔ تم اس حویلی سے دفع ہو جاؤ اور تنوی کا نام بھی اپنی زبان پر مت لانا۔"
"اماں! اللہ کا واسطہ ہے اس معمولی سی بات کو انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔" منصور بھٹی نے منت بھرے انداز میں کہا۔
"کسی بھول میں مت رہیں۔ تنوی سے میں کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہوں گا۔" اس کا انداز چیلنج کرتا ہوا تھا۔ جنت بیگم کا غصہ شدید ہونے میں لحہ بھی نہ لگا۔
"یہ تو تمہیں وقت بتائے گا۔" جنت بیگم نے رخ بدل لیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ تمہیں اب دفع ہو جانا چاہیے۔
"چلو جلال...!" وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکل گئے تھے۔

✡ ✡ ✡

دانیال حسن، فیضان کے خدشات کے برعکس بڑی خوش دلی سے ملے تھے۔ انہوں نے فیضان سے اپنے رویے کی معافی بھی مانگی تھی۔ جسے فیضان نے بڑے دل کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ ولید سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی الگ شرمندہ شرمندہ دکھائی دیتا تھا۔ اسے تھوڑی دیر میں ڈسچارج کیا جانا تھا۔ توقیر صاحب کے استفسار پر دانیال حسن نے بتایا کہ انیبا اور ثروت گھر جا چکی ہیں۔
فیضان کو مایوسی ہوئی۔ لاشعوری طور پر وہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔ اسے دیکھنا چاہتے تھے۔
"توقیر بھائی...!" جس وقت وہ دونوں واپسی کا قصد کر رہے تھے۔ فیضان نے سوچ سمجھ کر کہنا شروع کیا۔
"آپ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ مجھے انیبا سے اچھی شریک حیات نہیں مل سکتی۔" ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
"عقل والی بات دیر سے سمجھتے ہو تم۔" توقیر صاحب اس بات کا مافی الضمیر سمجھتے ہوئے شرارت سے بولے۔
"دانیال بھائی سے آپ اور فیاض بھائی بات کریں گے یا مجھے خود ہی....."
"اب اتنا بھی اپنا بزرگ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" توقیر صاحب نے خوش گواریت سے ڈپٹ کر کہا۔
"تمہارا رشتہ طے کرنے کے لیے تمہارے بزرگ ابھی زندہ ہیں۔ فیاض اور دانیال سے میں خود ہی بات کر لوں گا۔ ہاں البتہ انیبا سے خود بات کرنا چاہو تو اس کی اجازت ہے۔"
توقیر صاحب کے انداز پر فیضان کے چہرے پر جھینپی ہوئی سی مسکراہٹ آگئی تھی جبکہ توقیر صاحب دل کھول کر ہنس دیے۔

✡ ✡ ✡

"تنوی!"
"جی بی جان!"
"تم جانتی ہو نا کہ تمہارے ماں باپ کے بعد میں نے ہی تمہیں پال پوس کر بڑا کیا ہے؟"
"جی....."
"اور یہ بھی کہ تمہارے ددھیال والے تمہیں رکھنے کو تیار نہیں تھے ان کا خیال تھا تمہاری پیدائش ان کے گھرانے کے لیے منحوس ثابت ہوئی ہے۔ ایسے میں میں نے نہ صرف ان سب کی زبانیں بند کروائی تھیں بلکہ تمہیں اپنے پاس رکھ کر یہ بھی ثابت کیا کہ ان کی باتیں بے بنیاد ہیں۔"

"جی! مجھے سب یاد ہے۔ آپ وقتاً "فوقتاً" بتاتی رہی ہیں مجھے۔"

"میں نے تمہیں اپنی نواسی نہیں بلکہ بیٹی سمجھا ہے۔ تم مجھے زریں سے بھی زیادہ عزیز رہی ہو۔"

"جی ہاں! میں یہ بھی جانتی ہوں۔"

"تم اور شبیہہ دونوں مجھے اتنے عزیز ہو' تب ہی میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے سے منسوب کیا تھا کہ تم مجھ سے کہیں دور نہ جاؤ' ہمیشہ میرے پاس رہو۔ میری آنکھوں کے سامنے۔۔۔"

تنوی کے پاس ان کے اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ یہ تو ان کے دل کے خیالات تھے۔ وہ کیا کہتی سو خاموش رہی۔

"لیکن اب شبیہہ تمہیں مجھ سے دور لے جانا چاہتا ہے۔ اتنی دور کہ شاید میں تمہیں دوبارہ دیکھ بھی نہیں سکوں گی۔"

تنوی نے چونک کر جنت بیگم کو دیکھا۔

"وہ میری بات نہیں مان رہا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ایسا بھی کر سکتا ہے۔"

"آخر بات کیا ہے بی جان!" تنوی نے پریشان ہو کر پوچھا تھا۔

"اس بات کو چھوڑ دو۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میں نے تمہارا اور شبیہہ کا رشتہ ختم کر دیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔" تنوی کے دل کو دھکا سا لگا۔

"اس تعلق میں تمہیں کوئی دلچسپی تھی نہ شبیہہ کو۔ یہ رشتہ میری مرضی سے جڑا تھا' میری مرضی سے ختم ہو رہا ہے۔ امید کرتی ہوں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟"

تنوی کے پاس الفاظ ختم ہو چکے تھے۔ صرف الفاظ ہی نہیں اس کا تو دل بھی خالی ہو چکا تھا۔ جنت بیگم کے رعب سے نڈھال گردن اثبات میں ہل گئی۔

"دیکھو تنوی! مجھے ذرا بھی امید ہوتی کہ شبیہہ تمہیں خوش رکھے گا۔ تمہارا خیال رکھے گا تو میں یہ رشتہ کبھی ختم نہ کرتی۔ شبیہہ نے میری ہر امید پر پانی پھیر دیا ہے۔ میرا خیال تھا میری تربیت اسے ایک کامیاب اور مکمل شخصیت بنائے گی لیکن اپنی ماں کی غیر ذمہ دارانہ روش نے اسے مکمل طور پر نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ مجھے پہلے بھی اس کی ذہنی حالت کا اندازہ تھا لیکن میرا خیال تھا' وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن اب میں مایوس ہو چکی ہوں۔ مجھے یہ بھی فکر ہے کہ کہیں وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔" جنت بیگم نے بڑی سمجھ داری سے اس کے گرد جال بن دیا تھا وہ پہلے ہی ان کے اثر میں تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا اب اس کی باتوں پر ایمان نہ لاتی۔

"وہ حویلی چھوڑ کر جا رہا ہے۔ تمہیں بھی ساتھ لے جانے کی ضد کر رہا ہے۔ تم خود سوچو شبیہہ اگر حق پر ہوتا تو کیا میں اس کا ساتھ نہ دیتی جب کہ آج تک میں نے ہی اسے سب سے زیادہ سپورٹ کیا ہے۔ پھر مستقیم کیا اسے اکیلا چھوڑ سکتا ہے۔۔۔ نہیں نا؟ تو میں نے اور مستقیم نے سوچا ہے تمہیں اس کے ساتھ نہ جانے دیا جائے۔ وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا اور زبردستی نکاح کرے گا۔ ہمیں یہ منظور نہیں ہے۔ تم عاقل و بالغ ہو' اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہو۔۔۔ تم سمجھ رہی ہو ناں تمہیں اب کیا کرنا ہے؟ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں تنوی! اور تم مجھے زریں سے بڑھ کر عزیز ہو۔"

جنت بیگم نے اپنی مرضی کی گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔ تنوی کا جھکا ہوا سر ہولے سے ہل گیا۔

☼ ☼ ☼

"تم بہت جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔" جلال نے شبیہہ کو اپنا سامان پیک کرتا دیکھ کر پریشانی جمع بے زاری

سے کہا تھا۔

”میری خاطر بی جان سے جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت تھی۔ وہ غلط بات کر رہی تھیں۔“ شبیہہ نے مصروفیت بھرے انداز میں کہا تھا۔

ماوی جو ایک طرف خاموشی سے بیٹھی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بے زاری سے داہنی ٹانگ بائیں پر منتقل کی اور بازو سینے پر باندھتے ہوئے مزید غور سے ان دونوں کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ دونوں جیسے اس کی موجودگی کو یکسر بھلا چکے تھے۔

”تو کون سا انہوں نے آج پہلی دفعہ غلط بات کی ہے۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں۔ کون سا انہوں نے پہلے کسی کی پروا کی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ ہمیشہ غلط بات کرتی ہیں اور کبھی کسی کی پروا نہیں کرتیں لیکن آج سے پہلے مجھے اس بات کا اتنا احساس نہیں تھا۔“

”ٹھیک ہے جو ہونا تھا ہو چکا۔ بی جان نے سزا مجھے دی ہے آخر تمہیں بحث میں کودنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”اب ہو گیا جو ہونا تھا۔ اب خاموش رہو اور مجھے پیکنگ مکمل کرنے دو۔ میں دوبارہ حویلی میں قدم رکھنا نہیں چاہتا۔ اچھا ہو گا تم بھی اپنا سامان سمیٹ لو۔“

جلال نے اس کی طرف سے مایوس ہوتے ہوئے سر جھٹکا۔

”کیا تم دونوں میں سے کوئی مجھے یہ بتانا پسند کرے گا کہ آخر ہوا کیا ہے؟“ ماوی نے ان دونوں کو خاموش ہوتا دیکھ کر بے زاری سے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں۔ بی جان نے ہم تینوں کو حویلی سے نکال دیا ہے اور اس سارے فساد کی جڑ تم ہو۔“ شبیہہ نے بنا کسی کی طرف دیکھے سرد لہجے میں کہا تھا۔

”اب تم خود کو انڈر اسٹیمیٹ تو نہ کرو۔ بے شک فساد کی جڑ میں ہوں لیکن تم دونوں کی باتیں سن کر لگتا ہے کہ تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔“

ادھار رکھنا تو ماوی نے سیکھا ہی نہیں تھا‘ سو فوراً ”حساب برابر کر لیا۔ شبیہہ کے سوٹ کیس میں شرٹ ٹھونستے ہاتھ رکے۔ اس نے ابرو اچکا کر ماوی کو دیکھا۔ اگلے ہی پل غیر متوقع طور پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

”زبان بہت چلاتی ہو تم۔ لیکن چونکہ اب تم میری بھابھی بن چکی ہو اس لیے تمہاری ہر گستاخی معاف کی۔“ پھر اس نے روئے سخن جلال کی طرف موڑا۔ ”اس کے باوجود مجھے تم سے ہمدردی ہے جلال! بد زبان بیوی اللہ کا عذاب ہوتی ہے۔“

جلال ہنس دیا۔ ماوی بد مزا ہوئی۔

”تم نے کبھی بتایا نہیں جلال! تمہارے بھائی کو مسکرانا بھی آتا ہے۔“ صاف چوٹ تھی مگر شبیہہ اور جلال دونوں نے لطف لیا تھا۔

”نہیں بتایا ہو گا لیکن جلال نے مجھے ضرور بتایا ہے کہ تم تحمل اور پیار سے بھی بات کر لیتی ہو۔ بات تو نا قابل یقین تھی لیکن چونکہ جلال کہہ رہا تھا تو میں نے یقین کر لیا۔ ویسے کیا واقعی تم جلال سے پیار سے بات کرتی ہو؟“ اس کا انداز دلچسپی لیے ہوئے تھا لیکن ماوی بری طرح جھینپ گئی۔

”کوئی نہیں!“ نہایت مشرقی انداز تھا۔ جلال تو مسحور ہی ہو کر رہ گیا پھر شبیہہ کے ٹھوکا دینے پر چونکا۔

”خیر مذاق ایک طرف... لیکن اب میں نے تمہیں بھابھی مان ہی لیا ہے تو تمہارا بھی فرض بنتا ہے کہ دیور کی

کچھ مدد کرو۔“

”کیسی مدد...؟“

”حالانکہ تنوی سے بات کرنے میں مجھے خود بھی کوئی وقت نہیں ہو گی لیکن اس وقت شاید یہ مناسب نہ ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم اس سے میرے لیے بات کرو۔“

”پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟ صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے۔“ ماوی چڑ گئی۔

”ابھی ایسا کوئی کام مت کرو جو بی جان کے غصے کو بڑھاوا دے۔“ جلال نے تیزی سے کہا۔

”مجھے بی جان کے ڈراوے مت دو جلال! انہوں نے سب کی زندگیاں خراب کی ہیں۔ میرے باپ کی‘ میری ماں کی اور خود میری...“ شبیہہ نے ناراضی اور تاسف سے کہا۔

”تمہاری بات اپنی جگہ درست لیکن کبھی کبھی مصلحت کا دامن تھامنا چاہیے۔ چاہے آپ کی مرضی نہ ہو تب بھی۔“

”جلال بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ مستقیم اور منصور آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے عقب میں عالیہ بھی تھیں اور ان کا چہرہ غیر معمولی طور پر دمک رہا تھا۔ ان کی نگاہیں ماوی پر تھیں۔

”ابھی اماں غصے میں ہیں۔ اور انہوں نے خود کشی کی دھمکی نہ دی ہوتی تو دوسرے پہلوؤں پر غور کیا جا سکتا تھا۔ تم ان کی ضد سے واقف ہو‘ کچھ الٹا سیدھا کر بیٹھیں تو ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اللہ کی ناراضی الگ سہنا پڑے گی۔ ابھی یہی بہتر ہے کہ تم تینوں چلے جاؤ۔ کچھ روز تک ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گا تو ہم سب مل کر انہیں پریشرائز کریں گے۔ وہ جلال اور ماوی کی شادی کو ضرور قبول کر لیں گی۔“ مستقیم کا انداز بڑا اچھا تھا۔

”آپ کی خام خیالی ہے بابا! بی جان کا پریشرائز ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔“ شبیہہ نے کہا تھا۔

”معجزے بھی تو ہوتے ہیں بھائی!“ یہ منصور چچا تھے۔

شبیہہ نے جیسے ناچار قائل ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

پھر عالیہ نے بڑھ کر ماوی کو خود سے لپٹا لیا۔

”تم تو مجھے ویسے بھی بہت عزیز ہو گئی تھیں۔ اب پتا چلا کہ میرے جلال کی بیوی ہو تو اور بھی پیاری ہو گئی ہو۔“ انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

پھر منصور اور مستقیم نے فرداً ”فرداً“ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

”ہم نہیں جانتے‘ تمہاری والدہ کو اماں پر کیوں شک ہے لیکن سچ یہی ہے کہ اماں نے نہ رجب بھائی کو قتل کیا اور نہ کروایا ہے۔ بہرحال ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔“

عالیہ نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر ماوی کو پہنا دی۔

”یہ تمہاری منہ دکھائی ہے۔“

”چچی! پلیز اس تکلف میں نہ پڑیں۔“ ماوی نے کہا۔ وہ انگوٹھی نہیں لینا چاہتی تھی۔

”ارے تکلف کیسا؟ یہ تو رسم ہوتی ہے بلکہ مجھے تو شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ تم کو اپنی پرانی انگوٹھی منہ دکھائی میں دے رہی ہوں۔ اماں کا موڈ ٹھیک ہو جائے تو باضابطہ طور پر تمہیں اس حویلی کی بہو بنائیں گے۔ پھر ساری رسمیں ہوں گی۔ تنوی اور حرم تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہیں۔“

ماوی کا سر ہل گیا تھا اور جس وقت وہ جلال اور شبیہہ کی ہمراہی میں حویلی سے نکل رہی تھی۔ اس کے کندھوں پر سب کی محبتوں کا بوجھ تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ)

نمرہ احمد

سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں۔ حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہو چکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے' وہاں میجر احمد اس کی شکایت پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔ داور کی شادی میں سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کی غرض سے تعارف کرواتے ہیں۔ وہ ولیمہ والے دن حیا سے بیہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی' حیا کی عزت بچاتا ہے۔ ڈولی اور اس کا دوست پنکی حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتے رہتے ہیں۔ حیا یورپی یونین کی طرف سے ملنے والے اسکالرشپ پر اپنی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے کے ساتھ ترکی جاتی ہے۔ اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں اور ابو ظہبی ایرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ ترک لڑکی ہالے ان کو ہر جگہ گائیڈ کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق مسز عبداللہ حیا اور ڈی جے کی

مکمل ناول

دعوت کرتی ہیں۔ وہاں حیا کو پاشا کے متعلق پتا چلتا ہے۔ حیا جہان کے گھر جاتی ہے۔ جہان سرد مزاجی سے ملتا ہے، تاہم سبین پھپھو بہت محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو سفید پھول ملتے ہیں۔ جہان خفا ہوتا ہے۔ جہان کو حیا کے ساتھ اپنے نکاح کا علم ہے۔ اپنے باپ کے غدار ہونے پر اسے شرمندگی ہے۔ ویلنٹائن کی رات حسب معمول حیا کو ملنے والے سفید پھولوں کے ساتھ کاغذ پر حیا کے دوست معتصم کو لیموں کا رس لگا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ماچس کی تیلی جلا کر کاغذ کو تپش پہنچاتا ہے تو وہاں "اے آر پی" لکھا ہوتا ہے۔ حیا، جہان اور ڈی جے جزیرہ بیوک ادا کی سیر پر جاتے ہیں۔ وہاں ایک بنگلے پر اے آر پاشا لکھا ہوتا ہے۔ ایک بچہ حیا کا پرس چھین کر اسی بنگلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ حیا اس کے پیچھے پیچھے اس بنگلے میں داخل ہو جاتی ہے، جہاں اس کی ملاقات عبدالرحمن پاشا کی ماں سے ہوتی ہے۔ وہ حیا کو بتاتی ہے کہ پاکستان میں ایک چیریٹی شو میں پاشا نے پہلی بار حیا کو دیکھا تھا اور اسی رات پہلی مرتبہ سفید پھول بھیجے تھے اور میجر احمد سے پاشا نے ہی کہہ کر ویڈیو ہٹائی تھی۔ میجر احمد کرنل گیلانی کا بیٹا ہے، جسے جہان کے ابا پھنسا کر ترکی چلے گئے تھے۔ پاشا حیا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ حیا کہتی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ پاشا کی ماں وعدہ کرتی ہے کہ وہ اب کبھی حیا کے راستے میں نہیں آئے گا اور اسے اس کا کلچ وے کر جانے دیتی ہے۔ حیا، پاشا سے جہان کے ریسٹورنٹ کے لیے مدد مانگتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے جہان کے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی خبر ملتی ہے۔ حیا سخت پچھتاتی ہے۔ ترکی میں ڈی جے مر جاتی ہے۔ اس کی میت کے ساتھ حیا اور جہان بھی پاکستان آجاتے ہیں۔ جہان سے حیا کی والدہ کے علاوہ تمام لوگ سرد مہری سے ملتے ہیں، تاہم آخر میں سلیمان صاحب کے دل میں بھی جہان کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مہوش کی شادی والے دن پنکی، حیا کو ڈولی کی طرف سے ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا دیتا ہے، جو ایک پہیلی سے کھلے گا اور جب تک وہ کھولے گی، ڈولی اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ وہ چھ حرفی کوڈ کھولنے کی حیا بہت کوشش کرتی ہے، جہان سے بھی کہتی ہے، پھر ترکی لے جاتی ہے۔ ڈبا کھلوانے کے لیے حیا، معتصم کی مدد لیتی ہے۔ ڈبے کا کوڈ یونانی مفکر ہراقلیطس کے کسی فلسفے میں پوشیدہ ہے۔ مسز عبداللہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کوئی اسے اغوا کر لیتا ہے۔ وہاں ایک روسی حیا کے سر پر گرم گرم ویکس ڈالتا ہے اور گرم سلاخوں سے اس کے بازو پر who لکھ دیتا ہے۔ حیا، عثمان شبیر کے بیٹے سفیر کو فون کرتی ہے۔ وہ پاشا کو اطلاع دیتا ہے اور حیا وہاں سے پاشا کے بنگلے پر پہنچ جاتی ہے جہاں عائشے اور بہارے اس کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ مختلف پہیلیوں پہ رکھے گئے کوڈ والے وہ ڈبے عائشے اور بہارے بناتی ہیں۔ حیا کے اغوا سے سب بے خبر ہیں سوائے میجر احمد کے۔ میجر احمد حیا کو بتا دیتا ہے کہ وہی پنکی ہے اور ڈبے پر پہیلیاں بھی وہی لکھتا ہے۔ جہان حیا سے ملنے بیوک ادا آتا ہے۔ باتوں میں حیا کو پتا چلتا ہے کہ جہان اور روحیل ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں۔ وہ روحیل سے تصدیق کرتی ہے۔ وہ اقرار کر لیتا ہے کہ جہان کو گولی لگی تھی اور اس نے جہان کی مدد کی تھی۔ ارم کی منگنی ہو جاتی ہے۔ عائشے اور بہارے کی غیر موجودگی میں حیا، پاشا کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے۔ اسی وقت پاشا کا فون آتا ہے اور اس کے کمرے میں جانے پر حیا کو ڈانٹتا ہے۔

بہارے کا پزل باکس کھل گیا۔ اس میں سے نیکلس نکلتا ہے مگر وہ سمندر کی لہروں میں بہہ جاتا ہے۔ حیا کو پتا چلتا ہے کہ پاشا کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے، جو بظاہر یونان میں ہے۔

پاشا اپنی سیکریٹری دیمت سے اپنے مسئلے پر مشورہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی اسے زبان بند رکھنے کے لیے اس کے ایک راز سے اپنی واقفیت بھی ظاہر کر دیتا ہے۔

جہان بیوک ادا آتا ہے۔ حیا اس کا پیچھا کرتی ہے مگر کچھ جان نہیں پاتی۔ اخبار میں چھاپنے کے لیے ایک کہانی وہ جہان اور پاشا کو سناتی ہے۔ جہان اسے شائع کروانے سے منع کرتا ہے جبکہ پاشا بھڑک اٹھتا ہے۔ پاشا بیوک ادا آتا ہے تو اسے حیا کا پزل باکس ملتا ہے۔ وہ اسے چھپا لیتا ہے۔ بہارے کو علم ہوتا ہے پھر جب عائشے گل اور حیا اسے ڈھونڈتی ہیں تو بہارے چپکے سے اسے لا کر دے دیتی ہے۔ اس پر پاشا بہارے سے ناراض ہوتا ہے۔

سلیمان صاحب ترکی آتے ہیں۔ حیا ہوٹل مرمرا میں ملنے جاتی ہے تو ان کے ساتھ ولید لغاری اور اس کا باپ موجود ہوتا ہے۔ حیا جہان کو فون کر کے بلا لیتی ہے۔ وہاں جہان اپنا تعارف حیا کے شوہر کی حیثیت سے کرواتا ہے۔ حیا اپنا موبائل مرمت کرانے جاتی ہے تو دکان والا بتاتا ہے کہ اس کے فون میں ٹریسر لگا ہے۔ حیا اسے لگا رہنے دیتی ہے۔ سلیمان صاحب اپنی بہن کے ساتھ مل کر حیا اور جہان کی باقاعدہ منگنی کرتے ہیں۔

عائشے گل کے کہنے پر حیا اسکارف پہننا شروع کر دیتی ہے۔ ایک کافی شاپ میں پاشا سے سامنا ہوتا ہے تو حیا اس کے منہ پر کافی پھینک کر بھاگ جاتی ہے۔

ایک سیمینار میں شرکت کرنے کے بعد حیا باقاعدہ نقاب لینا شروع کر دیتی ہے۔ حیا کا پزل باکس کھل جاتا ہے مگر اندر ایک اور پہیلی نکلتی ہے۔ جس کے سلسلے میں وہ نسلی امانت لا کر جاتی ہے۔ وہاں اسے پاشا کا میسج ملتا ہے کہ برگر کنگ میں ایک سرپرائز ہے۔ وہ سب چھوڑ کر جہان کے ریسٹورنٹ پہنچتی ہے۔ وہاں پاشا اور جہان ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ حیا جہان کا پاشا سے تعلق نکلنے پر بے حد خفا ہوتی ہے اور ترکی چھوڑ کر فوراً پاکستان آجاتی ہے۔

امانت لاکر سے حیا کو فلیش ڈرائیو ملتی ہے، جو کسی پاس ورڈ سے کھلے گی۔ حیا کی سہیلی زارا اس کے حجاب لینے پر تنقید کرتی ہے، جہان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ سبین پھپھو ان کی میت لے کر بائیس سال بعد پاکستان آئی ہیں۔ جہان دوسرے دن پاکستان پہنچتا ہے۔ سبین پھپھو پاکستان میں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ ارم کی منگنی کے فنکشن میں حیا حجاب لے کر شرکت کرتی ہے۔ اسے سب کی سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ فنکشن سے واپسی پر حیا، جہان کو شروع سے لے کر اب تک اپنے ساتھ ہونے والے تمام واقعات سناتی ہے۔ جواباً جہان بتاتا ہے کہ اس نے ہوٹل گرینڈ میں کچھ عرصہ کام کیا ہے اور وہ پاشا اور اس کے بھائی کو جانتا ہے۔ وہ دونوں سگے بھائی نہیں ہیں اور یہ بات آنے اور جہان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ فیملی کے جعلی پاسپورٹ بنانے میں تاخیر پر جہان سے پاشا کی تلخ کلامی ہوئی تھی جس پر حیا پاکستان آجاتی ہے۔ پاشا عائشے اور بہارے کو جعلی ناموں سے دوسرے ملک بھجوا رہا ہے۔

امریکا میں روحیل نے بدھسٹ عورت سے شادی کر لی۔ جہان اس بات سے واقف ہوتا ہے تاہم ایک احسان کے بدلے وہ اس کا پردہ رکھتا ہے۔ سلیمان صاحب کو اس بات پر ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ حیا ان کے آفس جانا شروع کر دیتی ہے۔ تایا فرقان اور زاہد چچا کو بہت برا لگتا ہے۔ ولید لغاری ان کے بزنس کا دس فیصد کا پارٹنر ہے۔ وہ ہیڈ آرکیٹیکٹ کے ساتھ مل کر ٹریڈ سینٹر کے نقشے میں جان بوجھ کر غلطی کرتا ہے۔ جس سے ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا الزام سب حیا کے سر تھوپ دیتے ہیں تاہم وہ وینڈر سے مل کر سپلائی جاری کروا دیتی ہے۔ جس سے ان کا حالیہ پروجیکٹ متاثر ہو رہا تھا۔ فرخ کے ولیمہ والے روز حیا جب اپنے تایا زاد سے پردہ کرتی ہے تو تایا فرقان اس کے حجاب پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے خوب بے عزت کرتے ہیں۔ زاہد چچا بھی اس کی حمایت نہیں کرتے حتی کہ فاطمہ بھی حیا کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔

جہان حیا سے دبے لفظوں میں گھر والوں کی حمایت کرتا ہے تو حیا سختی سے حجاب نہ اتارنے کا فیصلہ سناتی ہے۔ جہان بغیر کچھ کہے چلا جاتا ہے۔

۱۰

دسویں قسط

وہ جا رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے ہی تو آیا تھا۔

اس نے بھیگا چہرہ کھڑکی کی طرف موڑا۔ وہ اب تیز بارش میں سبک قدموں سے لان عبور کرتا نظر آ رہا تھا۔ بوچھاڑ اسے بھگو رہی تھی مگر اس نے اس سے بچنے کو اپنے سر پر کچھ بھی نہیں تانا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ لمحے بھر کو رکا اور پلٹ کر دیکھا۔

حیا کا دل ڈوب کر ابھرا۔ رخسار پہ بہتے گرم آنسو مزید تیزی سے نیچے لڑھکنے لگے۔ جہان نے آخری بار پلٹ کر اسے نہیں بلکہ اوپر اپنی ماں کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھا تھا۔ چونکہ پھپھو ادھر نہیں تھیں، سو اگلے ہی پل جہان نے گردن ذرا سی تایا فرقان کے گھر کھلنے والے درمیانی دروازے کی طرف موڑی اس کی ماں

وہاں تھی۔

اسے اب بھی صرف اپنی ماں کی فکر تھی۔ پھر وہ مڑا اور گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ حیا پلٹنے لگی' تب ہی اس کو باہر درمیانی دروازے کی اوٹ میں کچھ غائب ہوتا دکھائی دیا۔ گلابی اور پیلا آنچل۔ ارم کا دوپٹا جو وہ پہچانتی تھی۔ یقیناً" ارم ادھر آئی تھی اور وہ سب سن چکی ہوگی۔ اس نے گہری' تھکی تھکی سی سانس اندر کو کھینچی۔

ارم کس سلسلے میں ادھر آئی تھی' وہ نہیں جانتی تھی' نہ ہی یہ کہ جہان نے اسے دیکھا تھا یا نہیں مگر وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ واپس جاکر وہ تمام رشتے داروں کے بیچ کھڑے ہو کر سارا قصہ مزے سے دہرا دے گی۔ قرآن خوانی کی تقریب میں گویا رنگ بھر جائے گا۔ گوسپ کا ایک نیا موضوع۔

لاؤنج کا دروازہ اماں پورا بند کر کے نہیں گئی تھیں' سوائے یہ خام خیالی ہرگز نہ تھی کہ ارم نے کچھ نہ سنا ہوگا۔ بس چند ہی منٹ بعد پورے خاندان کو پتا چل جائے گا کہ حیا نے جہان کو گنوا دیا ہے۔ وہ حیا کے رویے سے تنگ آکر اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

وہ تھکے تھکے سے انداز میں واپس صوفے پہ آگری۔ کھڑکی کے ساتھ سبز بوتل کی کرچیاں ابھی تک بکھری تھیں۔ اس میں انہیں اٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ اس میں ابھی کسی شے کی ہمت نہیں تھی۔

✡ ✡ ✡

وہ ارم ہی تھی اور اس نے وہی کیا جو حیا نے سوچا تھا۔ فاطمہ واپس آئیں تو سخت متاسف تھیں۔ وہ سبین پھپھو کی بات سن ہی نہیں رہی تھیں جو بار بار کہہ رہی تھیں۔

"بھابھی! وہ اس وجہ سے نہیں گیا' اس نے صبح مجھے بتا دیا تھا کہ وہ آج چلا جائے گا۔ اس نے ویسے ہی چلے جانا تھا۔"

پھپھو کو ارم سے بھی شکوہ تھا۔ انہوں نے ارم کو ہلکا سا ڈانٹ بھی دیا تھا کہ وہ غلط بات نہ کرے مگر فاطمہ کا انداز بتا رہا تھا کہ انہیں یقین نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی اس سب کا ذمہ دار تھا تو وہ حیا تھی جس نے اپنی "ضد" کے پیچھے سب کچھ کھو دیا تھا۔

جب تایا نے اسے بے عزت کر کے گھر سے نکالا تھا' تب وہ روئی تھی' لیکن جب جہان چلا گیا تو اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔ خندق کی جنگ میں صرف بنو قریظہ تو نہیں ہوتا نا۔ اس میں جاڑے کی سختی بھی ہوتی ہے' وہ سردی اور خشکی جو لوگوں کے رویوں میں در آتی ہے۔ رشتے سرد مہر ہو جاتے ہیں اور اس میں بھوک کی تنگی بھی ہوتی ہے۔ معاشی دباؤ اور فکر بھی ہوتی ہے۔ وہ اب پروا کیے بنا کان لپیٹے اماں کی ساری باتیں سنتی رہتی اور آگے نکل جاتی۔ آفس میں البتہ اب رویہ ذرا بدلا تھا۔ اس کی بات سنی جاتی تھی' کبھی کبھار تائید بھی ہو جاتی۔ وہ کاریڈور میں چل کر جا رہی ہوتی یا لفٹ کے انتظار میں کھڑی ہوتی' لوگ ادھر ادھر ہٹ جاتے۔ اس کے لیے رستہ چھوڑ دیتے۔ اس کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

ہیڈ آرکیٹیکٹ رضوان بیگ کو اس نے اگلے ہی روز اپنے آفس میں بلایا تھا۔

"بیٹھیے۔" اپنے مخصوص انداز میں پاور سیٹ پہ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے' اس نے ہاتھ سے سامنے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے البتہ ان کے چہرے پہ ذرا الجھن تھی۔

"کچھ پئیں گے؟"

"کافی ٹھیک رہے گی!"

"شیور!" اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

"ایک اچھی کڑوی سی بلیک کافی اندر بھجیں' بغیر چینی کے!"

رضوان صاحب ذرا چونکے۔ ریسیور رکھ کر وہ واپس کرسی پہ پیچھے ہو کر بیٹھی اور سنجیدگی سے ان کو دیکھا۔

"بیگ صاحب! ادھر آپ نے کون سی ملٹی اسٹوری پارکنگ دیکھ لی جو آپ کو لگا کہ اس ٹریڈ سینٹر میں اسے

ہونا چاہیے؟"

"میرا خیال تھا کہ وہ ایک منفرد آئیڈیا ہے' جس میں کم جگہ پر ایک بہت بڑی پارکنگ بن سکتی تھی۔"

"آپ کے ساتھ اور کس کا خیال تھا یہ؟"

رضوان صاحب نے ابرو اٹھائی۔

"آپ مجھ پہ الزام لگا رہی ہیں؟" بنا گھبرائے وہ قدرے ناگواری سے بولے۔

"بیگ صاحب! آواز نیچی رکھ کر بات کریں کیونکہ آپ کے پارٹنر نے ایک دو جگہ بہت فخر سے آپ کا اور اپنا کارنامہ بیان کیا ہے' میں تو پھر آپ سے بند کمرے میں پوچھ رہی ہوں۔"

"میرا کوئی پارٹنر نہیں ہے' یہ دھمکیاں آپ کسی اور کو دیں۔ ایک عمر گزری ہے کارپوریٹ ورلڈ میں' آپ کی طرح وراثت میں کرسی نہیں ملی۔"

استہزائیہ انداز میں کہتے وہ اٹھے۔

"اگر میرا آئیڈیا ان کو پسند نہیں آیا تو اس کی ذمہ داری ہم دونوں پر ہے۔ میں نے ڈیزائن بنایا' آپ نے پیش کیا۔ اگر کوئی مسئلہ تھا تو اس وقت آپ کی سمجھ داری کدھر تھی؟ جو آپ نے تب کچھ نہیں کیا؟ اب اپنی ناکامی چھپانے کے لیے آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔ مائی فٹ!" وہ سر جھٹک کر تیزی سے مڑے اور باہر نکل گئے۔

اس نے جیسے سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور فون کا ریسیور اٹھایا۔ ایک نمبر ڈائل کر کے وہ دھیرے سے بولی۔

"عمران صاحب! پورے آفس میں موبائل جیمر آن کر دیں جیسا کہ ہم نے پہلے بات کی تھی اور بیگ صاحب کے آفس فون کی ایک لائن مجھے ٹرانسفر کر دیں۔"

ریسیور واپس رکھتے ہوئے ایک طویل سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے رضوان بیگ کو اکسا دیا ہے۔ وہ اب پہلی کال اسے ہی کریں گے جو ان کا ساتھی تھا۔ اخلاقی حرکت تھی یا غیر اخلاقی' اسے یہی درست لگا تھا۔

✡ ✡ ✡

سمندری بگلے ساحل کنارے پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ نیلا' خوبصورت باسفورس آج صبح بہت ہی پرسکون تھا۔ وہ ہاربر کے قریب سڑک پہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی توجہ سمندر کی طرف تھی نہ موسم کی جانب' وہ قدرے تشویش کے عالم میں ایک ہاتھ سے موبائل پہ نمبر ملا رہا تھا جب سلسلہ ملا تو اس نے فون کان سے لگایا۔

"ہاں بولو سفیر! کیا مسئلہ ہوا ہے؟" دوسری جانب سے آواز سن کر وہ بھنویں سکیڑ کر بولا تھا۔

"عبدالرحمٰن بھائی! میں نے بہت کوشش کی مگر معاملہ میرے ہاتھ سے باہر ہے۔ میں....."

"سفیر بے! مجھے تمہید سے نفرت ہے۔ سیدھی بات کرو۔" وہ ذرا بے زاری سے بات کاٹ کر بولا تھا۔ کار کی رفتار اس نے قدرے آہستہ کر دی تھی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب پوری طرح فون کی طرف متوجہ تھے۔

"بھائی! میں..... اصل میں بہارے مسئلہ کر رہی ہے۔ اس نے پہلے ہمیں کہا کہ وہ آخری فلائٹ سے جائے گی' سب کے جانے کے بعد۔ اس نے سب کو راضی کر لیا کہ اسی شرط پہ وہ بغیر کوئی شور ڈالے آرام سے چلی جائے گی۔"

"پھر' وہ نہیں جا رہی؟" اس نے بمشکل اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"صرف یہی نہیں' اس نے اپنا پاسپورٹ بھی جلا دیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ جب تک آپ نہیں آئیں گے اس کے پاس' وہ نہیں جائے گی۔"

بہارے' عائشے اور آنے کے جانے کے بعد عثمان شبیر کے گھر پہ تھی اور وہ یقیناً" وہیں اسے بلا رہی تھی۔

"سفیر! میں نے تمہیں ایک کام کہا تھا' وہ بھی تم سے نہیں ہوا۔ بہت اچھے!" وہ برہمی سے گویا ہوا۔

"سوری بھائی!" وہ نادم تھا۔

"پھر آپ کب آئیں گے؟"
"میں کیوں آؤں گا؟ اتنا فارغ ہوں میں کہ ایک ضدی بچے کی مرضی پہ چلا آؤں؟ اسے بولو' اس نے جانا ہے تو جائے' نہیں تو نہ جائے۔ مجھے پروا نہیں ہے اور سنو! اب اتنی غیر اہم باتوں کے لیے مجھے تنگ مت کرنا۔" "قریبا" جھڑکتے ہوئے اس نے فون بند کیا اور ڈیش بورڈ پہ ڈال دیا۔
مسائل پہلے کم تھے جو یہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اب اس کا پاسپورٹ پھر سے بنوانا پڑے گا۔ اور یہ بہارے کی شرائط۔۔۔ ذرا ایک دو کام کر لے پھر نپٹے گا وہ اس ٹانگ برابر لڑکی سے۔
ناگواری سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے سوچا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے میں پھر سے درد اٹھنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لاؤنج میں صوفے پہ پیر اوپر کیے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ویسلین کی ڈبی تھی' جس میں سے وہ دو انگلیوں پہ کریم نکال کر ایڑیوں پہ مل رہی تھی۔ فاطمہ اور سبین شام کی چائے پی کر ابھی ابھی اٹھی تھیں۔ ارم کے سسرال والے آئے تھے' شادی کی تاریخ رکھی جا رہی تھی' سو ان کا وہاں ہونا ضروری تھا۔ حیا کا دل بھی نہیں چاہا کہ وہ وہاں ان کے ساتھ ہو جائے' وہ بہت پتھر دل ہو گئی تھی' یا بہت مضبوط جو دل پہ لگنے والی چوٹوں کو سہنا سیکھ گئی تھی۔
دروازہ ہولے سے بجا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سونیا دروازے میں کھڑی تھی۔
"بھابھی! آئیے' پلیز۔" وہ خوشگوار حیرت سے مسکراتی اٹھی اور ویسلین کی ڈبی بند کر کے میز پہ رکھی۔
"تھینکس!" سونیا خوش دلی سے مسکراتی صوفے پہ آ بیٹھی۔ حیا نے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر ہاتھ پونچھے اور اس کے قریب آ بیٹھی۔ سونیا بظاہر مسکرا رہی تھی مگر اس کے انداز میں قدرے ہچکچاہٹ تھی' جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر متذبذب ہو۔
"کیسے بھابھی؟" وہ بغور اس کو دیکھ رہی تھی۔
"اصل میں حیا! میں تمہیں لینے آئی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم آ کر ابا سے معافی مانگ لو' ان کی ناراضی دور ہو جائے گی اور ہم سب پھر سے ساتھ مل کر بیٹھ سکیں گے۔ دیکھو' اب سب ادھر ہیں' مگر تمہاری کمی پھر بھی محسوس ہو رہی ہے۔"
حیا نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ آفس سیٹ پہ بیٹھ کر جس طرح وہ معاملات کا تجزیہ کرتی تھی' ویسے ہی اس کے دماغ نے فوراً" کڑیاں ملانی شروع کیں۔ ظفر اور دوسرے ملازموں کے ہوتے ہوئے بھی مہمانوں کی آمد پہ تائی سارا کام سونیا سے کرواتی تھیں۔ اس کو لمحے بھر کی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ سو یہ تو طے تھا کہ وہ خود سے یعنی تائی سے چھپ کر نہیں آئی تھی' مطلب اسے تائی نے ہی بھیجا تھا۔ تاکہ وہ حیا کو جھکا سکیں اور ان کی انا کی تسکین ہو سکے۔ دوسری طرف اسے "معاف" کر کے تایا اور تائی ایثار اور عظمت کا پرچم بلند کریں گے۔ زبردست۔
"میں تیار ہوں بھابھی!" وہ بولی تو اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔ "میں تایا ابا سے ہر اس وقت کی معافی مانگنے کو تیار ہوں جب میں نے ان کا دل دکھایا' جب میں نے کوئی گستاخی کی یا مجھ سے کوئی بدتمیزی سرزد ہوئی۔ ان سے کہیے میں پوری دنیا کے سامنے معافی مانگنے پہ تیار ہوں۔ وہ بڑے ہیں' میں چھوٹی۔ مجھے جھکنا چاہیے' میں جھک جاؤں گی' لیکن۔۔۔ لیکن بھابھی! تایا ابا نے ایک شرط رکھی تھی۔"
وہ لمحے بھر کو رکی۔
"اور وہ شرط یہ تھی کہ میں ان کے گھر ان کے بیٹوں سے منہ لپیٹے بغیر داخل ہوں گی ورنہ نہیں ہوں گی۔ میں ان کی اس بات کا بھی مان رکھوں گی۔ میں ہر بات کی معافی مانگ لوں گی' سوائے اپنے حجاب کے۔ یہاں میں ٹھیک ہوں' وہ غلط ہیں۔ میں ان کے گھر میں داخل نہیں ہوں گی۔ یہ بات آپ ان کو بتا دیں۔"
"حیا!" سونیا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "اب

نا بھی کیا پردہ؟ دیکھو اس دن ڈاکٹر ذاکر نائیک کہہ رہے تھے کہ۔۔۔"
"بھابھی پلیز' کوئی میرے حق میں بات کرے یا خلاف' مجھے فرق نہیں پڑتا۔ بہت سی لڑکیاں صرف سکارف لیتی ہیں' چہرہ نہیں ڈھکتیں کیونکہ انہوں نے خدا سے اتنا ہی وعدہ کیا ہوتا ہے۔ سو جتنا وہ کرتی ہیں' اس پہ قائم رہتی ہیں' اس سے نیچے نہیں جاتیں۔ میں نے بھی ایک وعدہ کیا تھا کہ جو حکم سن لوں گی اور اس پہ دل کھل جائے گا' اسے اپنا لوں گی۔ اب میرا دل نقاب کے لیے کھل چکا ہے۔ پلیز مجھے اسے نبھانے دیں۔"
وہ بات کرنے کے ساتھ ساتھ ایڑی پہ لگائی چکنائی کو انگلیوں سے مل بھی رہی تھی۔ ذرا سی سخت پڑی ایڑی اس کی پوروں کو کھردری محسوس ہو رہی تھی۔
"دیکھو! تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر حیا! تم جانتی ہو پورا خاندان باتیں بنا رہا ہے کہ جہان تمہیں صرف اس لیے ٹھکرا کر گیا ہے کیونکہ تم نے اپنی دقیانوسی ضد نہیں چھوڑی۔"
"بھابھی! جب ارم نے یہ بات سرعام کہی تھی' تب پھپھو نے یہ کہا تھا کہ وہ صرف اپنی چھٹی ختم ہونے پہ واپس گیا ہے مگر لوگوں نے ان کی بات پہ یقین نہیں کیا۔ انہوں نے ارم کی بات پہ یقین کیا۔ لوگ اسی بات پہ یقین کرتے ہیں جس پہ وہ یقین کرنا چاہتے ہیں۔"
ساری کریم ایڑی میں جذب ہو گئی تھی' اس نے میز پہ رکھی ڈبی کھولی۔ انگلی اندر ڈال کر پورے پہ ذرا سی ویسلین نکالی اور پھر سے کھردری ایڑی پہ لگانے لگی۔
"اور اگر جہان نے واقعی تمہیں اسی وجہ سے چھوڑا ہو' تب تم کیا کرو گی؟" وہ جیسے بہت فرصت سے اسے سمجھانے آئی تھی۔ یقیناً" اسے بھیجا گیا تھا۔
"بھابھی! یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے' جسے ہم ہینڈل کر لیں گے۔ میں نیکسٹ ویک ترکی جا رہی ہوں نا' بات کر لوں گی اس سے۔ پورے خاندان کو اس بات کی کیوں اتنی فکر ہے' میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔" وہ غصے سے نہیں بلکہ بہت نرمی سے ہموار لہجے میں بول رہی تھی۔ بات کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیاں ایڑی کا مساج بدستور کر رہی تھیں۔
"مگر حیا! تم یہ بھی تو دیکھو کہ کزنز سے پردہ کون کرتا ہے۔ میری ایک فرینڈ کا تعلق بہت سخت قسم کی پٹھان فیملی سے ہے' مگر ان کے ہاں بھی کزنز سے چہرے کا پردہ نہیں کیا جاتا۔ ٹھیک ہے' وہ سب اسلام کا حصہ ہے' مگر اب اس سب کو دقیانوسی سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔"
اس نے بہت دکھ سے سونیا کو دیکھا۔
"اگر میرے اور آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج ہمارے سامنے ہوتے تو کیا ان کی موجودگی میں بھی آپ یہی بات کہہ سکتیں؟"
سونیا ایک دم بالکل چپ ہو گئی۔
"بتائیں نا بھابھی! ان کے سامنے آپ سے پوچھا جاتا تو آپ ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو سپورٹ کرتیں یا اپنے ساس سسر کو؟"
سونیا نے لب کھولے' مگر کچھ نہیں کہہ سکی۔ اس کے پاس سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ حیا نے ڈبی سے ذرا سی مزید ویسلین نکالی اور دوسری ایڑی پہ دھیرے دھیرے رگڑتے ہوئے بولی۔
"کیا آپ جانتی ہیں کہ داور بھائی پہلے مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے؟" سونیا کی آنکھیں حیرت سے ذرا سی کھلیں۔ دھیرے سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"بالکل ایسے جیسے فرخ کچھ عرصہ پہلے تک مجھ سے شادی کے لیے تائی اماں کو تنگ کرتا رہا ہے' ویسے ہی داور بھائی نے بھی بہت اصرار کیا تھا۔ یہ بات میں نے تائی کے منہ سے آپ کی شادی سے دو روز قبل سنی تھی۔ جانتی ہیں داور بھائی ایسا کیوں چاہتے تھے؟"
وہ کچھ نہیں بولی۔ وہ بس بنا پلک جھپکے شاک کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔
"کیونکہ میں ہمیشہ بہت تیار رہا کرتی تھی۔ اب بھی رہتی ہوں۔ میرے کپڑے' جوتے' بال' ناخن۔۔۔ میں

ہر چیز آج بھی اتنی ہی تراش خراش کر سیٹ رکھتی ہوں جتنا پہلے رکھتی تھی۔ فرق بس اتنا ہے کہ اب میں باہر نکلتے ہوئے خود کو ڈھک لیتی ہوں۔ جانتی ہیں اس سے کیا ہوتا ہے؟ بس اتنا کہ دوسری عورتوں کے شوہر میری طرف متوجہ نہیں ہوتے اور یوں اپنی بیوی سے ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں رہتی ان کے پاس۔"

ایڑی میں ساری چکنائی جذب ہو چکی تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح کھردری تھی مگر وہ جانتی تھی کہ یہ چکنائی ایک دم سے اثر نہیں کرتی۔ آہستہ آہستہ وہ کھردرے پن کو نرم کرے گی اور یوں پھٹی ہوئی جلد ویسی ہو جائے گی جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔

"کیا آپ اب بھی مجھے غلط سمجھتی ہیں؟" ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے بہت اطمینان سے دیکھا۔ وہ جو بالکل گم صم سی بیٹھی تھی۔ کچھ کہے بنا اٹھ کھڑی ہوئی۔

حیا نے دور تک سونیا کو جاتے دیکھا اور پھر اپنی پھٹی ایڑیوں کو۔ آہستہ آہستہ یہ نرم پڑ جائیں گی۔ وہ جانتی تھی کچھ چیزیں کافی وقت لیا کرتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اس دن اس سے صرف اتنی غلطی ہوئی کہ وہ بغیر بتائے زارا سے ملنے چلی آئی تھی۔ آج آفس میں زیادہ کام نہیں تھا، ویسے بھی باقر صاحب کو وہ اپنی ٹاپ heirarchy کو از سر نو تشکیل دے کر نگران بنا چکی تھی، سو اس پہ کام کا بوجھ ذرا کم تھا۔ فراغت ملی تو سوچا زارا سے مل لے۔ پانچ جولائی آ کر گزر بھی چکی تھی۔ اب اس کو اسی ہفتے واپس ترکی جا کر کلیئرنس کروانی تھی انہی سوچوں میں غلطاں وہ اس کے گھر آئی۔

"زارا اندر کمرے میں ہے، فارینہ وغیرہ آئی ہوئی ہیں۔ تم اندر چلی جاؤ۔" زارا کی ممی اسے دروازے پہ ہی مل گئیں۔ وہ کہیں جانے کے لیے نکل رہی تھیں۔ خوش اخلاقی سے بتا کر وہ باہر نکل گئیں۔ وہ سر ہلا کر اندر آ گئی۔

زارا کا کمرا کاریڈور کے آخری سرے پہ تھا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ کمرے سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فارینہ اور مشال کی آوازیں، ان کی کلاس فیلوز اور فرینڈز، وہ یقیناً "اچھے وقت پہ" آئی تھی۔ ان سے بھی مل لے گی۔ یہی سوچ کر وہ چند قدم آگے آئی مگر اس سے پہلے کہ مانوسیت پیدا کرنے کے لیے کوئی آواز دیتی ادھ کھلے دروازے سے آتی آوازوں نے اسے روک دیا۔

"حیا کو مت بلانا پلیز!" بے زاری سے بولتی وہ زارا تھی۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹتی دیوار سے جا لگی۔ سانس بالکل رو کے۔ وہ اب ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

"کیا یار! اکٹھے ہو جائیں گے تو مزا آئے گا نا۔" فارینہ ذرا حیران ہوئی۔

"تم اس سے ملی نہیں ہو نا ترکی سے واپسی پہ، اسی لیے کہہ رہی ہو۔ ورنہ وہ اتنی بور ہو گئی ہے کہ کوئی حد نہیں۔ تمہیں پتا ہے اس نے برقع پہننا شروع کر دیا ہے۔ اینڈ آئی مین رئیل برقع!" وہ "رئیل" پہ زور دے کر جیسے بے یقینی کا اظہار کر رہی تھی۔

"برقع؟ ڈونٹ ٹیل می زارا!"

"ہاں، میں نے اسے بولا، تم ترکی سے آئی ہو یا عمرے سے۔"

یہ جھوٹ تھا۔ زارا نے کبھی اسے ایسے نہیں کہا تھا۔ وہ دم سادھے سنے گئی۔

"میں اس کا وہ کالا طالبان والا برقع نہیں ود اسٹینڈ کر سکتی۔ پلیز اسے کال مت کرنا۔ اسے دیکھ کر میرا دم گھٹتا ہے۔ پتا نہیں اپنا کیا حال ہوتا ہو گا۔"

"خیر! حیا کو میں جتنا جانتی ہوں، اس لحاظ سے اس نے برقع بھی ڈیزائنر لیا ہو گا، برانڈڈ برقع۔ شاید فیشن میں کر رہی ہو۔"

اب مزید کھڑے ہونا خود کو ذلیل کرنا تھا۔ وہ بنا چاپ پیدا کیے واپس پلٹ گئی۔ باہر گیٹ کیپر کے قریب وہ رکی تھی۔

"زارا کو بتا دینا کہ میں آئی تھی، مگر جا رہی ہوں۔ وجہ پوچھیں تو کہنا انہیں معلوم ہے۔" سختی سے دوٹوک انداز میں کہہ کر وہ باہر کار کی طرف بڑھ گئی۔

"چلو اور کہیں دور لے جاؤ۔ میں ذرا دور جانا چاہتی ہوں۔" پچھلی سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے اس نے تھکے تھکے انداز میں ڈرائیور سے کہا، جس نے سر ہلا کر کار اسٹارٹ کر دی۔

اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ گردن کے پچھلے حصے اور کندھوں پہ عجب دباؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے اب اعصاب تھکان کا شکار ہو رہے ہوں۔ وہ انسان ہی تھی۔ اس کی قوت برداشت اور اعصاب کی مضبوطی کی بھی ایک حد تھی۔ اس سے زیادہ پریشر وہ نہیں لے سکتی تھی۔ ہر دروازے سے دھتکارے جانا، ہر جگہ سے ٹھکرائے جانا، ہر دوست کا چھوٹ جانا، کیا مشکلات کی کوئی حد تھی؟ صبر بصبر بصبر۔ انسان کتنا صبر کرے؟ ایک نقاب ہی تو کرنا شروع کیا تھا اس نے، ایک دم سے اتنے چہروں سے نقاب کیسے اتر گئے تھے؟

ڈرائیور بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی چلاتا گیا۔ بہت دیر بعد جب اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تو اس نے گھر چلنے کا کہا۔

ابا کمرے میں تھے۔ آج ٹیک لگا کر بیٹھے، عینک لگائے اخبار دیکھ رہے تھے۔ اس نے دروازے کی درز سے ان کو دیکھا۔ ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔ پھر وہ بنا انہیں تنگ کیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

زارا کی باتوں نے اتنا ڈسٹرب کیا تھا کہ وہ رات کا کھانا بھی نہیں کھا سکی۔ فاطمہ نے پوچھا۔ ان کا رویہ ذرا بہتر تھا۔ آخر ماں تھیں۔ مگر اس نے بھوک نہ لگنے کا بہانہ کر دیا۔ پھر وہ اوپر چھت پہ چلی آئی۔

کین کا جھولا منڈیر سے لگا ویران پڑا تھا۔ وہ اس پہ بیٹھی تو ڈھیرے سے بہت سی یادیں سامنے دیوار سے لگے ابا کے گملوں کے اوپر سائے بن کر ناچنے لگیں۔

آج چاند کی روشنی کافی تیز تھی، پودوں کے پتے چمک رہے تھے۔ اسے سبانجی میں جھیل کنارے پہ چھائی چاندی کی تہہ یاد آئی اور چاندی کے مجسمے اور اسی جگہ بیٹھا وہ شخص جو خاموشی سے اس کی کہانی سنے گیا تھا، مگر اپنی نہیں سنائی تھی۔ واپس جا کر فون بھی نہیں کیا۔ وہ تھا ہی ایسا، پھر بھی وہ اس سے امید وابستہ کر لیتی تھی۔ پاگل تھی وہ۔

بہت دیر وہ جھولے پہ بیٹھی ابا کے گملوں کو دیکھتی رہی۔ وہ پہلے سے زیادہ مرجھا گئے تھے۔ ابا بیمار پڑے تو ملازموں نے بھی ان کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ منڈیر کے سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔ ان کے اور منڈیر کے درمیان قریباً چار گز چوڑا صحن تھا۔ وہ چھت کا پچھلا حصہ تھا۔ ٹیرس دوسری طرف تھا۔ وہ اب ٹیرس پہ نہیں بیٹھتی تھی کہ وہاں بے پردگی ہوتی تھی سامنے گھروں میں نظر آتا تھا، اللہ، اللہ، پھر پردہ!

اس نے بددلی سے سر جھٹکا، نہیں، وہ اپنے پردے سے تنگ نہیں پڑ رہی، مگر پھر وہ بے زاری کیوں محسوس کر رہی ہے؟

اپنی سوچوں سے اکتا کر وہ ایک دم کھڑی ہوئی اور اندر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی، مگر پھر رک گئی۔ گملوں اور منڈیر کے درمیان کچھ تھا۔ کچھ چمکا تھا۔

"کون؟" وہ ذرا چونکی ہو کر پیچھے ہوئی۔ "کوئی ہے؟"

وہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ خاموشی۔ اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر شاید اس کا وہم ہو۔ اس نے سر جھٹک کر پھر سے قدم اندر کی جانب بڑھانے چاہے مگر لمحے بھر کو پھر سے کچھ چمکا۔

"کون..... کون ہے؟" وہ بالکل ساکن کھڑی پلکیں سکیڑے اس جگہ کو دیکھے گئی۔ اسے ڈر نہیں لگ رہا ہے۔ وہ بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہے۔ اس نے خود کو بتانے کی کوشش کی، مگر فطری خوف نے اسے چھوا تھا۔ پھر بھی وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھی۔ گملوں کی قطار

کے ساتھ چلتی وہ آخری گملے تک پہنچی جس میں لگا منی پلانٹ ڈنڈی کی مدد سے قریباً چھ فٹ اونچا کھڑا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا' مگر کچھ تھا۔ کسی احساس کے تحت وہ ذرا سی آگے ہوئی اور پھر ایک دم رک گئی۔

"خدایا۔" وہ جیسے کرنٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹی اور پھر بے یقینی سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گردن اونچی کر کے دیکھا۔

اونچے منی پلانٹ سے لے کر چھت کی منڈیر تک ایک ان دیکھی دیوار سی بنی تھی' مکڑی کے جالے کی دیوار۔ جیسے کسی بیڈ منٹن کورٹ میں جالی دار نیٹ لگا ہوتا ہے۔ وہ چھ فٹ اونچا اور بے حد لمبا سا جالا بے حد خوبصورت اور سحر انگیز تھا۔ اس کے تانے بانے بہت نفاست سے بنے تھے گو کہ وہ بہت پتلا تھا' پھر بھی چاند کی روشنی کسی خاص زاویے سے پڑتی تو دھنک کے ساتوں رنگ چمکتے۔

وہ اسے تحیر سے دیکھتی الٹے قدموں پیچھے آئی۔ اگلے ہی پل وہ اندر سیڑھیوں کے دہانے پہ غصے سے نور بانو کو پکار رہی تھی۔

"جی' جی آئی۔" نور بانو جو کچن میں کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی' بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

"جاؤ کوئی جھاڑو لے کر آؤ۔ اتنے جالے لگے ہیں چھت پہ۔ تم صفائی کیوں نہیں کرتیں ٹھیک سے؟" پتا نہیں اسے کس بات پہ زیادہ غصہ چڑھا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر نور بانو بھاگتی ہوئی لمبی والی جھاڑو لیے اوپر آئی۔

"اتنا بڑا جالا یہاں بنا ہی کیسے؟" جب نور بانو اس کے ساتھ باہر چھت پہ آئی تو وہ حیرت اور اچنبھے سے جیسے خود سے بولی تھی۔

"حیا باجی! دیکھیں نا' یہاں کی صفائی کی ذمہ داری نسرین (جزوقتی ملازمہ) کی ہے' وہ روز چھت صاف نہیں کرتی۔ مجھے تو لگتا ہے کافی دن سے ادھر سے گزری بھی نہیں ہے۔ گزری ہوتی تو جالا نہ بنتا۔ یہ مکڑیاں جالے ادھر ہی بناتی ہیں جہاں کچھ عرصہ کچھ گزرا نہ ہو' چاہے بندہ' چاہے جھاڑو۔ جتنے اتار لو جالے' پر کچھ روز بعد بُن لیتی ہیں۔ سدا کی کام چور ہے نسرین' ذرا سا کام نہیں ہوتا۔ یہ جالا دیکھنے میں کتنا بڑا تھا جی' مگر جھاڑو ایک دفعہ ماری اور اتر گیا۔ اتنی سی بات تھی۔"

نور بانو جھاڑو ہوا میں اوپر نیچے مارتی جلدی جلدی وضاحتیں دے رہی تھی۔ حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ وہاں سے کافی دنوں سے کوئی نہیں گزرا تھا۔ وہ بھی ادھر آتی تو جھولے پہ بیٹھ کر تھوڑی دیر بعد اندر چلی جاتی۔ اسی لیے تو جالا بنا تھا۔ اسی لیے تو جالے بنتے ہیں۔ اس کے دل میں بھی بن گئے تھے۔ اب اسے ان کو صاف کرنا تھا۔ کیسے؟ لمحے بھر بعد ہی اس کے دل نے اسے جواب دے دیا تھا۔

اب اسے صبح کا انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ویسی ہی خوبصورت اور پرسکون تھی جیسی وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ لہلہاتا سبزہ' کشادہ سڑکیں اور کیمپس کے سرخ اینٹوں والے بلاکس۔ کیمپس میں رش بہت کم تھا۔ وہ بنا کچھ دیکھے' سیدھی ڈاکٹر ابراہیم حسن کے آفس آئی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ان کا نمبر مل گیا تھا اور چونکہ وہ ان کی ایک اچھی اسٹوڈنٹ تھی' اس لیے انہوں نے ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا۔

"السلام علیکم سر!" اجازت ملنے پہ ان کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے وہ بولی۔ وہ معمر مگر پروقار سے استاد تھے۔ مسکراتے ہوئے اس کے لیے اٹھے' اور "وعلیکم السلام" کہتے ہوئے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت شکریہ آپ نے ٹائم دیا۔ میں کچھ پریشان تھی' سوچا آپ سے ڈسکس کر لوں' شاید کوئی حل نکل آئے۔" کرسی کھینچتے ہوئے اس نے وہی بات دہرائی جو فون پہ کہی تھی۔ اپنے سیاہ عبایا اور نفاست سے لیے گئے نقاب میں وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

"شیور۔ آپ بتائیے اور چائے لیں گی یا....؟"

"نہیں نہیں سر! پلیز' کچھ بھی نہیں۔ بس میں بولنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک سامع چاہیے۔"

انہوں نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ وہ منتظر تھے۔ حیا ایک گہری سانس لے کر ٹیک لگا کر بیٹھی کہنیاں کرسی کے ہتھی پہ رکھے' ہتھیلیاں ملائے' وہ پلاٹینم کی انگوٹھی انگلی میں گھماتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں جانتی ہوں کہ ایک مسلمان کا بہترین ساتھی قرآن ہوتا ہے اور اسے اپنی تمام کنسولیشن (ہدایت) اللہ تعالیٰ سے لینی چاہیے' اپنا مسئلہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر یہی کافی ہوتا تو اللہ سورۂ عصر میں یہ نہ فرماتا کہ "انسان خسارے میں ہے' سوائے ان کے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی۔ اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔" سر! یہ جو وتواصوبالصبر ہوتا ہے نا' یہ بندے کو بندوں سے ہی چاہیے ہوتا ہے' خصوصاً تب جب دل میں مکڑی کے جالے بن جائیں۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کرسی پہ قدرے آگے ہو کر بیٹھے وہ بہت توجہ سے اسے سن رہے تھے۔

"آپ مجھے جانتے ہیں' آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ میرے لیے دین کبھی بھی لائف اسٹائل کا حصہ نہیں رہا تھا' پھر بھی میں ایک بُری لڑکی کبھی بھی نہیں تھی۔ ہر انسان اپنی کہانی خود سناتے ہوئے خود کو مارجن دے دیا کرتا ہے' شاید میں بھی دے رہی ہوں۔ پھر بھی میں بے شک حجاب نہیں لیتی تھی' مگر لڑکوں سے بات نہیں کرتی تھی۔ میری کسی لڑکے سے خفیہ دوستی نہیں تھی۔ میں دکان دار سے پیسے پکڑتے ہوئے بھی احتیاط کرتی تھی کہ ہاتھ نہ چھوئے۔ میرا نکاح بچپن میں ہوا تھا اور میں اتنی وفادار تھی کہ اگر کبھی کسی لڑکے سے یوں ملی تو اسی نکاح کو بچانے کے لیے۔"

وہ کہہ رہی تھی اور ہر ہر لفظ سے تکلیف عیاں تھی۔ دل میں چبھے کانٹے اتنی اذیت نہیں دیتے جتنا ان کو نوچ کر نکالنے کا عمل اذیت دیتا ہے۔

"پھر میں باہر چلی گئی۔ وہاں بھی دین میرے لیے بس اتنا ہی تھا کہ میلاد اٹینڈ کر لیا اور توپ قپی میں متبرکات دیکھ کر سر ڈھانپ لیا' بس ثواب مل گیا' پھر جو چاہے کرو۔ مگر پھر میں نے محسوس کیا کہ میری عزت نہیں ہے۔ میں نے خود کو بے عزت اور رسوا ہوتے دیکھا۔ میری نیت کبھی بھی غلط نہیں ہوتی تھی' پھر بھی میں رسوا ہو جاتی تھی۔ تب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیوں ہوتا ہے۔ پھر مجھے اللہ نے دو قسم کے عذاب چکھائے۔ روحانی اور جسمانی۔ پہلے میں نے موت دیکھی' اور پھر موت کے بعد کا جہنم۔" درد سے اس نے آنکھیں میچ لیں۔ بھڑکتا الاؤ' دہکتے انگارے۔ سب کچھ سامنے ہی تھا۔

"میری جلد پہ آج بھی وہ زخم تازہ ہیں جو اس بھیانک حادثے نے مجھے دیے اور تب مجھے سمجھ میں آگیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا صرف تمنا اور خواہش سے نہیں ملتی۔ اس کے لیے دل مارنا پڑتا ہے۔ محنت کرنی پڑتی ہے اور میں نے دل مارا۔ تاکہ میری آنکھ میں اور دل میں اور وجود میں نور داخل ہو جائے اور میں نے وہ سب کرنا چاہا جو اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ میں کروں مگر تب مجھے کسی نے کہا تھا کہ قرآن کی پہیلیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں اور یہ کہ "احزاب" میں آیت حجاب اترنا بھی ایک پہیلی ہے۔ اس نے اس پہیلی کو یوں حل کیا کہ حجاب لینا خندق کی جنگ کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جہاں کسی عہد میں بندھے بنو قریظہ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں' جہاں جاڑے کی سختی اور بھوک کی تنگی ہوتی ہے اور پھر میں نے خود کو اسی خندق میں پایا۔ اب جب کہ میں اس دوسرے لائف اسٹائل کو نہیں چھوڑنا چاہتی تو لوگ مجھے اس پہ مجبور کر رہے ہیں۔ میرے سگے تایا جو اپنی بیٹی کو ساری عمر اسکارف کرواتے آئے ہیں' وہی اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ میں کیسے اس دل کی ویرانی پہ قابو پاؤں جو میرے اندر اتر آئی ہے؟ میں کیسے ان جالوں کو صاف کروں؟"

بہت بے بسی اور شکستگی سے کہتے اس نے اپنا سوال

ان کے سامنے رکھا۔ دل جیسے ایک غبار سے صاف ہوا تھا۔ ایک بوجھ سا کندھوں سے اترا تھا۔

"میں جہاں تک آپ کی بات سمجھ سکا ہوں۔" بہت دھیمے مگر مضبوط لہجے میں انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "تو آپ کے دل میں مکڑی کے جالے اسی لیے بن رہے ہیں کہ آپ لوگوں کے ان رویوں کو دائمی سمجھ رہی ہیں۔ دیکھیں! قرآن کیا کہتا ہے؟ ایک سورہ ہے جس کا نام عنکبوت یعنی "مکڑی" ہے' اس میں یہی لکھا ہے ناکہ جو شخص اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بناتا ہے' اس کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ جو اپنا گھر بنتی ہے اور بے شک گھروں میں سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے تو بیٹا یہ جو "کارساز" بنانا ہوتا ہے نا' یہ صرف کسی انسان کو خدا کے برابر سمجھنا نہیں ہوتا بلکہ کسی کو زور آور تسلیم کرنا اور اس کے رویّے کو خود پہ طاری کرلینا بھی ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے حجاب کے لیے بہت فائٹ کی' یہی تو عورت کا جہاد ہوتا ہے' اس کی الٹی میٹ اسٹرگل۔ مگر آہستہ آہستہ فطری طور پہ آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لوگوں کا رویہ ہمیشہ یہی رہے گا۔"

"آپ کو لگتا ہے وہ بدلیں گے؟ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "میرے تایا کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کریں گے' آپ ان کو نہیں جانتے۔"

"آپ کے تایا کا مسئلہ پتا ہے کیا ہے حیا؟ بہت سے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی اپنی بیٹی کو اسکارف اللہ کی رضا کے لیے کروایا ہوگا' انہوں نے حجاب کے لیے اسٹینڈ لیا ہوگا' جیسے آج آپ لے رہی ہیں' اور حجاب کے لیے ہر اسٹینڈ لینے والے کو آزمایا جاتا ہے۔ آپ کو طنزو طعنے کے نشتروں سے آزمایا گیا کیونکہ یہی آپ کی کمزوری ہے کہ آپ کسی کی ٹیڑھی بات زیادہ برداشت نہیں کرسکتیں اور آپ کے تایا کو "تعریف' ستائش اور واہ واہ" سے آزمایا گیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔ یہ بات ان سے لوگوں نے کہی ہوگی اور یوں ان کا وہ کام جو اللہ کی رضا کے لیے شروع ہوا تھا اس میں تکبّر اور خود پسندی شامل ہوگئی۔"

وہ بالکل یک ٹک ان کو دیکھے جارہی تھی۔ اس نے تو کبھی اس نہج پہ سوچا بھی نہیں تھا۔

"اب اس خود پسندی میں وہ اتنے راسخ ہوگئے کہ اپنی ہر بات ان کو درست لگتی ہے۔ یہاں ہر شخص نے اپنا دین بنا رکھا ہے' اصولوں کا ایک سیٹ اسٹینڈرڈ جس سے آگے پیچھے ہونے کو وہ تیار نہیں۔ آپ کے تایا کا بھی اپنا دین ہے۔ جو اس تک عمل کرے **مثلاً** صرف اسکارف لے' اس کو وہ سراہیں گے مگر جو اس سے آگے بڑھے' شرعی حجاب شروع کرے' **مثلاً** ان کے بیٹے یا داماد سے پردہ کرنے لگے' اس نے ان کے دین سے آگے نکلنے کی کوشش کی' **نتیجتاً** وہ ان کے عتاب کا شکار ہوا۔"

اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جو اسے لگتا تھا کہ تایا اس کی مخالفت میں دین کے دشمن ہوگئے ہیں تو وہ غلط تھی۔ وہ یہ سب دین اور صحیح کام سمجھ کر ہی تو کررہے تھے۔

"مگر اب اس سب کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سب کدھر ختم ہوگا؟ انا اور اپنی نیکی پہ تکبر کی یہ جنگ۔۔۔ کیا بنے گا اس کا؟"

اس کی بات پہ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

"حیا! ابھی آپ نے احزاب کی پہیلی کی بات کی۔ اسے آپ نے حجاب سے تشبیہ دی۔"

"میں نے نہیں' میری دوست نے۔" اس نے فوراً" تصحیح کی۔

"دوست۔ آپ کی دوست نے یہ سب کہا؟ خندق' بنو قریظہ' بھوک اور جاڑا۔ سب کی حجاب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے' مگر پھر بھی آپ ایک آخری چیز مس کر گئی ہیں۔"

"کیا؟" وہ چونکی۔ کیا عائشے کچھ مس کر گئی تھی؟

"آپ نے احزاب کی پہیلی ابھی مکمل حل نہیں کی۔ آپ بس ایک چیز نہیں دیکھ رہیں' وہ جو اس پہیلی کی اصل ہے' اس کی بنیاد ہے' ایک چیز جو آپ بھول گئی ہیں۔"

"کیا سر؟" وہ آگے ہو کر بیٹھی۔

"اگر وہ میں آپ کو بتاؤں یا سمجھاؤں تو آپ کو اس کا اتنا فائدہ نہیں ہوگا جتنا آپ کے خود سوچنے سے ہوگا۔ قرآن کی پہیلیاں خود حل کرنی پڑتی ہیں۔ خود سوچیں' خود ڈھونڈیں' آپ کو اپنے مسئلے کا سیدھا سیدھا حل نظر آجائے گا۔"

اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔ اب اسے پہیلیاں بوجھنا اچھا لگتا تھا۔

"ٹھیک ہے' میں خود سوچوں گی۔ مگر سر! لوگ مجھے دقیانوسی کہتے ہیں تو میرا دل دکھتا ہے' میں اپنے دل کا کیا کروں؟" وہ ایک ایک کر کے دل میں چبھے سارے کانٹے باہر نکال رہی تھی۔ اذیت ہی اذیت تھی۔

"دقیانوسی کیا ہوتا ہے حیا؟"

اس نے جواب دینے کے لیے لب کھولے' وہ کہنا چاہتی تھی کہ پرانا' بیک ورڈ' پینڈو' مگر رک گئی۔ اہل علم کے سوالات کا جواب کسی اور طریقے سے دینا چاہیے۔

"آپ بتائیں سر! کیا ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر حسن ذرا سے مسکرائے۔ "اصحاب کہف کا قصہ تو سنا ہوگا آپ نے؟ جس بادشاہ کے ظلم و جبر سے' اور اللہ کی فرمانبرداری سے روکے جانے پہ انہوں نے اپنے گھر چھوڑ کر غار میں پناہ لی تھی' اس بادشاہ کا نام دقیانوس تھا۔

King Decius دقیانوس کا طریقہ اللہ کی فرماں برداری سے روکنا تھا۔ سو اللہ کی اطاعت کی کوئی بھی چیز دقیانوسی کیسے ہوسکتی ہے؟" وہ لمحے بھر کو بالکل چپ رہ گئی۔

"میں تو یہ سمجھ جاؤں' مگر ان کو کیسے سمجھاؤں؟ میں نے اپنی اماں سے ایک گھنٹہ بحث کی مگر وہ نہیں سمجھیں۔"

"آپ کی عمر کتنی ہوگی؟"

"تیئس سال کی ہونے والی ہوں۔" اس نے بنا حیران ہوئے تحمل سے بتایا۔

"آپ کو بارہ' تیرہ برس کی عمر سے اسکارف لینا چاہیے تھا' مگر آپ نے بائیس' تیئس برس کی عمر میں لیا۔ جو بات دس سال' ایک دوست کی موت اور ایک بھیانک حادثے کے بعد آپ کی سمجھ میں آئی' آپ دوسروں سے کیسے توقع کرتی ہیں کہ وہ ایک گھنٹے کی بحث سے اسے سمجھ لیں گے؟" وہ بہت نرمی سے اس سے پوچھ رہے تھے۔

"تو کیا ان کو بھی میرا موقف سمجھنے میں دس سال لگیں گے؟"

"اس سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے اور کم بھی' مگر آپ انہیں ان کا وقت تو دیں۔ کچھ چیزیں وقت لیتی ہیں حیا!"

"مگر انسان کتنا صبر کرے سر! کب تک صبر کرے؟" وہ اضطراب سے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جب زخم پہ تازہ تازہ دوا کا قطرہ گرتا ہے تو ایسی ہی جلن اور تکلیف ہوتی ہے۔ میرے بچے! صبر کی ایک شرط ہوتی ہے' یہ صرف اسی مصیبت پہ کیا جاتا ہے جس سے نکلنے کا راستہ موجود نہ ہو۔ جہاں آپ اپنے دین کے لیے لڑسکتی ہوں' وہاں لڑیں وہاں خاموش نہ رہیں۔ آپ سے آیت حجاب میں اللہ نے کیا وعدہ کیا ہے؟ یہی کہ آپ چادریں اپنے اوپر لٹکالیں تاکہ آپ پہچان لی جائیں اور آپ اذیت نہ دی جائیں۔ یہ جو "پہچان لی جائیں" ہے نا' عربی میں "عرف" کہتے ہیں۔ اس کا مطلب "تاکہ آپ عزت سے جانی جائیں" بھی ہوتا ہے۔ آپ اپنا وعدہ نبھا رہی ہیں تو اللہ سے کیا توقع کرتی ہیں؟ وہ آپ کو عزت دینے اور اذیت سے بچانے کا وعدہ نہیں نبھائے گا کیا؟"

مرہم لگنے کے باوجود زخم درد کررہے تھے۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا سا بن گیا۔

"مگر کب سر؟ کب میں تبدیلی دیکھوں گی؟" اس کی آواز میں نمی تھی۔

"مزدور کو اجرت مزدوری شروع کرتے ہی نہیں ملتی حیا! بلکہ جب مطلوبہ کام لے لیا جاتا ہے تب ملتی ہے' شام ڈھلے' مگر کام ختم ہوتے ہی مل جاتی ہے' اس کے پسینے کے خشک ہونے کا انتظار کیے بغیر۔ ابھی آپ

نے کہا تھا کہ اللہ کی رضا صرف تمنا اور خواہش سے نہیں مل جاتی۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ کے راستے میں تھکنا پڑتا ہے' پھر ہی اجرت ملتی ہے۔"

فون کی گھنٹی بجی تو وہ رکے اور ریسیور اٹھایا۔ چند ثانیے کو وہ عربی میں بات کرتے رہے' پھر ریسیور رکھ کر اٹھے۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں' تب تک آپ بیٹھیں۔ سوری! میں آپ کو زیادہ کچھ آفر نہیں کر سکتا' سوائے اس کے۔" انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا شیشے کا جار اس کے سامنے میز پہ رکھا جو گلابی ریپر والی کینڈیز سے بھرا تھا۔

"اٹس او کے سر!" وہ خفیف سی ہوگئی۔

"دو ہفتے قبل ہم ترکی گئے تھے' یونیورسٹی آف استنبول میں ایک کانفرنس تھی' اس سلسلے میں۔ یہ میں کپادوکیہ سے لایا تھا۔ آپ کو ترکی پسند ہے' سو یہ بھی اچھی لگے گی۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ مسکراکر بتاتے ہوئے چند کتب اٹھائے' جن میں سرفہرست ہولی بائبل تھی' باہر نکل گئے۔

اس نے بھیگی آنکھیں رگڑیں اور پھر مسکرا کر جار کھولا۔ اندر ہاتھ ڈال کر دو کینڈیز نکالیں۔ گلابی ریپر اتار کر اس نے کینڈی منہ میں رکھی' پھر ریپر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پہ کوئی عجیب و غریب سا غار بنا تھا۔ جو بھی تھا' اس نے دوسری کینڈی اور ریپر پرس میں ڈال دیے۔ ترکی سے متعلقہ ہر چیز اسے بہت پیاری تھی۔

کینڈی کو اپنے منہ میں محسوس کرتے' اس نے گردن موڑ کر بند دروازے کو دیکھا جہاں سے ابھی ابھی سر گئے تھے۔

کچھ لوگ صرف دین کی وجہ سے آپ کے کتنا قریب آجاتے ہیں نا۔

☼ ☼ ☼

صبح آفس جانے سے قبل وہ ڈائننگ ٹیبل پہ جلدی جلدی ناشتا کر رہی تھی۔ کل سے اس کا دل اتنا پرسکون تھا کہ کوئی حد نہیں۔ کبھی کبھی انسان کو اپنا بوجھ بانٹ لینا چاہیے' مگر صحیح بندے کے ساتھ اور صحیح وقت پہ۔

"نور بانو!" فاطمہ قریب ہی کچن میں کھڑی نور بانو کو ہدایات دے رہی تھیں۔

"عابدہ بھابھی اور سحرش دوپہر کے کھانے پہ یہاں ہوں گی' تم لنچ کی تیاری ابھی سے شروع کردو۔ یوں کرنا کہ....."

جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے وہ ٹھہر گئی۔

یہ عابدہ چچی اور سحرش کے چکر ان کے گھر بڑھ نہیں گئے تھے؟ پرسوں ہی تو وہ آئی تھیں اور پھپھو کے لیے ایک بہت قیمتی جوڑا بھی لائی تھیں۔ آج پھر آرہی تھیں۔ کیوں بھلا؟

"اماں!" کرسی سے اٹھ کر ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے فاطمہ کو آتے دیکھا تو پکار لیا۔

"چچی کیوں آرہی ہیں' ابا سے ملنے؟"

"نہیں! تمہاری پھپھو کے ساتھ شاپنگ پہ جانا چاہتی ہیں۔ سحرش کے کالج میں کوئی فنکشن ہے۔ اسے آئرش طرز کی دلہن بننا ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی خاص ڈریس بنوانا چاہتی ہے۔ سبین کو تجربہ ہے نا کپڑوں وغیرہ کا' اس لیے۔"

"اچھا۔" وہ الجھنے سے عبایا پہننے لگی۔

"پہلے تو سحرش کسی سے مشورے نہیں لیتی تھی' اب کیوں؟ اور پھپھو ہی کیوں؟ یا پھر وہ جہان سکندر بنتی جارہی تھی۔ ہر ایک پہ شک کرنا۔ اف!" وہ نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھ کر باہر نکل آئی۔

"خیر جو بھی ہے۔" اسے آتے دیکھ کر ڈرائیور نے فوراً" پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ.....

"حیا!" ارم کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ بیٹھتے بیٹھتے رکی اور حیرت سے پلٹی۔ ارم سامنے ہی کھڑی تھی۔ سر پہ دوپٹا لیے' آنکھوں تلے حلقے' چہرے پہ سنجیدگی۔

"ارم؟" اسے حیرت ہوئی۔ ارم چلتی ہوئی اس کے سامنے آئی۔

"بات کرنی تھی تم سے۔" پھر اس نے ڈرائیور کو دیکھا۔

"تم باہر جاؤ۔" وہ جیسے اسی جگہ پہ بات کرنا چاہتی تھی۔ ڈرائیور فوراً" تابعداری سے وہاں سے ہٹ گیا۔

"بتاؤ' کیا بات ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

ارم چند لمحے اسے سنجیدگی سے دیکھتی رہی' پھر دھیرے سے بولی۔

"اس روز میں نے جو سنا' وہ وہاں جا کر بتا دیا' صرف اس لیے کیونکہ مجھے تم پہ غصہ تھا۔ کیونکہ تم نے بھی میرا پردہ نہیں رکھا تھا۔"

"ارم! اگر تم نہ بھی بتاتیں اور مجھ سے کوئی پوچھتا کہ وہ کیوں گیا ہے تو میں خود ہی بتا دیتی۔ جہاں تک بات ہے میری..... مجھے تایا نے رات کے تین بجے فون کر کے پوچھا تھا کہ میرے پاس کوئی دوسرا نمبر ہے یا نہیں اگر تم نے مجھ پہ بھروسا کیا ہوتا تو میں بھی تم پہ بھروسا کرتی کہ تم مجھے پھنساؤ گی نہیں۔" وہ گاڑی کے کھلے دروازے کے ساتھ ہی کھڑی' بہت سکون سے کہہ رہی تھی ارم چند لمحے لب کاٹتی رہی' پھر نفی میں سر ہلایا۔

"مگر میں نے اس روز زیادتی کردی تمہارے ساتھ۔ آئی ایم سوری فار دیٹ۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" حیا نے بغور اسے دیکھا۔ وہ واقعی نادم تھی یا اس کے پیچھے کوئی اور مقصد تھا۔ البتہ اس کا دل پسیجنے لگا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق تو پڑا ہے نا' اسی وقت سے عابدہ چچی' پھپھو کے پیچھے پڑی ہیں کہ تمہارا پتا صاف ہو اور وہ جہان کے لیے سحرش کی بات چلا سکیں۔"

"کیا؟" وہ چونکی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔

"ہاں! اسی لیے تو روز ہی پھپھو کے پاس آئی بیٹھی ہوتی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں؟" اب کے ارم کو حیرت ہوئی۔ حیا نے بمشکل شانے اچکائے۔

"جو بھی ہے' مجھے ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا۔" اس نے بظاہر لاپروائی سے کہا' البتہ اس کا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔

"مگر..... خیر۔" ارم نے گہری سانس لی۔ لمحے بھر کو وہ خاموش رہی پھر بولی۔

"کیا مجھے تمہارا فون مل سکتا ہے' مجھے ایک کال کرنی ہے بس!" اس کا لہجہ ملتجی نہیں ہوا' بلکہ ہموار رہا۔ "بس مجھے اس قصے کو ختم کرنا ہے' بس اسے خدا حافظ کہنا ہے۔"

تو یہ بات تھی۔ حیا نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔ ارم نے "جسے" بھی فون کرنا تھا وہ اسے اپنے لینڈ لائن یا کسی بھی طرح ماں' بھابھی کسی کا بھی فون لے کر کرسکتی تھی' مگر غالباً" وہ پہلے پکڑی گئی ہوگی یا پھر سختی بڑھ گئی تھی تب ہی وہ خطرہ مول نہیں لیتی تھی۔

"ٹھیک ہے! مگر بہتر ہے کہ تم میرا فون استعمال مت کرو..... الٰہی بخش!" اس نے دور کھڑے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ فوراً" ہاتھ باندھے ان کے پاس آیا۔

"کیا میں تمہارا فون لے سکتی ہوں ایک منٹ کے لیے؟"

"جی' جی!" اس نے فوراً" اپنا موبائل پیش کیا اور دور چلا گیا۔

"لو۔" حیا نے موبائل ارم کی طرف بڑھایا۔ ارم نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے فون تھاما اور تیزی سے نمبر ملانے لگی۔

وہ گاڑی میں بیٹھی اور دروازہ بند کیا۔ باہر ارم جلدی جلدی فون پہ دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اسے کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ نہ اس نے سننے کی کوشش کی۔ ایک منٹ بعد ہی ارم نے فون بند کردیا۔ حیا نے بٹن دبایا' شیشہ نیچے ہوا۔

"تھینکس حیا!" ممنونیت سے کہتے ہوئے اس نے فون حیا کو تھمایا۔ "میں چلتی ہوں۔" وہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔ جب وہ درمیانی دروازہ پار کر گئی تو حیا نے موبائل کے کال ریکارڈز چیک کیے۔ اس نے ڈائلڈ کالز میں سے کال مٹادی تھی' مگر یہ نوکیا کا وہ ماڈل تھا جس میں ایک کال لاگ الگ سے موجود تھا۔ حیا نے اسے کھولا۔ وہاں نمبر محفوظ تھا۔ اس نے وہ نمبر اپنے موبائل میں اتارا اور محفوظ کرلیا۔

"الٰہی بخش!" اب وہ دور کھڑے الٰہی بخش کو واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

"کبھی اگر ارم نے اسے پھنسانے کی کوشش کی تو اس کے پاس ثبوت بھی تھا' اور موقع کا گواہ بھی۔" الٰہی بخش کو آتے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔

"ذیشان صاحب کے آفس لے چلو! جہاں اس دن گئے تھے۔" فون آگے ہو کر اسے تھماتے ہوئے اس نے الٰہی بخش کو ہدایت دی۔

"اور ارم بی بی نے تمہارا فون استعمال کیا ہے' یہ بات کسی اور کو پتا نہیں لگنی چاہیے۔"

"جی میم!" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

☆ ☆ ☆

ذیشان انکل آفس میں نہیں تھے۔ ان کی سیکریٹری پھر بھی اسے آفس میں لے گئی کیونکہ رجا (ان کی ایب نارمل بیٹی) اندر تھی۔

"آپ بیٹھ جائیے۔ سر ابھی آتے ہوں گے۔" جاتے ہوئے ان کی سیکریٹری نے اوپر سے نیچے تک ایک عجیب سی نظر اس پہ ڈالی تھی۔

وہ بنا اثر لیے کاؤچ پہ بیٹھ گئی۔ اس کے عبایا کو بہت سی جگہوں پہ اسی طرح دیکھا جاتا تھا مگر جب دوسرے غلط ہو کر اتنے پر اعتماد تھے تو وہ درست ہو کر پر اعتماد کیوں نہ ہو؟ اور وہ بھی کتنی پاگل تھی جو تالی اور اس کی باتوں کو دل سے لگا لیتی تھی۔ تالی بے چاری نے چند ایک بار فقرے اچھالنے کے سوا کیا ہی کیا تھا۔ وہ تو اہل مکہ تھی' ان سے کیا گلہ؟ اصل اذیت دینے والے تو بنو قریظہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ جنگ وہی جیتتا ہے جو ہار نہیں مانتا' اور پھر انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔

اس لمحے ڈی جے اسے بہت یاد آئی تھی۔ دھیان بٹانے کے لیے اس نے سر جھٹکا تو خیال آیا' رجا اس لمبے سے کاؤچ کے دوسرے سرے پہ بیٹھی تھی۔ چہرہ اخبار پہ اتنا جھکائے کہ گھنگریالے بال صفحے کو چھو رہے تھے' وہ قلم سے اخبار پہ نشان لگا رہی تھی۔ اسے ورڈ پزل اچھے لگتے تھے۔ حیا کو بھی اب اچھے لگتے تھے' مگر وہ آخری پزل ابھی تک حل نہیں ہو سکا تھا۔ رجا تو اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی' مگر شاید وہ رجا کی کوئی مدد کر سکے۔

"رجا! کیا کر رہی ہو؟" وہ نرمی سے کہتی اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی۔ رجا نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اخبار اس کے سامنے کیا۔ اس کی حرکات بہت آہستہ تھیں۔ اسے بچی پہ بہت ترس آیا۔ مگر پھر سوچا' وہ کیوں ترس کھا رہی ہے؟ جب وہ ایب نارمل لڑکی اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے محنت کر رہی ہے تو وہ اس کے بارے میں ہمدردی اور تاسف سے کیوں سوچے؟ اسے تو ستائش سے سوچنا چاہیے۔

"دکھاؤ! کیا ہے یہ؟" اس نے وہ پرانا' مڑا تڑا ہوا اخبار رجا کے ہاتھ سے لیا۔ ایک ہی پزل پہ وہ کافی دن سے لگی ہوئی تھی شاید' اسی لیے وہ جگہ کافی خستہ حال لگ رہی تھی۔ ذیشان انکل یقیناً "اپنی محبت میں سمجھتے تھے کہ رجا یہ پزل حل کر لے گی۔ ورنہ۔ وہ شاید ذہنی طور پہ کافی پیچھے تھی۔

"تم سے یہ حل نہیں ہو رہا؟" اس نے پیار سے پوچھا۔ رجا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ ایک ثانیے کو اسے بے اختیار بہارے گل یاد آئی۔

"اچھا! یہ دیکھو۔ یہ جو پہلا لفظ ہے نا' یہ ایک اینا گرام ہے' اینا گرام یوں ہوتا ہے جیسے کسی لفظ کے حروف آگے پیچھے کر دو تو نیا لفظ بن جائے' جیسے silent (سائلنٹ) کے حروف ادل بدل کر دو تو listen (لسن) بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں اینا گرامز میں بہت حکمت اور دانائی چھپی ہوئی ہے۔ اب یہ پہلا لفظ دیکھو!" وہ اخبار سے پڑھ کر بتانے لگی۔

"یہ لکھا ہے Try Hero Part (ٹرائی ہیرو پارٹ) یہ کسی مووی کا نام ہے' تمہیں بتانا ہے کہ اس کے حروف ادل بدل کرو تو کس مووی کا نام بنتا ہے۔ ٹھیک؟"

رجا نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بنا تاثر کے خالی خالی آنکھوں سے حیا کو دیکھتی رہی۔

حیا نے چند ثانیے اس لفظ کو غور سے دیکھا اور پھر اس کی سمجھ میں آگیا کہ ٹرائی ہیرو پارٹ کے حروف کی جگہیں آگے پیچھے کرنے سے کیا بنتا تھا۔

"Harry Potter دیکھو! اس سے 'ہیری پوٹر' بنتا ہے۔ اب یہاں لکھو 'ہیری پوٹر۔'" اس نے اخبار رجا کو تھمایا۔

رجا نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلائی اور بہت آہستگی سے ایک ایک حرف خالی جگہ پہ اتارنے لگی۔

"اب یہ اگلا مجموعہ دیکھو۔ vest Action Old (اولڈ ویسٹ ایکشن) اس سے کسی مشہور ایکٹر کا نام بنتا ہے۔ جو پرانی انگریزی ایکشن فلموں میں کام کیا کرتا تھا۔ کیا ہو سکتا ہے؟" وہ ان تین الفاظ کو دیکھتے ہوئے سوچ میں پڑ گئی۔ ذیشان انکل کے پاس وہ کس کام سے آئی تھی' اسے سب بھول چکا تھا۔

"اوہ ہاں! Clint Eastwood (کلائنٹ ایسٹ ووڈ)۔" وہ ایک دم چونکی۔ بہت ہی دلچسپ پزل تھا۔

"ویسے میں تمہیں چیٹنگ کروا رہی ہوں' یہ غلط بات ہے' چلو! اب باقی تم خود سولو کرو۔ بس تمہیں ان الفاظ کے حروف کی جگہوں کو ادل بدل کرنا ہے' جیسے میں نے کیا تھا' پھر تم نئے الفاظ بنا سکو گی' ٹھیک؟" بات ختم کرنے سے قبل ہی اس کا ذہن اپنے اس آخری پزل کی طرف بھٹک گیا۔

swap؟ سواپ کرنے کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے نا' کیا وہ کوئی ہنٹ تھا کہ اسے حروف کی جگہوں کو swap کرنا ہے اور کوئی نیا لفظ بنانا ہے؟ مگر وہ کل بارہ حروف تھے' اور پاس ورڈ تو آٹھ حرفی ہونا چاہیے تھا' پھر وہ اس سے کیا بنا سکتی تھی؟ ایک دم وہ بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہو سکتا ہے وہ دو الفاظ کوئی اینا گرام ہی ہو۔ اینا گرام کے ذریعے کوڈز لکھنا تو بہت قدیم طریقہ تھا' یہ ہر دور میں استعمال ہوتا رہا تھا۔ فلسفے میں' آرٹ' فکشن' جاسوسی' ہر چیز میں کہیں نہ کہیں اینا گرامز کا ایک کردار ہوتا تھا۔ اسے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا بھلا؟

فلیش ڈرائیو اس کے پاس پرس میں ہی تھی' مگر اسے اس کو صرف اپنے لیپ ٹاپ میں لگانا چاہیے اور ابھی ابھی وہ کام اسے کرنا تھا۔ ذیشان انکل سے وہ بعد میں مل لے گی۔ ابھی اسے اپنے آفس پہنچنا تھا جہاں تنہائی میں وہ یہ کام کر سکے۔

باہر سیکریٹری کو بتا کر' رجا کو 'بائے' کہہ کر وہ تیزی سے باہر آئی تھی۔ گاڑی میں ہی اس نے اپنے موبائل سے گوگل آن کیا' اور ایک اینا گرام فائنڈر ویب سائٹ کھولی تاکہ وہ دیکھ سکے کہ سائڈ اسٹوری سے کتنے ممکنہ الفاظ بن سکتے ہیں۔

"پانچ ہزار چار سو تراسی مجموعات؟" نتیجہ دیکھ کر اس نے گہری سانس لی۔ اب ان میں سے کون سا درست ہو سکتا ہے بھلا؟ خیر' وہ ان تمام الفاظ کو دیکھتی ہے' شاید کچھ مل جائے۔

پہلا مجموعہ تھا۔ "Pasty Powders"

"اونہوں!" اس نے خفگی سے نفی میں سر ہلایا۔

So Try" "Trays Swopped"

"Swopped

وہ ان عجیب و غریب مجموعات پر سے نظر گزارتی تیزی سے موبائل اسکرین کو انگلی سے اوپر نیچے کر رہی تھی کہ ایک مجموعہ الفاظ پہ ٹھہر گئی۔

Story Swapped کے حروف کو آگے پیچھے کرنے سے بننے والے یہ دو الفاظ تھے۔

Type Password

"ٹائپ پاس ورڈ؟" اس نے اچنبھے سے دہرایا۔

"یعنی کہ پاس ورڈ ٹائپ کرو۔ کیا مطلب؟" اور پھر روشنی کے کسی کوندے کی طرح وہ اس کے دل و دماغ کو روشن کر گیا۔

"پاس ورڈ۔ پاس ورڈ میں پورے آٹھ حروف ہوتے ہیں۔ ٹائپ پاس ورڈ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی خفیہ لفظ ٹائپ کرے' بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لفظ "پاس ورڈ" ہی ٹائپ کردے۔

لفظ ''پاس ورڈ'' جو آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا پاس ورڈ ہے' لاکھوں ای میل ہولڈرز کا پاس ورڈ آج بھی یہی لفظ ''پاس ورڈ'' ہی ہے۔ دنیا کا سب سے کامن' سب سے آسان پاس ورڈ۔ اس نے موبائل بند کیا' اور پرس میں ڈالا۔

''تیز چلاؤ الٰہی بخش!'' وہ بے چینی سے بولی۔ اپنے آفس پہنچنے کی اتنی جلدی اسے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

''میں آفس جا رہی ہوں مگر پلیز! میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی' سو مجھے کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ ٹھیک؟'' اپا کی سیکریٹری کو حکمیہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔

آفس مقفل کرنے اور نقاب اتارنے کے بعد اس نے لیپ ٹاپ کھول کر میز پہ رکھا اور پرس سے مخملیں ڈبی نکالی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اندر سیاہ فلیش ڈرائیو ویسی ہی رکھی تھی۔ اس نے اسے باہر نکالا' اور ڈھکن کھول کر ساکٹ میں ڈالا۔

چند لمحوں بعد اسکرین پہ آٹھ چوکھٹے اس کے سامنے چمک رہے تھے۔ کی بورڈ پہ انگلیاں رکھ کر اس نے لمحے بھر کو آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر کو کھینچی اور پھر آنکھیں کھولیں۔ اگر وہ غلط ہوئی تو وہ اس فائل کو کھو دے گی۔ مگر اسے یقین تھا کہ ''پاس ورڈ'' ہی وہ لفظ تھا جو اسے اس فائل میں داخل کر دے گا۔ ٹھنڈی پڑتی انگلیوں سے اس نے ٹائپ کیا۔

''پی اے ایس ایس ڈبلیو او آر ڈی''

اور انٹر پہ انگلی رکھ دی۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی' پھر ہرا سگنل چمکا acces granted (ایکسیس گرانٹڈ) پاس ورڈ درست تھا۔

''یا اللہ!'' وہ خوش ہو' یا حیران' اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا' مگر دل کی دھڑکن مزید تیز ہو گئی تھی۔ اسکرین اب وہ فائل کھل رہی تھی۔ اس کے لیے جو پروگرام کمپیوٹر نے کھولا وہ ونڈوز میڈیا پلیئر تھا۔

''میڈیا پلیئر؟'' اس نے اچنبھے سے اسکرین کو دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فائل کوئی ویڈیو یا آڈیو تھی۔ اس کا پہلا خیال اپنی اور ارم کی ویڈیو کی طرف گیا تھا اور بھائی کی مہندی کی.....

مگر اسے زیادہ کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ کوئی ویڈیو ہی تھی اور شروع ہو چکی تھی۔

اس کے پہلے منظر پہ نظر پڑتے ہی حیا سلیمان کا سانس رک گیا۔ اسے لگا وہ کبھی ہل نہیں سکے گی۔

''اللہ' اللہ' یہ کیسے.....؟'' وہ سفید پڑتا چہرہ لیے چمکتی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

جو کام نپٹا کر اسے بہارے گل سے نپٹنا تھا' وہ کام ابھی نہیں ہوئے تھے' مگر وہ جانتا تھا کہ آج دوپہر سے اچھا موقع اسے حلیمہ عثمان کے گھر جانے کا نہیں ملے گا' اس لیے وہ ادھر آگیا تھا۔

حلیمہ آنٹی نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ سوٹ میں ملبوس' وہی گلاسز' جیل سے پیچھے کیے بال اور عبدالرحمٰن کے ماتھے کے مخصوص بل۔

''عبدالرحمٰن؟ آجاؤ۔'' وہ خوش گوار حیرت سے کہتے ہوئے ایک طرف ہوئیں۔

''سفیر کدھر ہے حلیمہ؟'' بے تاثر اور سپاٹ انداز میں پوچھتے ہوئے اس نے اندر قدم رکھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ لوگوں کو کبھی ریلیشن شپ ٹائٹل سے نہیں بلایا کرتا تھا۔ صرف ان کے پہلے نام لیا کرتا تھا۔

''ہوٹل میں ہوگا' کال کروں اسے؟''

''نہیں! آپ اسے کال نہیں کریں گی..... اور بہارے؟'' اس نے یک لفظی استفسار کیا۔ جتنا حلیمہ عثمان اسے جانتی تھیں' وہ بھانپ گئیں کہ وہ بہت برے موڈ میں تھا۔

''وہ اندر اسٹڈی روم میں بیٹھی ہے۔ بہت اداس ہے۔'' انہوں نے ملال سے بتایا۔ شاید اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کی۔

''حرکتیں جو ایسی ہیں اس کی۔'' وہ بے حد بے غصے سے کہتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھر کر اسٹڈی روم کی جانب بڑھ گیا۔

بنا دستک کے دروازہ دھکیلا تو کرسی پہ بیٹھی بہارے گل نے چونک کر سر اٹھایا۔ پورے گھنگھریالے بالوں کی پونی بنائے' لمبے فراک میں ملبوس وہ جو واقعی غمزدہ لگ رہی تھی' اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''عبدالرحمٰن!'' وہ کرسی سے اٹھی اور میز کے پیچھے سے گھوم کر سامنے آئی۔ بہارے کا پھول جیسا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

''بہت اچھا لگتا ہے تمہیں دوسروں کو اذیت دینا؟'' وہ اتنے غصے سے بولا تھا کہ وہ وہیں رک گئی۔ چہرے کی جوت بجھ سی گئی۔

''میں تمہارے لیے کیا نہیں کرتا اور تم بدلے میں میرے مسائل بڑھانے پہ تلی ہو۔ تم میری دشمن ہو یا دوست؟'' اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''تم مجھ سے ناراض ہو عبدالرحمٰن؟''

''نہیں' نہیں! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اتنا پیسہ خرچ کر کے' اتنی مشکل سے میں نے تمہارے لیے پاسپورٹ بنوایا تھا۔ نئی شناخت' نیا گھر' نئی زندگی..... مگر تم نے اسے جلا دیا۔'' وہ اتنی برہمی سے جھڑک رہا تھا کہ کوئی حد نہیں۔

بہارے خفگی سے سر جھکائے واپس کرسی پہ جا بیٹھی۔

''مجھے نیا گھر نہیں چاہیے۔ اگر میں چلی جاتی تو تمہاری مدد کون کرتا؟ میں نے تم سے مدد کا وعدہ کیا تھا نا۔ تمہیں میری ضرورت ہے' میں اس لیے نہیں گئی۔'' چند لمحے بعد سر اٹھا کر بہت سمجھ داری سے اس نے سمجھایا۔

''اچھا! مجھے تمہاری ضرورت ہے؟'' وہ استہزائیہ انداز میں کہتا آیا اور کرسی کھینچ کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔ اب دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔

''ہاں! ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

''مجھے ایک بے وقوف بچے کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے' سنا تم نے!''

''مجھے بچہ مت کہو۔'' بہارے نے دبے دبے غصے سے اسے دیکھا۔ میں پورے ساڑھے پانچ سال بعد پندرہ سال کی ہو جاؤں گی۔

''اور پھر؟''

''اور..... اور تم مجھ سے تب شادی کرو گے' کرو گے نا؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ عائشے نہ بھی ہو' تب بھی اسے لگتا کہ وہ کہیں نہ کہیں سے خفگی سے اسے دیکھ رہی ہے۔

''بہارے گل!'' اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔ ''میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔ بلکہ جو تم کر رہی ہو' اس سے تم مجھے مروا ضرور دو گی۔''

''نہیں! ایسے مت کہو۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کر سکتی۔'' اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ''مگر تم ہمیشہ مجھے ہرٹ کرتے ہو' تم ہمیشہ مجھ سے جھوٹ بولتے ہو۔''

''اچھا! کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔'' اس کے تیور ویسے ہی لگ رہے تھے' مگر پلکیں سکیڑے اب وہ جس طرح اسے دیکھ رہا تھا' بہارے کو محسوس ہوا وہ دلچسپی سے اس کی بات سننے کا منتظر ہے اور اس کا غصہ بھی ذرا کم ہوا ہے۔

''بہت سارے جھوٹ..... اتنے تو ادالار میں بگلے نہیں ہیں' جتنے جھوٹ تم نے مجھ سے بولے ہیں۔'' وہ خفا سے انداز میں مگر ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔ ''مگر اب مجھے سب پتا چل گیا ہے۔''

''مثلاً'' کیا پتا چل گیا ہے تمہیں میرے بارے میں؟'' بہارے کو لگا وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ چیلنج دیتی مسکراہٹ۔ اکساتی ہوئی مسکراہٹ۔

''بہت سی باتیں..... یہ کہ تمہارا اصلی نام عبدالرحمٰن نہیں ہے اور یہ بھی کہ تمہارا نام جہان سکندر ہے اور تم ہی حیا کے کزن ہو۔''

جہان ایک دم ہنس پڑا۔ بہارے کو حوصلہ ہوا۔ اسے برا نہیں لگا' وہ اسے ڈانٹے گا نہیں۔ اس کو ذرا تقویت ملی۔

''صبر نہیں ہوا عائشے سے..... میں نے اسے کہا تھا کہ جاتے وقت بتائے۔ اس نے ابھی بتا دیا۔'' وہ جیسے

بہت محظوظ ہوا تھا۔

"اس نے اپنے جاتے وقت ہی بتایا تھا۔ تم بہت جھوٹ بولتے ہو عبدالرحمٰن۔" بہارے نے خفگی سے اسے دیکھا تھا۔

"اور یہ بات تم نے کتنے لوگوں کو بتائی ہے؟" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے تاثرات اب تک ہموار ہو چکے تھے۔ نہ غصہ تھا' نہ محظوظ سی مسکراہٹ۔

"کسی کو نہیں۔ پرامس۔"

"مجھے امید ہے کہ تم اسے راز رکھو گی۔ کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں بہارے گل؟" میز پہ دونوں ہتھیلیاں رکھ کر اس کی طرف جھک کر وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔"

"تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟"

"میں نے جلا دیا اور میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔" اس کے تھوڑی دیر قبل ہنسنے کا اثر تھا' جو وہ ذرا نروٹھے انداز میں بولی تھی۔

"میں تمہارا نیا پاسپورٹ جلد بھجوا دوں گا اور تمہیں جانا پڑے گا' کیونکہ میں بھی یہاں سے جا رہا ہوں۔" وہ واپس سیدھا ہوا۔

"کدھر ہمارے ساتھ؟" اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

"نہیں! بلکہ یہاں سے بہت دور اور میں تم سے آخری دفعہ مل رہا ہوں۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔ تم مجھے ایک اچھی یا بُری یاد سمجھ کر بھلا دینا۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے اس سے قبل کہ میں گرفتار ہو جاؤں اور اگر میں گرفتار ہوا تو مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ اگر تم نہیں چاہتیں کہ میرے ساتھ یہ سب ہو' تو میری بات مانو۔ جب پاسپورٹ آجائے تو چلی جانا۔" وہ بے تاثر لہجے میں کہہ کر جانے کے لیے مڑا۔

"مگر تم کہاں جا رہے ہو؟" وہ پریشانی سے کہہ اٹھی۔

جہان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"میں جہاں بھی جا رہا ہوں' اس کے بارے میں تمہیں' عائشے' آنے یا پاشا بے کو نہیں بتا سکتا۔ اس لیے یہ سوال مت کرو۔"

"کیا تم نے کسی کو نہیں بتایا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟" وہ آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل بول پائی تھی۔

"میں نے آنے سے کچھ دن پہلے حیا کو بتایا تھا' اسے معلوم ہے میں کدھر جا رہا ہوں۔ اسے راز رکھنے آتے ہیں۔" وہ کہہ کر دروازہ کھولتا باہر نکل گیا۔

بہارے گل بھاگ کر باہر آئی۔ بھیگی آنکھوں سے اس نے اپنے عبدالرحمٰن کو بیرونی دروازہ پار کرتے دیکھا۔ یہ خیال کہ وہ اسے آخری دفعہ دیکھ رہی ہے' بہت اذیت ناک تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کے چہرے پہ لڑھکنے لگے۔

آج پہلی دفعہ اسے یقین آیا تھا کہ وہ آخری دفعہ عبدالرحمٰن کو دیکھ رہی ہے۔

مگر بہت جلد وہ غلط ثابت ہونے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسکرین کی روشنی اس کے سفید پڑتے چہرے کو بھٹکا رہی تھی۔ وہ سانس روکے' یک ٹک اس منظر کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے چل رہا تھا۔

وہ ایک کمرے کا منظر تھا۔ نفاست سے بنا بیڈ' کھڑکی کے آگے گرے پردے۔ کیمرا کسی اونچی جگہ پہ رکھا تھا' کیونکہ اسے سامنے رائٹنگ ٹیبل کی خالی کرسی نظر آ رہی تھی۔ کیمرہ یقیناً" کمپیوٹر مانیٹر کے اوپر رکھا گیا تھا۔ مانیٹر نظر نہیں آ رہا تھا' مگر وہ جانتی تھی کہ یہاں کمپیوٹر ہی رکھا ہوتا ہے۔ وہ کمرا پہلے کئی بار دیکھ چکی تھی۔ کمرے نے اسے نہیں چونکایا تھا' اس شخص نے چونکایا تھا جو ابھی ابھی کرسی پہ آ کر بیٹھا تھا۔

"میں امید کرتا ہوں مادام! آپ وہ پہلی اور آخری شخصیت ہوں گی جو اس فائل کو کھول پائیں گی۔" اس کے ہاتھ میں مونگ پھلی کا پیکٹ تھا' جسے کھولتے ہوئے وہ مخاطب تھا۔ کس سے..... یقیناً" حیا سے۔

وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

"میرا نام جہان سکندر احمد ہے۔" بہت پرسکون سے انداز میں گویا اسے دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"میجر جہان سکندر احمد! احمد میرے دادا کا نام تھا اور یہی میرا سرنیم ہے۔ میں جانتا ہوں' تم یہ سمجھتی ہو کہ میں یعنی میجر احمد' پنکی تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ میں پنکی نہیں تھا۔" بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مونگ پھلی نکال کر منہ میں رکھتا تھا۔

وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ بنا پلک جھپکے' دم سادھے۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ بولا۔

"میں ڈولی تھا۔ یاد ہے تمہیں؟" وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ گیم جیتنے کے بعد کنگ میکر کی مخصوص مسکراہٹ۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی' نہیں پہچانتی تھی۔

"ایک چوتھے نام سے بھی تم مجھے جانتی ہو۔ عبدالرحمٰن پاشا۔ ہوٹل گرینڈ کا مالک' ایک بُرا آدمی۔" وہ گویا سانس لینے کے لیے رکا' پھر نفی میں سر ہلایا۔

"میں بُرا آدمی نہیں ہوں' نہ ہی کبھی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھے خود تلاش کرو۔ مجھے خود ڈھونڈو' مجھے ڈسکور کرو۔ بہت بار میں نے تمہیں بتانے کی کوشش کی' مگر تم نہیں سمجھ سکیں۔ سو میں نے چاہا کہ میں تمہیں خود بتا دوں۔"

وہ اب ٹیک لگا کر کرسی پہ بیٹھا جیسے یاد کر کے' سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ اس کی نگاہیں دور کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی تھیں۔

وہ بالکل سانس روکے' دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز تھا۔

"میں نے تمہیں سب کچھ ڈائریکٹلی اسی لیے نہیں بتایا' کیونکہ میں کبھی اتنی آسانی سے' اتنے صاف لفظوں میں کسی کو کچھ نہیں کہا کرتا۔ میرے پیشے کا یہی تقاضا ہے اور میں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ انفارمیشن کو ان کوڈ اور ڈی کوڈ کرنے میں صرف کیا ہے۔ اس لیے میں نے ایک پزل ترتیب دیا۔ ایک ٹریژر ہنٹ۔" اور تم اسے حل کر لو گی۔ یہ میں جانتا ہوں۔ کب کرو گی' تب میں کہاں ہوں گا۔ زندہ بھی ہوں گا یا نہیں' باہر ہوں گا یا پھر سے جیل میں..... میں نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ تم اسے حل کر لو گی۔"

جولائی کی گرمی میں ہی اس کے ہاتھ' پیر برف بن رہے تھے۔ وہ پلکیں بالکل بھی نہیں جھپک پا رہی تھی۔ وہ بس اسکرین کو دیکھ رہی تھی' ایسے جیسے اس نے کبھی اسے نہ دیکھا ہو۔ وہ واقعی پہلی دفعہ اس شخص سے مل رہی تھی۔

"جب تک انسان کسی دوسرے کی جگہ پہ کھڑا نہیں ہوتا' وہ نہیں جان پاتا کہ اصل کہانی کیا ہے۔ ایک ہی روایت میں اگر راوی اور مروی کی جگہیں بدل دو تو سارا قصہ ہی بدل کر رہ جاتا ہے۔ پچھلے چند ماہ میں تمہاری زندگی کی کہانی کا حصہ رہا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم میری طرف کی کہانی سنو۔" بات کے اختتام پہ وہ مسکرایا تھا۔

"اسے کہتے ہیں اپنی کہانیوں کو swap کرنا' رائٹ؟"

"یو ایڈیٹ!" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ وہ ابھی تک پلکیں نہیں جھپک پا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ ماہ دسمبر کے اسلام آباد کی خوب صورت' ٹھنڈی سی سہ پہر تھی۔ بادل ہر سو چھائے تھے۔ سبز درخت' سیاہ بادل' سرمئی سڑک' ایک پرسکون ٹھنڈا سا امتزاج۔

وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے' سر جھکائے سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ جس ہوٹل میں اسے جانا تھا وہ وہاں سے چند گز کے فاصلے پہ تھا۔ وہ عادتاً" ٹیکسی سے مطلوبہ مقام سے ذرا دور اترا تھا۔ اب اسے پیدل چل کر ہوٹل تک جانا تھا۔

وہ وہی کر رہا تھا' مگر سر کے پچھلے حصے میں اٹھتا درد شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ میگرین نہیں تھا' مگر شدت ویسی ہی تھی۔ وہ ظاہر نہیں کرتا تھا' لیکن

تکلیف کبھی کبھی ناقابل برداشت ہوجاتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ابھی اس کی ذہنی اذیت کا بڑا سبب ممی کی باتیں بنی ہوئی تھیں، جو صبح سے اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ جب ممی غصے سے اسے "جہان سکندر" کہہ کر مخاطب کرتیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب اگر وہ بات نہیں مانے گا تو وہ ہرٹ ہوں گی۔ ایسے مواقع کم آتے تھے، مگر جب آتے تو اسے دکھی کر جاتے۔ تب اس کے پاس بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی نہیں تھا۔ آج تو ممی نے کال کے اختتام پہ طعنہ بھی دے دیا تھا۔

"جہان سکندر! تم مجھ سے زیادہ اپنے باس کی مانتے ہو، مجھے اب یہی لگا ہے۔"

ہوٹل کا بیرونی گیٹ سامنے تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ اسے کسی نے نہیں روکا، البتہ آج معمول سے زیادہ سیکیورٹی نظر آرہی تھی۔ انٹرنس کینوپی کی طرف جاتے ہوئے وہ محتاط نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ یقیناً ہوٹل میں کوئی خاص تقریب ہونی تھی، جس کی وجہ سے سیکیورٹی عام دنوں سے کہیں زیادہ تعینات کی گئی تھی۔

ابھی وہ انٹرنس سے ذرا دور تھا۔ جب اس کا موبائل بجا۔ وہ رکا اور سیاہ جیکٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ اس کا سلور اسمارٹ فون جو کچھ عرصہ قبل اسے دیا گیا تھا، جس میں لگے بے حد بیش قیمت سرویلینس (نگرانی کرنے والے) آلات اس کی قیمت کو اسی ماڈل کے کسی بھی فون سے کئی گنا زیادہ بنا چکے تھے اور وہ جانتا تھا کہ موجودہ کام ختم ہوتے ہی اسے یہ سب واپس کرنا ہوگا، سیکرٹ فنڈ کی ایک ایک پائی کا حساب اور جسٹی فیکیشن انہیں ہی دینی پڑتی تھی۔

"مسز پارٹنر!" اسکرین پہ یہ نام جل بجھ رہا تھا۔ وہ عادتاً کبھی بھی نمبرز لوگوں کے اصل ناموں سے محفوظ نہیں کرتا تھا۔ حماد پارٹنر کے نام سے اور اس کی منگیتر ثانیہ جو ان کے ساتھ ہی کام کرتی تھی، مسز پارٹنر کے نام سے اس کے فون میں موجود تھی۔

"ہیلو!" اس نے فون کان سے لگایا۔ پہلے دوسرے کو بولنے کا موقع دینا بھی اس کی عادت بن چکی تھی۔ بہت سی عادات جو ان بارہ سالوں نے اسے دی تھیں۔

"تم کہاں ہو؟ میں لابی میں تمہارا انتظار کررہی ہوں؟"

"بس آرہا ہوں۔" اس نے موبائل بند کرکے جیکٹ کی جیب میں رکھا اور داخلی دروازے تک آیا۔ گارڈ نے کافی رکھائی سے اس سے شناخت طلب کی۔ آج واقعی حد سے زیادہ سختی تھی۔ ایسے مواقع پہ جو کم ہی آتے تھے۔ وہ اپنی اصل شناخت ہی دکھایا کرتا تھا۔

اس نے اندرونی جیب سے والٹ نکالا، اسے کھولا اور اندر والٹ کے ایک خانے میں پلاسٹک کور میں مقید کارڈ کچھ اس طرح سے سامنے کیا کہ اس کا انگوٹھا اس کے نام کو چھپا گیا، مگر تصویر، ایجنسی کا سہ حرفی مخفف اور وہ مشہور زمانہ پھول بوٹوں سے مزین چار چوکھٹوں کا نشان واضح تھا۔

گارڈ کی تنی ابرو سیدھی ہوئیں، ایڑھیاں خود بخود مل گئیں اور "سر" کہتے ہوئے اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر راستہ دیا۔

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ والٹ واپس رکھتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

کبھی کبھی جب وہ پاکستان میں ہوتا تھا تو یہ عیش اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

لابی میں داخل ہوتے ہی اس نے بنا گردن گھمائے بس نگاہوں سے چھت، فانوس اور دیواروں کے کونوں میں لگے سیکیورٹی کیمروں کا جائزہ لیا۔ کتنے کیمرے تھے، ان کا رخ کیا تھا۔ ڈیوٹی پہ کتنے گارڈز موجود تھے، اگر آگ لگ جائے یا ایمرجنسی ہو تو فائر ایگزٹ کس طرف تھی اور اس جیسی بہت سی باریکیوں کو جانچ کر وہ لابی میں ایک طرف لگے صوفوں کی جانب بڑھ گیا۔ جدھر ایک صوفے پہ ثانیہ بیٹھی تھی۔

اس نے سیاہ سفید دھاریوں والی شلوار قمیص پہ بلیک سوئیٹر پہن رکھا تھا، گلے میں دوپٹا، گھنگھرالے بھورے بالوں کی اونچی پونی اور اپنے مخصوص انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی ثانیہ اسے اپنی جانب متوجہ پاکر شناسائی سے مسکرائی تھی۔ وہ اس کی ایک بہت اچھی دوست تھی، ان سے جونیئر تھی مگر حماد کی فیملی سے گہرے تعلقات کے باعث وہ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

وہ بھی جواباً ہلکے سے مسکرا کر اس کی طرف آیا۔ وہ دو صوفے آمنے سامنے لگے تھے۔ درمیان میں چھوٹی میز تھی۔ جس پہ ثانیہ کا سیاہ پاؤچ رکھا تھا۔ ایک قدرے بڑا پرس بھی ساتھ ہی پڑا تھا۔ وہ قریب آیا تو ثانیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم! کیسے ہو اور کب سے ہو ادھر؟"

"وعلیکم السلام۔ فائن تھینکس۔ زیادہ دن نہیں ہوئے۔ کام سے آیا تھا۔" مقابل صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے بتایا۔ وہ کتنے دنوں سے اسلام آباد میں تھا، تعداد اس نے نہیں بتائی۔ دوسرے آپ کے بارے میں جتنا کم جانیں اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

"وہ تو مجھے اندازہ تھا۔ تمہارا کام!" اس نے بیٹھتے ہوئے ابرو سے سیاہ پاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔ جہان نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"جتنا کرسکی، کردیا۔ تمہاری معلومات ٹھیک تھیں۔ وہ سفارت خانے کی کار استعمال نہیں کرتی۔"

اب اس کے سامنے بیٹھی وہ اسے دھیمی آواز میں امریکی سفارت خانے کی سیکنڈ سیکریٹری کے متعلق بتا رہی تھی، جو ویزا سیکشن کی ہیڈ تھی اور بھارتی نژاد امریکی شہری تھی۔ اسے سفارت خانے کی سیکنڈ سیکریٹری کے متعلق چند معلومات درکار تھیں، وہ بھی بہت جلد۔ اس لیے اس نے صبح ثانیہ کو فون کیا تھا۔ ثانیہ تمام ضروری چیزیں لے آئی تھی اور اب زبانی بریفنگ دے رہی تھی۔

"یو نو واٹ! وہ امریکی سفارت خانے کی ان گاڑیوں میں سے کوئی استعمال نہیں کرتی، جو ہر وقت اسلام آباد میں گردش کرتی رہتی ہیں ویسے ان گاڑیوں کی تعداد قریباً" "ڈیڑھ سو ہے۔"

"ایک سو چالیس!" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ تصحیح کی۔ ثانیہ سرہلا کر رہ گئی۔ وہ ہمیشہ اس سے زیادہ باخبر رہتا تھا۔

"بہرحال، وہ ان میں سے کسی گاڑی پہ سفر نہیں کرتی کیونکہ اس کو ایک جگہ یہ کہتے سنا گیا تھا کہ اگر ان ڈیڑھ سو... ایک سو چالیس گاڑیوں میں سے کسی ایک کا دروازہ بھی کھلے تو ایمبیسی کو خبر ہوجاتی ہے، اسی لیے اسے ایمبیسی کی گاڑیوں سے چڑ ہے اور یہ بھی کہ ان کی اتنی سیکیورٹی ڈی سی میں نہیں ہوتی جتنی اسلام آباد میں ہوتی ہے۔"

"اس کے باوجود امریکی سفارت کار خود کہہ کہہ کر اپنی پوسٹنگ اسلام آباد میں کرواتے ہیں۔ کراچی سے بھاگتے ہیں، مگر اسلام آباد تو ان کے لیے جنت ہے۔"

چند منٹ وہ دونوں سفارت خانے کی باتیں کرتے رہے۔ نام لیے بغیر، بے ضرر سی باتیں، پھر لمحے بھر کو جب وہ دونوں خاموش ہوگئے تو ثانیہ نے موضوع بدلا۔

"کوئی اور کام بھی ہے اسلام آباد میں؟" اس نے سرسری سا پوچھا مگر وہ جانتا تھا وہ کس طرف اشارہ کررہی ہے۔

"ہاں! دو دن بعد میرے کزن کی مہندی ہے اور ممی چاہتی ہیں کہ میں وہ اٹینڈ کروں۔"

"اور تم کیا چاہتے ہو؟" وہ پتلیاں سکیڑے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ وہی تیکھا انداز جو ان کے ہم پیشہ افراد میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ بس میں ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا۔"

"ملو گے نہیں تو بات آگے کیسے بڑھے گی؟ تمہارا نکاح ہوچکا ہے تمہارے ماموں کے گھر۔ اس طرح اس بے چاری لڑکی کی زندگی تو مت لٹکاؤ یا نبھاؤ یا چھوڑ دو!" بات کے اختتام پہ اس نے ذرا سے کندھے اچکائے۔

جہان نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ثانیہ کے لیے یہ تبصرہ کرنا کتنا آسان تھا۔

"چھوڑ ہی تو نہیں سکتا۔ ممی بہت ہرٹ ہوں گی۔ ایک ہی تو صورت ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ پھر

سے ایک ہوجائیں' یہ راستہ میں کیسے بند کردوں؟"

"تو پھر نبھاؤ۔ کتنے عرصے سے تم اس بات کو لٹکا رہے ہو۔ جاکر مل لونا اپنے ماموؤں سے۔"

"میں ان کے گھر جاؤں' ان سے ملوں' ان کے ساتھ تعلقات پھر سے استوار کروں' میرا دل نہیں چاہتا یہ سب کرنے کو۔" اس نے بے بسی سے سر جھٹک کر کہا تھا۔ اپنے ملک میں اپنے دوستوں کے ساتھ' بس یہی وہ مقام تھا' جہاں وہ اپنے دل کی بات کہہ دیا کرتا تھا۔

"دیکھو جہان! انسان اپنا کیا بہت جلد بھول جاتا ہے وہ بھی بھول چکے ہوں گے۔ تم جاؤ اور ان کو ایک مثبت اشارہ دو۔ اس سے وہ یہ جان لیں گے کہ تم اور تمہاری ممی ان کے ساتھ رشتہ رکھنا چاہتے ہو۔ وہ تمہیں بہت اچھا ویلکم دیں گے۔" وہ کرسی پہ ذرا آگے ہوکر بیٹھی گویا سمجھا رہی تھی مگر وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

"میں رشتہ نہیں نبھاپاؤں گا' میں کیوں ان کو دھوکا دوں؟ کیوں ان کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کروں؟ دیکھو! میں جھوٹ بول کر شادی نہیں کروں گا اور سچ جاننے کے بعد وہ اپنی بیٹی سے میری شادی نہیں کریں گے۔ بات پھر وہیں آجائے گی کہ ممی ہرٹ ہوں گی۔" وہ شدید قسم کے مخمصے میں تھا یا شاید وہ مسئلہ حل کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"ضروری نہیں ہے کہ چیزیں ویسی ہی ہوں جیسے تم سوچ رہے ہو۔ تم انہیں بتانا کہ تم کیا جاب کرتے ہو۔ اس کی کیا پیچیدگیاں ہیں۔ کیا مجبوریاں ہیں' اور یہ کہ تم یہ جاب نہیں چھوڑ سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انڈراسٹینڈ کریں گے۔" جہان نے نفی میں سر ہلایا۔ لابی میں پس منظر میں دھیما سا بجتا میوزک جیسے ایک دم سے بہت تلخ ہوگیا تھا۔

"تم میرے ماموؤں کو نہیں جانتی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پہ ایشو بنانے والے لوگ ہیں۔ وہ اس بات کو ایشو بنالیں گے کہ ہم نے پہلے انہیں بے خبر کیوں رکھا۔ اتنے سال میں کبھی ان سے ملنے نہیں آیا' وغیرہ وغیرہ۔ اپنے تمام رویے' سب تلخ باتیں' سب بھلا کر وہ پھر سے ممی پہ چڑھ دوڑیں گے اور نتیجتاً ممی ہرٹ ہوں گی۔ میں ان کو مزید دکھی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اب میں کیا کروں' میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" ثانیہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی' پھر آہستہ سے بولی۔

"جہان! اگر ہر چیز بالکل ویسے ہو جیسے تم کہہ رہے ہو اور وہ واقعی تمہاری ممی کو پھر سے ہرٹ کریں' تب بھی وہ اتنی مضبوط تو ہیں کہ بہادری سے مقابلہ کرسکیں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تم صرف اور صرف اپنے رویے کی صفائیاں دے رہے ہو۔ اصل وجہ یہ نہیں ہے۔"

"تم بتاؤ! کیا ہے اصل وجہ؟" اس نے سنجیدگی سے ثانیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی' پھر بھی وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

"اصل وجہ یہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو کیونکہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جب انہیں بتاؤ گے کہ تم صرف ایک آدمی' آفیسر نہیں بلکہ ایک جاسوس بھی ہو اور وہ اس پہ ردعمل ظاہر کریں' تب بھی تم آدھے گھنٹے میں انہیں مطمئن اور قائل کرلوگے۔"

"نہیں! میں انہیں قائل نہیں کرسکتا۔ وہ جانتے بوجھتے کبھی بھی اپنی بیٹی کی شادی کسی ایسے جاسوس سے نہیں کریں گے جس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہ ہو۔ جو ان کی بیٹی کے ساتھ نہ رہے بلکہ دور کسی دوسرے ملک میں کسی دوسرے نام کے ساتھ زندگی گزارے' جو وہاں مر بھی جائے تو مہینوں ان کی بیٹی کو پتا نہ چلے کہ اس کی قبر کہاں ہے۔" اذیت سے کہتے ہوئے وہ کرسی پہ پیچھے کو ہوا۔ آنکھوں کے سامنے ایک روح کو زخمی کردینے والا منظر پھر سے لہرایا تھا۔

انطاکیہ کے قدیم شہر میں اس بڑے سے والان کے فوارے کے ساتھ کھڑا گھوڑا اور اس کی کمر پہ اوندھے منہ لادا گیا وہ وجود... اس نے سر جھٹکا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اصل وجہ نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" قدرے

خفگی سے کہتی وہ باہم ملی مٹھیاں میز پہ رکھتی آگے ہوئی۔ "تم اپنے ماموؤں سے ڈرتے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" بے زاری سے ہاتھ جھلا کر وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"ایسی ہی بات ہے' تم اپنے احساس کمتری سے ابھی تک چھٹکارا نہیں پاسکے کہ وہ تمہیں تمہارے ابا کا طعنہ دیں گے اور تم ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکو گے۔ کم آن جہان! اب اس چیز سے باہر نکل آؤ۔" جہان نے جواب نہیں دیا۔ وہ گردن ذرا سی موڑے دائیں طرف دیکھتا رہا۔

"مجھے حیرت ہوتی ہے کبھی کبھی تم پہ۔ اتنا قابل آفیسر' اتنا شاندار ٹریک ریکارڈ' ایجنسی کے بہترین ایجنٹس میں سے ایک۔ پھر بھی اپنے اندر کے احساس کمتری سے تم نہیں لڑ سکے۔ تم اپنے ابا کے کسی جرم میں شریک نہیں رہے ہو جہان!"

جہان اس کی بات نہیں سن رہا تھا' وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا' وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

لابی کے دوسرے کونے میں دو لڑکیاں صوفوں پہ بیٹھ رہی تھیں۔ ایک نیلے لباس میں تھی اور دوسری سیاہ میں۔ سیاہ لباس والی دراز قد لڑکی جس نے سیاہ لمبے بال آگے کندھے پہ دائیں طرف کو ڈالے ہوئے تھے' کافی خوب صورت تھی۔ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے دوسری لڑکی کے ہاتھ سے کینڈی پکڑی اور منہ میں رکھی۔ دوسری لڑکی ساتھ ہی کچھ کہے جارہی تھی۔

"جہان!" ثانیہ نے اسے پکارا۔ وہ ذرا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "کیوں دیکھ رہے ہو ایسے؟ یہ پاکستان ہے!" وہ خجل ہوا' نہ شرمندہ' بلکہ دوبارہ ان دو لڑکیوں کو دیکھا۔

"ثانیہ! یہ بلیک کپڑوں والی میری بیوی ہے۔"

"اوہ اچھا!" ثانیہ تجربے اور ذہنی پختگی کے اس درجے پہ تھی کہ بنا چونکے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں! اچھی ہے۔ تم نے بلایا ہے اسے؟"

"نہیں! میں تو خود اسے دیکھ کر حیران رہا ہوں۔" اس نے لاعلمی سے شانے اچکائے۔

"آر یو شیور یہ وہی ہے؟"

"ہاں! میں نے اس کی پکچرز دیکھ رکھی ہیں۔" ثانیہ نے اب کے ذرا احتیاط سے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ سیاہ لباس والی لڑکی کو جیسے مرچیں لگی تھیں۔ کینڈی غالباً "مرچ والی" تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا اور ناک سرخ پڑ گئی تھی۔ وہ جیسے خفگی سے ساتھ والی کو ڈانٹنے لگی جو ہنس رہی تھی۔

"کیا وہ تمہیں پہچان لے گی؟"

"معلوم نہیں۔ میں تصویروں کے معاملے میں احتیاط برتتا ہوں' سو شاید نہیں!" وہ بہت غور سے دور بیٹھی لڑکی کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"اتنی نزاکت؟" اسے مایوسی ہوئی تھی۔

"یہ یہاں کیا کررہی ہے؟" وہ جیسے خود سے بولا۔

"پتا کروں؟" ثانیہ کی بات پہ اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ وہ اٹھ گئی۔ اسی وقت سیاہ لباس والی لڑکی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی اٹھی تھی۔ انہیں شاید کہیں پہنچنا تھا۔

"یہ کہاں پڑھتی ہے؟" ثانیہ نے جاتے ہوئے پوچھا۔

"انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی' شریعہ اینڈ لاء' ساتواں سمسٹر!" ممی کی دی ہوئی معلومات اس نے جوں کی توں دہرا دی۔ "اور اس کا نام حیا سلیمان ہے۔"

ثانیہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ وہ دونوں لڑکیاں اب لابی پار کررہی تھیں۔ ثانیہ سیدھی ان کے پاس نہیں گئی' بلکہ پہلے اس نے قریب بنے کیفے کی طرف جاتے راستے پہ تیز تیز چلتے ایک ویٹر کو روکا اور اس سے ٹرے لی جس میں کافی کے چار کپ رکھے تھے۔ وہ یقیناً "عملے سے واقف" تھی' سو ویٹر سر ہلا کر آگے چلا گیا۔ ثانیہ ٹرے اٹھائے ان دو لڑکیوں کی جانب بڑھ گئی' جو اب لابی کے آخری سرے تک پہنچ چکی تھیں۔

اس نے کچھ کہہ کر انہیں روکا۔ وہ دونوں پلٹی

تھیں۔ اتنی دور سے وہ ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا مگر ان کے تاثرات بخوبی دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ نے ٹرے اسی لیے پکڑ رکھی تھی تاکہ وہ یہ تاثر دے سکے کہ وہ لابی کے قریب ہی بنے کیفے (جس میں سیلف سروس موجود تھی) سے اٹھ کر آئی ہے' (اس کیفے کی انٹرنس پہ اگر آپ موجود ہوں تو لابی وہاں سے صاف نظر آتی ہے)' اور ان سے بات کر کے وہ فوراً" واپس جہان کی طرف آنے کے بجائے اندر کیفے میں چلی جائے گی تاکہ وہ لڑکیاں اس طرف نہ دیکھ پائیں جہاں وہ بیٹھا تھا۔

سیاہ لبادے والی لڑکی اچنبھے سے نفی میں سر ہلاتی کچھ کہہ رہی تھی۔ ان سے کافی فاصلے پہ بیٹھا وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً" اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ دوسرے بھی بہت سے لوگ جو آس پاس سے گزر رہے تھے گردن موڑ کر ایک دفعہ اس پہ نگاہ ضرور ڈالتے تھے۔ اس نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔

اسے کیا برا لگا تھا' وہ فیصلہ نہ کر سکا۔

"چیریٹی لنچ ہے کوئی' اسی لیے آئی ہے۔" ثانیہ ان کو بھیجنے کے بعد کیفے میں چلی گئی تھی اور اب جب کہ وہ لڑکیاں اندر جا چکی تھیں' وہ واپس آئی اور صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بتانے لگی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ غیر معمولی سیکیورٹی کی وجہ اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"کیا بات ہوئی؟" وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگا۔

"بس وہی پرانا حربہ کہ آپ کو میں نے اصول الدین ڈپارٹمنٹ میں دیکھا تھا اور متوقع طور پر اس نے مجھے نہیں پہچانا' پھر میں نے پوچھ لیا کہ ادھر کس لیے آئی ہیں وہ' سو اس نے بتا دیا۔ اچھی ہے ویسے۔" اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ کچھ اسے بہت برا لگا تھا۔

"پھر جاؤ گے آج اس کے گھر؟"

"ہاں! جاؤں گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر وہ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس عجیب سے اتفاق نے ایک دم بہت کچھ بدل دیا تھا۔ "خالی ہاتھ مت جانا۔ کچھ لے کر جانا۔"

"میں ترکی سے ان کے لیے کچھ نہیں لایا۔ خالی ہاتھ ہی جاؤں گا۔"

"اچھا! پھر کچھ خرید کے لے جانا' اچھا امپریشن پڑے گا۔ چلو! چل کر کچھ کھاتے ہیں۔" وہ جیسے جان گئی تھی کہ اس کا موڈ اچھا نہیں ہے' سو اٹھتے ہوئے بولی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز پہ رکھا سیاہ پاؤچ اٹھا کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

"تم اپ سیٹ لگ رہے ہو۔"

"نہیں! بالکل نہیں۔" وہ زبردستی مسکرایا۔ "تم سناؤ کب تک تمہارا منگیتر دوبارہ مجھ جتنا ہینڈسم ہو جائے گا؟"

"چند سیشن مزید لگیں گے' برن کافی زیادہ تھا۔" بات کا رخ بدلنے پہ ثانیہ اسے حماد کے بارے میں بتانے لگی۔ کچھ عرصہ قبل ایک حادثے میں اس کا چہرہ قدرے مسخ ہو گیا تھا' البتہ سرجری سے وہ بہتر ہو رہا تھا۔ وہ بے توجہی سے سنتا گیا۔ اس کا ذہن وہیں پیچھے تھا۔

پھر جب ثانیہ چلی گئی تو وہ باہر آگیا۔ اسلام آباد کی ٹھنڈی سرمئی سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں ثانیہ کی باتیں مسلسل گونج رہی تھیں۔

"اس چیز سے باہر نکل آؤ۔۔۔ تم اپنے ابا کے کسی جرم میں شریک نہیں رہے ہو جہان! اس چیز سے باہر نکل آؤ۔۔۔"

اذیت کی ایک شدید لہر اس کے اندر اٹھی۔ آنکھوں کے سامنے وہ زخمی کر دینے والا منظر پھر سے لہرایا۔ ثانیہ غلط تھی۔ ایک جرم میں وہ اپنے باپ کے ساتھ کسی حد تک شریک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بچپن کی یادیں اس کے ذہن میں بہت ٹوٹی پھوٹی' بکھری مدھم مدھم سی تھیں۔ باسفورس کا نیلا سمندر' سمندری بگلے' جہانگیر میں واقع ان کا گھر اور دادا۔ یہ وہ سب تھے جو اس کے بچپن میں اس کے ساتھ تھے۔ دادا ابا کا ساتھ ان میں سب زیادہ اثر انگیز تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ شادی کے ساتویں برس ملنے والی پہلی اور آخری اولاد۔ احمد شاہ کا اکلوتا پوتا۔

دادا کاروبار کے سلسلے میں ترکی آیا کرتے تھے۔ وہ فوج سے میجر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وقت سے قبل ریٹائرمنٹ کی وجہ ان کی خرابیٔ صحت تھی۔ فوج سے باعزت طور پہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے اور تب ہی وہ ترکی آئے۔ اور پھر آتے جاتے رہے۔ ترکی میں ان کا علاج' جو پاکستان میں ممکن نہ تھا' قدرے سستا ہوتا رہا۔

جب ابا کا تبادلہ ترکی ہوا تو ممی بھی ساتھ آئیں۔ دادا نے تب ہی چند پیسے جوڑ کر جہانگیر (cihangir) کے علاقے میں زمین خریدی۔ وہ خوش قسمتی کا دور تھا۔ ابا نے بعد میں اس جگہ گھر بنوانا شروع کیا۔ وہ تب ہی پیدا ہوا تھا۔ دادا کی گویا آدھی بیماری دور ہو گئی۔ وہ تب بہت خوش رہا کرتے تھے۔ باقی بچی آدھی بیماری کے بہترین علاج کی سہولتوں کے باعث وہ استنبول نہ چھوڑ سکے۔ اس وقت سلطنت ترکیہ اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔ ابھی بابا کی حکومت آنے میں کئی دہائیاں پڑی تھیں۔ (بابا یعنی طیب اردگان) مگر ترکی تب بھی خوب صورت تھا۔

ابا واپس چلے گئے تھے مگر ممی' دادا اور وہ ادھر ہی رہے۔ دادا بگڑتی صحت کے باعث کاروبار میں بہت زیادہ فائدہ نہ حاصل کر سکے' سو گھر کے حالات قدرے خراب ہوتے گئے۔ کچھ عرصہ قبل کی خوش حالی روٹھ گئی۔ ابا کی تنخواہ پہ گزارا کرنا تو ناممکن سی بات لگتی تھی۔ تب ہی اس نے ممی کو کام تلاش کرتے اور پھر نوکری کرتے دیکھا۔ تب وہ بہت چھوٹا تھا' وہ عمر جس میں محنت اور مشقت کے معانی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

ممی ایک فیکٹری میں معمولی ملازمت کرنے لگی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیا کام کرتی تھیں مگر ملک کے برے حالات کے باعث وہ نوکری ان کی تعلیمی قابلیت سے کم ہی تھی۔ گھر سے جیسے قسمت ہی روٹھ گئی تھی۔

دادا ابا کو کاروبار میں شدید گھاٹا ہوا اور ناسازی صحت کے باعث ان کا کام کرنا نہ کرنا برابر ہو گیا' مگر وہ کام پھر بھی کرتے تھے۔ وہ محنت کرنے والے' مضبوط ہاتھوں والے' مشقت اٹھانے والے آدمی تھے۔ بظاہر رعب دار لگتے' مگر بات کرنے پر اتنے ہی مہربان اور شفیق۔ جہان کو وہ کبھی بیمار نہیں لگتے تھے۔ روز صبح وہ اسے ساتھ لے کر واک پہ جایا کرتے تھے۔ وہ تھک جاتا' دادا نہیں تھکتے تھے۔ وہ بہت مضبوط' بہت بہادر انسان تھے۔ وہ اس کے آئیڈیل تھے' اس کے ہیرو۔

برا وقت کم نہیں ہوا' بڑھتا گیا تو ایک روز اس نے دادا کو افسردہ دیکھا۔ جہانگیر والا گھر جو انہوں نے بہت چاہ سے بنوایا تھا' انہیں بیچنا پڑ رہا تھا۔

"دادا! ہم وہ گھر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟" جب وہ واک کے لیے باہر نکلے' تو ان کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے اس نے گردن اٹھا کر ان کو دیکھتے پوچھا تھا۔ انہوں نے ملال سے اسے دیکھا مگر بولے تو آواز مضبوط تھی۔

"یہ گھر بہت بڑا ہے' ہماری ضرورت سے بھی زیادہ اس کو بیچ کر ہم کوئی چھوٹا گھر لے لیں گے۔"

"کیا ہم نیا گھر خریدیں گے؟"

"نہیں بیٹا! ہم ابھی اس کے متحمل نہیں ہیں مگر یہ بات تم اپنی ماں سے مت کرنا۔ تم تو جانتے ہو' یہ جان کر وہ غمگین ہو گی۔ کیا تم کو راز رکھنے آتے ہیں میرے بیٹے؟" اس نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا۔

"جی دادا! مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔"

پھر انہوں نے جہانگیر چھوڑ دیا اور وہ سمندر کنارے ایک قدرے خستہ حال جگہ پہ آبسے۔ یہاں ان کا گھر چھوٹا اور پہلے سے کمتر تھا۔ کرائے کا گھر۔ تب اس کے قریب پھیلا ساحل سمندر آج کی طرح خوبصورت پختہ فٹ پاتھ سے مزین نہیں ہوتا تھا' بلکہ وہاں پتھروں کا کچا پکا سا ساحل تھا۔ بگلے ہر وقت وہاں پھڑپھڑاتے ہوئے اڑا کرتے۔ سو دادا کہتے تھے۔

استنبول مسجدوں کا شہر ہے' مگر جہان کو وہ ہمیشہ بگلوں کا شہر لگتا تھا۔ اپنے گھر کی بالکونی سے وہ ان بگلوں کو اکثر دیکھا کرتا تھا۔ شام میں وہاں بیٹھ کر وہ ان کو یوں شمار کرتا

جیسے لوگ تارے شمار کرتے تھے۔ وہ تھک جاتا، مگر بگلے ختم نہ ہوتے۔

وہ اب بھی صبح دادا کے ساتھ باسفورس کنارے واک پہ جایا کرتا تھا۔ وہ اپنی بیماری کے باوجود بہت تیز تیز چلا کرتے، جہان بگلوں کے لیے روٹی کا ٹکڑا پکڑے ان کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں لگا رہتا مگر وہ ہمیشہ آگے نکل جاتے، پھر رک جاتے اور تب تک نہ چلتے جب تک وہ ان کے ساتھ نہ آملتا۔

"آپ رکتے کیوں ہیں؟" وہ تنگ کر پوچھتا۔

"میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا مجھ سے آگے نکلے، پیچھے نہ رہے۔" وہ اسے ہمیشہ "میرا بیٹا" کہتے تھے۔

بہت بعد میں اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے اصل بیٹے کو بہت پسند نہیں کرتے۔ ابا عرصے بعد آیا کرتے اور جب بھی آتے، دادا کے ساتھ تلخ کلامی ضرور ہو جاتی۔ ممی اب کسی جگہ سے کپڑوں پہ مختلف قسم کے موتیوں کا کام سیکھتی تھیں، ساتھ میں نوکری۔ ابا ان سے بھی لڑتے مگر اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو صبر شکر کرکے، خاموشی سے اپنا کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ ابا کو بہت رسان سے جواب دے کر انہیں خاموش کرا دیتیں اور ساتھ ساتھ اپنا کام کرتی رہتیں۔ ممی اور دادا، یہ دونوں افراد کبھی فارغ نہیں بیٹھتے تھے۔ بے کار رہنا، یہ لفظ ان کی لغت میں نہیں تھا۔

بہت بچپن سے وہ ان کی طرح بنتا گیا۔ اسے کام کی عادت پڑ گئی اور پھر اسے فارغ بیٹھنے کا مطلب بھول گیا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ ورکنگ کلاس لوگ ہیں۔ انہیں ہر وقت کام کرنا چاہیے۔ فارغ صرف ان لوگوں کو بیٹھنا چاہیے، جو امیر ہوں اور جن کے پاس ہر سہولت میسر ہو۔ جیسا کہ اس کے ماموں لوگ۔

وہ ان سے تب ہی مل پاتا جب کبھی شاذ و نادر وہ ترکی آتے۔ وہ اسے ہمیشہ ناپسند رہے تھے۔ اس کے دونوں بڑے ماموں رعب دار، دبنگ اور مغرور سے تھے۔ ان کے سامنے بیٹھ کر ہی لگتا کہ وہ بہت شاہانہ قسم کے لوگ ہیں، جبکہ وہ، دادا اور ممی بہت غریب اور معمولی انسان ہیں۔ اس نے ممی کو بڑے ماموں کے سامنے سختی سے نفی میں سر ہلاتے، جیسے انکار کرتے یا منع کرتے ہیں دیکھا تھا۔ ممی استفسار پہ کچھ نہ بتاتیں، دادا سے پوچھا تو انہوں نے بتا دیا۔

"وہ تمہاری ممی کو پیسے دینا چاہتے ہیں، مگر وہ نہیں لیتیں۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے سوال کرتا۔

"جب انسان کے یہ دو ہاتھ سلامت ہوں تو اس کی عزت کسی سے کچھ نہ لینے میں ہی ہوتی ہے۔ جو ہاتھ پھیلاتا ہے میرے بیٹے! وہ اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے۔"

دادا کہتے تھے، انسان کو عزت سے جینا اور وقار سے مرنا چاہیے۔ جیسے دادا تھے، بہت عزت والے اور جیسی ممی تھیں۔ محنت کرکے، مشقت کرکے زندگی بسر کرنے والے لوگ مگر پتا نہیں کیوں ابا ایسے نہ تھے۔

وہ آٹھ برس کا تھا، جب ابا ایک روز ترکی آئے۔ تب وہ ایک اعلا عہدے پہ پہنچ کر کافی بہتر کمانے لگ گئے تھے، مگر تب بھی ان کے حالات نہ بدل پائے۔ البتہ اس بار اس نے پہلی دفعہ ابا اور دادا کو لڑتے ہوئے سنا تھا۔ بلند آواز سے، غصے سے بحث کرتے۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ ممی اس وقت گھر پہ نہیں تھیں۔ ابا لڑ جھگڑ کر سامان پیک کرکے باہر چلے گئے اور دادا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔

رات وہ ڈرتے ڈرتے، خاموشی سے دادا کے کمرے میں آیا۔ وہ چپ چاپ لیٹے تھے۔ لحاف اوڑھے، چھت کو تکتے۔ ان کا چہرہ پیلا، سفید اور ستا ہوا تھا اور آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔

"دادا!" وہ دھیرے سے ان کے پاس آبیٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا کہ "کیا وہ ٹھیک ہیں، انہوں نے کھانا کھایا ہے، ان کو کچھ چاہیے۔" دادا ابا نم آنکھوں سے اسے دیکھتے نفی میں سر ہلائے گئے۔

"تمہیں پتا ہے جہان!" اپنے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا چھوٹا سا ہاتھ تھام کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے کہنے لگے۔ "سلطان ٹیپو کو جس نے دھوکا دیا تھا، وہ میر صادق تھا۔ اس نے سلطان سے دغا کیا اور انگریز سے وفا کی۔ انگریز نے انعام کے طور پہ اس کی کئی پشتوں کو نوازا۔ انہیں ماہانہ وظیفہ ملا کرتا تھا۔ مگر پتا ہے جہان! جب میر صادق کی اگلی نسلوں میں سے کوئی نہ کوئی ہر ماہ وظیفہ وصول کرنے عدالت آتا تو چپڑاسی صدا لگایا کرتا۔

"میر صادق غدار کے ورثا حاضر ہوں"

ایک آنسو ان کی آنکھ سے پھسلا اور تکیے میں جذب ہو گیا۔

"میرے بیٹے! میری بات یاد رکھنا، جیسے شہید قبر میں جا کر بھی سیکڑوں سال زندہ رہتا ہے، ایسے ہی غدار کی غداری بھی صدیوں یاد رکھی جاتی ہے۔ دن کے اختتام پہ فرق صرف اس چیز سے پڑتا ہے کہ انسان تاریخ میں صحیح طرف تھا یا غلط طرف پہ۔"

پھر انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اسے آج بھی یاد تھا، دادا کے ہاتھ اس روز کپکپا رہے تھے۔

"میرے بیٹے! مجھ سے ایک وعدہ کرو گے؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ تمہارا ملک نہیں ہے، مگر تم اس کا کھا رہے ہو، کبھی اس کو نقصان مت پہنچانا۔ لیکن وہ جو تمہارا ملک ہے نا، جس نے تمہیں سب کچھ دیا ہے اور تم سے کچھ نہیں لیا، اس کا کبھی کوئی قرض آپڑے تو اسے اٹھا لینا۔ میں وہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا، جو تم پہ آن پڑا ہے۔ تم اسے اٹھا لینا۔" پھر انہوں نے لحاف میں جیسے جگہ بنائی۔

"آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔"

وہ وہیں دادا کے بازو سے لگا، ان کے لحاف میں لیٹ گیا۔ دادا بہت گرم ہو رہے تھے، ان کا بستر بھی گرم تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ سو گیا۔

صبح وہ اٹھا تو دادا فوت ہو چکے تھے۔

اس روز وہ بہت رویا تھا۔ ممی بھی بہت روئی تھیں۔ اس نے پہلی بار جانا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ موت کی شکل اور ہیئت کیا تھی، وہ کچھ نہیں جانتا تھا، سوائے اس کے کہ موت بہت سرد ہوتی ہے۔ دادا کے جسم کی طرح۔ اس نے بہت بار ان کا ماتھا، ان کی آنکھیں اور ہاتھوں کو چھوا۔ وہ برف ہو رہے تھے۔ سرد اور ساکن۔

اسی شام ایک سمندری بگلا ان کی بالکونی میں آگرا تھا۔ وہ زخمی تھا، جب تک اس نے دیکھا، وہ مر چکا تھا۔ جہان نے اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھا، وہ بھی سرد تھا۔ سرد اور سخت۔

یہی موت تھی۔

ابا ان کے ساتھ نہیں تھے، وہ کہاں تھے، اسے نہیں معلوم تھا۔ بس ممی اور وہ دادا کو پاکستان لے آئے۔ وہیں ان کو دفنایا گیا، وہیں وہ ابدی نیند جا سوئے، مگر ابا کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔

ممی ان دنوں بہت غم زدہ رہتی تھیں۔ غم بہت سے تھے، مگر تب وہ ان کی شدت کو نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اپنے بڑے ماموں کے گھر تھا، جب ایک روز ممی نے اسے بتایا کہ وہ اس کا نکاح ماموں کی بیٹی سے کر رہی ہیں۔

"کیوں؟" اس نے اپنا پسندیدہ سوال کیا تھا۔

"کیونکہ کچھ ایسا ہوا ہے کہ شاید ہم پھر یہاں نہ آسکیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تعلق کی ڈور بندھی رہے۔ میرے بھائی مجھ سے نہ چھوٹیں۔" ممی نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا مگر اسے یاد نہیں تھا۔ اسے صرف دادا کی باتیں یاد رہتی تھیں۔

ماموں کا گھر، ممانیاں اور ان کے بچے، اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہاں رہ کر اسے مزید احساس دلایا جاتا کہ وہ ان سے کم تر ہے۔ وہ بہت حساس ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یاد تھا۔

وہ اس روز فرقان ماموں کے کچن میں پانی لینے آیا تھا۔ جب اس نے اپنے سے تھوڑے سے بڑے داور کو غصے سے فریج کا دروازہ بند کرتے دیکھا۔

"نہیں! مجھے انڈا ہی کھانا ہے۔" صائمہ ممانی اس کو اصرار کرکے منانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر وہ بگڑے بگڑے انداز میں ضد کر رہا تھا۔

"کیوں انڈے ختم ہو گئے ہیں؟ میرے لیے انڈے کیوں نہیں بچے؟" دفعتاً اس کی نگاہ دروازے میں کھڑے گہرے بھورے بالوں والے لڑکے پہ پڑی تو اس کی آنکھوں میں مزید غصہ در آیا۔

"یہ لوگ ہمارے گھر کے سارے انڈے کھا جاتے ہیں، یہ کیوں آئے ہیں ہمارے گھر؟"

"بس کرو داور! کوفتوں میں ڈال دیے تھے، اسی لیے ختم ہوئے۔ میں منگوا دیتی ہوں ابھی۔" ممانی نے پتا نہیں اسے دیکھا تھا یا نہیں، مگر وہ فوراً" پلٹ گیا۔

اسے اپنے اندر سے ایک ہلکی سی آواز آئی تھی، جو انڈے کو ضرب لگا کر توڑنے کی ہوتی ہے، جو کسی کی عزت نفس مجروح کرنے کی ہوتی ہے۔

اس روز کھانے میں نرگسی کوفتے بنے تھے۔ اسے کوفتوں میں انڈے دکھائی دیے تو اس نے پلیٹ پرے کر دی۔ رات کو بھی اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اس کا اب ماموں کے گھر کسی بھی شے کو کھانے کا دل نہیں چاہتا تھا، انڈے تو کبھی بھی نہیں۔

ممی رات کو بہت حیرت سے وجہ پوچھنے لگیں تو اس نے صاف صاف وہ بتا دیا جو صبح ہوا تھا۔ ممی چپ ہو گئیں، پھر انہوں نے اسے توس اور ساتھ کچھ اور لا دیا۔ جتنے دن وہاں رہے، اس نے انڈوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ممی نے ایک دفعہ بھی اصرار نہیں کیا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ غم زدہ لگتی تھیں۔

وہ واپس آئے تو چند روز بعد ابا بھی آ گئے۔ وہ اب ان کے ساتھ رہتے تھے مگر گھر کا ماحول بہت تلخ اور خراب ہو گیا تھا۔ ممی اور ابا کی اکثر لڑائی ہو جاتی۔ ابا ہی بولتے رہتے، ممی خاموشی سے کام کیے جاتیں۔ اس نے بھی اپنی ماں کی عادت اپنا لی۔ وہ بھی خاموشی سے ممی کا ہاتھ بٹاتا رہتا۔

پھر جلد ہی انہوں نے استنبول چھوڑ دیا۔ صرف ایک گھر، ایک شہر نہیں، انہوں نے بہت سے گھر اور بہت سے شہر بدلے۔ وہ جیسے کسی سے بھاگ رہے تھے۔ کس سے اور کیوں؟ وہ نہیں جانتا تھا مگر اس نے ابا کو ہمیشہ پریشان اور مضطرب ہی دیکھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا وہ دس برس کا تھا جب اس نے جان لیا کہ ابا کس سے بھاگتے تھے اور یہ اس نے تب جانا جب اس نے دنیا کا سب سے خوب صورت آدمی دیکھا۔

ان دنوں وہ انطاکیہ میں تھے۔ ابا کے ایک دوست کے فارم ہاؤس میں دو کمرے ان کے پاس تھے۔ ممی ان لوگوں کے باڑے اور کھیت میں کام کرتی تھیں۔ وہ فصل کے دن تھے۔ انطاکیہ میں کٹائی کے موسم کی خوشبو بسی تھی۔ فارم کی چھت پہ چڑھ کر دیکھو تو دور شام کی سرحدی باڑ دکھائی دیتی تھی۔ وہ اکثر وہاں سے شام کی سرزمین کو دیکھا کرتا تھا، مگر اس رات وہ سو رہا تھا۔ جب اس نے وہ آواز سنی۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا ممی ادھر نہیں تھیں — ان کو آج رات دیر تک فصل کا کام نپٹانا تھا، وہ جانتا تھا۔ پھر آواز کس کی تھی؟ جیسے کوئی درد سے چلایا تھا۔ آواز ساتھ والے کمرے سے آئی تھی۔ وہ فوراً" بستر سے اترا۔ وہ ڈرا نہیں، وہ میجر احمد شاہ کا بہادر پوتا تھا۔ اس نے سلیپرز پہنے اور دروازہ کھول کر باہر آیا۔

دوسرا کمرا جو سامان کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کی بتی جلی ہوئی تھی۔ جہان نے اس کا دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر کا منظر بہت بھیانک تھا۔

کمرے میں چیزیں ادھر ادھر بکھری تھیں، جیسے بہت دھینگا مشتی کی گئی ہو۔ ابا ایک کونے میں شل سے کھڑے تھے، ان کے ہاتھ میں ایک چاقو تھا جس کے پھل سے خون کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ وہ خود بھی جیسے شاکڈ سے ہوئے سامنے فرش پہ دیکھ رہے تھے جہاں کوئی اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔

"ابا!" اس نے پکارا۔ جیسے کرنٹ کھا کر انہوں نے سر اٹھایا۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خوف در آیا۔ انہوں نے گھبرا کر چاقو پھینکا۔

"یہ..... یہ میں نے نہیں..... یہ مجھے مارنا چاہتا تھا، میں کیا کرتا؟" بے ربط سی صفائیاں دیتے وہ آگے آئے اور جلدی سے دروازہ بند کیا۔

جہان پھٹی پھٹی نگاہوں سے فرش پہ اوندھے منہ گرے شخص کو دیکھ رہا تھا، بلکہ نہیں، وہ اس خون کو دیکھ رہا تھا جو اس کے اوندھے گرے جسم کے نیچے کہیں سے نکلتا فرش پہ بہہ رہا تھا۔

"جہان! میری بات سنو میرے بیٹے!" ابا نے بہت بے چارگی سے اسے کندھوں سے تھام کر سامنے کیا۔

ان کا میرے بیٹے کہنے کا انداز بالکل بھی دادا جیسا نہ تھا۔

"یہ آدمی مجھ سے لڑ رہا تھا، میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ میں اس کو روکوں۔ ورنہ یہ مجھے پاکستان لے جاتا۔ میرے بیٹے! تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے، ٹھیک ہے؟" اس نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

"تم کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟ اپنی ماں کو بھی نہیں۔"

"نہیں ابا! مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔" اس نے خود کو کہتے سنا۔

"چلو! پھر جلدی کرو۔ اس جگہ کو ہمیں صاف کرنا ہے اور اس کی لاش کو کہیں دور لے کر جانا ہے۔ میں گھوڑا لاتا ہوں، تب تک تم تولیہ لے کر یہ جگہ صاف کر دو۔"

اس نے فرماں برداری سے سر اثبات میں ہلایا۔ چند روز پہلے باڑے میں ایک گائے زخمی ہو کر مر گئی تھی اس کا خون جو دیوار پہ لگ گیا تھا، اسی نے صاف کیا تھا ممی کے ہمراہ۔ اب بھی وہ کر لے گا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" ابا تیزی سے باہر نکل گئے۔ اسے لگا شاید وہ اب کبھی واپس نہ آئیں، جیسے دادا نہیں آئے تھے۔ پہلی دفعہ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کو ابا پہ بھروسا نہ تھا مگر کام تو اسے کرنا تھا۔ وہ بھاگ کر دو تین تولیے لے آیا اور پنجوں کے بل ٹکے فرش پہ جھکا خون صاف کرنے لگا۔

وہ باڑے کی گائے نہیں تھی، وہ کوئی انسان تھا، جیتا جاگتا وجود جو اب لاش بن چکا تھا۔ چند لمحے بعد ہی وہ شدید خوف کے زیر اثر آنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش آ گئی۔ مگر کام تو اسے کرنا تھا۔

کچھ ثانیے بعد کسی خیال کے تحت اس نے خون سے تر تولیہ چہرے کے قریب لے جا کر سونگھا۔ پھر ناک اس اوندھے منہ گرے وجود کے اوپر جھکا کر سانس اندر کو کھینچی۔

اس آدمی کے وجود سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو اس نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ وہ خوشبو دھیرے دھیرے اس کا خوف زائل کر گئی۔ بہت زور لگا کر اس نے اس آدمی کو سیدھا کیا۔ پھر اس کے سینے پہ، جہاں سے خون ابل رہا تھا، تولیہ زور سے دبا کر رکھا۔ اپنے سامنے ایک نعش کو دیکھ کر بھی اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ احمد شاہ کا بہادر پوتا تھا، بلکہ اس شخص میں ہی کچھ ایسا تھا جو ہر طرف خوشبو بکھیر رہا تھا۔

اس نے سیاہ پینٹ، سیاہ سوئیٹر اور سر پہ سیاہ اونی ٹوپی لے رکھی تھی۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا، وہ بہت خوب صورت اور وجیہہ آدمی تھا۔ سیدھا کرنے پہ اس کی ٹھوڑی جو سینے سے جا لگی تھی، ذرا اوپر کو ہوئی تو گردن پہ پسینے کے قطرے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ جہان نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا، وہ گرم تھا۔ دادا کے جسم کی طرح ٹھنڈا نہیں، سخت نہیں، اکڑا ہوا نہیں۔ وہ بہت نرم اور گرم تھا۔

کیا وہ واقعی مر چکا تھا؟

اسی اثنا میں ابا آ گئے۔ وہ اب پہلے سے زیادہ سنبھلے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس کے زخم پہ ایک کپڑا کس کر باندھنے کے بعد ابا اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہاں ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ اسے بمشکل گھوڑے پہ اوندھا لاد کر ابا نے باگ تھام لی۔ وہ بھی ساتھ ہی ہو لیا۔ رات کا وقت تھا، ہر سو سناٹا تھا، مہیب تاریکی۔

ابا فارم کی پچھلی طرف آ گئے۔ وہاں بڑے سے کچے صحن کے وسط میں ایک فوارہ بنا تھا۔ ابا دو بیلچے کہیں سے لے آئے اور زمین کھودنے لگے۔ اس نے بھی بیلچہ تھام لیا۔ وہ ان کی مدد کرنے لگا۔

کافی دیر بعد جب گڑھا کھد گیا، تو ابا نے اس لاش کو بمشکل اتار کر گڑھے میں ڈالا۔

"ابا! کیا یہ مر چکا ہے؟" وہ متذبذب تھا۔ تب ہی بول اٹھا۔ انہوں نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں! یہ مر چکا ہے، نہ سانس ہے نہ دھڑکن۔"

"یہ کون تھا ابا؟"

مٹی ڈالتے ہوئے وہ لمحے بھر کو رکے، جیسے فیصلہ

کر رہے ہوں کہ اسے بتانا چاہیے یا نہیں، مگر پھر بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہ پاک اسپائی تھا۔ اور مزید کوئی سوال نہیں۔"

جہان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مزید کوئی سوال کر بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اس سیاہ پوش شخص پہ جمی تھیں جس پہ ابا اب مٹی گرا رہے تھے۔ بلاشبہ وہ اس دنیا کا خوب صورت ترین آدمی تھا۔

پاک اسپائی۔ پاکستانی جاسوس۔

واپسی پہ ابا نے کمال مہارت سے تمام نشانات صاف کر دیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمرا یوں ہو گیا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چیزیں درست کرتے ہوئے اب اسے پتا نہیں کیوں پھر سے ڈر لگنے لگا تھا۔ جب تک وہ آدمی قریب تھا، اس کا سارا خوف زائل ہو گیا تھا، مگر جب وہ دفن ہو گیا تو وہ خوف پھر سے عود کر آگیا۔ ابا نے ہر نشان مٹا ڈالا، ممی کو بھی کچھ پتا نہ لگ سکا۔

مگر اسے یاد تھا، دادا کہا کرتے تھے "انسان جس جگہ پہ جو کرتا ہے، اس کا اثر وہ اس جگہ پہ چھوڑ جاتا ہے۔ آثار ہمیشہ وہیں رہتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ سورۂ یاسین میں لکھا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ انسان جو بولتا ہے، اس کے الفاظ ہوا میں ٹھہر جاتے ہیں۔ آثار کبھی نہیں مٹتے۔

اس پاک اسپائی کے آثار بھی اس کے ذہن پہ "اس کمرے کے فرش پہ اور فوارے کے سنگ مرمر پہ نقش ہو چکے تھے۔

اگلے تین روز وہ بخار میں پھنکتا رہا۔ ایک عجیب سا احساس کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ فوارے کے ساتھ کچے صحن کی قبر سے کوئی اسے آواز دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا، یہ احساس ہر شے پہ حاوی تھا۔

تب پہلی دفعہ اس نے وہی منظر خواب میں دیکھا۔ حقیقت میں وہ اسے دفنا کر آگئے تھے، مگر خواب میں ہمیشہ یوں دکھائی دیتا کہ جب وہ دفنا کر پلٹتے ہیں تو وہ قبر سے اسے پکارتا ہے۔ خوب صورت سحر انگیز سی آواز۔ مگر الفاظ اسے سمجھ میں نہیں آتے۔ وہ بہت مدھم، مبہم سا کچھ کہتا تھا، وہ کبھی نہ جان پایا کہ وہ کیا کہتا تھا لیکن تب بھی اسے لگتا کہ شاید وہ بتا رہا ہے کہ اس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔

وہ لوگ جلد ہی انطاکیہ چھوڑ کر ادانہ چلے آئے۔ یہاں سے وہ کچھ عرصے بعد قونیہ منتقل ہو گئے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا، تب چار برس کی خانہ بدوشی کے بعد وہ استنبول واپس آگئے۔ ممی نے بتایا کہ اب انہیں حکومت نے اجازت دے دی ہے اور یہ کہ اب وہ آرام سے استنبول میں رہ سکتے ہیں۔

مگر آرام سے وہ تب بھی نہیں رہنے لگے تھے۔ ممی ویسے ہی جاب کرتیں، البتہ ابا بدلتے جا رہے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ مضطرب اور چڑچڑے رہنے لگے تھے۔ کبھی کبھی وہ غصے میں اتنے بے قابو ہوتے کہ اسے لگتا، وہ پاگل ہوتے جا رہے ہیں۔

تب اسے وہ پاک اسپائی بہت یاد آتا۔ پھر ایک رات ممی کے ساتھ لیٹے ہوئے، چھت کو تکتے اس نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"ممی! یہ پاک اسپائی کون ہوتا ہے؟"

ممی چند لمحے خاموش رہیں، پھر کہنے لگیں۔

"بیٹا! پاکستان کی فوج میں جو خفیہ ایجنسیز ہوتی ہیں، ان میں بہت سے فوجی اور غیر فوجی کام کرتے ہیں۔ ان اہلکاروں میں سے کچھ تربیت یافتہ ایجنٹ ہوتے ہیں، وہ اپنے ملک کے رازوں کی حفاظت کے لیے دوسرے ممالک کے راز چرایا کرتے ہیں۔"

"مگر وہ کرتے کیا ہیں؟"

"وہ دوسرے ممالک میں جا کر جاسوسی کرتے ہیں۔ بھیس بدل بدل کر وہ ہر جگہ پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی ایک نام یا شناخت نہیں ہوتی۔ ان کا کوئی ایک گھر یا ایک فیملی نہیں ہوتی۔ وہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ بن جاتے ہیں۔ ان کو یہ سب سکھایا جاتا ہے، تاکہ وہ جاگیں اور پاکستان کے لوگ سکون سے سو سکیں۔ وہ اپنے ملک کی آنکھیں ہوتے ہیں۔"

"اور پھر ان کو کیا ملتا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" ممی نے گہری سانس لے کر کہا۔ "جب کوئی وردی والا سپاہی محاذ پہ لڑتا ہے تو اگر وہ زندہ رہ جائے تو غازی کہلاتا ہے۔ جان قربان کر دے تو شہید۔ اعزازات صرف وردی والے کو ملتے ہیں۔ ان کے نام سے سڑکیں اور چوک منسوب کیے جاتے ہیں، ان پہ فلمیں بنائی جاتی ہیں، مگر جو جاسوس ہوتا ہے، تاوہ unsung hero ہوتا ہے۔ بے نام و نشان، خاموشی سے کسی دوسرے ملک میں زندگی بسر کرتا، وہ اکیلا "تنہا ہی کام کیا کرتا ہے اور اگر گرفتار ہو جائے تو اسے بچانے کے لیے عموماً" کوئی نہیں آتا۔"

"کیوں؟" وہ حیران ہوا۔

"بیٹا! یہی اس پیشے کی مجبوری ہوتی ہے۔ گرفتار ہونے کی صورت میں جاسوس کا ملک، حکومت یا ایجنسی کوئی بھی کھلم کھلا اسے اون نہیں کرتی۔ اگر پوچھا جائے تو صاف انکار کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے طریقوں سے وہ اسے جیل سے بھگانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو جاسوس کو ساری زندگی جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ اگر وہ راز اگل دے تو وہ غدار کہلاتا ہے، اس لیے اسے یہ تک چھپانا ہوتا ہے کہ وہ جاسوس ہے، کیونکہ ہر ملک میں جاسوسی کی سزا موت ہوتی ہے۔ پھر اگر اس پہ جاسوسی ثابت ہو جائے تو اسے مار دیا جاتا ہے اور اس کی لاش کہیں بے نام و نشان دفن کی جاتی ہے یا کسی بھی طرح ڈسپوز آف کر دی جاتی ہے اور بعض دفعہ کتنے ہی عرصے تک اس کے خاندان والوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کا جنازہ تک نہیں پڑھایا جاتا۔"

اس کی آنکھوں کے سامنے انطاکیہ میں فوارے کے ساتھ کھودی گئی قبر گھوم گئی۔ بے نام و نشان قبر۔

"پھر تو اس کو کچھ بھی نہ ملا ممی!"

"بیٹا! جو آدمی خود کو اس کام کے لیے پیش کرتا ہے، وہ اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ گرفتار ہونے یا دیار غیر میں مارے جانے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہو گا۔ اس کو تاریخ کبھی ہیرو کے نام سے یاد نہیں کرے گی۔ اس کے ملک میں اس کی فائل پہ ٹاپ سیکرٹ یا کلاسیفائیڈ کی مہر لگا کر بند کر دی جائے گی۔ وہ یہ سب جانتے بوجھتے بھی خود کو اس جاب کے لیے پیش کرتا ہے۔ پتا ہے کیوں؟"

"کیوں؟" اس نے اپنا پسندیدہ سوال پھر سے دہرایا۔

"کیونکہ بیٹا! جو شخص اپنی جان کے ذریعے اللہ کی راہ میں لڑتا ہے اسے دنیا کے اعزازات اور تاریخ میں یاد رکھے جانے یا نہ رکھے جانے سے فرق نہیں پڑتا۔ اسے اس بات سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ گرفتاری کی صورت میں سب اسے چھوڑ دیں گے اور موت کی صورت میں کوئی اس کا جنازہ بھی اٹھانے نہیں آئے گا، کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے ہوتی ہے اور جسے یہ مل جائے، اسے اور کچھ نہیں چاہیے ہوتا۔"

ممی اکثر اسے ایسی باتیں بتایا کرتیں۔ پھر ایک دم چپ ہو جاتیں اور پھر اپنی رو میں کہتیں۔ "اپنے ملک کے راز کبھی نہیں بیچنے چاہئیں۔ انسان بھی کتنی تھوڑی قیمت پہ راضی ہو جاتا ہے۔" اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک لو دیتی اذیت ہوتی۔ بہت عرصے بعد جہان کو اس تاثر کی وجہ سمجھ آئی تھی۔

اور یہ تب ہوا جب ان کی جدیسی (گلی) سے پچھلی جدیسی میں رہنے والے ایک لڑکے حاقان نے اس پہ راہ چلتے فقرہ اچھالا کہ وہ پناہ گزین ہے، اور یہ کہ اس کا باپ ایک مفرور مجرم ہے۔

اس نے حاقان کو کچھ بھی نہیں کہا۔ مگر رات جب ممی سے پوچھا تو انہوں نے بتا دیا۔ سب کچھ صاف صاف کہ کس طرح ابا سے غلطی ہوئی اور اس کی سزا وہ بھگت رہے تھے۔ جلاوطنی کی سزا۔ اور ترک حکومت نے رحم کھاتے ہوئے انہیں سیاسی پناہ بخشی تھی۔ تب اسے لگا، وہ بھی وظیفہ لینے والوں کی قطار میں عدالت میں کھڑا ہے اور چپراسی زور زور سے صدا لگا رہا ہے۔

"سکندر شاہ غدار کے ورثاء حاضر ہوں۔"

اس سب کے باوجود وہ ابا سے نفرت نہ کر سکا۔ وہ ان سے اتنی ہی محبت کرتا تھا جتنی پہلے۔ ابا ویسے ہی اب بیمار رہنے لگے تھے۔ ممی کبھی کبھی ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا کرتی تھیں۔ مگر کے اخراجات "اس کی پڑھائی

ممی کو ڈبل شفٹ کام کرنا پڑتا۔ رات میں کبھی کبھار وہ ممی کو لاؤنج میں پاؤں اوپر کر کے بیٹھے تلووں پہ بنے چھالوں پہ دوا لگاتے دیکھتا۔ ان کے ہاتھ سوئی موتی کپڑے دھاگے اور قینچی سے آشنا ہو کر اب سخت پڑتے جا رہے تھے۔

تب وہ سوچتا کہ وہ بہت محنت کر کے بہت امیر آدمی بنے گا۔ تاکہ ممی کو کام نہ کرنا پڑے اور وہ انہیں جہانگیر والا گھر دوبارہ خرید کر دے سکے۔ مگر وہ وقت قوس قزح کی طرح دور چمکتا تو دکھائی دیتا، لیکن اگر وہ اس کے پیچھے بھاگتا تو ہو غائب ہو جاتا۔

ایک روز وہ اسکول سے آیا تو ممی اپنا زیور الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں، ان کے چہرے کے افسردہ تاثرات کو دیکھتے ہوئے وہ ان کے پاس آبیٹھا۔

"ممی! کیا آپ اپنا زیور بیچ دیں گی؟ جیسے دادا نے جہانگیر والا گھر بیچا تھا؟"

ممی بے دلی سے مسکرا دیں۔

"چیزیں اسی لیے تو ہوتی ہیں۔ میں تمہارے ابا کے اس پیسے کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتی، جو بینک میں رکھا ہے اور جس نے ہم دونوں کو اپنے ملک کے سامنے شرمندہ کر دیا ہے۔ اس لیے زیور بیچ رہی ہوں۔ مگر تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں جہان؟" وہ کثر دادا کو جہان سے یہ فقرہ کہتے سنتی تھیں اس لیے دہرایا تو اس نے پرملال مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

ممی نے زیور بیچ دیا۔ کچھ وقت کے لیے گزارہ ہونے لگا۔ مگر پھر اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ بھی کچھ کام کر کے پیسہ کمائے۔ تاکہ اس کی ماں کے ہاتھ نرم پڑ جائیں اور ان کے پیروں کے چھالے مٹ جائیں۔ یہی سوچ کر اس نے پچھلی جدیسی کے حاقان کے چچا کرامت کی ورکشاپ میں کام کرنے کے لیے خود کو پیش کر دیا۔ کرامت بے کا بیٹا علی کرامت اس کا کلاس فیلو بھی تھا سو اس کو کام مل گیا۔ اسے راز رکھنے آتے تھے۔ سو یہ بات اس نے ممی سے راز رکھی۔

کرامت بے کی گاڑیوں کی ورکشاپ ان کے گھر کے ساتھ تھی، یعنی جہان کے گھر سے پچھلی گلی میں۔ جہان کا کمرا بالائی منزل پہ تھا، اگر وہاں سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو کرامت بے کا گھر اور ورکشاپ دونوں دکھائی دیتی تھیں۔ ورکشاپ گلی کے بالکل نکڑ پہ تھی اس سے آگے دوسری گلی میں مڑو تو کمرشل ایریا شروع ہو جاتا تھا۔

ایک روز ممی نے اس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تو ورکشاپ میں ہاتھ منہ کالا کیے کام کرتا نظر آ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ کھیلنے کے لیے جانے کی اجازت لے کر جایا کرتا تھا، اور ممی کو علم ہوتا تھا کہ وہ علی کرامت کے گھر جا رہا ہے۔ آج ان کو پتا لگ گیا کہ وہ اصل میں کہاں جاتا تھا۔ جب وہ گھر آیا تو انہوں نے ساری بات دہرا دی، مگر نہ اسے ڈانٹا، نہ ہی خفا ہوئیں۔

"تم ورکشاپ میں کام کرو، اخبار بیچو یا پھولوں کے گلدستے بناؤ۔ کبھی ان کاموں میں اتنا پیسہ نہیں کما سکو گے کہ اپنی پوری کتابیں بھی خرید سکو۔ اس کے باوجود میں تمہیں نہیں روکوں گی۔ میں اپنے بیٹے کو مضبوط اور محنتی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اس نے ہمیشہ کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔ کمائی نہ ہونے کے برابر تھی، مگر پھر بھی اسے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس نے ممی سے کہا کہ وہ بڑا ہو کر مکینک بنے گا۔ ممی خوب ہنسیں۔

"ابھی تم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بہت سے پیشے دیکھ کر تم کہو گے تمہیں وہی بننا ہے، لیکن اصل میں انسان کو وہی پیشہ اپنانا چاہیے جس کے مطابق اس کی صلاحیت ہو۔ ابھی یہ فیصلہ بہت دور ہے کہ تم کیا بنو گے۔"

مگر تب بھی وہ جانتا تھا کہ وہ مکینک ہی بنے گا۔ یہی اس کی منزل تھی۔ پھر کبھی کبھی وہ خواب اسے ستاتا۔ وہ خواب جس نے ان برسوں میں کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ایک اسپائی اور اس کا روشن چہرہ۔ تب اس کی خواہش ہوتی کہ وہ بھی اس جیسا ہی بنے، لیکن پھر وہ ڈر جاتا۔ معلوم نہیں کیوں۔

اس کا یہ خوف، یہ عجیب سا الجھن بھرا ڈر کب نکلا؟

شاید تب جب اس نے فریحہ سے دشمنی مول لی۔

فریحہ کرامت بے کے بھائی کی بیوی تھی۔ دراز قد اسمارٹ، خوب صورت سبز آنکھوں اور کندھوں تک گرتے اخروٹی بالوں والی۔ اس کا لباس اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کے ناز و انداز سب میں ایک شاہانہ سی جھلک ہوتی تھی۔ وہ بہت مغرور، بہت طرح دار سی تھی، اس کا بیٹا حاقان بھی اتنا ہی مغرور اور نک چڑھا تھا۔ فریحہ کا شوہر ایکان معمولی صورت کا تھا۔ جبکہ کرامت بے کافی وجیہہ تھے۔ اسی لیے حاقان، جو عمر میں جہان سے دو برس ہی بڑا تھا، ہر جگہ اپنی ماں کے حسن کے قصے سنایا کرتا تھا۔ وہ لوگ پیچھے سے عرب تھے آپس میں عربی بولا کرتے۔ ایک روز فریحہ ایکان ان کے اسکول آئی تو حاقان نے سب کے سامنے اپنی ماں کو گلاب کا پھول پیش کرتے ہوئے عربی میں کچھ کہا جس میں "انت مرہ جمیلہ" ہی اسے سمجھ آیا۔

اس نے علی کرامت سے مطلب پوچھا تو اس نے بتایا کہ "مرہ جمیلہ" بہت بہت خوب صورت عورت کو کہتے ہیں اسے "انت" بھی بھول گیا صرف "مرہ جمیلہ" ذہن پہ نقش رہ گیا۔

بے حد حسین عورت... مرہ جمیلہ۔

جب ممی اپنے زیور بیچ رہی تھیں تو انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے ایک نیکلس رکھ لیا ہے وہ اسے نہیں بیچیں گی کیونکہ وہ اسے حیا کو دیں گی۔

"تم ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں تمہاری شادی اپنے بھائی کے گھر ہی کروں گی، اس لیے تمہیں استنبول میں کوئی لڑکی بہت خوب صورت نہیں لگنی چاہیے۔ سن لیا تم نے؟"

مگر فریحہ کافی خوب صورت تھی، اسے بھی اچھی لگی، لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ اسے مرہ جمیلہ ہی کہہ دے۔

حاقان سے اس کا جھگڑا گیم کے دوران ہوا تھا۔ ورکشاپ میں کام ختم کر کے وہ جدیسی میں کھیلتے علی کرامت، حاقان اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ آ شریک ہوا تھا۔ حاقان کو اعتراض تھا، مگر علی کرامت

کا کہنا تھا کہ جب دوسرے آدھے گیم کے دوران شامل ہو سکتے ہیں۔ تو جہان کیوں نہیں (اس کا اشارہ حاقان کی جانب تھا جو گزشتہ روز اسی طرح شامل ہوا تھا۔)
"مجھ میں اور اس میں فرق ہے۔ میں حاقان ایکان رضا ہوں اور یہ ایک پناہ گزین کی اولاد۔"
جہان نے ہاتھ میں پکڑی سرخ گیند کھینچ کر اس کو دے ماری۔ اس نے بروقت سر نیچے کرلیا مگر پھر تن فن کرتا آگے بڑھا۔ تھوڑی سی مار کٹائی کے بعد لڑکوں نے انہیں چھڑا لیا۔ وہ وہاں سے یوں بکھرے کہ حاقان کا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور جہان کی نکسیر پھوٹی تھی۔
گھر آکر اس نے چپ چاپ خون صاف کرلیا۔ اصل اذیت اس طعنہ کی تھی' جو اسے دیا گیا تھا۔ جیسے منہ پہ چابک دے مارا ہو۔ وہ تکلیف بہت زیادہ تھی۔ پھر بھی وہ ابا کے خلاف نہ جاسکا۔ شاید اس لیے کہ اس کی ماں نے کبھی اسے باپ کے خلاف نہیں بھرا' بلکہ ہمیشہ یہی سکھایا کہ نفرت گناہ سے کی جاتی ہے' گناہ گار سے نہیں۔
حاقان نے البتہ چپ چاپ اپنا خون نہیں صاف کیا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ فریحہ تن فن کرتی ان کے گھر آئی' بلند آواز اور رعونت سے اس کو بہت سی باتیں سنا کر گئی (اس کا شوہر کاروباری آدمی تھا' اور مالی حالات کرامت بے سے اچھے تھے' اسے اسی پیسے کا غرور تھا) یہی نہیں' اس نے جاکر میونسپلٹی والوں سے بات بھی کی کہ ان سیاسی پناہ گزینوں کو کہیں اور رہائش اختیار کرنے کا کہا جائے ورنہ وہ ماحول خراب کریں گے۔
ممی کو اس بات کا علم نہ ہو سکا' وہ گھر پہ نہیں تھیں۔ ابا ان دنوں بیمار رہنے لگے تھے' سو کمرے میں تھے۔ اس نے اکیلے فریحہ کی باتیں سنیں' مگر چپ رہا۔ میونسپلٹی والی بات اسے علی نے بتائی۔ اس کا دل جیسے ٹوٹ سا گیا۔ ابا کی وجہ سے' بلکہ اس کے اپنے جھگڑے کی وجہ سے ان کو یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ اتنی مشکل سے ممی خرچے کی گاڑی کھینچ رہی تھیں' اب ان کو مزید تکلیف سہنی پڑے گی۔ وہ بہت پریشان ہو گیا۔
"تم ان باتوں سے پریشان مت ہو بچے! کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ راستہ ہمیشہ ہوتا ہے' بس ڈھونڈنا پڑتا ہے۔" علی کی بات سن کر اس کی ممی نے کہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ان کو دیکھا۔
وہ اس وقت کچن سلیب کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ باہر کام سے آئی تھیں اور ابھی ابھی انہوں نے اسکارف سے کیا گیا نقاب اتارا تھا۔ اب وہ ٹشو سے چہرے پہ آیا پسینہ تھپتھپا رہی تھیں۔ ان کا رنگ سیاہ تھا' وہ مصری تھیں' مصری سیاہ فام مگر پھر بھی ان کے چہرے پہ ایسی روشنی ایسا نور تھا کہ وہ نگاہ نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اسے وہ بہت خوب صورت لگتی تھیں۔ اس دن ان کی بات سن کر وہ خاموشی سے اٹھ گیا' مگر بعد میں مارکیٹ جاکر اس نے ایک کارڈ خریدا اور اس پہ انگریزی میں لکھا۔
"you are my marrah jameelah"
ساتھ میں ان کا نام اور فقط میں اپنا نام لکھ کر اس نے کارڈ کو خط کے لفافے میں ڈالا اور گوند سے لفافہ بند کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ صبح جاکر چپکے سے یہ ان کو دے آئے گا۔ ٹھیک ہے کہ ممی نے کہا تھا کہ اسے کوئی دوسری لڑکی خوب صورت نہیں لگنی چاہیے۔ مگر وہ لڑکی تو نہ تھیں۔ وہ تو ایک درمیانی عمر کی خاتون تھیں اپنی جیٹھانی فریحہ سے بالکل مختلف۔
جس پل وہ کارڈ اپنے بیگ میں رکھ رہا تھا' اسے کھڑکی کے باہر کچھ دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے بتی گل کی اور کھڑکی کے شیشے کے سامنے آکھڑا ہوا۔
باہر رات پھیلی تھی۔ فریحہ کا گھر (جہاں کرامت بے اور ایکان دونوں کے خاندان اکٹھے رہتے تھے) اور کرامت بے کی ورکشاپ سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ ورکشاپ کے دروازے کے پاس دو ہیولے سے کھڑے تھے۔ ایک لاک کھول رہا تھا جبکہ دوسرا ساتھ میں چپکا کھڑا تھا۔
لاک کھول کر وہ اندر چلے گئے' جب دروازہ بند

کرنے کے لیے وہ سایہ پلٹا تو اسٹریٹ پول کی روشنی ان دونوں پہ پڑی۔ لاک کھولنے والے شخص کا چہرہ واضح ہوا۔ جو کرامت بے کا تھا جبکہ اس کے پیچھے موجود لڑکی اسی وقت پلٹی تھی۔ روشنی نے اس کے اخروٹی بالوں کو چمکایا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔
فریحہ۔۔۔ اور وہ بھی کرامت بے کے ساتھ اس وقت؟
استنبول میں رہنے والے ایک تیرہ سالہ لڑکے کے لیے یہ سب سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا' مگر یقین کرنا اور اس دھوکے کو جذب کرنا' یہ بہت مشکل تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تو تحیر کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا تھا۔ پھر ہر رات اس نے ان پہ نظر رکھنی شروع کردی۔ وہ ہر رات نہیں آتے تھے۔ دو' دو' تین' تین دن بعد آیا کرتے۔
قریباً" ایک مہینے بعد اس نے فریحہ کو سر راہ اس وقت روکا' جب وہ صبح واک پہ تیز تیز چلتی جارہی تھی۔
"لیڈی ایکان۔۔۔ کیا آپ مجھے ایک منٹ دے سکتی ہیں؟"
فریحہ نے گردن موڑ کر کچھ اچنبھے' کچھ نخوت سے اسے دیکھا۔
"بولو!"

☆ ☆ ☆

ثانیہ کی باتیں تب بھی اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ جب وہ اپنے اپارٹمنٹ بلڈنگ کی لفٹ سے نکلا۔ پرانی یادیں' کسی ٹوٹے کانچ کی سی صورت ماس میں کھب گئی تھیں۔ ان کو کھینچ کر نکالنے کی تکلیف کا تصور ہی جان لیوا تھا۔
اس نے سست روی سے فلیٹ کے دروازے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھولا تو اوپر کہیں سے پانی سے بھری ڈبی آگری۔ وہ عین ڈور میٹ پہ گری تھی اور کارپٹ گیلا ہو گیا تھا۔ اس نے توجہ دیے بغیر دروازہ بند کیا۔ وہ اکثر ایسی چیزیں گھر میں چھوڑ دیتا تھا۔ اگر ڈبی ابھی گری تھی تو اس کا مطلب تھا اس کے بعد فلیٹ میں کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ ڈبی دوبارہ بھر کر رکھی جاسکتی تھی' مگر کارپٹ پہ نشانات ضرور ملتے۔
اس کے باوجود عادت سے مجبور اس نے اندر آکر کچن کی کھڑکی کی کنڈی چیک کی پھر باتھ روم کے روشن دان کو دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔
اس نے ٹی وی آن کیا اور لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر پاؤں لمبے کرکے میز پہ رکھے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ وہ ان تمام ڈاکومنٹس کو دیکھنا چاہتا تھا جو ثانیہ نے اسے سی ڈی کی صورت میں دیے تھے۔
ثانیہ نے فائل پہ سہ حرفی پاس ورڈ لگا دیا تھا اور وہ اسے بتا چکی تھی کہ پاس ورڈ کیا تھا اگر وہ اس سے کچھ بھی لیتا تو اس کو اس فائل پہ یہی پاس ورڈ لگانے کا کہا کرتا تھا۔ "ARP"
لمحے بھر کو اس کا دھیان بھٹک کر ادالار میں اپنے ہوٹل گرینڈ کے آفس کے باہر لگی تختی کی طرف چلا گیا۔ وہاں بھی اس نے یہی لکھوا رکھا تھا۔ اس سے عمومی تاثر یہی پڑتا تھا کہ اے آر پی کا مطلب عبدالرحمان پاشا ہے جبکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ جب بھی خود کو اے آر پی لکھتا وہ اس سے مراد کبھی بھی عبدالرحمان

پاشا نہیں لیا کرتا تھا۔ اے آر پی کا مطلب اس کے نزدیک کچھ اور تھا۔

فائلز کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی وہ ذہنی طور پہ الجھا ہوا تھا۔ ممی نے صبح اسے جتنی تاکید سے کہا تھا کہ وہ ماموں سے مل لے 'اب اگر وہ نہیں جائے گا تو وہ ہرٹ ہوں گی' اور یہی وہ چیز تھی جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ اسے جانا ہی پڑے گا۔ وہ جتنا اس رشتے اور ان رشتہ داروں سے احتراز برتنے کی کوشش کر رہا تھا' اب اتنے ہی وہ اس کے سامنے آچکے تھے۔

بہت بے دلی سے اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ ماموں کا گھر یہاں سے دس منٹ کی ڈرائیو پہ تھا۔

کیا وہ ابھی ہی چلا جائے؟ گاڑی آج اس کے پاس نہیں تھی۔ سروس کے لیے دی ہوئی تھی اسے کل ملنا تھا۔ اگر ہوتی تب بھی وہ ٹیکسی پر ہی جاتا' کیونکہ وہ ان کو یہی تاثر دے گا کہ وہ ترکی سے آج آیا ہے' دو ہفتے قبل نہیں۔ البتہ وہ ان کے گھر رکے گا نہیں۔ واپس آجائے گا' کہہ دے گا کہ وہ ہوٹل میں رہائش پذیر ہے وغیرہ وغیرہ کور اسٹوری تو اس کے پاس ہمیشہ تیار ہوتی تھی۔

وہ اٹھا' اپنی جیکٹ پہنی' جوگرز کے تسمے باندھے اور والٹ اٹھا کر جانے لگا' پھر خیال آیا کہ وہ خط کے لفافے اٹھالے جن کو اسے پرانی تاریخوں میں اسٹیمپ کروا کے میڈم سیکنڈ سیکریٹری کو بھیجنا تھا یہ کام ماموں کے گھر جانے سے زیادہ ضروری تھا' پہلے اسے یہی کرنا چاہیے۔

پانی کی ڈبی دروازے کی اوپری جگہ پہ احتیاط سے رکھ کر' اس کی ڈور پھنسا کر وہ باہر نکل آیا۔ ٹیکسی نے اسے ماموں کے سیکٹر کے مرکز پہ اتارا۔ یہاں سے ان کا گھر سو قدم کے فاصلے پہ تھا۔ جس دن وہ اسلام آباد پہنچا تھا' اس نے یونہی سرسری سا وہ راستہ سمجھ لیا تھا۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اس دفعہ اسے جانا ہی پڑے گا۔

مرکز پہ ایک کوریئر سروس کی شاپ سامنے ہی تھی۔ اس کے سامنے پھول والا بیٹھا تھا۔ مختلف رنگوں اور قسموں کے پھول سجائے' وہ ان پہ پانی چھڑک رہا تھا۔ پھول..... اسے چاہیے کہ وہ ان کے گھر کچھ لے کر جائے' پھولوں سے بہتر کوئی تحفہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ایک بہت قیمتی اور خوبصورت تحفہ ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا وہ لڑکے کو گلدستہ بنانے کا کہہ دے اور تب تک وہ اندر کوریئر سروس سے لفافے اسٹیمپ کروالے۔

"بات سنو!" اس نے پھول بیچنے والے لڑکے کو پکارا۔ وہ جو پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا' فوراً" پلٹا۔

"جی صاحب!" اپنے سامنے موجود آدمی کو دیکھ کر' جو سیاہ جیکٹ میں ملبوس' پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا' وہ جلدی سے پانی کا برتن رکھ کر مودب سا ہوا اس کے پاس آیا۔

"گلاب کے پھول ہیں تمہارے پاس؟"

"کون سا رنگ چاہیے صاحب؟"

"سرخ!" اس نے بنا سوچے کہہ دیا۔ لڑکے نے ذرا تاسف سے سر ہلایا۔

"صاحب! سرخ پھول ختم ہوگیا ہے۔ تھوڑے سے سفید گلاب پڑے ہیں۔ وہ کردوں؟"

"نہیں' نہیں۔" اس نے قدرے برہمی سے نفی میں سر ہلایا۔ سفید گلاب' دشمنی کی علامت۔ ممی کو پتا چلے' وہ پہلے ہی دن ماموں کے گھر سفید گلاب لے گیا ہے تو وہ ازحد خفا ہوں گی۔

"مجھے سرخ ہی چاہئیں۔ کہاں سے ملیں گے۔"

"صاحب! میرے پاس سرخ اسپرے ہے' ان سفید پھولوں کو اسپرے کردوں؟ قسم سے صاحب اتنی مہارت سے کروں گا' بالکل پتا نہیں چلے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے' یہ ہی کردو۔" اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ نقلی سرخ رنگ کے گلاب' سفید گلاب سے پھر بھی بہتر تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

مری زمیں پہ لگی، آپ کے نگر میں لگی
لگی ہے آگ جہاں بھی، کسی کے گھر میں لگی

کواڑ بند کہاں' منتظر تھے آہٹ کے
لگی جو دیر تو دہلیز تک سفر میں لگی

ادھورے لفظ تھے' آواز غیر واضح تھی
دعا کو پھر نہیں دیر کچھ اثر میں لگی

پلٹ کے دیکھا تو بس ہجرتیں تھیں دامن میں
اگرچہ عمر یہاں اک گزر بسر میں لگی

پرند لوٹ کر آئے تھے کن زمینوں سے
کہاں کی دھول تھی جوان کے بال و پر میں لگی

فاطمہ حسن

کچھ اس کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں
ہم اس بات پر مسکرا سکتے ہیں

کھلا ہے یہ ہم پر ترے ہجر میں
کوئی دکھ بھی ہو' ہم اٹھا سکتے ہیں

نہ تم سے چھپا سکتے ہیں کوئی بات
نہ یہ بات تم کو بتا سکتے ہیں

بلا کر ہمیں اس نے اتنا کہا
بہت شکریہ' آپ جا سکتے ہیں

یہی زندگی ہے تو اجمل سراج
ہم اب ہاتھ اس سے اٹھا سکتے ہیں

اجمل سراج

اک ہاتھ میں خوابوں کی دولت، اک ہاتھ میں کاسہ لائے ہیں
ہم خاک نشیں تری چوکھٹ پر اک سجدہ کرنے آئے ہیں

تو ملنے اب یا رد کر دے، جو چاہے وہ حالت کر دے
ہم دُور سے چل کے آئے ہیں، اک عرضِ تمنا لائے ہیں

کوئی شہزادہ کسی جنگل سے آنے کا رستہ بھول گیا
اک شہزادی کے ہاتھوں میں جو پھول ہیں مرجھائے ہیں

جو دُور کہیں سے آتا ہے، چپ چاپ چلا بھی جاتا ہے
اسے دیکھ کسی دن روزن سے، جسے تُو نے خواب دکھائے ہیں

کوئی صحرا پار نہیں بھٹکا، کوئی دریا بیچ نہیں ڈوبا
یہ جھوٹے سچے قصے تو کچھ لوگوں نے پھیلائے ہیں

اک عمر خلش تو رہنی ہے، بس تجھ سے بات یہ کہنی ہے
جب وقت گزر جائے تو یہاں کچھ لوگ بہت پچھتائے ہیں

صابر وسیم

کون کہتا ہے
دسمبر استعارہ ہے
دُکھوں کا دُوریوں کا
محبتوں اور فاصلوں کے بیچ
ڈولتی مجبوریوں کا

کون کہتا ہے
دسمبر میں اشارہ ہے
جدائی کا، بے وفائی کا
در و دیوار سے لپٹی ہوئی سرد تنہائی کا
دسمبر سے ہی کیوں مشروط ہیں
یہ نسبتیں ساری

مہینے، دن، پہر، موسم
کیا سب ایک سے نہیں ہوتے
ابھی پچھلے برس تک یہی سوچ تھی میری
مگر اب کے دسمبر میں
جب تم ساتھ نہیں ہو
اور سال کی آخری راتوں کی برفیلی تنہائی
میری ذات کے در و دیوار سے لپٹی ہوئی ہے
تو مجھ کو بھی یہی محسوس ہوتا ہے
دسمبر استعارہ ہے
دُکھوں کا دُوریوں کا
محبتوں اور فاصلوں کے درمیان
ڈولتی مجبوریوں کا...!

اُم ثمامہ

صبا سحر

عاریتاً

دعوت میں مہمان جمع تھے۔ اس میں مارک ٹوئین اور ایک نوجوان مصنف بھی شامل تھا۔ کھانے کے بعد نوجوان مصنف کی نظر کتابوں کی الماری پر پڑی تو وہ کتابیں دیکھنے لگا۔ چند کتابیں اسے بہت پسند آئیں۔ اس نے میزبان سے وہ کتابیں عاریتاً" مانگیں۔ میزبان نے صاف انکار کر دیا۔ نوجوان مصنف کو بڑی تکلیف پہنچی۔ مارک ٹوئین نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔

"دوست! تمہیں میزبان کے انکار سے آزردہ نہیں ہونا چاہیے۔ لوگ عاریتاً" کتابیں لے جاتے ہیں پھر واپس نہیں کرتے۔ ذرا سوچو! یہ ساری کتابیں ایسی ہی تو ہیں جو ہمارے میزبان نے عاریتاً" حاصل کیں اور ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیں۔"

سعدیہ ثاقب..... لاہور

سینچری

کرکٹر کی نو بیاہتا بیوی اسپورٹس گڈز کی دکان میں داخل ہوئی اور بڑے جوش سے کہا۔ "مجھے ایک عدد سینچری خریدنی ہے۔"

"جی..... سینچری؟" دکان دار ششدر رہ گیا۔

"جی۔ آج میرے شوہر کی سالگرہ ہے۔ وہ ہمیشہ روتے رہتے ہیں کہ سینچری کسی طرح ہی نصیب نہیں ہوتی۔"

سمیرا علی..... ڈیفنس

جواب

جارج برنارڈ شا کو اپنے ان نقادوں سے اچھی طرح نمٹنا آتا تھا جو کبھی کبھی ان کے فن پر بے جا تنقید کر دیا کرتے تھے۔

ایک بار تھیٹر میں ان کا نیا ڈراما پیش کیا جا رہا تھا۔ وہ ڈراما عوام کو اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے شور مچا مچا کر منتظمین کو مجبور کر دیا کہ ڈراما نگار کو اسٹیج پر لایا جائے تاکہ اس عظیم فن کار کا دیدار ہو سکے۔"

برنارڈ شا اسٹیج پر پہنچے اور بار بار جھک کر ناظرین کی تعریفوں کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ اسی دوران ایک جانب سے آواز آئی۔

"شا! تمہارا ڈراما بالکل بکواس تھا۔"

سارے تھیٹر پر سکتہ ہو گیا۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد برنارڈ شا آگے بڑھے اور آواز کی جانب منہ کر کے کہا۔

"میرے دوست! میں تم سے سو فیصدی متفق ہوں لیکن اتنی اکثریت کے سامنے ہم دونوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

ہال دوبارہ تعریفی تالیوں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

نسرین اختر..... میٹرو ول

انگریز شیدائی

حکومت ہند کے ایک انگریز افسر کو کسی مشاعرے میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہ ادبی تقریب انہیں بہت پسند آئی۔ انہوں نے بہت ذوق و شوق سے اردو زبان سیکھی اور اپنے آپ کو اردو شاعری کے شیدائیوں میں شامل کرنے لگے اور کچھ ہی عرصے بعد وہ میر، غالب، مومن اور انشا کے کلام کو سمجھنے کا دعوا کرنے

لگے۔ چنانچہ ایک محفل میں وہ حسب معمول اپنی گوہر افشانیوں میں مشغول تھے۔ ایک صاحب نے میر کا ایک سادہ سا شعر سنا کر مطلب دریافت کیا۔

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

شعر سن کر وہ کہنے لگے۔ "اس کا مطبل ہے کہ ام' تم اور میر صاحب سب جیل کھانا جانا مانگتا۔"

ثوبیہ کاشف۔۔۔۔ باغبان پورہ

احساس کمتری

نئے نئے دولت مند ہونے والے ایک صاحب کی بیگم ایک سرجن کے پاس پہنچیں اور بولیں۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا آپریشن کر دیجیے۔"

"مگر کس چیز کا آپریشن؟" سرجن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کسی بھی چیز کا۔" خاتون نے بے پروائی سے کہا۔

"دراصل میرا کسی بھی مرض کے سلسلے میں آپریشن نہیں ہوا۔ اس وجہ سے مجھے بیگمات کے درمیان بیٹھ کر بات چیت کرنے میں مشکل پیش آتی ہے اور احساس کمتری سا ہونے لگتا ہے۔"

صالحہ اقصیٰ۔۔۔۔ آزاد کشمیر

میچنگ

ایک امریکی نے اپنے دوست سے پوچھا "سنا ہے تمہاری بیوی نے گھریلو ڈیکوریشن میں ڈپلوما کیا ہوا ہے؟"

دوست نے جواب دیا "ہاں ٹھیک سنا ہے، لیکن اب وہ مجھ سے طلاق لے رہی ہے۔"

پہلے دوست نے حیرت سے پوچھا "وہ کیوں؟"

دوسرے دوست نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کیونکہ میں گھر کے فرنیچر اور پردوں سے میچ نہیں کرتا۔"

الماس تنویر۔۔۔۔ ہزارہ

لاجواب

"ہیلو ڈاکٹر!" آدھی رات کو ڈاکٹر کو فون پر آواز سنائی دی۔

"میں خالد بول رہا ہوں" میری بیوی اس وقت سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ شاید اپنڈکس ہے۔ آپ فوراً" آجائیں۔"

"ناممکن!" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"ابھی پچھلے سال تو میں نے تمہاری بیوی کا اپنڈکس نکالا تھا۔ دوسرے اپنڈکس کے بارے میں میں نے کبھی نہیں سنا۔"

"لیکن دوسری بیوی کے بارے میں تو سنا ہوگا۔"

دوسری طرف سے جواب ملا۔

ارم کمال۔۔۔۔ فیصل آباد

قابل دید

ایک صاحب دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ اتفاق سے ان کی ایک ملنے والی آگئیں۔ انہیں کھاتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"کیا کھایا جا رہا ہے اکیلے ہی اکیلے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "مونگ کی دال چھلکوں والی، ہم عموماً" رات کے بچے سالن میں دال ڈال دیا کرتے ہیں۔ مزا دوبالا ہو جاتا ہے۔"

خاتون نے یہ سن کر اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بولیں۔ "کیا تھوڑی سی دال ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔" پھر انہوں نے بیگم کو آواز دی۔ وہ ٹرے میں دال اور روٹی لے آئیں۔ خاتون نے پر تکلف انداز میں نوالہ توڑا اور کھانے لگیں۔ جب وہ آدھی روٹی کھا چکیں تو ہاتھ روک کر تعجب سے بولیں۔

"اس میں تو رات کے سالن کا مزا نہیں ہے۔"

"دراصل میں آپ کو یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ آج اتفاق سے رات کا سالن بچا ہی نہیں مگر آپ میری

بات ختم ہونے سے پہلے ہی دال طلب کر بیٹھیں۔"

ان صاحب نے متانت سے جواب دیا۔

(مسرت الطاف احمد۔۔۔۔ کراچی)

رشتے داری

مردم شماری کرنے والے نے اپنا رجسٹر کھولتے ہوئے خاتون سے کہا۔ "آپ کا کہنا ہے کہ پڑوسی آپ کا دور کا رشتہ دار ہے۔ اس رشتے کی تفصیل بتا دیجیے۔"

"ہمارا کتا ان کے کتے کا بہنوئی ہے۔" خاتون نے جواب دیا۔

ہما فہیم۔۔۔۔ ملیر کراچی

چیدہ چیدہ

☆ سرکاری دفتر میں بڑے عہدے پر کام کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ دو ماہ کی تعطیلات پر چلے جائیں، تب بھی کسی کو آپ کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

☆ ایک کلب ممبر نے اپنے دوست سے کہا۔

آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ الفاظ کس طرح زخمی کرتے ہیں۔۔۔۔ خصوصاً" جب آپ کی بیوی آپ کے سر پر ڈکشنری دے مارے۔"

☆ اگر عورت کسی مرد کی تعریف کر رہی ہے تو وہ مرد اسے باتونی ہونے کا طعنہ ہرگز نہیں دے گا۔

نسیم سحر۔۔۔۔ گلشن اقبال

یادگار تصویر

ایک وکیل نے ایک فوٹو گرافر سے کہا۔

"میں ایک یادگار تصویر بنوانا چاہتا ہوں جس میں میرے دونوں ہاتھ میرے کوٹ کی جیب میں ہوں۔"

"اگر تصویر یادگار بنوانا چاہتے ہیں تو آپ اپنے ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں نہیں دوسرے کی جیب میں ڈال کر بنوائیں۔"

فوٹو گرافر نے مشورہ دیا۔

نمو رزاق۔۔۔۔ ڈیفنس

انداز بیاں اور

جرمنی کے ایک قصبے میں پولیس نے رات کو بارش میں اونچے درخت پر بیٹھے ہوئے شخص کو گرفتار کر لیا اور اس سے پوچھا کہ وہ سامنے والے گھر میں کام کرتی ہوئی لڑکی کو کیوں گھور رہا تھا۔

"جناب! میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس میں گھریلو ذمہ داریاں اٹھانے کی صلاحیت ہے یا نہیں؟"

آدمی نے اطمینان سے جواب دیا۔

شائستہ جاوید۔۔۔۔ ایف بی ایریا

وہم

ایک آدمی اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس سے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! مجھے کئی دنوں سے یہ وہم ستا رہا ہے کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے۔ یہ وہم نہیں حقیقت ہے۔"

ڈاکٹر نے پر سوچ انداز میں کہا۔

"وہ میرا ہی آدمی ہے جسے میں نے تم سے اپنا سابقہ بل وصول کرنے کے لیے تمہارے پیچھے لگا رکھا ہے۔"

نازیہ نجم۔۔۔۔ ملیر

اندازہ

بیوی نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ "آخر آپ نے کس چیز سے اندازہ لگایا کہ ہمارا منا بڑا ہو کر سیاست دان بنے گا؟"

"منا دراصل ایسی باتیں کرتا ہے، جو کانوں کو تو بھلی لگتی ہیں لیکن غور کرو تو ان کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔"

شوہر نے سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔

رشیدہ بتول۔۔۔۔ بلدیہ ٹاؤن

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، پھر جب اسے پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔"

پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

ترجمہ:۔"آپ کے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے۔جب وہ بستیوں کے رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے۔"

اِن شاءاللہ نہ کہنے کا نتیجہ،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"حضرت سلیمان بن داؤدؑ نے ارادہ ظاہر کیا۔میں آج ستر خواتین کے پاس جاؤں گا۔ہر ایک سے ایک شہسوار پیدا ہوگا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا۔"

آپ کو اِن شاءاللہ کہنا یاد نہ رہا۔آپ ان سب کے پاس گئے۔ان میں سے کسی کے ہاں بچہ پیدا نہ ہوا۔ صرف ایک خاتون سے آدھا بچہ ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔"اگر آپ ان شاءاللہ کہہ دیتے تو آپ کی خواہش پوری ہوجاتی۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشادات،

- زندگی میں کبھی کسی کو یہ موقع مت دو کہ وہ تمہارے چہرے کی مسکراہٹ چھین لے... یاد رکھنا دُنیا تمہارے لیے ہے تم دُنیا کے لیے نہیں۔
- اس وقت سے ڈرو جب تمہارا وفادار دوست تم سے بچھڑ جائے۔ وہ دن آدھی قیامت کے برابر ہوتا ہے۔
- جب تم نماز نہیں پڑھتے تو یہ مت سوچو کہ وقت نہیں ملا بلکہ یہ سوچو کہ تم سے ایسی کون سی خطا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے سامنے کھڑا کرنا بھی پسند نہیں کیا۔
- ماں کی خدمت سے جنت تو مل جاتی ہے مگر جنت کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب باپ کی اطاعت کی جائے۔

اُمِ ایمان۔کوٹ چھٹہ

تقدیر،

تقدیر اپنا بیشتر کام انسانوں کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کرلیتی ہے۔انسان راہ چلتے چلتے دوزخ تک جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے بہشت میں داخل ہوجایا کرتا ہے۔بہشت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔

(واصف علی واصف۔دل، دریا، سمندر)

ثمرہ، اقرأ۔کراچی

طاغوت،

"طاغوت" لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا، جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے، جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ اصولاً اس کی فرماں برداری ہی کو حق مانے، مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی

کرے۔اس کا نام فسق ہے۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے اصولاً منحرف ہوکر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باغی ہوکر اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے، اسی کا نام طاغوت ہے اور کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن بندہ نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔

حقیر نہ سمجھو،

موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے، روزانہ اپنے رب سے ہم کلام ہوتے تھے۔ایک دن حکم ہوا کہ موسیٰ جاؤ اور اپنے سے کمتر کو تلاش کرکے لاؤ۔

موسیٰ علیہ السلام نے حکم خدا سے ساری کائنات چھان ماری مگر اپنے سے کمتر کسی کو نہ پایا۔ شام کو خالی ہاتھ لوٹے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے موسیٰ! اگر آپ ایک بکری کے بچے کو ہی لے آتے تو ہم آپ کو نبوت سے محروم کردیتے۔"

اسی لیے کہتے ہیں کہ کسی کو اپنے سے حقیر نہ سمجھو۔

مسرت الطاف احمد۔کراچی

اظہارِ افسوس،

ایک دن ایک درویش بازار میں بیٹھا تھا۔بادشاہ نے پوچھا۔

"بھائی کیا کررہے ہو...؟"

درویش نے کہا۔"بندوں کی خدا سے صلح کروا رہا ہوں۔اللہ مان رہا ہے پر بندے نہیں مان رہے۔"

کچھ دنوں بعد درویش قبرستان میں بیٹھا رو رہا تھا۔بادشاہ نے کہا۔

"بھائی یہاں کیا کررہے ہو...؟"

درویش نے جواب دیا۔"اللہ کی بندوں سے صلح کروا رہا ہوں۔بندے تو مان رہے ہیں مگر آج اللہ نہیں مان رہا...!"

مسرت طارق۔آزاد کشمیر

شک،

اصل بات یہ ہے کہ جب کسی نے یہ کہا کہ یہ بات غلط ہے۔اس جگہ دال میں کچھ کالا ہے۔ تو آپ نے فوراً اسے تسلیم کرلیا۔

اس کے آگے سر جھکا دیا۔

جب کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ اچھا ہے۔ یہ خوب ہے یہ نیکی ہے۔تو تم رک جاتے ہو۔ماننے سے انکار کردیتے ہو۔خاموش ہوجاتے ہو۔ برائی پر تم کو پورا یقین ہے۔سو فیصد اعتماد ہے۔شیطان پر اور ابلیس پر پورا یقین ہے۔لیکن خدا پر نہیں۔

(از اشفاق احمد۔ بابا صاحب)

نوال افضل گھمن۔گجرات

نہر زبیدہ،

زبیدہ خاتون اپنے وقت کی نیک ملکہ تھیں۔

عام عورتیں اپنے شوہروں سے دُنیا کی چیزیں بنواتی ہیں۔ ممتاز نے تاج محل بنوایا۔گلشن آرا نے اپنے لیے باغ بنوایا۔نور جہاں نے اپنے لیے مقبرہ تعمیر کروایا۔ لیکن یہ وہ خاتون ہے جس نے اپنے خاوند سے فرمائش کی کہ حجاج کے پانی کی تنگی کے لیے ایک نہر بنوائی جائے جو طائف اور وادیٔ نعمان کے چشموں سے مکہ تک ہو۔ جس سے لاکھوں انسانوں، حیوانوں اور پرندوں نے پانی پیا اور ان کی زندگیاں بچیں۔اس نیک خاتون کو اس کا ثواب ملتا رہا۔اس کا نام "نہر زبیدہ" تھا۔

ہارون الرشید کے دورِ خلافت سے پہلے ہی مکہ میں پانی کی انتہائی قلت ہوچکی تھی۔ملکہ کو جب اہل مکہ کی تکلیف کی خبر پہنچی تو وہ سخت بے چین ہوئی اور اس نے ٹھان لیا کہ پانی کا کوئی مستقل انتظام ہونا چاہیے۔

اس نے جب علاقے کا سروے کروایا تو پتا چلا مکہ کے نواح میں پانی یا تو طائف کے چشموں میں ہے یا وادی نعمان میں۔اور ان کا فاصلہ پچیس کلومیٹر ہے۔ پہاڑیوں کو کاٹ کر نہر بنوانا محال ہے۔لیکن ملکہ نے پکا ارادہ کرلیا کہ نہر بنوانی ہے۔چاہے مزدور کو ایک کدال مارنے کی قیمت ایک ہزار اشرفی کیوں نہ دینی

پڑے۔

ملکہ نے کھدائی اور تعمیر کے لیے بڑے بڑے ماہرین اور انجینئروں کو طلب کیا۔ یہ لوگ مسلسل تین سال تک دن رات پہاڑیاں کاٹنے اور نہر بنانے میں مشغول رہے۔ اس کام پر ملکہ کے ستر لاکھ طلائی دینار خرچ ہوئے۔

جب اخراجات کا حساب ملکہ کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ دریائے دجلہ کے کنارے اپنے محل میں بیٹھی تھی۔ اس نے حساب کے کاغذات پر سرسری نظر بھی نہ ڈالی اور یہ کہہ کر کاغذات کو دریا میں ڈال دیا۔

"ہم نے حساب کو حساب کے دن کے لیے چھوڑ دیا۔ کیونکہ یہ کام میں نے اللہ کو راضی کرنے کے لیے کیا ہے۔ اگر میرے ذمے کسی کو کچھ دینا آتا ہے تو وہ مجھ سے لے لے اور میرا کسی کے ذمے کچھ باقی ہے تو میں نے اسے معاف کیا۔"

حنا کنول بیگ۔ سیالکوٹ

مصائب،

مصائب گناہوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور گناہگار کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مصیبتوں کے نزول کے وقت واویلا کرے۔

(امام ابو حنیفہ)

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

نیکی،

نیکی بیج کی طرح ہوتی ہے۔ آپ آدھا تولہ کا بیج بوتے ہیں، پانی دیتے ہیں۔ اس بیج میں سے ایک کونپل نکلتی ہے اور یہ کونپل آگے چل کر سینکڑوں ٹن کے درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی انسان زمین میں پچیس تیس فٹ کا درخت نہیں لگا سکتا لیکن دنیا کا ہر انسان با آسانی سینکڑوں، ہزاروں درختوں کے بیج بو سکتا ہے۔

(زیرو پوائنٹ 3۔ جاوید چودھری)

زد باریہ خالد۔ لاہور

گلاب اور کانٹا،

یہ ٹھیک ہے کہ تم ایک گلاب نہیں بن سکتے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم ایک کانٹا بن جاؤ۔ یہاں ایک راز کی بات ہے اور وہ میں تمہیں بتا ہی دیتا ہوں کہ جو شخص کانٹا نہیں بنتا۔ بالآخر وہ ایک گلاب بن جاتا ہے۔

(زاویہ اشفاق احمد سے اقتباس)

نوال افضل گھمن۔ گجرات

بات سے بات،

- جس کا آغاز نہ ہو اس کا انجام نہیں ہو سکتا، اللہ ہر آغاز سے پہلے ہے اور ہر انجام کے بعد۔
- یتیم کا مال کھانے والا ہزار یتیم خانے بنائے، سکون نہیں پائے گا۔ پیٹ میں آگ ہو تو دل میں سکون کہاں۔ رزق حلال نہ ہو تو سکون قلب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
- اگر تم نے کسی معمولی سے معمولی انسان کو بلاوجہ دکھی کر دیا تو ساری کائنات کا جو دکھ ہے ناوہ تمہارے سر پر بلاوجہ آجائے گا۔
- عبادت اس مقام پر نہیں پہنچا سکتی جہاں غریب کی خدمت پہنچاتی ہے۔
- اگر کیفیت اور یکسوئی نہ بھی میسر ہو تو نماز ادا کرنی چاہیے۔ نماز فرض ہے کیفیت فرض نہیں۔
- ہم جس کو برداشت نہیں کرتے اس کو بھی تو اللہ نے پیدا فرمایا ہے۔
- اگر کہیں شک بھی ہو جائے کہ یہ شخص اللہ کے قریب ہے تو اس کے قریب ہو جاؤ۔
- صبر سب سے قوی عمل ہے، سب سے بڑی قوت قوت برداشت ہے۔
- قائم ذات سے محبت کرو گے تو تم بھی قائم ہو جاؤ گے۔

(واصف علی واصف)

گل پری مرزا۔ لاہور

دس احکام،

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے توریت نازل کی۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ علیہ السلام کو پہلے دس احکام ملے جن میں دس اخلاقی باتیں تھیں۔ ان دس احکام کو احکام عشرہ کہتے ہیں۔ یہ احکام پتھر کی سلوں پر کندہ تھے۔ اسے صحیفہ کہا جاتا ہے۔

قوم عاد کا عذاب،

حضرت ہود علیہ السلام قوم عاد سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ عاد ہی کے شریف اور نیک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قوم عاد کا پیشہ کاشت کاری تھا۔ وہ زراعت کے طریقوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے علاوہ پہاڑوں کی چٹانیں کاٹ کر ان پتھروں سے مضبوط عمارتیں بناتے۔ پہاڑ کے غاروں میں بھی رہتے تھے۔ پتھروں سے شکار کرتے تھے۔ جانوروں کو آگ میں بھون کر کھاتے تھے۔

عیش و عشرت کی زندگی نے ان میں بہت سی برائیاں پیدا کر دی تھیں۔ یہ غریبوں پر مظالم ڈھاتے اور پتھروں کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے آگے سجدہ کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے تھے۔

عاد علیہ السلام نے انہیں بتوں کی پوجا سے روکا اور اللہ کے دیے ہوئے اناج سے غریبوں کا حصہ نکالنے کے لیے کہا مگر وہ باز نہ آئے۔ الٹا کہنے لگے۔

"ہمیں تم جس عذاب سے ڈرا رہے ہو وہ عذاب کب آئے گا؟"

ہود علیہ السلام نے کہا "یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، میں تو صرف اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہوں۔"

جب وہ قوم کسی طرح بھی راہ راست پر نہ آئی تو اللہ کے غضب نے جوش مارا۔ ان کے ہاں خشک سالی آگئی۔ بارش نہیں ہوئی۔ کنوئیں سوکھنے لگے۔ درخت مرجھا گئے۔

ہود علیہ السلام نے انہیں توبہ استغفار کرنے کو کہا لیکن وہ باز نہ آئے۔ ایک روز بادل کا ایک ٹکڑا آسمان پر نظر آیا۔ لوگ دیکھ کر خوش ہونے لگے کہ اب بارش ہو گی۔

حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا "یہ عذاب کی علامت ہے۔ اللہ کا عذاب آپہنچا ہے۔"

حضرت ہود علیہ السلام ایمان والوں کے ساتھ شہر سے نکل گئے۔ شہر میں اب کوئی ایمان دار نہیں رہا۔

اچانک تیز ہوائیں اور آندھی چلنے لگی۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑنے لگے۔ برتے ہوا میں اڑنے لگی۔ ہوا کے زور سے بڑی بڑی مضبوط عمارتیں بھی گر گئیں۔

قوم عاد کو اپنے مضبوط مکانوں پر بڑا ناز تھا۔ یہ تمام مکانات زمین بوس ہو گئے۔ زمین پر کچھ بھی نہیں بچا۔ یہ آندھی آٹھ دن اور سات راتیں رہی۔ جب آندھی تھمی تو لاشوں کا پتا بھی نہیں تھا۔

عاد کی قوم کا ذکر صرف کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ تباہ شدہ شہر کے کھنڈرات آج بھی درس عبرت کے لیے زمین پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

کلام ربانی،

عرب کا ایک مشہور شاعر ایک غار میں رہتا تھا۔ اس کے بہت سے شاگرد اپنا کلام بغرض اصلاح اس غار میں ڈال آتے تھے۔ ایک روز ایک شاگرد نے قرآن پاک کی آیت سورۃ الکوثر کو اپنا کلام ظاہر کر کے اس کا چوتھا مصرعہ بنانے کی درخواست کی۔ دوسرے دن وہ اپنا پرچہ واپس لایا تو چوتھے مصرعے کی جگہ درج تھا۔

"یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔"

عائشہ۔ گوجرہ

شاعری سچ بولتی ہے

سحرش یوسف

بقول پروین شاکر "محبت کو جب وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا۔ اس کا آہنگ بھی وہی ہے جو موسیقی کا ہے کہ جب تک سارے سُر سچے نہ لگیں تو گلے میں نور نہیں آتا اور جب تک دل کے زخم لَو نہ دیں تو حرفوں میں روشنی نہیں آتی۔

علامہ اقبال کے کلام کی نظیر نہیں ملتی۔ بلاشبہ وہ ایک الہامی شاعر تھے۔ ان کی یہ نظم یقیناً آج کے حالات سے بہت ہم آہنگ ہے۔ اس نظم کو پڑھیے اور علامہ اقبال کے پوشیدہ پیغام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

کل میکدے میں اک رند زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے رنگیں قبا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے مردِ غریب و بے نوا
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

فیض احمد فیض بنیادی طور پر انقلابی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ مگر ان کا بہت سارا کلام غزلوں اور نظموں پر بھی مشتمل ہے۔ اس غزل کو پڑھیے۔ آپ کو اس غزل میں رومانیت کی چاشنی کے ساتھ حقیقت کی تلخی بھی نظر آئے گی۔

ے کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

ناصر کاظمی کے لیے وہ الفاظ ہی نہیں جو ان کی تعریف کر سکیں۔ یہ غزل ان کے سب چاہنے والوں کے نام۔

ے ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

تیرے کرم سے اے المِ حسن آفریں
دل بن گیا دوست کی خلوت کبھی کبھی

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تیری صورت کبھی کبھی

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

احمد فراز کو کسی نے کہا تھا کہ آپ صرف ٹین ایجرز کے شاعر ہیں۔ مگر میں کہتی ہوں کہ وہ ہر عمر اور ہر دور کے شاعر ہیں کیونکہ وہ محبت کرتے تھے، محبت لکھتے تھے۔

ے قربت بھی نہیں دل سے اتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا

آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتیں لہو سے
اور زخمِ جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

وہ راحتِ جاں ہے مگر اس دربدری میں
ایسا ہے کہ اب دھیان اُدھر بھی نہیں جاتا

ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

دل کو تری چاہت پہ بھروسا بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

پاگل ہوئے جاتے ہو فراز اس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا

بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کے لفظ بولتے ہوئے محسوس ہوں۔ فرحت عباس شاہ ایسے ہی ایک شاعر جن کے لفظ گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی غزل کا ایک شعر۔

ے وہ جو سہتا رہا رت جگوں کی سزا چاند کی چاہ میں
مر گیا جب تو نوحہ کناں تھے شجر، چاند خاموش تھا

* * *

نوشی گیلانی، رنگوں اور تتلیوں سے کھیلنے والی دل نشین شاعرہ، جس کے لفظوں میں اس کے خوش رنگ جذبات کی مہک ہے۔ ان کی یہ نظم سب لڑکیوں کے نام۔

وقت کی تیز ہوا میں مولا
منزل کی خوشبو کے جنوں میں
یہ گمنام سی تتلی آخر
اُڑتے اُڑتے تھک جائے گی
اسے اُڑان کی خو نہ دیجے
یا اس کے پروں کی خوش رنگینی کو واپس لے لے
خیر ہو مولا
کہیں پہ کسی نگاہ
کی میلی بارش
روپ کے آنچل کو
رنگوں سے محروم نہ کر دے

اور اب کچھ انتخاب چند مشہور شعراء کے کلام سے

ے سنتے ہیں اپنے ہی تھے گھر لوٹنے والے
اچھا ہوا میں نے یہ تماشا نہیں دیکھا
یہ شہرِ صداقت بھی عجب شہر ہے شبنم
میں نے یہاں ایک شخص بھی سچا نہیں دیکھا
(شبنم شکیل)

ے لفظوں کی آبرو کو گنواؤ نہ یوں عدیم
جو مانتا نہیں اسے کہنا فضول ہے
(عدیم ہاشمی)

ے اسے زہریلی خوشبوؤں کے رنگین ہار دیتا ہوں
میں جس سے پیار کرتا ہوں، اسی کو مار دیتا ہوں
(منیر نیازی)

ے رات کی رانی کا جھونکا تھا کسی کی یاد تھی
دیر تک آنگن مرے احساس کا مہکا رہا
تیز رو چلتے ہیں ساغر قافلے اس نام سے
رہنماؤں سے ہمیشہ راہزن اچھا رہا!
(ساغر صدیقی)

پروین شاکر کی ایک غزل کے یہ چند اشعار تمام قارئین بہنوں کے نام۔

ے کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی
ذرا غور کیجیے گا۔

ے بات وہ آدھی رات کی، رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا اس پہ ترا جمال بھی

ہماری نئی نسل بھی کسی سے کم نہیں۔ نئی نسل کے چند شعراء کے کلام سے انتخاب آپ کی نذر۔

ے جب تلک میں اسے انجام نہیں دے سکتا
اس کہانی کو کوئی نام نہیں دے سکتا
پا نہیں سکتا وہ آرام کسی بھی صورت
جو کسی اور کو آرام نہیں دے سکتا
(نوشیرواں عادل)

ے خوابوں کی راکھ آنکھوں میں اپنے سجائے کون
اپنے نفس کو آپ ہی ایسے جلائے کون
تقدیر کا میں سامنا کیسے کروں بتا
لکھا ہے جو بھی ہاتھ میں اس کو مٹائے کون
(رقیہ کاظمی)

اور اب ایک معصوم سی شاعرہ کا پیارا سا دل بھاتا انتخاب۔ "رابعہ بصری" نام کی طرح دلکش شخصیت کی مالک ہیں۔ ان کی ایک نظم آپ سب بہنوں کے نام۔

مجھے اپنے لفظوں سے محبت ہے،

لوگ میرے لفظوں کو موتی سے تشبیہہ دیتے ہیں

وہ کہتے ہیں
آپ کے لفظ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں
آپ کی شاعری ہم اپنے پیاروں کو لکھ کر بھجواتے ہیں
انہیں اپنی چاہت کا احساس دلاتے ہیں
اور یوں کہ پھر وہ ہمارے ہی ہو جاتے ہیں
آپ کے لفظ ہمارے لیے روشنی ہیں
زندگی ہیں
انہیں کیا بتاؤں
مجھے اپنے لفظوں سے کتنی شکایت ہے
یہ اس وقت چپ ہو گئے تھے
جب انہیں بولنا تھا

میٹرک میں ہمارے فزکس کے ایک ٹیچر تھے "سر توکل" مضمون پڑھاتے تو وہ فزکس تھے مگر ادب سے خاصا لگاؤ تھا۔ خود بھی شاعر تھے۔ ان کے چند اشعار آپ کی نذر۔

ے میں زندہ تھا گزرتے موسموں میں
ہوا کب دفن، مجھ کو کیا پتا ہے
مجھے کب چین آئے گا خبر کیا
یہ دل بجھتا نہیں، ایسا جلا ہے

یہ تو تھا میرا انتخاب۔ امید کرتی ہوں کہ کچھ نہ کچھ ضرور پسند آیا ہوگا۔ آخر میں کچھ اپنے متعلق بتاتی چلوں میرا نام سحرش یوسف ہے۔ کھلابٹ ٹاؤن شپ، ہری پور ہزارہ کی رہائشی ہوں۔ ایف ایس سی میں ہری انجینئرنگ کی طالبہ ہوں اور آج کل فراغت کے باعث مطالعے کا شوق پورا کر رہی ہوں۔

نوال افضل گھمن ــــــ گجرات
تمہاری جیت سے زیادہ
ہماری ہار کا چرچا ہوا ہے

سعدیہ تنویر ــــــ فیصل آباد
زندگی اس کے تصور میں کٹی
دور وہ کر بھی وہی کام آیا

رضوانہ شکیل راؤ ــــــ لودھراں
اپنی رحمت کے خزانوں سے عطا کر مالک
خواب اوقات میں رہ کر نہیں دیکھے جاتے

اقصیٰ، عذرا ناصر ــــــ کراچی
سکون اور عشق وہ بھی دونوں ایک ساتھ
رہنے دو محسن کوئی عقل والی بات کرو

سعدیہ نازلی ــــــ کسووال
کوئی فلسفہ نہیں عشق کا، جہاں دل جھکے وہیں سر جھکا
وہیں زانو موڑ کے بیٹھ جا، نہ کوئی سوال و جواب کر

سدرہ داؤد ــــــ ٹھٹھہ کالونی
کشتی بھی نہ بدلی، دریا بھی نہ بدلا
اور ڈوبنے والوں کا جذبہ بھی نہ بدلا
ہے شوقِ سفر ایسا اک عمر سے یارو
پیار بھی نہیں پایا اور رستہ بھی نہیں بدلا

صائمہ سلیم ــــــ کراچی
تمہیں بھی ہم سے محبت ہو ضروری تو نہیں
عشق ہی عشق کی قیمت ہو، ضروری تو نہیں
دوستی تم سے لازم ہے مگر اس کے لیے
ساری دنیا سے عداوت ہو ضروری تو نہیں

نعمانہ بٹ ــــــ لاہور
کتنا پُرلطف لگتا تھا تیرا ساتھ مگر
بعد جدائی کے جو نقصان ہوا خوب ہوا

عفت جبیں ــــــ فیصل آباد
تاریخ کی عادت ہے بدل لیتی ہے آنکھیں
کل گر اسی تاریخ نے سچ بول دیا تو
حالات سے مجبور ہوں، وعدہ نہیں کرتا
میں لوٹ کے آؤں گا اگر وقت ملا تو

صائمہ جبیں ــــــ کراچی
یاد ہے میں کیا تھا، پر اب جانے کیا ہو گیا
آئینے میں شکل دیکھے زمانہ ہو گیا
ختم ہوئی ڈائری، گرتے ہوئے پتے
آ گیا ماہِ دسمبر، سال بوڑھا ہو گیا

اقرأ اکرم، سائرہ مختار ــــــ سیالکوٹ
تیری خبر کہاں رکھیں کہ ان دنوں ہم
خود اپنے آپ سے بھی رابطہ نہیں رکھتے

ارم کمال ــــــ فیصل آباد
لوگ ٹکرا کے در و بام سے مرتے نہ اگر
دیکھ لیتے کہیں وہ تیری سمندر آنکھیں
یہ شرارت بھرا لہجہ تو میری عادت ہے
تو ہر ایک بات پہ یوں نم نہ کیا کر آنکھیں

عابدہ نشاں ــــــ کراچی
کٹ ہی گئی جدائی بھی کب یوں ہوا کہ مر گئے
تیرے بھی دن گزر گئے میرے بھی دن گزر گئے
وہ بھی غبارِ خاک تھا ہم بھی غبارِ خاک تھے
وہ بھی کہیں بکھر گیا ہم بھی کہیں بکھر گئے

طاہرہ ملک ــــــ پسرور
ترستے تھے جو ہمیں ملنے کو کبھی
نجانے آج کیوں وہ میرے سائے سے بھی کتراتے ہیں
ہم بھی وہی ہیں دل بھی وہی ہے
نجانے کیوں لوگ بدل جاتے ہیں

مہک علی ______ لاہور

کون کہتا ہے نفرتوں میں درد ہے محسن
کچھ محبتیں بھی بڑی اذیت ناک ہوتی ہیں

آفرین کرن ______ کراچی

ہزاروں خواہشیں دل کے نہاں خانوں میں بستی ہیں
یہ آباد قصبے بھلا کب ویران رہتے ہیں
بلا کی افراتفری ہے اس جہان میں
کہ ہم اس بے دھیانی میں بھی تیرے دھیان میں رہتے ہیں

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

اس دور بے رخی میں اس قدر پاس وفا
بس یہی اک کام تھا جو ہم غلط کرتے رہے

مریم سائرہ منیر ______ شرقپور شریف

دسمبر جب بھی لوٹتا ہے میرے خاموش کمرے میں
میرے بستر پر بکھری کتابیں بھیگ جاتی ہیں

حنا سلیم اعوان ______ آخون بانڈی

نکتہ چیں ہے، غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو، مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ، بن آئے نہ بنے

توشین اقبال نوشی ______ گاؤں بدو مرجان

تیرے آنے کی امید بھی ہو چلی معدوم
نئے برس کا اہتمام ہے دسمبر آن پہنچا ہے
خنک رت میں تنہائی بھی چوکھٹ پر کھڑی ہے
جاڑے کی اداس شام ہے، دسمبر آن پہنچا ہے

رابعہ منیر ______ گوجرانوالہ

اداس راتوں میں تیز کافی کی تلخیوں میں
وہ کچھ زیادہ ہی یاد آتا ہے سردیوں میں

ناہید آفتاب ______ گلاسکو

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

نمرہ، اقرا ______ کراچی

کتنا اختیار تھا اسے اپنی چاہت پر
جب چاہا یاد کیا جب چاہا بھلا دیا
بہت اچھے سے جانتا ہے وہ مجھے بہلانے کے طریقے
جب چاہا ہنسا دیا جب چاہا رلا دیا

اسماء خان ______ کیماڑی

یہ جو رفاقتوں کی خواہشوں میں دل منتظر ہے پڑا ہوا
اسے کیا خبر کہ جدائیوں کے عذاب کتنے شدید ہیں

شبانہ عابد ______ بہاولپور

میں تو آج بھی تنہا ہوں کل کی طرح محسن
ساری کائنات تو اس کے ساتھ ہوتی جا رہی ہے

سعدیہ تنویر ______ فیصل آباد

طے کیا ہے تو کر ہی جانا ہے
دل نے حد سے گزر ہی جانا ہے
ایسا کرتے ہیں، تم پہ مرتے ہیں
ہم نے یوں بھی تو مر ہی جانا ہے

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات

پھر تو نے چھیڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

بشریٰ باجوہ ______ اوکاڑہ

میرے لفظوں پہ حاوی ہے تمہارے ہجر کا موسم
میری غزلیں، میری نظمیں، میرے اشعار روتے ہیں
دسمبر کی حسیں شامیں زمیں پر جب اترتی ہیں
میرے چھوٹے سے کمرے میں تیرے اقرار روتے ہیں

اینقہ انا ______ چکوال

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

صبا طارق ______ گوجرانوالہ

مجھے کیوں عزیز تر ہے یہ دھواں دھواں سا موسم
یہ ہوائے شام ہجراں مجھے راس ہے تو کیوں ہے
میں اجڑ کے بھی ہوں تیرا، تو بچھڑ کے بھی ہے میرا
یہ یقین ہے تو کیوں ہے یہ قیاس ہے تو کیوں ہے

ارم کمال ______ فیصل آباد

کیا کہیں کیسے وہ تنہائی کے موسم تھے کہ جو
تم سے جھیلے نہ گئے، ہم سے گزارے نہ گئے
اک اچٹتی سی نظر چاند پہ ڈالی تھی ندیم
آج تک آنکھ کی دہلیز سے تارے نہ گئے

تبصیر نشاط

خوشی کا سماں

شادی محض ایک فریضہ ہی نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی بازی ہے جسے کھیلنے والا تمام عمر کھیلتا ہی رہتا ہے اور یہ تمام عمر ختم نہیں ہوتی، تاوقت یہ کہ اسے کھیلنے والے فریقین میں سے دونوں فریقین ایک دوسرے سے یا کوئی ایک فریق دوسرے سے وفا نہ کرے یا پھر اس کی عمر وفا نہ کرے۔ تاہم بعض افراد یہ بازی کھیلنے سے پہلے ایک اور بازی کھیلتے ہیں جسے عرف عام میں "عشق کی بازی" کہا جاتا ہے..... اور خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ، جو یہ بازی جیت لیتے ہیں۔ (اور جو جیت کر بھی بد قسمت ہوں، اس کا پتا شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی چلتا ہے۔)

معروف اداکارہ فاطمہ آفندی اور کنور ارسلان کا شمار ایسے ہی خوش قسمت افراد میں ہوتا ہے کہ دونوں عشق کی بازی جیت کر اب شادی کی بازی کھیل رہے ہیں۔ دونوں نے پہلی مرتبہ ایک ساتھ ڈراما سیریل "لڑکیاں محلے کی" میں کام کیا تھا۔ تب کنور ارسلان نے سوچا کہ محلے کی اس لڑکی کو کیوں نہ اپنے گھر لے آؤں۔ یوں دونوں کی منگنی ہو گئی۔ گزشتہ دنوں اس منگنی کو بھی اپنا کنارا مل گیا۔

ماضی میں اکثر لوگ کنفیوز رہتے تھے کہ شادی کی بازی کھیلنے والے فریقین کا تعلق ایک ہی میدان سے ہو تو زیادہ بہتر رہتا ہے یا مخالف میدان سے..... مگر جناب! آج کی نسل خاص طور پر فنکاروں نے یہ معمہ شاید حل کر لیا ہے، جب ہی تو کئی فنکار آپس میں دھڑا دھڑ شادیاں کر رہے ہیں۔ سائرہ یوسف اور شہروز سبزواری کے بعد یہ دوسری نمایاں شادی ہے۔

فاطمہ آفندی اور کنور ارسلان بے حد خوش ہیں۔ ہم سب کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں کہ یہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح خوش و خرم رہیں اور ہمیں کبھی یہ سننے کو نہ ملے کہ کاش! میں تیری بیوی نہ ہوتی۔

محبت

مرزا غالب نے کہا تھا کہ
"عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے"

غالب کا یہ شعر اور لوگوں پر صادق آتا ہو یا نہیں، اپنے شعیب ملک پر خوب فٹ بیٹھتا ہے۔ بلکہ وہ تو اس

کی عملی تفسیر اور چلتی پھرتی تصویر ہی بن کے رہ گئے ہیں۔ کرکٹ سے ان کی محبت باقی رہی ہو یا نہیں' ثانیہ مرزا سے ان کی محبت خوب زوروں پر ہے۔ ثانیہ مرزا کے عشق کا جادو ان کے سر پر چڑھ کر کیا بولا' وہ اپنے پرانے عشق کرکٹ کو یکسر فراموش ہی کر بیٹھے۔ شادی کے بعد انہوں نے جب جب بھی کرکٹ کھیلا' یہ ہی محسوس ہوا ہے' گویا دل لگی کر رہے ہوں۔ شعیب ملک کا کہنا ہے کہ ثانیہ سے شادی کو ڈھائی برس بیت گئے' مگر ہماری محبت ابھی تک جوان ہے۔ میں بہترین لائف پارٹنر کی حیثیت سے محض ثانیہ کی زندگی کے دیگر معاملات پر ہی نہیں' بلکہ ثانیہ کے ٹینس کیریر پر بھی توجہ دیتا ہوں۔ (کاش! تھوڑی توجہ اپنے کھیل پر بھی دے دیا کریں۔)

شعیب کی خواہش ہے کہ ثانیہ ابھی مزید ٹینس کھیلیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ ثانیہ جب تک دل چاہے' کھیلتی رہیں۔ وہ ٹینس سے اپنا رشتہ برقرار رکھیں۔ (اور ہاں! آپ سے اور اس ملک سے بھی) شعیب ملک نے کہا کہ ہم بے حد مصروف رہتے ہیں' مگر جب بھی موقع ملتا ہے' ہم کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وقت ساتھ گزاریں..... شادی کے ڈھائی برس بعد بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ثانیہ میری بیوی نہیں' بلکہ گرل فرینڈ ہوں۔ ثانیہ بھی مجھے اپنا بوائے فرینڈ ہی سمجھتی ہیں۔

(صحیح بات ہے' شادی کے بعد ڈھنگ سے شادی شدہ زندگی نہ گزاری جائے تو بندہ خود کو غیر شادی شدہ ہی لگتا ہے۔)

ڈراما

ڈراما نگاری بہت بڑا فن ہے۔ اردو ادب میں سب سے بڑا ڈراما نگار آغا حشر کو سمجھا جاتا ہے۔ اردو ادب کے اکثر ناقدین اس پر متفق بھی ہیں۔ لیکن جناب! یہ تو ماضی کی بات تھی۔ آج کے ناقدین شاید اس پر کوئی اختلافی پہلو بھی رکھتے ہوں کہ آج بڑے بڑے ماہر ڈراما نگار سامنے آگئے ہیں اور وہ اپنے فن میں اتنے طاق ہیں کہ "فی البدیہہ ڈرامے" بھی تیار کر لیتے ہیں۔ آپ یقیناً "حیران ہوں گے' کیونکہ اب تک آپ نے "فی البدیہہ" کی اصطلاح شاعری اور تقریری مقابلوں ہی میں سنی ہوگی۔ لیکن جناب! یہ اپنے فن میں اتنے ماہر ہیں کہ انہیں دیکھ کر یہ اصطلاح ڈراما نگاری میں بھی رائج کرنا پڑی۔ ہماری بعض اداکاراؤں کا شمار ایسے ہی ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے۔ ڈراما نگاری کا فن انہیں اتنا بے چین رکھتا ہے کہ وہ آف دی کیمرہ بھی اکثر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں اور چونکہ یہ اداکارہ بھی ہیں تو اپنے بنائے ہوئے ڈراموں پر اداکاری بھی خود ہی کرتی ہیں۔ آن دی کیمرہ ڈراموں میں بے شک اوسط درجے

کی اداکاری کرتی ہوں' مگر آف دی کیمرہ ڈراموں میں ان کی اداکاری بے حد عروج پر ہوتی ہے۔

اداکارہ لیلیٰ بھی ایک اوسط درجے کی اداکارہ ہیں۔ آن دی کیمرہ تو یہ فلموں میں کام کرتی ہیں (اگر کام مل جائے تو.....) تاہم آف دی کیمرہ یہ اکثر ڈراموں میں فن اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہتی ہیں۔ ابھی چند دن پہلے ہی کی بات ہے۔ ہماری سینیٹ کے قائد ایوان جہانگیر بدر کو ایک ریسٹورنٹ کا افتتاح کرنا تھا۔ لیلیٰ تقریب میں مدعو نہیں تھیں' مگر پھر بھی پہنچ گئیں۔ آداب مہمانی نبھاتے ہوئے جہانگیر بدر سے ملیں تو مصافحہ کے لیے ہاتھ بھی بڑھا دیا' مگر قائد ایوان شاید بن بلائے مہمانوں سے مصافحہ کرنا پسند نہیں کرتے' سو انہوں نے لیلیٰ کا ہاتھ اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے اپنے بیٹے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لیلیٰ ان کی اس حرکت پر اتنی چراغ پا ہوئیں کہ انہوں نے اسی وقت انتقاماً" صحافیوں کے سامنے ایک بیان داغ دیا کہ جہانگیر بدر انہیں اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اس سے پہلے میرا کے گھر پر ہونے والی ملاقات میں بھی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔

یہ بیان دیتے وقت لیلیٰ کے ہمراہ میرا کی والدہ شفقت بیگم بھی موجود تھیں۔ میرا نہیں تھیں' تاہم جب ان تک یہ خبر پہنچی تو انہیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر جہانگیر بدر کو دباؤ میں آکر لیلیٰ کو واقعی بہو بنانا پڑ گیا تو لیلیٰ کا یہ ڈراما صرف کامیاب ہی نہیں' بلکہ بلاک بسٹر کامیاب ٹھہرے گا۔ سو میرا اور ان کی والدہ نے اگلے دن ہی لیلیٰ کے بیان کو جھوٹ قرار دے دیا۔

(انتقامی بیان میں بہو بنانے کی خواہش کا دعوا.....؟ مگر جناب! یہ درست بھی ہے کہ بعض بہوویں اپنے سسرال میں انتقاماً" آئی ہوتی یا کوئی بھیانک سزا ہی لگتی ہیں..... ویسے اس سب میں لیلیٰ کا بھی اتنا قصور نہیں ہے کہ قائد ایوان نے سب کے سامنے ہی لیلیٰ کا ہاتھ اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دیا ہے..... اور کسی خاتون کا ہاتھ کسی مرد کے ہاتھ میں دینے کا مطلب تو آج کل بچہ بچہ بھی جانتا ہے۔)

یہ بیان کا لمانہ

ایک تخت نما کرسی پر بال ٹھا کرے بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی طرف دو نشستی صوفہ تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ اس نے گہرے شیشوں میں چھپی آنکھوں سے میرا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سچی بات ہے کہ میں ہنسی روکنے کی کوششوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس لمبے قد کے آدمی نے بہت تیز زعفرانی رنگ کی دھوتی اور کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کے گلے میں مالائیں تھیں اور تیز خوش بو نے سانس لینا مشکل بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو اس پر میک اپ کی تہیں نظر آئیں۔ یوں لگا جیسے خواجہ سراؤں کے کسی ادھیڑ عمر "گرو" کے ہاں آگیا ہوں۔

(نصرت جاوید..... برملا)

کراچی میں قاتل آزاد ہے اور محافظ قید۔ محافظ اتنے مفلوج کہ آج تک ایک دہشت گرد کو' ایک بھتہ خور کو ایک ٹارگٹ کلر کو سزا نہیں دی جا سکی۔ مظلوموں کا کوئی والی وارث ہے ہی نہیں۔ جس طرح کراچی میں لوگوں کو مارا جا رہا ہے' اس انداز کا ظلم تو غیر بھی نہیں کرتے۔ جس شہر میں ٹارگٹ کلرز اور بھتہ خور تھانوں کے ایس ایچ اوز خود منتخب کریں' وہاں کوئی کیسے پکڑا جا سکتا ہے۔ ان جلتے ہوئے شہروں میں فوج بھیج دی جائے؟ اگر ہاں تو پھر پی پی' ایم کیو ایم اور اے این پی کا کیا فائدہ؟

(ایاز رانا..... پریشر گروپ)

جنرل کیانی سے التماس ہے کہ وہ غلط کاریوں میں ملوث سابق فوجیوں کے تحفظ کو ہرگز اپنے فرائض منصبی کا حصہ نہ بنائیں۔

(عرفان صدیقی..... نقش خیال)

☆

خط کے

رضیہ جمیل

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔

آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وہ لوگ جو دہشت گردی کر رہے ہیں، بے گناہ اور معصوم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں، ان کو کیفرِ کردار تک پہنچائے اور ہمیں ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ (آمین) اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف

راولپنڈی سے عفیفہ خیام ایک نئے اور دلچسپ تعارف کے ساتھ شریکِ محفل ہیں، لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو اس دفعہ "دیوارِ شب" کو نہ پا کر بہت دکھ ہوا۔ "جنت کے پتے" میں ایک لڑکی اپنے اللہ، اپنی آخرت کے لیے اتنی مشکلات، اتنی ذلت، حتیٰ کہ اپنے شوہر کی بھی غیر واضح بے اعتنائی کو کتنے صبر سے برداشت کر رہی ہے۔ جیسے جیسے اس دفعہ کی قسط پڑھتی گئی دل شرم سے پانی پانی ہوتا گیا۔

ہر ماہ کوئی نہ کوئی بہن اپنے اپنے علاقے کے تعارف کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، تو میرے دل میں بھی خیال گزرا کہ کیوں نہ میں بھی اپنی "رحمانیہ منزل" کا تعارف کرواؤں۔ "رحمانیہ منزل" نہ شہر ہے، نہ گاؤں، نہ قصبہ بلکہ امن اور خوشیوں کا گہوارہ ہمارا آبائی گھر تھا۔ جسے ہمارے دادا جان نے 1962ء میں بہت چاہتوں و ارمانوں کے ساتھ بنایا تھا۔ اس سال کے آغاز میں 30 جنوری کو ہمارا یہ آبائی گھر فروخت ہو گیا اور "رحمانیہ منزل" کے مکینوں کو یوں لگا کہ زندگی بس یہیں تک تھی، لیکن اللہ سے دعا ہے کہ "رحمانیہ منزل" کے مکین جہاں جہاں بھی جائیں ان کو یہاں سے زیادہ خوشیاں ملیں۔ (آمین)

یہاں میں اپنے میکے کی دو ایسی روایات کا ذکر کروں گی جو سب سے الگ، سب سے منفرد ہیں۔ "رحمانیہ منزل" میں لگ بھگ 50 افراد آباد ہیں۔ (ماشاءاللہ) (بہت بڑی اور کھلی عمارت ہے، ہر فیملی کے لیے دادا ابو نے الگ پورشن بنوایا تھا، سو جگہ کا کوئی مسئلہ نہیں رہا کبھی) سو "رحمانیہ منزل" ہمیشہ سے بہو، بیٹیوں سے آباد رہی، اس لیے کسی بھی تہوار پہ کوئی باہر سے آئے یا نہ آئے سب مل کر، اکٹھے ہو کر سب سے بڑے تایا ابو کے پورشن میں اکٹھے ہوتے اور بس.... رونق کا سماں یوں ہوتا جیسے دوسرے لوگوں کے ہاں شادی بیاہ اور دوسری تقریبات پہ بھی نہ ہوتا ہو گا۔

"رحمانیہ منزل" کے مکینوں میں رشتوں کا احترام ہے، اتفاق ہے، محبت ہے، بس دعا یہ ہے کہ اب جب ہم سب دور، دور جا رہے ہیں تو یہ محبتیں قائم رہیں کہ دوری تو دوری ہوتی ہے، چاہے دو گلیوں کی ہی کیوں نہ ہو، بس دلوں میں دوری کبھی نہ آئے۔

"رحمانیہ منزل" کی پہلی روایت جو کہ سنت بھی ہے، وہ یہ ہے کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے، آج تک کسی بڑے سے لے کر بچے تک سب کو جن میں عورتیں بھی شامل ہیں، عید کی نماز چھوڑتے نہیں دیکھا، ہر عید پر عید کی نماز کے اوقات میں چاہے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو یا سخت گرمی نے جان نکالی ہو "رحمانیہ منزل" کے باہر بڑا سا تالا لگا ہوتا تھا اور اندر سے بالکل خالی.... اور جیسے ہی عید کی نماز ختم ہوتی "رحمانیہ منزل" میں واپسی کا سفر شروع اور جیسے جیسے سب مکین پہنچتے اور سب سے بڑے تایا ابو کے پورشن میں اکٹھا ہوتے تو یوں لگتا جیسے سارے جہان کی رونقیں یہیں اتر آئی ہیں اور میری بھابھیاں اللہ ان کو اجر دے، فٹافٹ لمبے لمبے دسترخوان بچھا دیتی ہیں۔ (یہ بھی رحمانیہ منزل ــــ کی روایت ہے کہ ہمیشہ سنت کے مطابق زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاتا ہے۔) اور عید والے دن دسترخوان کی شان سادہ ابلے چاولوں اور دہی بڑوں کی وجہ سے الگ ہی ہوتی ہے۔

جی ہاں جناب یہ ہے "رحمانیہ منزل" کی دوسری سب سے منفرد روایت، جس کا ذکر میں بہت فخر سے کروں گی، میری دادی اماں ہر عید پر صبح ناشتے میں سادہ چاول اور دہی بڑے لازمی بنواتی تھیں، چاہے ساتھ جو مرضی پکوان ہوں، ان میں ردوبدل ہو سکتا تھا اور ہے، لیکن ابلے چاول اور دہی بڑے لازمی بنتے ہیں۔ (چونک گئے نا آپ کہ یہ کیسا ناشتا ہے اور وہ بھی عید کے دن، تو جناب جس کو عجیب لگتا ہے لگے، ہمیں تو چھوٹی عید ہو یا بڑی ان دو چیزوں کے بغیر عید عید ہی نہیں لگتی۔ دادی اماں کے بعد ان کی چاروں بہوؤں اور پھر بہوؤں کی بہوؤں نے بھی آج تک اس روایت کا بڑی چاہت سے اہتمام کیا ہے جو کہ رحمانیہ منزل سے جانے کے بعد سب کے الگ الگ ہونے کے بعد بھی اسی طرح قائم و دائم رہنی ہے (ان شاءاللہ) جیسے آپ لوگوں کو میرے میکے کی یہ روایت عجیب لگ رہی ہے، ایسے ہی جب میری کوئی بھابھی شادی ہو کر "رحمانیہ منزل" آتی تھی تو وہ بھی یہ سوال کرتی تھی کہ آپ لوگ صبح صبح یہ سب کیسے کھاتے ہو اور اب یہ حال ہے کہ ان کو بھی ان دو چیزوں کے بغیر عید، عید ہی نہیں لگتی اور "رحمانیہ منزل" کی بیٹیوں کو جب شادیوں کے بعد عید والے دن بھی روایتی ناشتے کرنے پڑتے ہیں اور ان کی ترسی نگاہیں دہی بڑے اور ابلے چاولوں کو ڈھونڈتی ہیں تو یقین کریں، آپ لوگ کیا کوئی بھی "رحمانیہ منزل" کی بیٹیوں کے اس درد کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

اکثر لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں کہ عید والے دن وہ بھی صبح صبح تم لوگ یہ کیسے کھاتے ہو تو ہم سب ان لوگوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ عید والے دن بھی تم لوگ وہی ناشتے کیسے کرتے ہو جو سارا سال کرتے ہو؟

بھئی عید والے دن تو کچھ ایسا ہو جو سارا سال ناشتے میں نہ کھایا ہو، کوئی ایسی روایت، کوئی ایسی چیز جس کی یاد صرف عید سے وابستہ ہو۔ یہ نہیں ہے کہ اور کچھ نہیں بنتا اور بھی بہت بہت کچھ بنتا ہے۔ لذیذ اور مزے دار، لیکن ان میں ردوبدل ہو سکتا ہے، ان دو چیزوں میں نہیں۔

اس دفعہ کی بڑی عید اس طرح اکٹھے "رحمانیہ منزل" میں آخری عید تھی کہ دسمبر میں ان سب نے اپنے اگلے آشیانوں کی طرف روانہ ہو جانا ہے، اس لیے عید کو گزرے اتنے دن ہونے کے باوجود دسمبر جیسے جیسے قریب آ رہا ہے دل بہت اداس ہے، تو تھوڑا بڑا کرنا پڑتا ہے، پھر دیکھیں خون میں کیسے سرخی ملاتی ہے۔ آخر میں آپ سے 2 سوال کرنے ہیں کہ خواتین اور شعاع میں جو دو صفحات شاعری کے لیے مخصوص ہیں کیا ان میں ہر کوئی شرکت کر سکتا ہے؟ اور دوسرا سوال کہ کیا خط کو عام انداز مطلب لائن اور صفحہ کی دوسری طرف چھوڑے بغیر بھی لکھا جا سکتا ہے؟

ج پیاری عفیفہ! رحمانیہ منزل کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا۔ نسل در نسل اس طرح پیار، محبت سے رہنا اور احترام اور چاہت کے ساتھ اچھی روایت کو قائم رکھنا واقعی بہت کم نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے گھروں میں اب بھی محبت کی یہ روایات قائم ہیں۔

شاعری کے سلسلے میں ہر کوئی شرکت کر سکتا ہے، لیکن خط آپ لائن چھوڑ کر صفحے کے ایک جانب ہی لکھیں۔

دوسرا خط سرگودھا سے ملکہ مہرناز کا ہے۔ لکھتی ہیں

سرورق مجھے کچھ خاص نہ لگا، لیکن پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں پڑھ کر تو میرے تن بدن میں سنسنی سی پھیل گئی، ان باتوں سے ہمیں بہت کچھ حاصل ہوتا ہے، جیسے کہ علم میں اضافہ، اس پر عمل کی کوشش اور اچھی سوچ۔ "دیوارِ شب" کو نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ سعدیہ رمیس کی "چھری تلے" عام سی لگی، پڑھ کر مزا نہیں آیا۔

مہوش مغل نے "دل ہے کہ مانتا نہیں" میں پتا نہیں کیا بتانے کی کوشش کی۔ انا اور محبت کی کہانی عجیب تھی۔ پورے ڈائجسٹ میں جس ناول کو پڑھ کر مزا آیا' وہ سائرہ رضا کا "وہ پہلی بار جب ہم ملے" تھا۔ سب سے دلچسپ کریکٹر نوال کا تھا۔ ویسے ہیرو صاحب کا نام کچھ مشکل لگا۔ اخفش' اتنا پیچیدہ نام جس کو بولتے ہوئے زبان بھی اجنبی سا محسوس کرے۔ آگے سے ان کے چچا کا نام بھی اتنا غیر مانوس اخطب۔ خیر جب آپ اتنے مشکل نام استعمال کریں تو ان کے معنی و مطلب بھی بتادیا کریں' تاکہ اگر کوئی وہ نام رکھنا چاہے تو ان کو پریشانی نہ ہو اور اس ناول کے سلسلے کی اگلی قسط کی میں شدت سے منتظر ہوں۔ کب آئے گی؟ نمرہ احمد کے "جنت کے پتے" کی کیا بات ہے۔ جس طرح حیا نے بزنس کو سنبھالا ہے وہ اس کے ذہین میں ہونے پر مہر ثبت کرتا ہے۔ "میرے سنگ سنگ دھنک" ایک اچھی ہلکی پھلکی اسٹوری تھی۔ اس ماہ کی مسکراہٹیں ساری مسکرانے والی ہی تھیں۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" کافی تاریخی معلومات ملیں۔

ج پیاری ملکہ! ہمیں افسوس ہے کہ فروری کے بعد آپ کا کوئی خط شامل اشاعت نہ ہوسکا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں آپ کا کوئی خط موصول ہی نہیں ہوا' یہ تو ممکن ہے کہ کسی ایک ماہ کوئی خط شامل نہ ہوسکے' لیکن بار بار ایسا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ آپ نے ایڈریس صحیح نہ لکھا ہو یا کوئی اور وجہ ہو۔ اخفش نام واقعی مشکل تھا اور اخطب بھی آسان نام نہیں۔ آپ نے خود ہی لکھا ہے کہ اتنے پیچیدہ نام جن کو بولتے ہوئے زبان بھی اجنبی سا محسوس کرے اس لیے ان مشکل ناموں کو کون رکھنا پسند کرے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے' آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

حلیمہ سعدیہ' فیصل آباد سے لکھتی ہیں

عرصہ سات سال بعد شعاع کی محفل میں پھر سے حاضر ہوں۔ 2005ء میں ابو کی وفات کے بعد میں سخت بیمار ہوگئی' پھر کبھی لکھنے کی طرف دھیان ہی نہ گیا۔ شعاع پڑھنے بیٹھے تو حروف نے پہچان ہی کھودی۔ خوب صورت موسموں کو محسوس کرنا چاہا تو سوائے گرد و غبار کے کچھ دکھائی نہ پڑا۔ ہر انسان کی زندگی میں کچھ ٹرننگ پوائنٹ ہوتے ہیں۔ میری زندگی میں یہ لمحہ میرے ابو کے جانے سے آیا اور یہی حقیقت ہمیں آئینہ دکھاتی ہے۔ ہماری بے بسی کا اور اس کی بادشاہی کا۔ بے شک ہر شے کو فنا ہے اور باقی رہنے والی ذات رب ذوالجلال کی ہے۔

پہلے مصحف اور اب "جنت کے پتے" واہ نمرہ جی کمال کردیا۔ ہر خندق کھودنے کے بعد بنو قریظہ سے واسطہ تو پڑتا ہی ہے۔ آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" میں لگتا ہے ماوی اپنی والدہ کی بے وقوفی کا شکار ہوچکی ہے۔ اب فیضان ماما کے بدترین خدشات درست ثابت ہوتے نظر آرہے ہیں۔ مہوش مغل کا "دل ہے کہ مانتا نہیں" بس ٹھیک لگا۔ واہ صبا جی آپ نے تو محفل لوٹ لی۔ مجھے اپنی ہنسی پہ قابو پانا دشوار ہوا جارہا تھا۔

افسانے سو' سو ہی تھے۔ سدرہ سحر کا "من شرالو سواس" پازیٹو رہنے کا سبق دیتے ہوئے بہتر رہا۔

آپی آپ نے انیقہ انا کو بتایا کہ نمرہ کے ناول میں بہارے 9 سال کی ہے۔ تو وہ پھر اتنی بڑی بڑی باتیں کیسے کرلیتی ہے۔

"تاریخ کے جھروکوں سے" صرف امت الصبور ہی جھانک سکتی ہیں یا ہم بھی یہ گستاخی کرسکتے ہیں؟ اور شاعری سچ بولتی ہے کیا ختم ہوگیا؟

ج پیاری حلیمہ! زندگی کا اصل امتحان اسی وقت ہوتا ہے جب قدرت ہم سے کوئی نعمت واپس لے لیتی ہے۔ اس وقت ہمت و حوصلہ سے کام لینا ہوش و حواس برقرار اور خود کو سنبھالنا در حقیقت ہماری شخصیت کی پہچان ہوتا ہے۔ والد صاحب کی وفات بہت بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے۔ (آمین)

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاعری سچ بولتی ہے کا سلسلہ ختم نہیں کیا' آپ اپنا انتخاب بھجوادیں۔ آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے' یقیناً" آپ کا انتخاب بھی اچھا ہوگا۔

عفت جبیں' فیصل آباد سے لکھتی ہیں

عرصہ ہوگیا آپ کی محفل میں شرکت کیے۔ اس دوران بہت سے ایسے ناول پڑھے جنہیں پڑھ کر دل اش اش کر اٹھا۔ ستمبر میں شائع ہونے والا سائرہ رضا کا مکمل ناول "دل موم کا دیا" اف کیا ناول تھا۔ اس میں الفت کا کردار جس خوب صورتی سے لکھا گیا ہے' بے حد الجھا ہوا کردار' جس کو صرف اپنا آپ عزیز تھا اور اس کا بدترین انجام ویل ڈن سائرہ جی اور ہاں ٹائٹل تو بے حد پیارا تھا اور اب نومبر کے شمارے کی بات ہوجائے۔ اس میں بھی سائرہ رضا نے زبردست لکھا۔ لیکن الگ اسٹائل میں۔ اس میں نوال کا کردار دل کو بے حد بھایا۔ ناول پڑھتے ہوئے کئی بار ہنسی آئی۔ مہوش مغل نئی لکھنے والی ہیں' لیکن اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن صبا سحر کا ناولٹ بازی لے گیا۔ قسم سے ہنس ہنس کے برا حال ہوگیا۔ افسانوں میں سب سے اچھا افسانہ "نیت" لگا اور ہاں آپ سے ایک بات پوچھنی تھی کہ کیا سائرہ رضا نوال والے کردار کو لے کر آگے بھی ناول لکھیں گی۔

ج عفت! مصروفیت کی بات تو ٹھیک ہے کہ آپ وقت نہ نکال پائیں' لیکن یہ سوچ کر خط نہیں لکھا کہ جگہ نہیں ملے گی' یہ ٹھیک نہیں ہے' جگہ نہ ملتی ہم تک آپ کی رائے تو پہنچ جاتی۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ' آپ کا خیال صحیح ہے' سائرہ رضا اس سلسلہ کو آگے بڑھائیں گی اور نوال کے کردار کو لے کر آگے بھی ناول لکھیں گی۔

مسز عمار محبوب نے علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے لکھا ہے

تنقید نہیں کررہی ہوں' مگر ایک بات جو آج کل بہت زیادہ محسوس کررہی ہوں' وہ اپنی پرانی مصنفات کی غیر حاضری ہے۔ رفعت سراج' میمونہ خورشید علی' ماہا ملک' حمیرا راحت' ساجدہ حبیب اور تنزیلہ ریاض صاحبہ اچھی تحریر' ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے' جیسے کہ آج کل "کوہ گراں تھے ہم" اور "زمین کے آنسو" آخری بات امید ہے کہ آپ کو برا نہیں لگے گا' نئی مصنفین کو بہت زیادہ جگہ مت دیا کریں۔ آج میں برملا یہ کہہ سکتی ہوں کہ ان رسالوں نے میری زندگی بنانے میں' رشتوں کو نبھانے کا سلیقہ سکھانے میں' بچوں کی تربیت کرنے میں اور اپنے سے جڑے ہر رشتہ کا ادب و احترام خصوصاً" اپنے بزرگوں کی عزت و تکریم کرنے کا سلیقہ سکھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

ج پیاری عمارہ! ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے نکلنے والے پرچوں نے آپ کی شخصیت کو توازن عطا کیا اور زندگی برتنے کا سلیقہ سکھایا۔ در حقیقت پرچا ترتیب دیتے ہوئے ہمارے پیش نظر بھی صرف یہی مقصد ہوتا ہے اور آپ کے خطوط ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے۔ حوصلہ افزائی کے لیے شکریہ۔

پرانی مصنفات کی تحریریں ہم بھی پرچے کی زینت بنانا چاہتے ہیں' لیکن بہت سی مصنفات مصروفیات میں گھر کر لکھ نہیں پارہی ہیں' کچھ لکھنا چھوڑ چکی ہیں۔ کچھ ٹی وی چینلز کو پیاری ہوگئی ہیں۔ بہت سی نئی مصنفین بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ایک بات کا یقین دلادیں' تحریریں ہم صرف معیار دیکھ کر منتخب کرتے ہیں' خواہ کسی نے بھی لکھی ہوں۔

اسماء خان' کراچی سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے حسب معمول "جنت کے پتے" پڑھا' جہان کا کردار بے حد پسند ہے۔ نمرہ احمد کا یہ ناول بھلائے نہیں بھولے گا۔ "ستارہ شام" بھی اب کچھ ڈرامائی موڑ پر ہے اور "سنڈریلا" کی تو کیا ہی بات ہے' مگر ہر پل ہنساتے اس ناولٹ نے آنسو بہانے پر بھی مجبور کیا ہے۔ رومان کا کردار پسند ہے' مگر میشا کو مائر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ آخر سنڈریلا جو ہوئی اور سنڈریلا کو تو اس کے خوابوں کا شہزادہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ افسانوں میں "چھری تلے" اچھی کاوش تھی' باقی بھی ٹھیک تھے اور مکمل ناول بھی پسند آیا۔

ج اسماء! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی تحریریں قابل اشاعت نہیں۔ ابھی آپ کو بہت محنت کی ضرورت ہے۔ فی الحال صرف مطالعہ کریں۔

ام ایمان نے کوٹ چھٹہ ڈیرہ غازی خان سے لکھا ہے

پچھلے پندرہ سالوں سے شعاع' خواتین' کرن کا ساتھ ہے تو پہلی بار بڑی امید کے ساتھ قلم اٹھایا تھا کہ حوصلہ افزائی ہوگی۔ لیکن افسوس.... اب بڑی ہمت کے بعد دوسری مرتبہ قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے۔

ج ام ایمان! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اچھی تحریروں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ آپ میں صلاحیت ہے' لیکن لکھنے کا انداز ٹھیک نہیں ہے' ڈائریکٹ نصیحت اور تقریریں اثر نہیں رکھتیں۔ آپ کہانی کے

انداز میں لکھیں۔

کراچی سے گل ناز لکھتی ہیں

دلہن اچھی تھی، مگر مجھے میچنگ بالکل پسند نہ آئی۔ عالیہ بخاری کو نہ پا کر شدید مایوسی ہوئی۔ نمرہ احمد حسب معمول شروع میں گلیمر پن کا شکار لگ رہی تھیں۔ خدیجہ کے مرنے کے بعد کہانی نے رخ بدلا اور ہمارے خیالات بھی بدل ڈالے۔ خاص طور اس پر اس قسط کا آخری سین بہت اچھا تھا۔ مکمل ناول میں سائرہ رضا کا انداز برجستہ، شوخ جملے، مگر پلاٹ ڈگمگایا ہوا محسوس ہوا۔ ان کی گرفت کمزور تھی اس بار، کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ (سائرہ رضا، آپ کا "دل موم کا دیا" میری امی کو بے حد پسند آیا تھا۔)

ناولٹ میں مہوش مغل نے پرانے موضوع پر، پرانے ہی انداز سے لکھا۔ (معذرت کے ساتھ) یہ موضوع اب بالکل گھس چکا ہے۔ صبا سحر (یہ غالباً "نئی رائٹر ہیں) کا انداز بے حد دلچسپ تھا، اچھا لگا۔ افسانے تقریباً" سارے ہی اچھے تھے۔ سدرہ پلیز کوئی مکمل ناول لکھیں نا! "ستارہ شام" پڑھ کر دماغ الجھ سا گیا۔ سارے کردار پریشانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ "دستک نہ دو" پر آمنہ زریں کا تبصرہ البتہ زبردست تھا۔ راحت جبیں سے ریکویسٹ کہ سرد موسم کے لیے ایک گرم سا ناول عنایت فرمائیں اور رخسانہ، فارحہ اور فاخرہ آپ بھی لوٹ آئیں۔ "عشق ممنوع" سیریل کے اداکاروں کا انٹرویو اگر شائع کر سکیں تو؟ میں نے یہ کہانی دو سال قبل لکھی تھی، بھجوانے کی جرات اب کر رہی ہوں۔

ج گل ناز آپ کی کہانی پڑھ لی ہے، آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، انداز بیاں دلچسپ ہے کہانی البتہ کچھ کمزور لگی۔ آپ کسی بھی مہینہ کی پانچ تاریخ کو فون کر لیں، آپ کی کہانی کے بارے میں بتا دیں گے۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعہ پہنچائی جا رہی ہے۔

عروج انجم ہیڈ فقیریاں سے شریک محفل ہیں

سب سے پہلے مجھے نمرہ سے بات کرنی ہے۔ نمرہ! تجسس، معلومات، فلاسفی، تاریخ، ترکی کے گلی کوچوں کی سیر اور اسلامی نقطہ نظر سب ہی کچھ ہے آپ کے ناول میں، مگر عائشے گل اور میجر احمد کی باتوں نے مجھے اسیر کر لیا ہے اور پزل باکس کی پہیلیوں نے بہت مزا دیا ہے۔ عائشے اور حیا میں فرشتے اور محمل کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس بار آپ نے جو سورہ احزاب اور پردے کو ایک مضمون میں باندھا ہے وہ بات تو دل کو لگتی نہیں، مگر ہو سکتا ہے درست ہو۔ پردے کا ذکر تو دیگر سورتوں میں بھی ہے۔ بہرحال یہ میرا نقطہ نظر ہے، کوئی فتویٰ نہیں۔ آپ کو فون کر کر کے میں تھک چکی ہوں، مگر جواب ندارد۔

ج عروج! نمرہ کا مقصد بنو قریظہ اور پردہ میں مماثلت ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کوئی بھی اچھا یا بڑا کام کیا جائے تو اس میں مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا گھر اور باہر دونوں جگہ کرنا پڑتا ہے۔ اور ثابت قدم رہنے والے ہی کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ اشعار پر نام سہوا" غلط شائع ہو جاتے ہیں آئندہ خیال رکھیں گے۔

فون نمبر 32721666 ہے۔ آپ کی کال اس لیے نہ مل سکی کہ فون خراب تھا، اب ٹھیک ہو گیا ہے۔

زوباریہ خالد لاہور سے شریک محفل ہیں، لکھتی ہیں

السلام علیکم! ٹائٹل اچھا تھا۔ لیکن ماڈل صاحبہ اتنی پریشان کیوں تھیں۔ سب سے پہلے دوڑ لگائی "اک نئی سنڈریلا" تک۔ یہ تو پتا لگ رہا ہے کہ میشا، رومان کی سنڈریلا ہے، تو پھر ماریٔ کی ہیروئن کون ہے۔ "جنت کے پتے" میں نمرہ احمد نے حیا کے احساسات کو بہت اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔ مجھے نمرہ احمد کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔ سائرہ رضا نے اپنے ناول کا اختتام جلدی میں کیا۔ (ایسا مجھے لگا) ماہا ملک کہاں ہیں؟ وہ آج کل کیوں نہیں لکھ رہیں؟

آپ کا اندازہ صحیح ہے سائرہ رضا اس ناول کا دوسرا حصہ بھی لکھیں گی، لیکن جس طرح یہ ناول اپنی جگہ مکمل تھا، اسی طرح وہ بھی مکمل ناول ہوگا۔

ماہا ملک کہاں ہیں؟ ہم تو خود ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمارے لیے ناول لکھیں گی۔

نورین نے گاؤں مسالا راولپنڈی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

2009ء میں باقاعدگی کے ساتھ شعاع پڑھنا شروع کیا، ایسا پسند آیا یہ سلسلہ کہ تب سے رشتہ قائم ہے۔ میں راولپنڈی کے گاؤں مسالا میں رہتی ہوں۔ جس میں گیس اور آئل کی چار سے بھی زائد کمپنیاں ہیں۔ سب سے پہلے نمرہ احمد کے "جنت کے پتے" کی بات کرتی ہوں۔ اس ناول میں بہت سے مقام ایسے بھی آئے کہ جب نمرہ احمد نے آیت و حدیث کی اتنی اچھی تفسیر بیان کی جو سیدھی دل کو لگی اور خوف خدا سے رونا بھی آیا۔ ایک دفعہ جب حیا سے ڈی جے بچھڑی، ایک دفعہ جب وہ آگ میں جلی، ایک دفعہ — جب سب نے اس کے نقاب پر انگلی اٹھائی۔ مجھے حد سے زیادہ رونا آیا اور اس بات پہ خوشی بھی کہ حیا اپنے فیصلے پہ قائم رہی، جانے ہماری حیا کے لیے اور کتنے امتحانات باقی ہیں۔ فائزہ افتخار کا "سنڈریلا" اس دفعہ دکھی کر گیا اور فائزہ جی پلیز میشا اور رومان کو جدا مت کیجئے گا۔ سائرہ رضا کا ناول بھی اچھا لگا۔ نوال کی خود اعتمادی ہر فن مولا اور اسپیشلی اینڈ بہت اچھا لگا، مختلف سا۔ ناولٹ اور سب افسانے بھی اچھے تھے۔ عمیرہ احمد، ماہا ملک، مریم عزیز، رخسانہ نگار، ام مریم، بھی بہت پسند ہیں اور پلیز کنیز نبوی صاحبہ سندھ دھرتی پر ایک اور مکمل ناول لکھ ڈالیں، اب ہم منتظر ہیں اور جواد احمد کا انٹرویو بھی شامل کریں۔

ج پیاری نورین! آپ کا یقین درست ثابت ہوا، آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ شعاع میں آپ کی شرکت سے خوشی ہوئی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ آپ کا پیغام آپ کی پسندیدہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ ام مریم کا ناول ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل ہوگا۔ جواد احمد کا انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔

عندلیب گل نے فیصل آباد سے لکھا ہے

میں نہیں جانتی میں کن الفاظ میں نمرہ کے ناول پر تبصرہ کروں۔ میں نے 4th کلاس میں "قراقرم کا تاج محل" پڑھا تھا، اب میں B.A میں ہوں، مگر وہ ناول میرے ذہن سے نہیں نکلا۔

"ستارہ شام" معذرت کے ساتھ مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ "چھری تلے" سعدیہ رئیس جیسے کو تیسا کے محاورے کو پورا کرتی محسوس ہوئیں۔ "بے رخی" سدرہ المنتہیٰ حقیقت پسندی کا ثبوت لیے ہوئے تھی۔ واقعی جذبوں کو ان کی شدت کے مطابق پذیرائی نہ ملے تو وہ آہستہ آہستہ مر جاتے ہیں۔ "دل ہے مانتا نہیں" مہوش مغل کچھ حقیقت سے دور لگی۔ اتنی جلدی جلدی خودکشی کرنا آسان کام نہیں۔ "نیت" اچھا افسانہ تھا۔ "پہلی بار ہم ملے" سائرہ رضا مزے کا ناول تھا۔ "من شر الوسواس" سبق آموز تحریر تھی۔ "میرے سنگ رنگ دھنک" نٹ کھٹ سی تحریر مزا دے گئی۔ "اک نئی سنڈریلا" اچھی تحریر ہے، مگر بہت مصنوعی سی لگتی ہے۔ حقیقت میں تو ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ باقی سارے سلسلے تو ہر دفعہ کی طرح اے ون تھے۔ اب آؤں اپنے اصل مقصد کی طرف، میں نے آپ کو تین افسانے بھیجے تھے۔ پچھلے ماہ کے شعاع میں کرن شبیر صاحبہ نے "شاعری سچ بولتی ہے" میں جو انتخاب بھیجا تھا وہ نومبر 2006ء کے شعاع میں فرزانہ انصاری صاحبہ نے بھی شائع کروایا ہے اور تو اور کرن شبیر صاحبہ نے شاعری کے علاوہ بھی سارے فقرے ان کے ہی چرائے ہیں۔

ج پیاری عندلیب شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ کرن شبیر نے اگر یہ کیا ہے واقعی یہ غلط حرکت ہے۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

آپ کی تحریروں کے لیے معذرت۔ فی الحال آپ مطالعہ کریں، آپ کو بہت محنت کی ضرورت ہے۔

فوزیہ سید نے سلانوالی ضلع سرگودھا سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

"جنت کے پتے" کی، نمرہ جی زبردست نمرہ جی۔ آپ کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ پلیز آپ سے ریکویسٹ ہے کہ حیا کو جہان سے الگ مت کیجئے گا۔ سائرہ رضا کا "پہلی بار ہم ملے" بھی بہت مزے کی تحریر تھی۔ نوال کا کردار بہت مزے کا تھا۔ اخفش کا مطلب کیا ہے؟ مہوش مغل کی "دل ہے کہ مانتا نہیں" اسٹوری بس ٹھیک ہی تھی۔ صبا سحر کی اسٹوری "میرے سنگ سنگ دھنک" نے تو ہمیں ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دیا۔ بہت مزا آیا۔ ارمان کا کردار بہت مزے کا تھا۔

ج پیاری فوزیہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ چھ سال بعد آپ نے خط لکھا، اس سے پہلے ہماری بزم میں شرکت کرنے کو دل نہیں چاہا؟! اخفش ایران میں ایک حکیم گزرا ہے۔ اس کے لغوی معنی علم نجوی جاننے والا کے ہیں۔

وثیقہ زہرہ نے 440 فیض پور سے لکھا ہے۔

نومبر کا شمارہ ملتے ہی جنت کے پتے کی طرف دوڑ لگائی زبردست قسط تھی۔ "ستارہ شام" اچھی جارہی ہے لگتا ہے۔ مادی کسی مصیبت میں گرفتار ہونے والی ہے۔ سائرہ رضا کا ناول "پہلی بار ملے" اس ماہ کی بیسٹ کہانی تھی ناولٹ اور افسانے بھی زبردست تھے غزلیں اچھی لگیں۔

ج پیاری وثیقہ! نومبر کا شمارہ آپ کو پسند آیا۔ بہت شکریہ۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع میں آپ کی شرکت سے بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ایبٹ آباد سے ارم نواز لکھتی ہیں

شعاع میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ کیا کہوں میں "ستارہ شام" اچھا جارہا ہے۔ بس مادی کے ساتھ کچھ برا مت کریں پلیز۔ جویا کی کہانی میں اس کا کردار جوں کا توں ہے۔ پلیز ان سے کہیں کہ جویا کے کردار کو تھوڑا بڑھائیں اور اس کے ساتھ برا مت کریں۔ اور "جنت کے پتے" بھی بہت اچھی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے نمرہ احمد پورے ترکی میں رہ کر آئی ہیں۔

ج ارم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہانی بھجوانے کے لیے پوچھنے یا اجازت لینے کی ضرورت نہیں فوراً بھجوائیں۔ قابل اشاعت ہوئی تو ہم ضرور شائع کریں گے احادیث ہم صرف مستند کتابوں سے نقل کرتے ہیں آپ ہمیں احادیث نہ بھجوائیں۔

کلور کوٹ ضلع بھکر سے اسماء کرن نے لکھا ہے

مجھے خط لکھنے پر نمرہ احمد کے ناول "جنت کے پتے" نے مجبور کیا ہے۔ نمرہ جی! آپ نے اتنی معلومات کہاں سے لی ہیں اور کہانی لکھنے کا انداز اتنا پیارا ہے۔

دوسرا زبردست ناولٹ فائزہ افتخار کا "اک نئی سنڈریلا" ہے۔ فائزہ افتخار کی کہانیاں تو ویسے بھی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ میں نے بھی ایک افسانہ لکھا ہے۔ کیا میں بھیج دوں؟

ج اسماء جی! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد اور فائزہ افتخار تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ افسانہ بھجوانے کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں، ضرور بھجوائیں۔

کراچی سے منیرہ عادل لکھتی ہیں

"پہلی شعاع" کی چھوٹی سی مگر گہری اور بہترین بات حمد اور نعت بہت اعلا۔ ان کے شعرا کو اللہ اس کا بہترین اجر عطا کرے۔ اسی طرح پیارے پیارے نبی کی پیاری باتیں بھی ادارے کی بہترین کاوش۔ "دستک اور بندھن" دونوں اچھے لگے۔ "عید قربان اور ہم" تبصیر نشاط کا سروے سب پر سبقت لے گیا۔ مختلف شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے دلچسپ جوابات پڑھ کر واقعی اچھا لگا۔

"سنڈریلا" فائزہ افتخار کی بہترین کاوش جتنا دیکھنے میں مزہ آتا ہے۔ اتنا ہی پڑھنے میں بھی آتا ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ صباسحر کا ناولٹ بھی اچھا ہے۔ صبیحہ اقبال کے "نازک ڈور میں" بہترین پیغام دیا گیا۔ صباحت جاوید کا "نیت" بھی مجھے بہت اچھا لگا۔ "خط آپ کے" میں بہنوں کے تبصرے اور آپ کے جواب دینے کا انداز اچھا لگا۔ "آئینہ خانے میں" بہترین لگا۔

ج پیاری منیرہ شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

فضا بانو، ملائکہ ساجد اور نوید ساجد مغل پورہ لاہور سے تشریف لائی ہیں۔ لکھا ہے

اس ماہ کا سرورق بے حد اچھا تھا۔ ماڈل سے لے کر لباس اور زیورات سب بہترین تھا۔

نمرہ احمد نے خوب لکھا ہے مذہب وہ نہیں جو فیشن کے طور پر اپنایا جائے یہ تو روشنی ہے جو روح پہ اترتی ہے اور دل سونا بنا سکتی ہے۔ ویل ڈن نمرہ۔ "اک نئی سنڈریلا" فائزہ پلیز ناولٹ کو اتنی جلدی نہ سمیٹیں، ابھی ابھی تو سب کردار واضح ہوئے ہیں۔ ابھی تو مزا آنے لگا ہے۔

مجھے تو بیشا پہ حیرت ہوتی ہے کہاں تو وہ اتنی معصوم ہے کہ اسے پتا ہی نہیں کہ رومان انسان ہے اور کہاں وہ زینی کو مائر کی نظروں سے گرانے کے لیے اتنی سازشیں کرتی پھرتی ہے پھر بھی اچھی لگتی ہے "پہلی بار ملے" سائرہ رضا آپ کو دل جیت لینے کا فن آتا ہے آپ کا ناول بے حد اچھا تھا "ستارہ شام" آمنہ جی! آپ نے تو کمال کر دیا۔ مادی کے باپ نے خود کشی کی ہے یہ بات تو واضح ہے۔ مجھے تو ثمینہ بیگم کے دل میں بھی چور لگتا ہے۔ آپی! پلیز ماہا

ملک، راحت جبیں، فاخرہ جبیں، فرحت اشتیاق، میمونہ خورشید علی، سیما مناف، نگہت سیما، آمنہ مفتی کو کہیں سے ڈھونڈیں۔ عمیرہ احمد تو اب بس ٹی وی کی ہو کے رہ گئی ہیں ان سے بھی کچھ لکھوائیں۔ ایک شکوہ ہے عید نمبر میں مہندی کے ڈیزائن ضرور شائع کیا کریں۔ آپی میں بھی کہانی لکھنا چاہتی ہوں کیا اسی طرح کے صفحات پہ لکھوں یا سادہ صفحے پہ۔

ج فضہ، ملائکہ اور نوید آپ لوگوں نے شعاع کی محفل میں شرکت کی، ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ یہ مصنفین شعاع کے لیے لکھیں۔ بیشا ایک سادہ اور معصوم سی لڑکی ہے جو اپنے خواب اور خواہشوں میں الجھی ہوئی ہے۔ اس نے زینی کے خلاف کوئی سازش نہیں کی، پتا نہیں آپ کو ایسا کیوں لگا، وہ تو صرف زینی کے جھوٹ اور فریب کا پردہ چاک کرنا چاہتی ہے۔

عید نمبر میں مہندی کے ڈیزائن شامل نہ ہو سکے، اس کا ہمیں افسوس ہے۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ ناول یا افسانہ آپ کسی بھی قسم کے صفحات پر لکھ سکتی ہیں۔ لائن والے ہوں یا سادہ۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ بس صفحے کے ایک جانب اور ایک سطر کا وقفہ دے کر لکھیں۔

صالحہ اور اقصیٰ نے میرپور آزاد کشمیر سے لکھا ہے

ٹائٹل اچھا تھا، ٹائٹل پر دلہن کی تصویر رانی مکھر جی کی تھی یا کسی اور ماڈل کی ہے۔ عالیہ بخاری کو نہ پاکر دل بہت خراب ہوا "ستارہ شام" میں مادی سے کم از کم ایسی بے وقوفی کی امید نہ تھی کہ بغیر خط پڑھے سب کے سامنے جنت بیگم کو الزام دینا ہمیں لگتا ہے کہ مادی بھی سزا کاٹنے کے بعد پاگل ہو کر حال کی جنت بننے والی ہے۔ جہاں سے کہانی شروع ہوئی تھی۔ نمرہ احمد کی تعریف کے لیے تو ہمارے پاس الفاظ ہی کم پڑ جاتے ہیں۔ فائزہ افتخار کا ناول بھی اچھا جارہا ہے۔ بیشا کو رومان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اخفش اور نوال کی نوک جھونک مزا دے گئی۔ صباسحر کا ناول ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر گیا، مہوش مغل کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ مجموعی طور پر پورا شمارہ ہی لاجواب تھا۔

ٹی وی آرٹسٹ اظفر رحمٰن کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں۔

رخسانہ نگار کے بیٹے کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو بیٹے کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے آمین!

ج صالحہ اور اقصیٰ! اپنی دوست عینی کو بتادیں، ان کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ رخسانہ نگار عدنان تک آپ کی مبارک باد پہنچائی جارہی ہے۔

عنبرین بلوچ تونسہ شریف سے لکھتی ہیں۔

میرا اور شعاع کا ساتھ بہت پرانا ہے، میری خالہ اور ممانی یہ رسالے پڑھتی تھیں۔ سالگرہ نمبر 1992ء میں، ہما کوکب بخاری کے مکمل ناول "وہ جیسے میری ذات کی گم گشتہ کڑی تھی" میں "ربیکا" بہت اچھی لگی جبکہ نمرہ بخاری کے افسانے "تیرہ شبوں کا ساتھی" کی بیفا نیازی بہت مغرور لڑکی تھی۔ افسانہ بہت زبردست تھا اب سے میں ان کی دیوانی ہوں اور ابھی مجھے جس چیز سے زیادہ دلچسپی ہے وہ پڑھنے کے ساتھ لکھنا، میں افسانے اور ناولٹ لکھتی بھی ہوں۔

ج پیاری عنبرین! آپ کا افسانہ مل گیا ہے ابھی پڑھا نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ٹائٹل پر اداکارہ رانی مکھر جی کی تصویر نہیں تھی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

ویجی ٹیبل پوٹلی

اجزا :

سموسے کی رول پٹی	دس عدد
چکن	آدھا پاؤ
بند گوبھی	ایک کپ
شملہ مرچ	ایک عدد
پیاز چھوٹی	ایک عدد
انڈا	ایک عدد
لہسن پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

چکن ابال کر اس کے ریشے کرلیں۔ پیاز، شملہ مرچ اور بند گوبھی باریک کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں یہ تینوں چیزیں ڈالیں اور ساتھ ہی نمک، مرچ اور لہسن پیسٹ بھی شامل کرکے اچھی طرح مکس کریں۔ رول پٹی پر انڈا پھینٹ کر برش کی مدد سے ہلکا سا لگائیں۔ چکن کا آمیزہ رکھ کر سارے کونے اٹھا کر پوٹلی کے انداز میں اکٹھا کریں اور تھوڑا سا گھما دیں۔

ایک پتیلی کی تہہ میں تیل لگا کر ڈھکن ڈھک کر دس منٹ تک چولہے پر گرم کریں پھر پوٹلیاں رکھ کر بھاپ پر بیس منٹ تک پکائیں۔ آنچ ہلکی رکھیں۔ کیچپ کے ساتھ شام کی چائے پر پیش کریں۔

پیازی پسندے

اجزا :

گوشت	ایک کلو
دہی	ایک کپ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	دس عدد
پیاز	تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت کے پسندے بنوا کر ابال لیں۔ پیاز باریک کاٹ کر سنہری کریں۔ پسندے ڈال کر لہسن ادرک پیسٹ، نمک، دہی اور ہری مرچ کاٹ کر ڈالیں۔ تیل چھوڑنے تک بھونیں پھر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ پیش کرتے وقت لیموں کا رس چھڑک دیں۔

کونٹی نینٹل بریانی

اجزا :

گوشت	ڈیڑھ کلو
چاول	ایک کلو
لہسن پیسٹ	تین کھانے کے چمچے
ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
دہی	آدھا کپ
ٹماٹو پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
زردہ رنگ	ایک چٹکی
یخنی کیوب	ایک عدد
بریانی ایسنس	چند قطرے
پسی سیاہ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت دھو کر خشک کریں پھر اس میں دہی، نمک سویا ساس، کالی مرچ، سرخ مرچ، دو چمچے لہسن پیسٹ ڈال کر مکس کریں اور رکھ دیں۔ الگ پتیلی میں تیل گرم کرکے بقیہ لہسن پیسٹ اور کتری ہوئی ادرک ڈال کر فرائی کریں۔ ٹماٹو پیسٹ اور گوشت بمعہ مسالا ڈال کر پانچ دس منٹ بھونیں اور ایک کپ پانی اور یخنی کیوب ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ چاول ڈال کر اتنا پانی ڈالیں کہ چاول دو کنی گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے۔ زرد رنگ، بریانی ایسنس اور گرم مسالا چھڑک کر دم پر لگا دیں۔

پیش کرتے وقت چوکور کٹے ہوئے ٹماٹر اور شملہ مرچ سے سجاوٹ کریں۔

کوفتے

اجزا :

روکھا گوشت	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
بیسن	چار کھانے کے چمچے
پیاز	تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کرکے دھولیں اور کسی چھلنی میں ڈال کر رکھ دیں تاکہ اس کا اضافہ پانی نکل جائے۔ فرائنگ پان میں چار چمچے تیل گرم کرکے بیسن سنہرا کرلیں۔ بیسن سمیت تمام مسالے گوشت میں ڈال کر گرائنڈ کرلیں۔ ہری مرچ ہرا دھنیا باریک کتر کر شامل کریں اور کوفتے بنا کر فریز کرلیں۔ ٹکیہ یا سیخ کباب کی شکل میں بھی بنا سکتی ہیں۔ ٹکیہ بنانے کی

صورت میں اسے شام کی چائے پر بطور اسنیکس استعمال کر سکتی ہیں۔ انڈا لگا کر فرائی کر لیں اور کوفتے بنانے کی صورت میں آپ جب چاہیں عام طریقے سے شوربا بنائیں اور کوفتے فرائی کر کے اس میں ڈال دیں۔ کوفتے کا سالن تیار ہے۔

انڈے کا حلوہ

اجزا :

انڈے	بارہ عدد
چینی	ڈیڑھ پاؤ
بالائی	ایک پیالی
کیوڑہ	ایک چائے کا چمچہ
بادام	حسب ضرورت
پسا کھوپرا	آدھی چھٹانک
سبز الائچی	چار عدد
کھویا	آدھی پیالی
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

بالائی پھینٹ کر اس میں کھویا مسل کر ڈال دیں، پھر آدھا چمچہ کیوڑہ اور چینی ڈال کر اتنا پھینٹیں کہ پھٹکی نہ رہے اور سارا آمیزہ یکجان ہو جائے۔ انڈوں کو جھاگ آنے تک پھینٹیں۔ کھلے منہ کے برتن میں گھی گرم کر کے الائچی دانے کڑکڑائیں پھر تمام چیزیں ڈال کر چمچہ چلاتے رہیں۔ پانی خشک ہو جائے۔ حلوہ گھی چھوڑ دے تو آدھا چمچہ کیوڑہ ڈال کر تھوڑی دیر کے لیے ڈھک دیں۔ حلوہ تیار ہے۔

اسٹیم ران روسٹ

اجزا :

بکرے کی ران	ایک عدد
دہی	ایک پاؤ
ادرک لہسن پیسٹ	دو چائے کے چمچے
کچا پپیتا	دو چائے کے چمچے
خشخاش	دو چائے کے چمچے
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ران صاف کر کے گہرے لمبے کٹ لگائیں اور کچا پپیتا لگا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ دہی میں تیل سمیت تمام مسالے (خشخاش پیس کر) مکس کر کے ہاتھ سے اچھی طرح ران پر لگائیں اور ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر ایک بڑی پتیلی میں پانی گرم کریں۔ اس کے اندر کسی چھلنے میں لیگ پیس رکھ کر بھاپ میں اتنی دیر پکائیں کہ گوشت گل جائے۔ چپاتی، سلاد اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

کھجور کا شربت

اجزا :

کھجور	1 پاؤ
دودھ	1 لیٹر
کریم	آدھا کپ
بادام	12 عدد
چینی	آدھا کپ

ترکیب :

کھجور سے گٹھلیاں نکال کر بلینڈر میں ڈالیں۔ ساتھ ہی چینی اور دودھ ملا کر بلینڈ کر لیں۔ اس کے بعد بادام (باریک کاٹ کر) اور کریم ڈال کر مکس کر لیں۔ (زیادہ گاڑھا لگے تو آدھا گلاس پانی بھی شامل کر سکتی ہیں۔) برف ڈال کر ٹھنڈا کریں اور مہمانوں کو پیش کریں۔

☆

تاریخ کے جھروکوں سے

امت الصبور

(یہودیوں کی شرارتیں، عہد شکنی، حملے اور مسلمانوں کی مدافعتیں)

لفظ یہود سے اگرچہ صرف وہی ایک قبیلہ مراد ہونا چاہیے، جو یہود ابن یعقوب علیہ السلام کی نسل سے تھا۔ لیکن اصطلاحاً "بنی اسرائیل کے بارہ قبائل ہی کا نام یہی پڑ گیا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے ابتدائی زمانہ میں خدا کی مقبول اور برگزیدہ قوم تھی۔ لیکن آخر میں وہ خدا سے اس قدر دور ہوتے گئے کہ خدا کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔

حضرت مسیحؑ جیسے رحم دل نے ان کی حالتوں کو دیکھ کر انہیں سانپ اور سانپ کے بچے بتایا تھا اور یہ بھی خبر دی تھی کہ خدا کی بادشاہت اس قوم سے لے جا کر ایک دوسری قوم کو دی جائے گی۔ جو اس کے اچھے پھل لائے۔

جب اس بشارت کے ظہور کا وقت آگیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بہترین تعلیم کی تبلیغ شروع کی تو یہود نے سخت پیچ و تاب کھایا اور آخر یہی فیصلہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ویسا ہی ظلم و ستم کا آماجگاہ بنایا جائے، جیسا کہ مسیحؑ کو بنا چکے تھے۔

یہود اگرچہ ہجرت کے پہلے ہی سال معاہدہ کر کے امن عامہ کا پیمان باندھ چکے تھے۔ لیکن فطری شرارت نے زیادہ دیر تک چھپا رہنا پسند نہ کیا۔ معاہدہ سے ڈیڑھ سال ہی کے بعد شرارتوں کا آغاز ہو گیا۔ جب مسلمان نبی کریمؐ کے ساتھ بدر کی جانب گئے ہوئے تھے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک مسلمان عورت بنو قینقاع کے محلے میں دودھ بیچنے گئی۔ چند یہودیوں نے شرارت کی اور اسے سر بازار برہنہ کر دیا۔ عورت کی چیخ و پکار سن کر ایک مسلمان موقع پر جا پہنچا۔ اس نے طیش میں آکر فساد انگیز یہودی کو قتل کر دیا۔ اس پر سب یہودی جمع ہو گئے۔ اس مسلمان کو بھی مار ڈالا اور بلوہ بھی کیا۔ نبی کریمؐ نے بدر سے واپس آکر یہودیوں کو اس بلوہ کے متعلق دریافت کرنے کے لیے بلایا۔ انہوں نے معاہدہ کا کاغذ بھیج دیا اور خود جنگ پر آمادہ ہو گئے۔

یہ حرکت اب بغاوت تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے ان کو یہ سزا دی گئی کہ مدینہ چھوڑ دیں اور خیبر میں جا آباد ہوں۔

تیسری سازش، غزوہ خندق یا جنگ احزاب

5 ھ کا مشہور واقعہ جنگ خندق ہے۔ بنو نضیر خیبر پہنچ کر بھی امن سے نہیں بیٹھے۔ انہوں نے یہ عزم کیا کہ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک متفقہ کوشش کی جائے۔ جس میں عرب کے تمام قبائل اور جملہ مذاہب کے جنگجو شامل ہوں۔

انہوں نے بیس سردار مقرر کیے کہ عرب کے تمام قبیلوں کو حملہ کے لیے آمادہ کریں۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذیقعد 5 ھ میں دس ہزار کا خونخوار لشکر جس میں بت پرست، یہودی وغیرہ سب ہی شامل تھے، مدینہ پر حملہ آور ہوا۔ قرآن مجید میں اس لڑائی کا نام جنگ احزاب ہے۔

1 ۔ قریش، بنو کنانہ، اہل تہامہ، زیر کمان سفیان بن حرب تھے۔

2 ۔ بنی فزارہ، زیر کمان عقبہ بن حصین۔

3 ۔ بنی مرہ، زیر کمان حارث بن عوف۔

4 ۔ بنی الشجع و اہل نجد زیر کمان مسعود بن رخیلہ۔

مسلمانوں نے جب ان لشکروں سے مقابلہ کی طاقت نہ دیکھی تو شہر کے گرد خندق کھودلی۔ دس دس آدمیوں نے چالیس چالیس گز خندق تیار کی تھی۔

صحابہ خندق کھودتے ہوئے یہ شعر پڑھتے تھے۔

"ہم وہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت اسلام کی ہے۔"

خندق کھودنے پتھر توڑنے مٹی ہٹانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی صحابہ کو مدد دیتے تھے۔ سینہ مبارک کے بال مٹی سے چھپ گئے تھے اور ابن رواحہ کے اشعار ذیل کو باآواز بلند پڑھتے تھے۔

اے خدا! تیرے سوا ہم کو ہدایت تھی کہاں
کیسے پڑھتے ہم نمازیں کیسے دیتے ہم زکوٰۃ
اے خدا ہم پر سکینہ کو تو فرمادے نزول
دشمن آجائے تو ہم کو کر عطا یا رب ثبات
بے سبب ہم پر یہ دشمن ظلم سے چڑھ آئے ہیں
فتنہ گر ہیں وہ نہیں بھائی ہمیں فتنہ کی بات

مسلمان صرف تین ہزار تھے۔ اسلامی لشکر مدینہ ہی کے اندر اس طرح اترا کہ سامنے خندق تھی اور پس پشت کوہ سلع۔ بنو قریظہ یہودی جو مدینہ میں آباد تھے اور جن پر معاہدہ کے تحت پابندی تھی کہ مسلمانوں کا ساتھ دینا ہے۔ ان سے شب کی تاریکی میں حیی بن اخطب یہودی سردار بنو نضیر جاکر ملا اور انہیں عہد توڑنے پر آمادہ کرکے اپنی طرف ملالیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کئی نقیب (حواری) بھی ان کے پاس بار بار سمجھانے کو بھیجے مگر انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"محمدؐ کون ہے کہ ہم اس کی بات مانیں۔ اس کا ہم سے کوئی عہد و پیمان نہیں۔"

اس کے بعد بنو قریظہ نے شہر کے امن و امان میں بھی خلل ڈالنا شروع کردیا اور مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو خطرہ میں ڈال دیا۔ چنانچہ ان تین ہزار مسلمانوں میں سے بھی ایک حصہ کو شہر کے امن عامہ کی حفاظت کے لیے علیحدہ کرنا پڑا۔ بنو قریظہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ جب باہر سے دس ہزار دشمن کا جرار لشکر حملہ آور ہوگا اور شہر کے اندر غدر پھیلا کر ہم مسلمانوں کی عافیت تنگ کردیں گے تو دنیا پر مسلمانوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ طبعاً" جنگ سے نفرت تھی۔ آپ نے غطفانی سرداروں سے گفتگو کی طرح ڈالی۔ ان لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ہمیں دے دیا جائے تو ہم واپس چلے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مشاورت کی۔ لیکن انصار نے جنگ کو ترجیح دی۔ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے اس تجویز کے متعلق تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"جن دنوں یہ حملہ آور قبائل شرک کی نجاست میں آلودہ اور بت پرستی میں مبتلا تھے ان دنوں بھی ہم نے ان کو ایک چھوہارہ تک نہیں دیا۔ آج جب خدا نے ہمیں اسلام سے مشرف فرمادیا ہے تو ہم انہیں کیونکر پیداوار کا ثلث دے سکتے ہیں۔ ان کے لیے ہمارے پاس تو تلوار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

حملہ آور فوج کا محاصرہ بیس دن تک رہا۔ کبھی کبھی اکے دکے کا مقابلہ بھی ہوا۔ عمر بن عبدود جو اپنے آپ کو ہزار جوانوں کے برابر سمجھا کرتا تھا۔ حیدر کرار علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا اور نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ بھی مقابلہ میں ہلاک ہوا۔ اہل مکہ نے نوفل کی لاش لینے کے لیے دس ہزار درہم مسلمانوں کے پیش کیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لاش دے دو قیمت درکار نہیں۔"

جب وہ اس عرصہ میں محصور مسلمانوں سے کوئی مورچہ نہ لے سکے تو ان کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ آخر ایک رات تمام لشکر اپنے ڈیرے ڈنڈے اٹھاکر رفوچکر ہوگیا۔

عدل و انصاف

اسلام کا ابتدائی دور اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ حجاز کے شمال میں عربوں کے ایک خاندان بنی غسان نے ایک سلطنت قائم کررکھی تھی۔ شام میں رومیوں کا اقتدار قائم ہوا تو یہ غسانی سلطنت ان کے زیر اثر آگئی۔ جبلہ اس کا آخری تاجدار تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ عرب کے تمام قبیلے اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے ہیں اور نئی اسلامی حکومت نے روم و ایران کی شوکت پر بھی لرزہ طاری کردیا ہے تو وہ خود بھی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا اور حضرت عمرؓ کو اپنے ارادے کی اطلاع دے دی کہ مدینہ منورہ میں حاضر ہوکر اسلام لانا چاہتا ہوں۔ حضرت عمرؓ یہ اطلاع پاکر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ بہت شوق سے آؤ۔ قبول اسلام کے بعد تمہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوجائیں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور تمہارے ذمے وہی فرض عائد ہوجائیں گے جو ہم پر عائد ہیں۔

جبلہ پانچ سو سواروں کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا۔ اس نے تمام سواروں کو زربفت کی قبائیں پہنا رکھی تھیں۔ خود بھی زرتار لباس زیب بدن کررکھا تھا اور سر پر مرصع سنہرا تاج جگمگا رہا تھا۔ اہل مدینہ نے اس ٹھاٹھ کا جلوس پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

غرض جبلہ، حضرت عمرؓ کے دست مبارک پر اسلام لایا۔ حج کا موسم قریب تھا اور حضرت عمرؓ ہی کے ساتھ وہ بھی حج کے لیے مکہ معظمہ پہنچا۔ ایک روز خانہ کعبہ کا طواف کررہا تھا کہ اتفاق سے ایک بدوی کا پاؤں نادانستہ جبلہ کے جبے کے دامن پر پڑگیا۔ جبلہ کے دماغ سے شاہی غرور ابھی زائل نہ ہوا تھا۔ اس نے بدوی کے منہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ ناک کا بانسہ پھوٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ بدوی نے جبلہ سے تو کچھ نہ کہا اور دادخواہی کے لیے حضرت عمرؓ کے پاس پہنچ گیا۔

خلیفہ اسلام نے شکایت سن کر جبلہ کے پاس آدمی بھیجا اور دریافت کیا کہ اس بے گناہ کو کیوں مارا ہے؟

جبلہ نے جواب دیا کہ اس نے سخت گستاخی کی۔ میرے لباس پر پاؤں رکھ دیا۔ یہ تو طمانچہ ہی تھا اگر خانہ خدا کی حرمت کا پاس نہ ہوتا تو اس کا سر اڑا دیتا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا "خیر! اور جو کچھ آپ کرتے وہ تو دیکھ لیا جاتا۔ آپ نے اپنے جرم کا اقبال تو کرہی لیا۔ جس طرح بھی ہو اس بدوی کو راضی کیجئے ورنہ مجھے حکم دینا پڑے گا کہ بدوی بھی آپ کے منہ پر اسی طرح طمانچہ رسید کرے۔"

جبلہ یہ سن کر حیران رہ گیا اور بولا "میں فرماں روا ہوں اور یہ ایک ادنیٰ شخص ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اسلام قبول کرلینے سے میری عزت بڑھے گی۔ یہ معلوم نہ تھا کہ جو عزت مجھے پہلے سے حاصل ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا "اسلام نے تمہیں اور اس شخص کو برابر کردیا ہے۔ فضیلت میں بڑا وہ ہے جو نیک اعمال میں بڑا ہو۔ تمہاری عزت یقیناً" بڑھ گئی۔ وہ اس طرح کہ تم میں اور تمام مسلمانوں میں اخوت و برادری کا رشتہ پیدا ہوگیا۔"

آخر جبلہ نے ایک رات سوچنے کی مہلت مانگی۔ اندھیرا چھاگیا تو وہ اپنے سواروں کو لے کر چپ چاپ مدینہ سے نکل گیا۔ وہ اپنے وطن میں بھی نہ ٹھہرا بلکہ رومی بادشاہوں کے علاقے میں جا پہنچا اور باقی زندگی وہیں عیش و آرام سے بسر کی لیکن آخری وقت تک اسلام سے پھر جانے پر پچھتاتا رہا وہ خود کہا کرتا تھا کہ کاش! میری ماں مجھے نہ جنتی اور کاش! میں وہ بات مان لیتا جو حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی۔

حضرت عمرؓ نے چھوٹے بڑے کا لحاظ کیے بغیر سلطانی عدل کا فیصلہ سنادیا اور جبلہ کی خاطر اصول میں رد و بدل گوارا نہ کیا۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ پہلی قومیں اس لیے ہلاک ہوئیں کہ غریبوں پر شریعت کا حکم لگادیا جاتا تھا اور امیروں سے کچھ نہ کہا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے دنیا کو اسلامی عدل کا نمونہ دکھادیا۔

☆

ادارہ

موسم سرما میں بالوں کو نرم ملائم اور چمک دار بنانے کے لیے ماہرین کی بہترین ٹپس پر عمل کر کے آپ پریشانی سے بچ سکتی ہیں

سردیوں کے دوران ٹھنڈی اور خشک ہوائیں نہ صرف چہرے' ہونٹوں اور جسم پر سخت اثرات مرتب کرتی ہیں بلکہ بال بھی خشک' کمزور اور بے رونق ہو جاتے ہیں۔

1 بالوں کو دھونا : موسم سرما میں بالوں کو کثرت سے نہیں دھونا چاہیے کیونکہ بالوں کو بہت زیادہ دھونے سے وہ روکھے اور کمزور ہو جاتے ہیں۔

ہفتے میں ایک مرتبہ یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ بالوں کو دھویا جائے' بالوں کو دھونے کے لیے نیم گرم پانی اور کسی اچھے معیاری شیمپو کا استعمال کیا جائے۔

اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ پانی بہت زیادہ گرم نہ ہو کیونکہ یہ بالوں کی قدرتی چکنائی اور روغن کو بالوں سے نکال دے گا' جس سے بال روکھے اور سر میں خشکی پیدا ہوگی۔

ایسے شیمپو ہرگز استعمال نہ کریں جس میں طاقتور ڈٹرجنٹ شامل ہوں۔

2 ہیئر کنڈیشنر : شیمپو لگانے کے بعد بالوں پر کنڈیشنر ضرور استعمال کریں کیونکہ موسم سرما کی وجہ سے بالوں میں پیدا ہونے والی خشکی کو کم کرنے میں مدد دیتا ہے اور بال نرم و ملائم اور چمک دار دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن اگر آپ مصنوعی کنڈیشنر کے بجائے قدرتی اشیاء سے بنے ہوئے کنڈیشنر استعمال کریں تو وہ بالوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوں گے۔

3 گرم تیل کا مساج : سردیوں کے موسم میں بالوں کو خشکی سے بچانے کے لیے ہفتے میں دو مرتبہ نیم گرم تیل سے سر کا مساج ضرور کریں۔ مساج کے لیے آپ زیتون کا تیل' ناریل کا تیل یا سرسوں کا تیل استعمال کر سکتی ہیں۔

اپنی پسند کے کسی بھی تیل سے سر کی کھوپڑی کا اچھی طرح مساج کریں' پھر تولیے کو گرم پانی میں اچھی طرح بھگو کر نچوڑ لیں تاکہ تولیے کا سارا پانی نکل جائے۔ اب تولیے کو پانچ منٹ کے لیے سر پر لپیٹ دیں' اس ٹریٹمنٹ کے ذریعے بال سارا تیل اچھی طرح جذب کر لیں گے۔ سردیوں کے موسم میں مہندی' ہربل آئل جیسے کہ کیسٹر آئل استعمال کرنے سے گریز کریں۔

4 بالوں کو باندھ کر رکھیں : موسم سرما میں بالوں کو ہمیشہ باندھ کر رکھیں کیونکہ ٹھنڈی اور خشک ہوائیں بالوں کو براہ راست نقصان پہنچاتی ہیں۔ خشک بال آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں' اس لیے بالوں پر بہت زیادہ برش کرنے سے گریز کریں اور نہ ہی گیلے بالوں کے ساتھ باہر جائیں۔